تفسیرِ مکی

جلد پنجم

استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ

حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ



الله الله الله

مکتبة الفقیر

MAKTABA-TUL-FAQEER

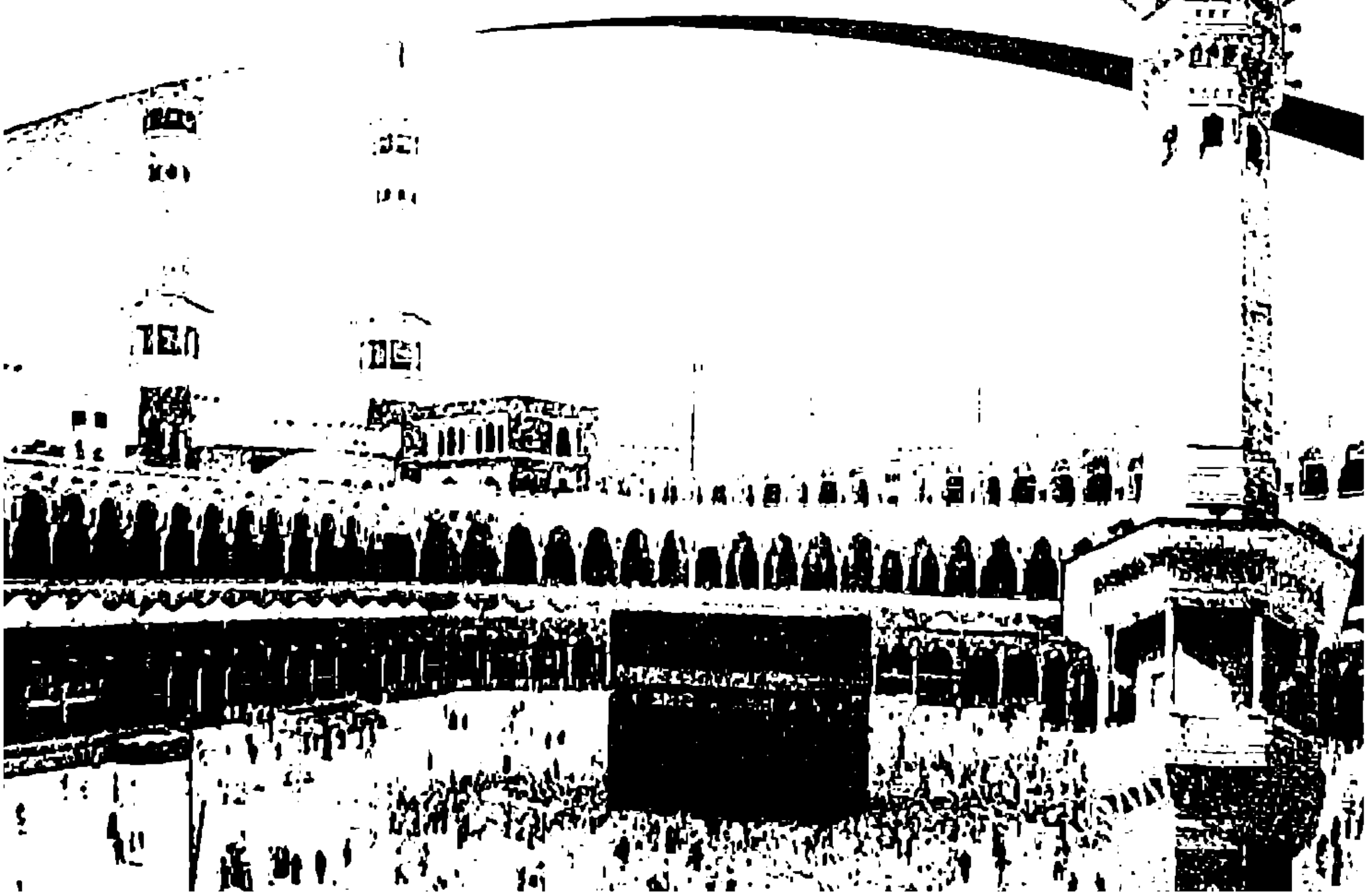
تفسیرِ مکیؒ

جلد 5

اُستاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکیؒ حجازی دامت برکاتہم

المُدرّس بالمسجد الحرام بمكة المُكرمة

تحقیق و ترتیب | مولانا امداد اللہ انور
اُستاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان



اجازت طباعت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وحدہ [illegible]

[illegible]

تمام مطبوعات [illegible] طباعت کی

اجازت ہے

[illegible] محمد مکی حجازی [illegible] بالمسجد الحرام

۴ ربیع الاول ۱۴۲۹

نام کتاب — تفسیر مکی جلد 5

صاحب خطبات — استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

تحقیق وترتیب — مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان

کمپوزنگ — دار التصنیف معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اشاعت اول — اکتوبر 2019ء

تعداد — 1100

ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org

0300-9652292,03228669680

0335-7873390,03101702690

E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تفسیر آلِ عمران 501

فہرست مضامین

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟

أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ

وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ

وَلَا تُبْطِلُوٓا۟ أَعْمَٰلَكُمْ



عرضِ ناشر

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: (۱)...... بیت اللہ، (۲)...... کتاب اللہ، (۳)...... اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجدِ حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برِ صغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو دان طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمالِ مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

زیر نظر تفسیر ''انوار الحرم'' المعروف ''تفسیر مکی'' حضرت اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل ایک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر ''مکتبة الفقیر'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور ''مکتبة الفقیر'' دونوں کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمة سید المرسلین ﷺ

اجازت ہو تو آکر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہو گا

قارئینِ کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:

فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی

مکتبة الفقیر

تفسیر سورۂ بقرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقۡتُلُوۡہُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡہُمۡ وَاَخۡرِجُوۡہُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ اَخۡرَجُوۡکُمۡ وَالۡفِتۡنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوۡہُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوۡکُمۡ فِیۡہِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡکُمۡ فَاقۡتُلُوۡہُمۡ ؕ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انۡتَہَوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۹۲﴾﴾ [البقرۃ: ۱۹۰تا۱۹۲]

''اور جہاد کرو اللہ کے راستہ میں ان (کافر) لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں اور کسی پر زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو قتل کرو جہاں بھی پاؤ اور ان کو نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا۔ اور فساد قتل سے زیادہ سخت ہے۔ اور ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے اس جگہ نہ لڑیں۔ پس اگر وہ خود لڑیں تو تم ان کو مارو۔ یہی کافروں کی سزا ہے۔ پس اگر یہ کفر سے باز آ کر اسلام لائیں تو اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔''

اسبابِ نزول:

سورۃ البقرۃ کی ان آیات میں قتال کے مسائل بیان کیے ہیں اور ان کے بعد قتال المسجد الحرام کا مسئلہ ہے۔ ابتداء میں جب اسلام آیا تو سرکار مدینہ ﷺ پر اللہ پاک نے وحی نازل فرمائی، قرآن مقدس نازل فرمایا اور آپ ﷺ نے اعلانِ نبوت فرمایا تو اس وقت مسلمانوں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صبر اور خالص صبر کا حکم تھا کہ دشمن جو

چاہے کرے، لیکن تم نے صبر کرنا ہے۔ اس لیے آپ جتنی بھی مکی آیات دیکھیں گے جو ہجرت سے قبل نازل ہوئیں، کسی میں بھی اللہ تعالیٰ نے قتال کا حکم نہیں دیا۔ سب سے پہلے قتال کا حکم مدینہ منورہ میں آیا۔ جب آپ ﷺ نے دعوتِ توحید دی اور کفار نے پوری قوت اور شدت کے ساتھ نبی پاک ﷺ کا مقابلہ کیا، انہوں نے اسلام کو روکا اور نبی پاک ﷺ کے راستے میں مشکلات پیدا کیں اور آہستہ آہستہ لوگ اسلام لانا شروع ہو گئے۔ عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں، کامل مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

بہر حال! یہ اسلام کا ابتدائی دور تھا اور بڑا مشکل دور تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اتنے ظلم توڑے گئے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت خباب رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور بی بی سمیہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ اگر آج کوئی آدمی آنکھیں بند کر کے سرزمینِ مکہ پر غور کرے تو کوئی گھاٹی یا پہاڑ ایسا نظر نہیں آتا جہاں میرے مدنی ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خون کے چھینٹے نہ پڑے ہوں۔ یہ گلیاں اور پہاڑ ان کی قربانیوں کے گواہ ہیں۔ مکہ کی وادیاں اور ان کی اذانیں اسلام پر ثابت قدم رہنے کی گواہ ہیں کہ انہوں نے اتنی بڑی قربانیاں دی ہیں کہ تاریخ میں کوئی ان کی مثال قائم نہیں کر سکتا۔

آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایک عورت کو ڈرایا اور دھمکایا جائے اور اس سے اتنا ظلم کیا جائے اور پھر بھی وہ ثابت قدم رہے اور اپنے ایمان کو نہ چھوڑے! وہ کیسی ثابت قدمی ہوگی کہ ابوجہل نے کفارِ مکہ کو جمع کر لیا اور بی بی سمیہ رضی اللہ عنہا کو دونوں ٹانگوں سے رسے بندھوا کر اونٹوں سے بندھوا دیئے۔ اور ان کو کہا کہ دیکھو! اب بھی کلمہ چھوڑ دو، ورنہ جب اونٹ دوڑیں گے تو تم دو ٹکڑے ہو جاؤ گی۔ انہوں نے کہا کہ دنیا کا عذاب منظور ہے، لیکن آخرت کا عذاب قبول نہیں ہے کہ یہ تو دنیا کی تکلیف خود بخود ختم ہو جائے گی، لیکن کافر کو جو آگے جہنم کی سزا ملنی ہے، اس سزا کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ پس اس ظالم نے مخالف سمت میں اونٹوں کو دوڑایا اور نیزہ لے کر بی بی کی شرم گاہ میں مارا، حتیٰ کہ وہ دو ٹکڑے ہو گئیں، لیکن اس وقت بھی زبان پر کلمہ تھا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ''۔

اتنی بڑی بڑی تکلیفیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انگاروں پر لٹایا گیا اور ان کے جسموں میں بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے اور کوئی چھڑانے والا بھی نہیں تھا اور کوئی ان تڑپتے ہوئے لوگوں پر پانی ڈالنے والا بھی نہیں تھا۔ جب یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ۴۰ ہو گئی، ۴۸ ہو گئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ حضور! اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ کیونکہ ظلم حد سے تجاوز کر

گیا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ نہیں! بلکہ تم صبر کرو، جواب نہ دو۔ جو تمہیں ستا سکتا ہے ستالے، مگر تم صبر کرو۔

پس علماء کرام نے لکھا ہے کہ اگر تمہیں منہجِ نبوی ﷺ کے مطابق زندگی میں انقلاب لانا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک داعی ہو، وہ جماعت بنائے تو شروع میں وہ صبر کرے، اور جب جماعت پختہ کار ہو جائے تو پھر ہر باطل سے ٹکرا جائے؛ اس لیے کہ جب تک جماعت ہی پختہ نہیں ہوگی، افراد کار ہی پختہ نہیں ہوں گے، ان میں نظم نہیں ہوگا اور ان میں اپنے امیر کی اطاعت کا جذبہ نہیں ہوگا تو وہ کیا مقابلہ کریں گے؟

اب جب ظلم بالکل حد سے بڑھ گیا تو صرف اتنی اجازت ملی کہ مکہ چھوڑ دیں اور ہجرت کر لیں۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے، پھر حبشہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کر گئے۔ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی۔ میرے آقا ﷺ مدینہ پاک تشریف لے گئے، اسلام پھیلنا شروع ہو گیا، انصاری مسلمان ہو گئے، قبیلہ اوس وخزرج والے مسلمان ہو گئے، دیگر کئی قبائل مسلمان ہو گئے، اسلام کی طاقت میں اضافہ ہو گیا تو اب اللہ پاک نے قتال کی اجازت دے دی کہ اب تم کافروں کے ساتھ قتال کر سکتے ہو، لیکن اللہ پاک کے ہر حکم میں حکمتیں ہیں اور اس میں حدود اور قیود ہیں۔ جیسے آپ نے روزہ میں پڑھا ہے کہ دن میں روزہ ہے اور رات کو اجازت ہے کہ کھائیں، پئیں اور بیوی سے ملیں۔ اب رعایت ہے۔

گزشتہ آیات سے ربط:

پہلے حج کا مسئلہ تھا اور اب قتال کا مسئلہ ہے۔ ان میں ربط یہ ہے کہ آپ ﷺ عمرہ کے لیے تشریف لے آئے اور آپ ﷺ نے خواب میں دیکھا تھا، جس کا ذکر اللہ پاک نے قرآن پاک میں بھی فرمایا ہے: ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ﴾ [الفتح:۲۷]

آیاتِ مبارکہ کا شانِ نزول اور عمرۃ القضاء:

آپ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ ﷺ اطمینان سے مسجد حرام میں جا رہے ہیں، عمرہ کر رہے ہیں، کوئی بالوں کو کٹوا رہا ہے اور کوئی بالوں پر استرا پھروا رہا ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے تیاری فرمالی اور تقریباً ۱۵۰۰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر عمرے کے لیے تشریف لے گئے۔ اللہ کے نبی کا خواب ایسے ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے، یعنی عین حق ہوتا ہے۔ اللہ کے نبی کی وحی جاگتے ہوئے بھی سچی اور نیند میں بھی سچی ہوتی ہے؛ اس

لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام مجسمہ صداقت و امانت ہوتے ہیں اور ان پر ایسا پہرہ ہوتا ہے کہ شیاطین ان پر حملہ کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن خواب میں تاریخ متعین نہیں تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام عمرہ کے لیے جائیں گے، لیکن کب؟ یہ متعین نہیں تھا کہ آپ اسی سال جائیں گے، اسی مہینہ میں جائیں گے، یا سال دو سال کے بعد جائیں گے، کب جائیں گے؟ یہ بات نہیں تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ اور مکہ والوں کو پتہ چلا کہ ۱۵۰۰ کا لشکر ان کے ساتھ ہے تو مکہ والوں نے اپنے آدمی بھجوا دیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راستے میں روک دیا۔ مکہ میں حدیبیہ مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ کیا ہوا تھا۔ مکہ والے پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے تو آپ رک گئے۔ بہر حال آپ نے عمرہ نہیں کیا اور صلح ہوگئی اور آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ واپس مدینہ تشریف لے گئے۔ اور صلح میں یہ بات طے ہوگئی کہ آپ ابھی تو واپس جائیں، اگلے سال آپ کو عمرہ کرنے کی اجازت ہوگی۔ ہم آپ کے لیے تین دن کے لیے حرم خالی کر دیں گے۔ آپ تین دن طواف کریں، صفا و مروہ دوڑیں، مکہ میں رہیں اور تین دن کے بعد آپ تشریف لے جائیں۔ تین دن کے اندر ہم آپ کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کریں گے۔ یہ بات طے ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔

اور اگلے سال عمرہ کے لیے تشریف لے آئے؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اسے چھوڑ دیا تھا۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو اسے قضاء کرنا پڑتا ہے۔ اب جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے لیے تشریف لائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مکہ کے کفار پر اعتبار نہیں ہے جیسے انہوں نے ہمیں بلا وجہ عمرہ سے روک دیا اور ۱۵۰۰ کا لشکر واپس آگیا۔ اب اندیشہ یہ ہے کہ یہ ابھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم مکہ جائیں اور یہ لڑنا شروع کر دیں اور ہمیں نقصان پہنچائیں، ان کا کیا اعتبار ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ تو ان کا حج و عمرہ کے ساتھ بھی تعلق تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء پر تشریف لا رہے تھے۔ تو پہلے بھی حج کا ذکر چل رہا تھا۔ اب مسئلہ بھی ضروری تھا کہ اگر ہم عمرہ کے لیے آئیں اور خدانخواستہ حرم میں کوئی آدمی ہم سے لڑ پڑے تو ہمارے لیے کیا حکم ہوگا؛ اس لیے کہ ہم تو حج کے لیے آئے ہیں، عمرہ کے لیے آئے ہیں، لیکن ایسے شریر بھی تو موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حرم کا بھی حیا نہیں کرتے، پھر بھی لڑتے ہیں۔ بہر حال ان حالات کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ [البقرۃ: ۱۹۰] (اور تم (بھی) اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال

کرو، (لیکن) ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑائی کریں)۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی پر اعتراض اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا جواب:

یہی وجہ تھی کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسا عظیم سپہ سالار اور عظیم کمانڈر...... کہ جس کی کمانڈری کے بارے میں لوگوں نے سینکڑوں کتابیں لکھ ڈالیں اور دشمنوں، انگریزوں اور کافروں نے اعتراف کیا ہے کہ اگر خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) جیسے دو جرنیل مسلمانون کو اور مل جاتے تو پوری زمین پر اسلام کا پرچم بلند ہوجاتا۔ تو اتنے بڑے جرنیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فتح ان کے نام لکھ دی تھی کہ خالد کا نام آیا اور جنگ کا پانسا بدل گیا۔......ان کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خط لکھا کہ آپ کو عہدے سے ہٹایا جاتا ہے، آپ اپنا چارج ابوعبیدہ بن الجراح کے سپرد کردیں اور آپ فقط ایک سپاہی بن کے رہیں۔ اب ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مجھے انچارج بنایا ہے اور آپ کو معزول کردیا ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مسکرائے اور فرمایا کہ اچھی بات ہے ابوعبیدہ!! عام سپاہی کی حیثیت سے لڑنا مجھے منظور ہے، میری جنگ کوئی ذاتی اقتدار کی خاطر تو نہ تھی، میں مارشل لاء لگا کر تو نہیں بیٹھا تھا، میں تو اللہ کے دین کے لیے لڑ رہا تھا۔ اب میں تمہاری قیادت میں ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑوں گا۔

دشمنوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آدمی بھیجا کہ ہم تمہیں آدھا ملک دیتے ہیں کہ اسلام نے تمہاری کتنی بے عزتی کی ہے!؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمہاری کتنی توہین کی ہے!؟ ہمارے ملک میں آجاؤ، ہم تمہیں آدھا ملک دے دیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ خبردار! خالد نہ تو پہلے ملک کے لیے لڑا ہے اور نہ اب ملک کے لیے لڑتا ہے۔ خالد پہلے بھی اللہ تعالیٰ کے لیے لڑتا تھا اور اب بھی اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے لڑے گا۔ یہ نہ سمجھو کہ اب خالد نہیں لڑے گا۔ جنگ تو اب بھی میں اسی طرح لڑوں گا، صرف نام ابوعبیدہ کا ہوگا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحم کردیا ہے اور ذمہ داریوں سے بچالیا ہے کہ پہلے پورے لشکر کی ذمہ داری مجھ پر تھی اور اب میں...... الحمدللہ!...... آزاد ہوں کہ لڑوں گا بھی اور ذمہ داری بھی کچھ نہیں ہے۔ میں تو بڑا خوش ہوں کہ اللہ پاک نے مجھے ایک فرض کی ذمہ داری سے ہٹادیا تو یہ جہاد ہے۔

اسی طرح آپ اپنی عزت کو بچانے کے لیے لڑ گئے۔ مثلاً: آپ گھر میں تھے کہ کسی نے تمہاری بیوی، بیٹی، بہن

وغیرہ پر حملہ کیا تو اس کے دفاع میں تم لڑو گے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے لڑنا ہے۔ اسی طرح تمہاری جائیداد ہے، تمہارا حق ہے، لیکن کوئی ظالم زبردستی چھیننا چاہتا ہے اور تم دفاع میں لڑ رہے ہو تو یہ بھی حق ہے، تمہیں دفاع میں لڑنے کا حق ہے۔ اگر تم مارے جاؤ گے تو شہید ہو گے اور وہ مرے گا تو جہنمی ہوگا۔

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان سے لڑو جو تمہارے ساتھ لڑتے ہیں۔ اور زیادتی مت کرو اور حد سے نہ نکلو۔ مطلب یہ ہے کہ تم کسی کی لاش کے ٹکڑے نہ کرو۔ خبردار! تم کسی کی عورتوں کو بلا وجہ قتل نہ کر دو، جبکہ وہ لڑ نہ رہی ہوں، یہ بھی تجاوز ہے۔ یا تم دشمن کو قتل کر کے اس کی بے حرمتی کرو اور ان کی خواتین کی بے عزتی کرو، یہ بھی حد سے تجاوز ہے۔ تم صرف قتال والوں سے قتال کر سکتے ہو۔

اب اللہ تعالیٰ نے دوسرا حکم دیا: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ [البقرۃ:۱۹۱] (قتل کرو ان کافروں اور مشرکوں کو جہاں پر بھی ان کو پاؤ۔ اور ان کو [اس مسجد حرام سے] نکالو جہاں سے تمہیں انہوں نے نکالا تھا)۔ جہاں سے انہوں نے تمہیں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب ان سے لڑائی کی اجازت ہے کہ اگر تم ان کو اللہ تعالیٰ کے حرم سے نکال سکتے ہو تو نکال دو۔

﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ [البقرۃ:۱۹۱]

''اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ برا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ آپس میں لڑنا، اختلاف کرنا، مسلمانوں کو روکنا، مسجد حرام کو بند کر دینا، عمرے والوں کو عمرے سے روک دینا اور مسلمانوں کے اندر ایسے حالات پیدا کرنا کہ وہ ایک دوسرے سے لڑ پڑیں، یہ فتنہ تو قتل سے بھی زیادہ برا ہے؛ اس لیے کہ قتل میں تو ایک آدمی سے ٹکرانا ہے، اور فساد میں پوری قومیں آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گی۔

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۱۹۲]

اگر وہ رک جائیں (یعنی اتنا بڑا کفر ہے کہ نبی پاک ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ لڑتے رہے، لیکن اس کے باوجود اگر وہ اپنے ظلم سے رک جائیں)، توبہ کر لیں اور ایمان میں آجائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ مہربانی فرمانے والے ہیں۔ اتنے بڑے جرم، اتنی بڑی خطائیں اور اتنے بڑے کفر کو اللہ پاک معاف فرما دیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مطلقاً فرمایا:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ [البقرۃ: ۱۹۳]

تم کفار کے ساتھ لڑو اور اس وقت تک لڑتے رہو جب تک دنیا سے فتنہ فساد ختم نہ ہو جائے۔ اللہ کے دین کے اعلاء کے لیے لڑتے رہو۔

مسلمانوں نے جب سے جہاد چھوڑا ہے عزت ختم ہو گئی ہے۔ جب سے مسلمانوں نے جہاد کا جذبہ نکال دیا ہے اس وقت سے اسلام کی عزت وعظمت ختم ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک وقت آئے گا کہ میری امت کے دلوں سے جہاد کا جذبہ مر جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ وجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ دنیا کی حرص پیدا ہو جائے گی اور موت کی کراہیت پیدا ہو جائے گی۔ یعنی وہ لوگ موت کو پسند نہیں کریں گے، اس لیے ان کے دلوں میں جذبہ جہاد باقی نہیں رہے گا۔ اور جس قوم میں جذبہ جہاد باقی نہ رہے وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی۔

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۹۳]

پھر اگر کفار رک جائیں تو پھر تجاوز کی اجازت نہیں، مگر ان لوگوں کے ساتھ جو اپنی جانوں پر خود ظلم کرنے والے ہیں۔ یعنی اگر وہ ظلم کریں اور حد سے تجاوز کریں تو ان کو سزا دینے کی اجازت ہے۔

ابو جعفر رازی رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جو مدینہ منورہ کے اندر قتال کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور پاک ﷺ اس سے قتال کرتے تھے جو آپ ﷺ سے قتال کرتا تھا۔ پس جو آپ ﷺ سے لڑتا آپ ﷺ بھی اس سے لڑتے تھے اور جو رک جاتا آپ ﷺ بھی اس پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سورۃ البراءۃ نازل ہوئی۔

بعض علماء کرام نے یہ فرمایا ہے کہ اس آیت میں جو الفاظ آئے ہیں ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۹۰] (تم اللہ کے راستے میں ان سے لڑو جو آپ سے لڑیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ہم سے نہ لڑیں ہم بھی ان سے نہ لڑیں۔

بعض علماء کرام نے فرمایا کہ پہلے یہی حکم تھا، لیکن جب سورۂ براءت کی آیت ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً﴾ [البراءۃ: ۳۶] (اور تم سب لڑو مشرکوں سے جیسا کہ وہ سب تم سے لڑتے ہیں) نازل ہوئی تو پہلا

حکم منسوخ ہو گیا۔

اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا کہ "پہلا حکم منسوخ ہو گیا" یہ کوئی اتنی راجح بات نہیں ہے۔ پہلا حکم بھی یہی ہے کہ جب وہ کفر پر ہوتے ہوئے لڑتے ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے بھی نہیں لڑتے ہو۔ جیسے فرمایا کہ جن کافروں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے حرم سے نکال دیا تو تم ان کافروں کو اللہ کے حرم سے نکال دو۔ اس لیے مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ منسوخ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ فرمایا کہ کافروں سے قتال کیا جائے۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مکی زندگی گزاری ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ۴۰ سال کے بعد قرآن نازل ہوا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال مکہ مکرمہ میں رہے، لیکن مکی زندگی کے اندر اللہ پاک نے جہاد اور قتال کا حکم نہیں دیا، لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ۲ ہجری میں اللہ پاک نے قتال کا حکم فرما دیا۔ چونکہ ابتداء میں اسلام کمزور تھا، مسلمانوں کی تعداد معمولی سی تھی۔ جب ہجرت فرمائی اور مسلمانوں کی تعداد بڑھی اور اللہ تعالیٰ نے قوت اور طاقت دے دی تب اللہ پاک نے فرمایا کہ اب جہاد کیا جائے۔ اس لیے فرمایا کہ ان آیات میں مسلمانوں کے لیے اِغراء ہے کہ وہ تمہارے ساتھ لڑتے ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے بیٹھ گئے ہو، اس لیے حکم فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً﴾ [التوبۃ: ۳۶] جیسے تمہارے ساتھ لڑنے کے لیے تمام مشرکین تیار ہوتے ہیں اسی طرح تم بھی ان کے ساتھ اکٹھے ہو کر قتال کرو۔

اور فرمایا: "وَلَا تَعْتَدُوْا" (اور تم حد سے نہ گزر جانا)۔ اسلام ایک عادلانہ دین ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے قتال کا حکم دیا تو فرمایا کہ قتال کا حکم تو ہے، لیکن تم حد سے نہ گزر جانا۔ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

تجاوز کا معنیٰ:

تجاوز کا معنیٰ یہ ہے کہ تم ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو، ان کی عورتوں کو قتل کر ڈالو اور چھوٹے بچوں کو قتل کر ڈالو۔ یہ حرام ہے۔ چاہے وہ کافروں کی عورتیں ہیں، ان کے بچے ہیں، ان کے مندر ہیں اور ان کے کلیسا ہیں، لیکن ان کو نہ توڑو، ان کے پنڈت راہب پادری وغیرہ کو قتل مت کرو۔ اسی طرح ان کے درختوں کو آگ مت لگاؤ، ان کی فصلوں کو آگ مت لگاؤ۔ یہ تجاوز ہے۔ تمہیں تو بس قتال کا حکم ہے، البتہ اگر کوئی عورت دشمن کے ساتھ مل کر لڑائی میں

شریک ہے تو اس کو قتل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ان کا کوئی پنڈت، راہب یا پادری وغیرہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے خلاف لڑ رہا ہے تو اس کو بھی قتل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ مثلاً: قلعہ بند ہو گیا، ان کو نکالنے کے لیے یا دباؤ بڑھانے کے لیے ان کی دیواریں توڑی جاتی ہیں تو یہ کوئی بات نہیں ہے، ورنہ بلاوجہ تجاوز کرنا ناجائز ہے کہ دشمنوں کے حیوان قتل کر ڈالو، درختوں کو آگ لگا دو اور فصلوں کو تباہ کر دو۔ اسلام نے ان چیزوں سے منع کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو اللہ کے دین کے لیے اور اللہ کے کلمے کے لیے۔ یاد رکھو مثلاً: جو لوگ قومیت کی بنیاد پر لڑتے ہیں، جو لوگ عصبیت کی بنیاد پر لڑتے ہیں، صوبائی عصبیت کی بنیاد پر لڑتے ہیں یا قبائلی نفرتوں کی بنیاد پر لڑتے ہیں، یہ جہاد نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو فساد ہوتا ہے۔ جہاد تو وہ ہوتا ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے ہو کہ جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا دین نافذ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا قرآن اور اللہ تعالیٰ کی شریعت نافذ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا دین سر بلند ہو جائے اور کفر کے قانون مٹ جائیں، وہ جہاد ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی اقتدار یا کسی قومیت کے لیے لڑ رہے ہیں کہ یہ مہاجر ہے، یہ سندھی ہے، یہ پختون ہیں، یہ بلوچ ہے اور یہ افغان ہے۔ یہ لڑائیاں تو فتنہ ہیں، یہ لڑائیاں جہاد نہیں ہیں۔

اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ قومیت کے نعرے لگاتے ہیں کہ جیسے آپ ﷺ کے زمانے میں اوس اور خزرج کے درمیان لڑائی ہوگئی تو جب انہوں نے یہ نعرہ لگایا ''يَا مَعْشَرَ الْأَوْسِ!'' (اے اوس کی جماعت!) ''يَا مَعْشَرَ الْخَزْرَجِ!'' (اے خزرج والو!) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کیا قبیلوں کے نعرے لگا رہے ہو!؟ یہ نعرے تو بڑے بدبودار ہیں، اسلام سے ان کا کیا تعلق ہے!؟ مسلمان تو مؤمن ہوتا ہے۔ مسلمان کا خدا ایک ہوتا ہے، رسول ایک ہوتا ہے، قرآن ایک ہے اور شریعت ایک ہے۔ اسلام تو ان کو مٹانے کے لیے آیا ہے۔ کسی عربی اور عجمی کا کوئی فرق نہیں ہے، کسی گورے اور کالے کا کوئی فرق نہیں ہے، کسی چھوٹے اور بڑے کا کوئی فرق نہیں ہے اور کسی زبان کا فرق نہیں ہے۔ جس نے کلمہ پڑھا: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' تو وہ سب بھائی بھائی ہو گئے۔

لہٰذا آج مسلمانوں کے ملک میں جو لڑائیاں ہو رہی ہیں یہ تو فتنے ہیں۔ اور دشمن نے اس لیے کروائی ہیں کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح ہے کہ مسلمانوں کو کبھی کافر آ کر مٹا نہیں سکتا۔

آپ ﷺ نے اپنی امت کے لیے تین دعائیں مانگی ہیں: دوتو اللہ پاک نے منظور فرمالیں، لیکن ایک دعا سے اللہ پاک نے منع فرمادیا۔

1 ......ایک دعا تو یہ مانگی تھی کہ اے اللہ! میری امت قحط سے ہلاک نہ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ دعا منظور ہے۔

2 ......اور دوسری دعا آپ ﷺ نے یہ مانگی: یا اللہ! میری امت پر باہر سے کوئی ایسا دشمن مسلط نہ کردینا کہ وہ میری امت کو بالکل ختم کرڈالے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ پاک نے میری یہ دعا بھی منظور فرمالی۔

3 ......اس کے بعد آپ ﷺ نے دعا مانگی کہ ان میں آپس میں اتحاد واتفاق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا کہ یہ دعا مت مانگو۔ یہ آپس میں لڑیں گے۔ یہ جب میرے نافرمان ہوجائیں گے تو میں ان کا آپس میں قتال کرادوں گا کہ یہ ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔

مسلمانوں کی شکست کے اسباب:

اسی طرح تاریخِ اسلام کا آپ مطالعہ کرکے دیکھ لیں کہ اسلام کو کبھی شکست نہیں ہوئی کہ کافروں نے، مجوسیوں نے یا غیر قوموں نے مسلمانوں کو شکست دی ہو۔ کبھی تاریخ میں ایسا واقعہ نہیں ملتا۔ شکست کب ہوئی ہے؟ سب سے پہلی فتح بدر میں ہوئی اور سب سے پہلی شکست احد میں ہوئی۔ احد میں کیوں شکست ہوئی؟ ایک تو یہ کہ منافقوں نے اپنی جماعتوں کو نکال لیا کہ پہلے تو کلمہ پڑھتے تھے، حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھے، لیکن جب جہاد کے لیے جانے لگے تو علیحدہ ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو نہیں لڑتے۔ یہ جنگ نہیں ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو قتل کرنے والی بات ہے اور خودکشی کی بات ہے، ہم نہیں لڑسکتے۔ تو انہوں نے انکار کردیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے امیر کے حکم کی اطاعت نہیں کی۔ اور وہ بھی نافرمانی نہیں تھی، بلکہ اجتہادی غلطی تھی۔ یعنی سوچ اور فکر کی غلطی تھی، نافرمانی نہیں تھی۔ اسی طرح پوری تاریخ کو پڑھ لیں! اگر مسلمانوں کو شکست ہوئی ہے تو اندر کی کسی وجہ سے ہوئی ہے۔ آپ کے مسلمانوں نے منافقت کی ہوگی، کہیں انہوں نے غداری کی ہوگی، کہیں فروخت ہوئے ہوں گے، کہیں دشمن کے ہاتھوں ان کے آلہ کار بنے ہوں گے، پھر مسلمان آپس میں ٹکرا گئے اور آپس میں تباہیاں اور بربادیاں ہوگئیں۔

اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے! دشمن بڑا سمجھ دار ہے، ہر کام بڑے منصوبے سے کرتا ہے۔ کافر برائی بھی ضابطے سے کرتے ہیں اور مسلمان نیکی بھی ضابطے سے نہیں کرتا۔ دشمنوں نے مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا۔ یہ فتنے ہیں اور فتنہ قتل سے بھی برا ہوتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو جب شکست ہوئی فتنوں کی وجہ سے ہوئی۔ مسلمان کو کافر نہیں مار سکتا، مسلمان کو مسلمان ہی مارتا ہے۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آج بھی مسلمان اکٹھے ہو کر ایک نعرہ تکبیر لگائیں تو کافر ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ کافر کی کیا طاقت ہے!!؟ مسلمان ہمیشہ مسلمان کی وجہ سے مرتا ہے۔

جب آپ ﷺ جہاد کے لیے لشکروں کو روانہ کرتے تو فرماتے کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے نکلو اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان لوگوں سے جہاد کرو جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کفر کیا۔ کیا آج مسلمان کافر سے لڑتا ہی نہیں، بلکہ اگر مؤذن لڑ رہا ہے تو امام کے ساتھ اور مولوی مولوی کے ساتھ۔ اگر گاؤں میں چار مسجدیں ہیں تو وہ چاروں ایک دوسرے کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ ایک مسجد میں دو قاری ہیں، وہ آپس میں قطعاً متفق نہیں ہوں گے۔ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر قاریوں کا آپس میں جھگڑا ہو جائے تو ایک قاری کی دوسرے قاری پر گواہی قبول نہ کرنا: اس لیے کہ یہ تو مینڈھے سے بھی زیادہ بغض رکھتے ہیں کہ جیسے ہی موقع ملے تو ٹکر مار کر ایک دوسرے کو گرا ڈالیں۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ قراء بہت ہو جائیں گے، لیکن علم ختم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

جنگ میں عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرو:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کسی جنگ میں آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک عورت قتل ہوئی پڑی ہے تو آپ ﷺ غصہ میں آ گئے اور فرمایا:

((لَا تَقْتُلَنَّ امْرَأَةً وَلَا صَغِيرًا ضَرَعًا)) [تاریخ ابن عساکر: ۱/ ۹۵]

عورتوں کو کیوں قتل کرتے ہو؟ چاہے عورت دشمن کی ہو، کسی کی بھی ہو، عورت تو عورت ہی ہوتی ہے۔ اس کے قتل کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ جیسے معصوم بچہ ہوتا ہے۔ بچہ تو بچہ ہی ہوتا ہے، کسی کا بھی بچہ ہو۔ کافر کا ہو، چاہے دشمن کا ہو۔ آپ ﷺ نے منع فرما دیا کہ خبردار! جنگ میں بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرو۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ...... جو آپ ﷺ کے راز دار ہیں وہ...... فرماتے ہیں کہ ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ نے

بہت سی مثالیں بیان فرمائیں، پھر آپ ﷺ نے ایک مثال بیان فرمائی:

((إِنَّ قَوْمًا كَانُوا أَهْلَ ضَعْفٍ وَ مَسْكَنَةٍ، قَاتَلَهُمْ أَهْلُ تَجَبُّرٍ وَ عَدَاءٍ فَأَظْهَرَ اللّٰهُ أَهْلَ الضَّعْفِ عَلَيْهِمْ فَعَمَدُوا إِلَى عَدُوِّهِمْ فَاسْتَعْمَلُوهُمْ وَسَلَّطُوهُمْ فَأَسْخَطُوا اللّٰهَ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ))

[مسند احمد بن حنبل: ۵/۴۰۷، مجمع الزوائد: ۵/۲۳۲]

ایک بڑی کمزور قوم تھی۔ ان کی ایک ایسے قبیلے کے ساتھ لڑائی ہوگئی جو بڑی سخت، بڑی قوت اور طاقت والا قبیلہ تھا۔ اللہ پاک نے ان کمزوروں کو فتح دی اور طاقت والے مغلوب ہو گئے اور شکست کھا گئے۔ اب جب یہ کمزور ان پر غالب آ گئے تو کمزوروں نے ان پر وہ ظلم کیا کہ وہ حد سے نکل گئے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب غالب آ گیا۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں فتح اس لیے نہ دی تھی کہ اب تم بھی ان سے زیادہ ظالم بن جاؤ۔ یہ مطلب تو نہیں کہ اگر ہم تمہیں کامیاب کر دیں اور فتح دے دیں تو تم حد سے نکل جاؤ۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی ناراضگی کا شکار ہو گئے۔ کیونکہ یہ کمزور جو تھے، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو قوی لوگوں پر طاقت دے دی تو انہوں نے حد سے تجاوز کیا اور ان سے ایسے ایسے کام لیے جو وہ کبھی نہ لیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اس تجاوز سے ان پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ مقصد یہ ہے کہ جب تمہیں اللہ تعالیٰ نے قوی لوگوں کے مقابلے کی طاقت دے دی ہے تب طاقت کے زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو، حد سے نہ نکلو اور زیادتی نہ کر بیٹھو۔

فتنہ ...... قتل سے زیادہ سخت کیوں ہے؟

کیونکہ جہاد میں جانوں کا نکلنا، مردوں کا قتل ہو جانا جہاد میں بہت بڑی قربانی ہوتی ہے۔ لیکن اللہ پاک نے تنبیہ فرمائی کہ شرک تو قتل سے بھی بڑا فتنہ ہے۔ تم جو شرک پر اڑے ہوئے ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہو یہ تو اس سے بھی زیادہ فتنہ ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ﴾ [البقرة: ۱۹۱] حرم کے اندر قتال نہ کرو؛ اس لیے کہ یہ تو امن کی جگہ ہے۔

مکہ کی حرمت کے احکام:

صحیحین میں روایت آئی ہے:

((إِنَّ هٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللّٰهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ، فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللّٰهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ))

[صحیح مسلم: ۹۸۶]

''اس شہر کو اللہ پاک نے اس دن سے حرمت اور عظمت والا بنایا ہے جس دن سے آسمان وزمین کو پیدا کیا۔ یہ قیامت تک حرمت والا رہے گا۔''

اس میں کسی کو لڑائی اور قتال کی اجازت نہیں ہے، مگر اللہ پاک کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے موقع پر چند گھنٹوں کے لیے مجھے اجازت دی ہے۔ خبردار! حرم کے اندر جو درخت بھی ہو اسے نہ کاٹا کرو، کسی چیز کو نقصان نہ پہنچایا کرو، نہ کسی چیز کو بھگایا کرو اور نہ ایذاء پہنچایا کرو۔ حضور اکرم ﷺ نے منع فرمادیا اور یہ بھی فرمادیا کہ اگر تم میں سے کوئی یہ کہے کہ حضور پاک ﷺ نے تو فتح مکہ کے موقع پر لڑائی کی تھی تو لہٰذا اجازت ہے تو اسے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے رسول ﷺ کو چند گھنٹوں کے لیے اجازت دی تھی، لیکن تمہیں اجازت نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حرم میں امن ضروری ہے، حتیٰ کہ کوئی جانور سائے میں بھی بیٹھا ہوا ہے، اسے بھی چھیڑنا منع ہے۔ درخت سے مسواک تک کاٹنا منع ہے، اسی طرح کوئی چیز حرم میں پڑی ہو...... جسے لقطہ کہتے ہیں...... اس کا اٹھانا بھی منع ہے۔ کسی کو ایذاء دینا بھی منع ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حرم کے آداب کا پورا پورا خیال رکھنا ضروری ہے۔

صلح حدیبیہ کی حکمت:

فتح مکہ کے دن اجازت دی گئی تھی۔ اس لیے بعض لوگ خندمہ (پہاڑ کا نام) میں قتل کیے گئے تھے۔ اور بعض نے کہا کہ مکہ صلح کے طور پر فتح ہوا، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنا دروازہ بند کرے تو اس کو امن ہے، جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی امن ہے اور جو حضرت ابو سفیان کی حویلی میں چلا جائے اس کو بھی امن ہے۔

﴿فَإِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۚ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝١٩١﴾ [البقرۃ:۱۹۱]

تم مسجد حرام میں قتال نہ کرو، البتہ اگر وہ خود قتال کریں تو تم دفاعی جنگ لڑ سکتے ہو اور ان سے قتال کر سکتے ہو۔ جیسے آپ ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر درخت کے نیچے قتال پر بیعت لی تھی، کیونکہ کفار مکہ لڑائی کے لیے تیار ہو گئے تھے اور بعض قبائل بھی تیار ہو گئے تھے۔ حضور پاک ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لڑائی کی بیعت لی کہ ہم بھی لڑیں گے، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تم کو حدیبیہ کے موقع پر جنگ سے منع کر دیا، یہ میری حکمت تھی، میں جانتا ہوں۔ اس لیے کہ مکہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو بے چارے مسلمان تھے، لیکن چھپے ہوئے تھے۔ اگر لڑائی ہو جاتی تو وہ مسلمان بھی مارے جاتے۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ جب ہم نے ان کو علیحدہ کر دیا، ہجرتیں

ہو گئیں، سب مدینہ میں جمع ہو گئے تو اب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ دیا اور فتح مکہ کے موقع پر فتح عطا فرمائی۔

اللہ پاک نے فرمایا کہ اگر وہ جنگ اور قتال چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور توبہ کریں تو اللہ پاک معاف کرنے والا ہے۔ کتنے بڑے گناہ کیوں نہ ہوں، اس کی عظمت کے سامنے کوئی بڑا نہیں ہے۔ آدمی کی ساری زندگی کفر و شرک میں گزر جائے، گناہوں میں گزر جائے، لیکن سچے دل کے ساتھ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے دروازے پر توبہ کرے تو اللہ پاک ایک منٹ میں اس کے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ [البقرۃ: ۱۹۳]

اس وقت تک جہاد کرتے رہو جب تک کہ دنیا سے کفر و شرک مٹ نہ جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ ہو جائے۔

جہاد میں اخلاصِ نیت:

حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ! بعض لوگ اس لیے لڑتے ہیں کہ پتہ چلے کہ یہ بہادر ہیں، یا برادری اور قوم کے لیے (یعنی ریا کے طور پر) لڑتے ہیں کہ لوگ کہیں کہ یہ بڑا مجاہد ہے۔ کیا یہ جہاد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جہاد نہیں، بلکہ جہاد صرف اس شخص کا ہے جس نے صرف اس لیے جہاد کیا، تاکہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو جائے۔

بخاری و مسلم میں حدیث آئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ پاک نے حکم دیا ہے کہ اس وقت تک کافروں سے جنگ لڑتا رہوں جب تک کہ وہ اقرار نہ کر لیں، توحید کا اور دین کا غلبہ نہ ہو جائے اور وہ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' نہ کہہ دیں۔ جب انہوں نے اقرار کر لیا تو اب ان کا خون محفوظ ہو گیا، البتہ اب اگر وہ غلطی کریں گے تو ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اگر وہ شرک سے توبہ کر لیں تو کوئی لڑائی نہیں ہے۔ ظالم وہ ہے جو کلمۂ توحید کا انکار کرے؛ لہٰذا کافر اور مشرک ظالم ہے۔

مسلمانوں کی باہمی جنگ میں کنارہ کشی کی جائے:

جب ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں لڑائی ہو رہی تھی اور جب ان کو مکہ میں شہید کیا گیا اور قتال ہو رہا تھا تو ایک

آدمی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ حضرت! لوگ قتل ہو رہے ہیں اور آپ گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں!؟ آپ کسی کی مدد کریں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں! مجھے منع کیا گیا ہے، میں کسی سے قتال کے لیے نہیں نکلوں گا۔ اس نے کہا کہ آپ کمال کرتے ہیں! حالانکہ آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم لوگ اس وقت تک قتال کرو جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو جائے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بڑا ہی پیارا جواب دیا!! فرمایا کہ ہم نے تو اس وقت جہاد کیا ہے کہ فتنہ بھی مٹ جائے، کفر بھی مٹ جائے اور دین اللہ کا ہو جائے اور اب تو تم مسلمان آپس میں لڑ رہے ہو، تاکہ فتنہ قائم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین مٹ جائے۔ تم تو لڑ کر دین کو مٹا رہے ہو، ہم تمہاری مدد کو کیوں نکلیں؟ ہم نے تو اس وقت جہاد کیا جب کافروں کے ساتھ جہاد تھا اور تم تو مسلمان کے ساتھ لڑ رہے ہو۔ تمہارے ساتھ مل کر لڑنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ اب وہ لوگ آئے اور انہوں نے کہا کہ یا ابا عبد الرحمن!...... یہ کنیت ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی۔ انہوں نے کہا کہ...... عجیب بات ہے کہ آپ ہر سال حج پر جاتے ہیں اور فلاں فلاں عمل کرتے ہیں اور اب آپ نے جہاد بھی چھوڑ دیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بنیاد ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر رکھی ہے۔ یہ تمام اعمال میں کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اللہ پاک نے قرآن پاک میں یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو اس کی صلح کرا دو۔ اگر صلح کی کوئی صورت نہ ہو سکے تو جو باغی ہے اس کو قتل کر دو اور اس وقت تک لڑتے رہو جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ ہو جائے تو آپ اس پر عمل کیوں نہیں کر رہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کفار کے ساتھ جنگیں لڑی ہیں، اب مسلمانوں کے درمیان فساد ہو گیا ہے، اب میں ان کی لڑائی میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اس زمانے میں اسلام کی قوت کم تھی اور لوگ آزمائے جاتے تھے۔

﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾﴾

[البقرۃ: ۱۹۴، ۱۹۵]

''حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے مقابل ہے اور ادب رکھنے میں بدلہ ہے۔ پس جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو، جیسے اس نے تم پر زیادتی کی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو! اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے (۱۹۴)۔ اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور مت ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں۔ اور نیکی کرو اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے (۱۹۵)۔''

ربطِ آیات:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بھلائی کے احکامات کا ذکر فرمایا ہے اور گزشتہ آیات میں جہاد کا حکم بیان ہوا۔ لیکن اس میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہر کافر سے جہاد کرنے کا حکم علیحدہ ہے اور مشرکینِ مکہ کے بارے میں حکم علیحدہ ہے۔

ایک اشکال کا جواب:

اب جو آیت ہم نے تلاوت کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے اشکال کا جواب دیا ہے۔ ''اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ...الخ'' مسلمانوں کے دلوں میں ایک شبہ پیدا ہوا کہ ایک تو مسجد میں قتال منع ہے۔ اس کا جواب آ گیا کہ اگر وہ لڑیں تو تم لڑو اور اگر وہ نہ لڑیں تو تم بھی نہ لڑو۔ مسلمانوں کو دوسرا اشکال یہ پیدا ہوا کہ جب ہم عمرہ پر جا رہے تھے تو وہ مہینہ ذی القعدہ کا تھا اور ذی القعدہ کا مہینہ ''اشہرِ حرم'' یعنی ان مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے جو حرمت والے ہیں۔ اور ان میں لڑائی منع ہے۔

۴ ماہ ہیں جنہیں ''اشہرِ حرم'' کہا جاتا ہے۔ وہ ۴ ماہ: ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم...... یہ تینوں متواتر ہیں......اور چوتھا مہینہ علیحدہ ہے، یعنی رجب کا مہینہ۔ یہ ۴ ماہ ہیں، جنہیں ''اشہرِ حرم'' کہتے ہیں۔ ان میں قتال منع ہے۔ حتیٰ کہ زمانۂ جاہلیت میں کافر بھی ان میں قتال نہیں کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں تقریباً ۹ ہجری تک یہ معاملات چلتے آئے کہ کافر بھی اس بات پر کاربند تھے کہ ان مہینوں میں قتال نہیں کرنا۔ پھر کافروں نے کچھ بدنیتی کی تھی۔ وہ اس طرح کہ اگر کسی قبیلے پر چڑھائی کا وقت آ گیا اور مہینہ محرم کا ہے تو وہ کہتے تھے کہ چلو اس محرم کو صفر کا مہینہ سمجھ لو اور لڑائی کر لو اور اس کے بعد والے مہینہ کو محرم بنا لیں گے، یعنی وہ خود مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے تھے کہ اب تو ہماری

دشمن سے لڑائی ہے اور موقع اچھا ہے۔ وہ ایسی حرکتیں کرتے تھے۔ لیکن بہرحال مسلمان تو ایسی باتیں نہیں کرتے، کیونکہ مہینے تو اللہ کے ہیں۔ اللہ پاک نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے چاند کا نظام بنایا ہے کہ ۲۸ (اٹھائیس) دنوں کا ایک دورہ رکھا ہے اور سورج کا ۳۶۰ (تین سو ساٹھ) دنوں کا۔ ایک دورہ رکھ دیا ہے تو یہ نظامِ خداوندی ہے۔

مسلمان تو کبھی اللہ تعالیٰ کے قانون کو نہیں توڑتا۔ اس لیے مسلمانوں کو یہ ڈر ہو گیا کہ اب ایک عجیب مسئلہ بن جائے گا کہ مہینہ تو ذی القعدہ کا بنتا ہے۔ اگر ہم ذی القعدہ میں چلے گئے تو ہم کیسے لڑیں گے؟ اب تو ہمارے لیے مشکل آجائے گی۔ تو اللہ پاک نے یہ جواب نازل فرمایا، تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے یہ اشکال دور ہو جائے۔

فرمایا: ﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ﴾۔

حرمت والے مہینے اور جنگ کے احکام:

فرمایا: ﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ﴾ (حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کا بدلہ ہے)۔ معنی یہ ہے کہ حرمت والے مہینے ٹھیک ہیں، لیکن اس وقت کہ جب دوسرا بھی تو احترام کرے۔ اگر دوسرا تلوار لے کر لڑنے کے لیے آجائے اور میں کہوں کہ نہیں! یہ تو ذی القعدہ کا مہینہ ہے۔ وہ بات تو نہیں سنے گا، وہ تو مار کر چلا جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حرمت والا مہینہ حرمت کے بدلے میں ہے جو اس کا احترام کرے اس کے لیے احترام ہے۔ اور اگر کسی دوسرے نے حرمت کو توڑا ہے تو پھر ہمارا کیا گناہ ہے؟ ہم تو دفاعی جنگ لڑ رہے ہیں، ہم نے عمداً حملہ تو نہیں کیا اور ہم نے تو لڑائی کی ابتداء نہیں کی۔

اس لیے فرمایا: ﴿وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ﴾ اور ''حُرُمَاتٌ'' ''حُرْمَةٌ'' کی جمع ہے۔ حُرْمَۃٌ کا معنی ادب اور احترام ہے۔ اور ادب و احترام تب قائم ہو سکتا ہے جب دونوں جانب سے ہو۔ اگر دونوں جانب نہ ہو تو پھر ادب کیسے قائم ہوگا؟ حرمت اور ادب تو برابر ہے۔ جب تم میرا ادب کرو گے تو میں بھی ادب کروں گا، تم میرا احترام کرو گے تو میں بھی تمہارا احترام کروں گا، تم میرے دین کا لحاظ رکھو گے تو میں بھی تمہارے دین کا لحاظ رکھوں گا اور تم میرے امام کے بارے میں اچھے الفاظ کہو گے تو میں بھی اچھے الفاظ کہوں گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ گھبرائیں نہیں! آپ تو لڑنے کے لیے نہیں جا رہے۔ اگر لڑائی کی ابتداء مشرکین نے کر دی ہے تو آپ کی جوابی جنگ ہوگی، آپ کو اجازت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا قانون کیسے عادلانہ ہے! ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۹۴] ہم نے اشہرِ حرم میں دفاع کرنے کی اجازت دے دی ہے، لیکن خبردار! ان کو اتنا ہی نقصان پہنچایا جائے جتنا انہوں نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ یعنی گو کہ تم نے ابتداء نہیں کی، پھر بھی اگر ذی القعدہ میں مشرکینِ مکہ نے زیادتی کی، تو جتنی زیادتی انہوں نے کی تم بھی اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو، اس سے آگے نہیں بڑھنا۔ جیسے اللہ پاک نے پچھلی آیات میں جہاد کا حکم دیا تھا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا دیا تھا: ﴿وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾۔ خبردار! جہاد کی اجازت تو ہے، لیکن تجاوز کی اجازت نہیں ہے کہ تم دشمنوں کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کردو، یا ان کی نعشوں کی بے حرمتی کرو یا ان کے مندر وکنیسہ اور ان کے عبادت خانوں کی بے حرمتی کرو، اس کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ پاک نے یہاں پر بھی حکم دے دیا کہ اگر کوئی تم سے زیادتی کرے تو تم بھی ان کے ساتھ اتنی ہی زیادتی کر سکتے، جو جتنی تم پر اس نے کی ہے۔

عدالتِ فاروقی:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایک شخص کی شکایت آئی۔ ایک غریب نے کہا کہ اس نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ آپ نے اسے بلالیا اور اس غریب کو کہا کہ اس کو تھپڑ مارو، جیسے اس نے تمہیں تھپڑ مارا تھا۔ جب وہ مسلمان تھپڑ مارنے کے لیے تیار ہوا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خبردار! جتنی زور سے اس نے تمہیں تھپڑ مارا ہے تم بھی اتنے زور سے ہی مار سکتے ہو۔ اس سے زیادہ زور سے مارا تو قیامت میں اپنا جواب خود دینا۔ اس نے کہا کہ حضرت! کون ہے جو پیمائش، پیمانے لائے؟ اور کون ہے جو تول سکتا ہے؟ ایسا نہ ہو کہ (قیامت کے روز) میں پکڑا جاؤں۔ تو اس نے کہا کہ میں چھوڑتا ہوں۔ میں تو مارتا ہی نہیں ہوں۔

اس لیے اسلام نے اجازت تو دی ہے، لیکن فردیا: ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ (اگر کسی نے تم سے بدلہ لیا ہے تو تم بھی اس سے اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہو، اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن اگر تم صبر کرلو تو یہ زیادہ بہتر ہے)۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔

اسلام کا داخلی اصلاحی نظام:

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (اللہ پاک سے ڈرو)۔ اسلام اور دوسرے نظام کا یہی فرق ہے کہ اسلام

ہمارے اندر روشنی پیدا کرتا ہے اور وہ روشنی ہمارے اندر نورِ ایمان کی ہے۔ جب ہمارا اندر ٹھیک ہو جاتا ہے تو باہر خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے مذاہب باہر کا تھوڑا سا علاج تو کرتے ہیں، لیکن اندر کی قوت کو بھی اجاگر نہیں کرتے۔ یہ ان میں اور ہم میں ایک فرق ہے۔

اس کی مثال یہ سمجھ لو کہ ایک آدمی کو پھوڑا نکل آیا، اوپر پٹی باندھ دو، اوپر مرہم لگا دو اور ٹکوریں وغیرہ کرلو۔ بعض اوقات وہ پھوڑا ٹھیک ہو جائے گا، بیٹھ جائے گا۔ لیکن اگر کوئی ماہر طبیب ہے تو وہ کہے گا کہ جناب! یہ پھوڑا پیدا کیوں ہوا ہے؟ پہلے اس کا سبب تو دور کرو۔ اگر یہ پھوڑا پٹی و مرہم وغیرہ سے ٹھیک بھی ہو گیا تو اور نکل آئے گا تو یہ بات ختم نہیں ہوگی۔ اصل علاج تو تب ہے جب ہم اس کے سبب کو تلاش کریں کہ اس کا سبب فساد فی الدم ہے، یہ خون کی خرابی ہے اور یہ سوداویت کا غلبہ ہے۔ اور یہ کون سی بیماری ہے؟ وہ اس کا علاج بھی کرے گا اور مرہم پٹی وغیرہ بھی کرے گا۔ اب اگر ایسے علاج کرے گا تو وہ ہمیشہ کے لیے ٹھیک ہو جائے گا۔ اسلام ہمارے اندر کو جگاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر پیدا کرو۔ جب دلوں کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو جائے تو اب کسی پہرے کی ضرورت نہیں ہے اور ہمیں کسی چوکیدار کی ضرورت نہیں ہے۔

اور جب اللہ پاک کا ڈر دلوں کے اندر پیدا ہو جائے تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی گناہ ہو جائے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ امرأۃ العزیز (عزیزِ مصر کی بیوی) نے کتنا بڑا اہتمام کیا کہ محل کے دروازے بند کر دیئے۔ اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت اس وقت ایک غلام کی سی ہے، خریدا ہوا غلام، نوکری والا غلام نہیں۔ خریدا ہوا غلام تو بول بھی نہیں سکتا۔ اتنے اہتمام کے باوجود جب بی بی نے کہا: ﴿هَيْتَ لَكَ﴾۔ اس نے جب اپنی طرف دعوت دی تو اللہ کے نبی علیہ السلام نے فوراً فرمایا: ﴿مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ کہ میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتا ہوں اور اپنے رب سے ڈرتا ہوں۔ ﴿اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ میرا خدا اور رب وہ ذات ہے جس نے مجھے پالا پوسا ہے، جوان کیا ہے اور جس نے میرے ٹھکانے کا انتظام کیا ہے۔ اگر میں اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑ دوں تو میں ظلم کرنے والا اور حد سے تجاوز کرنے والا ہو جاؤں گا۔ یہ اندر کا تقویٰ اور اندر کی روشنی تھی جو بتا رہی تھی کہ یہ بات مجھ سے نہیں ہو سکتی۔

اس لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو)۔ اگر اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم زیادتی کرو۔ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (اور یہ بھی جان لو کہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ اور اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی ڈرنے والوں کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ کی معیت بھی ڈرنے والوں کے

ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت بھی ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اب اگلی آیت میں فرماتے ہیں:

﴿وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۛ وَاَحۡسِنُوۡا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴾

[البقرۃ:۱۹۵]

اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو۔ اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ نہیں، بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ مال ہے۔

ہلاکت میں ڈالنے کی مختلف تفسیریں:

﴿وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ﴾

''اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں ڈالنے کے کیا معنی ہیں؟ اس کے بارے میں مفسرین کرام رحمہم اللہ نے بہت سے تفسیری اقوال نقل فرمائے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو سب نے اپنی اپنی زبان سے سمجھایا ہے اور بات سب کی ٹھیک ہے۔

بعض علماء کرام رحمہم اللہ نے یہ فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت اس بات کا حکم نہیں دیتی کہ تم سارا کا سارا خرچ کر ڈالو اور بیوی بچے بھوکے بیٹھے رہیں۔

اور بعض علماء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب ترکِ جہاد ہے کہ جہاد چھوڑ بیٹھو۔ بس جہاد کا چھوڑنا بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ یہ آیت ہم میں اتری اور ہم اس کے ترجمہ کو سمجھنے والے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن پاک ہماری موجودگی میں نازل ہوا اور ہم نے ہی اس کو سمجھا ہے۔ تو وہ فرماتے تھے کہ اس کا معنی ترکِ جہاد ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو اور جہاد کو نہ چھوڑنا۔ جہاد کا چھوڑنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ اسی لیے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ ساری زندگی جہاد میں رہے اور ساری زندگی جہاد کرتے رہے، حتیٰ کہ آپ قسطنطنیہ میں جا کر شہید ہوئے اور وہیں آپ کی قبر بنی، یعنی مدینہ منورہ سے بھی باہر۔ آپ کو شہادت کی موت نصیب ہوئی اور وہیں مدفون ہو گئے، لیکن جہاد نہیں چھوڑا۔ اس لیے علماء کرام نے فرمایا کہ جہاد کو چھوڑنا بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

اسی لیے آپ دیکھ لیں کہ پوری دنیا میں جتنے بھی اسلامی ملک ہیں سب کے سب اَدبار، ذلت، کمزوری، بالکل بےبسی اور بے چارگی کے عالم میں ہیں۔ یعنی جہاں بھی نظر ڈالیں! مسلمانوں میں کوئی ایسی قوت اور طاقت نہیں رہی کہ سر اٹھا کر چل سکیں۔ اس کی وجہ ترکِ جہاد ہے، یعنی انہوں نے جہاد کو بھلا دیا ہے۔ جس دن سے انہوں نے جہاد کو بھلایا اس دن سے اللہ تعالیٰ نے ان پر سے اپنی رحمتیں، اپنی نصرتیں اور اپنی برکتیں اٹھالیں۔ کہاں وہ مسلمان کہ جن کا نام سن کر کافر تھر تھر کانپتے تھے!؟ اور کہاں ہم مسلمان کہ کافروں کا نام سنتے ہیں تو تھر تھر کانپنے لگ جاتے ہیں اور فوراً میڈیکل رپورٹ بنوا کر گھر میں لیٹ جاتے ہیں!؟

مسلمان ہونے کے باوجود ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ فلاں سپر پاور ہے، فلاں سپریم پاور ہے اور فلاں کیا کیا بلا ہے۔ حالانکہ مسلمان تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سپر طاقت مان ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿أَيَبْتَغُونَ عِندَهُمُ الْعِزَّةَ﴾ کہ تم کافروں سے دوستی رکھ کر ان سے عزت اور غلبہ اور اپنا شرف ڈھونڈنا چاہتے ہو، حالانکہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ [النساء:۱۳۹] (بے شک تمام عزتیں اللہ پاک کے پاس ہیں) فرمایا کہ خبردار! تمہیں کافروں سے عزت نہیں ملے گی، بلکہ عزتوں کا مالک تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ فرمایا کہ: ﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ [المنافقون:۸] (اور عزت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، اس کے رسول کے لیے ہے اور ایمان والوں کے لیے ہے)۔ پس ترکِ جہاد سب سے بڑی ہلاکت ہے۔ اللہ پاک نے حکم دیا کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دنیاوی معاملات کے اندر الجھ کر رہ جاؤ اور بس کھانا پینا، پیسہ دولت وغیرہ مقصود بن جائے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ہر چیز میں، ہر معاملے میں، اقتصادی طور پر، قوت اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے، ہر لحاظ سے کافروں کے محتاج ہو گئے۔ ورنہ اگر ہم غور کریں کہ جتنی جدید ٹیکنالوجی اور ایجادات ہیں ان کے موجد اصلی مسلمان ہیں، لیکن مسلمانوں نے اب قرآن پاک کو قسم اٹھانے کے لیے اور تعویز لکھنے کے لیے رکھ لیا ہے۔ قرآن سے ایمان حاصل نہ کرنا اور شفا وغیرہ طلب کرنا، یہ بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

عبادت میں احسان کا معنیٰ:

﴿وَأَحْسِنُوا ۛ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ [البقرۃ:۱۹۵]

احسان کا مطلب کیا ہے؟ ایک تو احسان ہے عبادت میں اور ایک احسان ہے معاملات میں۔

عبادات میں احسان کا مطلب ہے جیسا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے خود ترجمہ فرمایا کہ جب آپ ﷺ سے حضرت جبرئیل نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ'' کہ تم اس مقام پر پہنچ جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرو کہ گویا تم اللہ پاک کو دیکھ رہے ہو۔ اگر اس مقام پر نہیں پہنچ سکتے تو کم از کم اتنی بات تو پیدا کرو کہ وہ خود تجھے دیکھ رہا ہے، میں اس کے سامنے ہوں اور وہ میری حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ یہ ہے عبادت میں احسان۔

معاملات میں احسان کا معنیٰ:

اور معاملات اور معاشرت میں احسان کا مطلب یہ ہے کہ تم جو چیز اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی چیز اپنے بھائی کے لیے پسند کرو۔ جو تمہیں ناپسند ہو سمجھو کہ وہ تمہارے بھائی کو بھی ناپسند ہوگی۔ تم اپنے لیے اچھے القاب پسند کرتے ہو تو دوسروں کے بھی اچھے القاب کے ساتھ پکارو، اگر تم کسی چیز کو اپنے لیے اچھا سمجھتے ہو تو اپنے بھائی کے لیے بھی اچھا سمجھو اور اگر کسی چیز کو اپنے لیے برا سمجھتے ہو تو اپنے بھائی کے لیے بھی برا سمجھو۔ اگر مرتبہ احسان مل جائے تو اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔ فرمایا کہ ﴿وَأَحْسِنُوْا ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾
[البقرۃ:۱۹۵]

شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ضحاک، سدی اور حضرت قتادہ رحمہم اللہ نے ان آیات کا شانِ نزول اس طرح بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ جب ۶ ھجری میں عمرہ کے لیے تشریف لے آئے اور مشرکین نے آپ ﷺ کو روک لیا کہ آپ حرم میں داخل نہیں ہو سکتے اور جو بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے سب کو روک دیا۔ تو فرماتے ہیں کہ یہ ذی القعدہ کا مہینہ تھا اور ذی القعدہ کا مہینہ حرمت والے مہینوں میں سے ہے، جس میں قتال اور جنگ حرام تھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور قضاء کے ارادے سے آپ اگلے سال عمرہ کے لیے تشریف لے آئے۔ اب سوال یہ پیدا ہو گیا کہ اب ہم جائیں اور کافر لڑیں اور ذی القعدہ کا مہینہ ہوگا اور مسجد الحرام بھی ہوگی تو پھر قتال کیسے ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرما دیا کہ تم مسجد حرام میں نہ لڑو، لیکن اگر کافر ابتداء کریں تو پھر دفاع کرنا جائز ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے آقا ﷺ کبھی اشہرِ حرم میں چڑھائی نہ کرتے تھے، البتہ

آپ ﷺ پر کوئی چڑھائی کرتا تو آپ ﷺ دفاع کرتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ جہاد کے لیے نکل جاتے اور راستے میں اشہرِ حرم میں سے کوئی مہینہ آجاتا تو آپ ﷺ قتال سے رک جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ مہینہ گزر جاتا پھر آپ ﷺ قتال شروع کر دیتے تھے۔

بیعت الرضوان اور صلح حدیبیہ:

جب آپ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر خیمے لگائے ہوئے تھے اور جب آپ ﷺ کو کافروں نے روک دیا تھا تو مقامِ حدیبیہ پر آپ ﷺ نے پڑاؤ کیا اور آپ ﷺ کے ساتھ ۱۴۰۰ (چودہ سو) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر تھا تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ مکہ والوں کے ساتھ جا کر بات کریں کہ ہم عمرہ کے لیے آئے ہیں، قتال اور لڑائی کے لیے تو نہیں آئے۔ آپ ﷺ نے ہر ممکن کوشش فرمائی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے اور آپ کو آنے میں اور مختلف سرداروں سے بات چیت کرنے میں دیر ہوگئی تو اسی اثنا میں ایک افواہ اُڑ گئی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مشرکین نے مار ڈالا ہے۔ اب آپ ﷺ بھی جوش میں آئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی جوش میں آگئے کہ ایک تو ہمیں حرم میں نہیں آنے دیا اور پھر ہم مصالحت کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں تو وہ ہمارے قاصد کو بھی قتل کر دیتے ہیں، لہٰذا اب تو ہم جہاد کریں گے۔ تو ۱۴۰۰ (چودہ سو) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے درخت کے نیچے آپ ﷺ کے ہاتھ پر قتالِ مشرکین پر بیعت کی کہ اب ہم مشرکین سے بدلہ لیں گے، لیکن حضور ﷺ کی خدمت میں یہ بات پہنچ گئی کہ پہلی خبر غلط تھی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ زندہ ہیں، ان کو قتل نہیں کیا گیا۔ تو آپ ﷺ نے لڑائی کا ارادہ ترک کر دیا اور پھر مصالحت اور صلح کی طرف مائل ہوئے۔ اور اس کے بعد صلح حدیبیہ کے واقعہ کے مطابق صلح ہوگئی۔

جب آپ ﷺ قتالِ ہوازن سے فارغ ہوئے، اس کے بعد آپ ﷺ نے طائف پر چڑھائی کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے جب طائف پر چڑھائی کی تو وہ لوگ قلعہ میں بند ہو گئے تو آپ ﷺ نے باہر سے ان کا محاصرہ کر لیا اور اس کے بعد پتھر پھینکنے کے لیے منجنیقیں تیار کی گئیں، تاکہ قلعہ توڑ دیا جائے، لیکن حرمت والا مہینہ داخل ہوگیا تو حضور اکرم ﷺ نے تقریباً چالیس دن تک وہاں محاصرہ قائم رکھا، لیکن قتال نہ ہوا، اس لیے کہ وہ قلعہ بند تھے، لیکن بڑے تیر انداز تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان سے بہت سے افراد شہید ہونے لگے تو آپ ﷺ نے وہ

محاصرہ بھی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد پھر آپ ﷺ مکہ کی طرف لوٹ آئے۔ جب آپ ﷺ طائف سے مکہ کی طرف لوٹ آئے تو آپ ﷺ نے جعرانہ سے احرام باندھا، جسے آج کل ''بڑا عمرہ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی تنعیم کو ''چھوٹا عمرہ'' کہتے ہیں اور جعرانہ کو ''بڑا عمرہ'' کہتے ہیں؛ اس لیے کہ جعرانہ سے آپ ﷺ نے خود عمرہ فرمایا ہے اور تنعیم سے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو احرام باندھنے کا حکم فرمایا اور انہوں نے احرام باندھا تھا۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی جہاد میں بہادری:

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے مراد ترکِ جہاد ہے۔ اس پر دلیل کے طور پر ایک اور روایت ہے جو ابوداود رحمہ اللہ نے اسلم ابوعمران رحمہ اللہ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم قسطنطنیہ پر تھے اور مصر پر حاکم حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ تھے اور شام پر یزید بن فضالہ بن عبید رحمہ اللہ تھے، شہر سے رومیوں کی ایک بہت بڑی جماعت نکلی اور باہر مقابلے کے لیے صف آراء ہوگئی، پس ہم نے بھی ان کے مقابلے میں صف باندھ لی۔ پھر اس کے بعد ہم مسلمانوں میں سے ایک مجاہد تیزی سے نکلا اور اکیلا ان کی صفوں میں گھس گیا۔ اور اس کے بعد لڑتے لڑتے وہ خیر و عافیت کے ساتھ واپس بھی آ گیا۔ اللہ پاک نے اس کی حفاظت فرمائی اور وہ بچ گیا۔ جب وہ واپس آیا تو لوگ چیخنے لگے: دیکھو! عجیب بات ہے! اس نے تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا! اکیلا آدمی دشمنوں کی صف میں گھس جائے، یہ کون سی عقل کی بات ہے!؟

جہاد جاری رکھنے میں حکمت:

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ لوگ اس طرح کہہ رہے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ قرآن پاک کی آیت کی غلط تاویل نہ کرو؛ کیونکہ جب قرآن اترا ہے تو ہم لوگوں میں ہی اترا ہے اور اس کے اوّلین مخاطب ہم لوگ ہی تو ہیں۔ ہم نے یہ قرآن اللہ کے رسول ﷺ سے سمجھا ہے۔ فرمایا کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ترکِ جہاد نہ کرو۔ ہم صحابہ کرام نے یہ سوچا تھا کہ اب دین کو غلبہ مل گیا ہے، اب ہم پھر مدینہ میں اپنے باغوں میں کام کریں اور اپنی زمینوں میں کام کریں تو اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی کہ خبردار! اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ اتارو۔ اگر تم مال میں لگ گئے اور جہاد کو چھوڑ دیا تو تمہاری عزت ختم ہو جائے گی۔ تم اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت ہم میں نازل ہوئی تھی، اس کے ہم ہی گواہ ہیں اور اس آیت کے مطلب کے گواہ ہیں۔

ابوبکر بن عیاش رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر میں نے اکیلا دشمن پر حملہ کر دیا اور اس نے مجھے مار ڈالا تو میرا اس دشمن پر اکیلا حملہ کرنا اس آیت ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ کی وعید کے تحت داخل ہو جائے گا؟ تو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں! تم اس وعید کے تحت داخل نہیں ہو گے: اس لیے کہ اللہ پاک نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا: ﴿فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ﴾ [النساء: ۸۴] (اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال کریں اور آپ ذمہ دار نہیں، مگر اپنے آپ کے)۔ لہٰذا اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ اس آیت کا تعلق نفقہ کے بارے میں ہے کہ آدمی اس قدر بھی خرچ نہ کر دے کہ اپنی ساری جائیداد خرچ کر دے اور اس کی بیوی بچے بھوکے بیٹھے ہوئے ہوں۔ اللہ پاک نے جہاں صدقہ کا حکم دیا ہے وہاں اعتدال کا حکم بھی دیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تو ہر چیز میں اعتدال کا حکم دیا ہے: ''خَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُهَا'' لیکن احادیث میں ایسے واقعات بھی موجود ہیں۔

غزوۂ تبوک پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مال نثاری:

مثلاً: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب غزوۂ تبوک کے موقع پر چندہ فرمایا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی آدھی جائیداد پیش کر دی اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پورے گھر میں جو کچھ بھی موجود تھا سب کا سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا: اے عمر! تم نے کیا دیا؟ انہوں نے عرض کیا: میں نے آدھا بچوں کے لیے چھوڑا ہے اور آدھا اللہ تعالیٰ کے راستے میں دے دیا ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو گئے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم نے کیا دیا؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! اللہ کا نام ہی چھوڑا ہے۔ جو گھر میں تھا سب ہی اٹھا کر لے آیا ہوں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا اور انکار نہیں فرمایا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ خیرات میں جب سارا مال دینے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرما دیا کہ تیسرے حصے سے زیادہ نہ دو۔ اسی طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی آئے اور سونے کی ایک ڈلی پیش کی کہ حضور! میں یہ صدقہ کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ میں آکر ایسے زور سے پھینکا کہ راوی فرماتے ہیں کہ اگر وہ صحابی کے سر میں لگ جاتا تو وہ زخمی ہو جاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کر دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ ان حالات میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ مقام ہے کہ وہ سب کچھ لٹانے کے بعد بھی

مطمئن تھے، ان کو اللہ تعالیٰ سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اور جس کا حضور پاک ﷺ نے واپس کر دیا وہ ایسا آدمی تھا کہ جذبے میں آکر اس نے خیرات تو کر دی، لیکن بعد میں وہ بے چارہ چیختا رہتا کہ یار! اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو غریب اور بھوکا ہو گیا ہوں۔ اصل میں یہ احوال مختلف ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہم جیسے کمزور لوگوں کو یہ اجازت نہیں ہے کہ دشمن 10000 (دس ہزار ہو) اور ہم جا کر اس سے لڑ پڑیں، لیکن سیدنا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ رومیوں کے عربی نصاریٰ کے لشکر کی تعداد 60000 (ساٹھ ہزار) تھی، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ساتھیوں سے کہا کہ میرا دل تو کرتا ہے کہ ان پر 60 (ساٹھ) صحابیوں کے ساتھ ٹوٹ پڑوں۔ انہوں نے کہا کہ جناب! ہم 60 (ساٹھ) آدمی ہیں اور آگے 60000 (ساٹھ ہزار) کا لشکر ہے۔ ہم 60 (ساٹھ) آدمی بہادری کے ساتھ لڑ بھی پڑے تو کیا کریں گے!؟ ان کا 200 (دو سو) آدمی مار ڈالیں گے، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم 60000 (ساٹھ ہزار) کو شکست دے کر جنگ جیت لیں یا ہماری لڑائی کا کوئی فائدہ بھی ہوگا؟ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تو کبھی فائدے کے لیے لڑا ہی نہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے لڑنا ہے۔ مر گئے تو شہید، اگر بچ گئے تو غازی۔ بس اللہ تعالیٰ کا نام لیں اور ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ صحابہ نے دن بھر 60000 (ساٹھ ہزار) کے ساتھ جنگ کی اور شام کو فاتح ہو کر اپنے لشکر میں لوٹے۔

ایک اور موقع پر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے لشکر کی کمان کر رہے تھے۔ وہ خیمہ میں سوئے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی آواز آتی ہے کہ اے ابوعبیدہ! تم سوئے ہوئے ہو اور خالد دشمنوں سے لڑ رہا ہے!!؟ جلدی کرو اور ان کی مدد کو پہنچو۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ لشکر لے کر فوراً پہنچے اور انہوں نے نقشہ کھینچا کہ اتنا گھمسان کا منظر ہے کہ اندھیرے میں کوئی تلوار چمک پڑے تو نظر آجائے، ورنہ کچھ نظر نہیں آتا تھا کہ ۱۰ (دس) آدمی تقریباً پوری فوج میں کیسے ڈھونڈیں؟ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ!'' کا نعرہ لگایا تو پتہ چلا کہ مسلمان اس طرف ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے مدد کی اور بہت بڑا لشکر شکست کھا گیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کامیاب ہو گئے۔

یہ معاملات تو ہر ایک کے حالات پر مبنی ہیں کہ ایک آدمی نے ساری جائیداد پیش کر دی اور حضور پاک ﷺ نے قبول فرمالی۔ اور ایک نے تھوڑی سی پیش کی، لیکن حضور اکرم ﷺ نے رد کر دی۔ یہ سارے واقعات احادیث کا ذخیرہ سامنے رکھتے ہوئے سمجھ میں آتے ہیں۔

انہوں نے فرمایا کہ یہ معنی نہیں کہ اگر تم اکیلے ہو تو نہ لڑو، بلکہ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ کوئی آدمی گناہ کرے اور گناہ میں لگا رہا اور توبہ نہیں کی تو اس نے اپنے آپ کو برباد کر دیا۔ تو یہ معنی ہے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا، ورنہ آدمی سے اگر گناہ ہو جائے اور وہ گڑگڑا کر توبہ کرے تو اللہ پاک اس کو ہلاکت سے بچالیں گے۔

حضرت عبدالرحمٰن الاسود بن عبد یغوث رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کر لیا تو ازدشنوءہ کا ایک آدمی دشمن کی طرف جانے لگا، تاکہ میں دشمن پر اکیلا حملہ کروں۔ مسلمانوں نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ اتنے دشمنوں سے اکیلے لڑنا عقل کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے جا کر اپنے کمانڈر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ یہ آدمی اکیلا جا رہا تھا، ہم نے منع کیا ہے۔ انہوں نے بلایا اور سمجھایا کہ ایسا نہ کرو۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔ اب یہاں پر صحابی نے منع فرما دیا۔ یہ اپنے اپنے حالات کے موافق احکام ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس آیت کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں؛ اس لیے کہ قرآن پاک کی پہلی آیت خود دلالت کر رہی ہے کہ یہ انفاق کا مسئلہ ہے: ﴿وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو)۔ لیکن خرچ کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب کچھ لٹا کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دو۔ یا ترجمہ یوں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد میں خرچ کیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنے ہاتھ روک کر بیٹھ جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہ کرو اور جہاد رک جائے۔ یعنی جہاد بالمال بھی ہوگا اور جہاد بالنفس بھی ہوگا۔ یعنی اگر تمہارے پاس لڑنے کی طاقت نہیں ہے تو مجاہدین پر اپنا مال خرچ کرو، ورنہ مجاہدین کب تک لڑتے رہیں گے؟ وہ تو کمزور ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تم سب ہلاکت اور بربادی کا شکار ہو جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے جہاد کا چھوڑنا ہلاکت ہے، اسی طرح مجاہدین پر خرچ کرنے سے رکنا بھی ہلاکت ہے۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدینہ کے انصار اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات کرتے تھے۔ ایک سال قحط پڑ گیا اور باغات میں پھل نہ آیا تو وہ بھی خرچ کرنے سے رک گئے۔ اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی، یعنی اس آیت کا تعلق اس واقعہ سے ہے۔

حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم بخل نہ کرو۔ یعنی بخل کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٝ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾

[البقرۃ:۱۹۶]

’’اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے لیے۔ پھر اگر روک دیے جاؤ تو جو کچھ میسر ہو قربانی سے۔ اور نہ منڈاؤ اپنے سر، حتیٰ کہ ہدی (قربانی کا جانور) اپنے محل (موقع حرم) پر پہنچ جائے۔ پھر تم میں سے جو مریض ہو یا اس کے سر میں بیاری ہو تو (تین) روزوں کا فدیہ یا خیرات یا قربانی کرے، پھر جب تمہیں امن حاصل ہو تو جو کوئی فائدہ اٹھائے عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر اس پر ہے جو قربانی میسر ہو اور جس کو قربانی نہ ملے تین دن کے روزے رکھے حج کے دنوں میں اور سات روزے جب واپس لوٹو۔ یہ دس روزے ہوئے پورے۔ یہ (حکم) اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہتے ہوں۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ کا عذاب (مخالفین کے لیے) سخت ہے (۱۹۶)۔‘‘

حج کی اہمیت:

حج کا مسئلہ قرآن پاک میں کئی مقام پر آیا ہے۔ اور حج کی فرضیت، جیسے: نماز، روزہ اور زکوٰۃ اسلام کے ارکان ہیں، اسی طرح حج بھی اسلام کا ایک رکن ہے اور اسلام کی بنیاد ہے، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ نماز اور روزہ ہر امیر اور غریب پر ہیں لیکن زکوٰۃ اور حج صرف امیر پر ہیں۔

امیر سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس اپنے ذاتی اخراجات کے بعد اتنے پیسے ہیں کہ حرم میں آئے اور خیریت کے ساتھ واپس اپنے ملک میں پہنچ جائے، اس پر حج فرض ہے۔ اور زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے۔

انسانوں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے حج کیا ہے۔ اور ضعیف روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت

آدم علیہ السلام نے چالیس حج کیے اور سب سے پہلا حج سرزمین ہند سے کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور ''عرفات'' کو ''عرفات'' اس لیے کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب حج کے تمام احکام اور مناسک سمجھائے گئے تو اسی میدان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پوچھا: ''عَرَفْتَ؟'' (کیا آپ نے سمجھ لیا ہے؟)۔ انہوں نے فرمایا: جی ہاں! سمجھ لیا۔ تو یہ ''عرفہ'' ہوگیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حج کے احکام و مناسک سمجھائے گئے تو ان سے بھی پوچھا گیا: ''عَرَفْتَ؟'' تو انہوں نے کہا: جی ہاں! سمجھ لیا۔

حج کے بعض احکام:

حج کا لغوی معنی: قصد (ارادہ)۔ اور شرعی معنی: چند مخصوص دنوں میں، مخصوص مقامات پر مخصوص افعال کا سرانجام دینا۔

حج کی شرائط:

1 ...... مسلمان ہونا۔

2 ...... عاقل و بالغ ہونا۔ اگر کوئی بچپن میں حج کرے اس کو نفلی حج کا ثواب ملے گا، اگرچہ وہ گود میں ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس کے والدین نے اس کے حج کی نیت بھی کر لی اور اپنے حج میں اس کو اپنے ساتھ ساتھ رکھا تو اس کا بھی نفل حج ہو جائے گا۔

3 ...... عورت کے لیے محرم کا ہونا۔ محرم اسے کہتے ہیں جس سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو، مثلاً: باپ، بیٹا اور بھائی وغیرہ۔ جس کے ساتھ نکاح جائز ہے اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتی۔ اگر ایک عورت مالدار اور غنی ہے، لیکن اس کو محرم نہیں ملا تو اسے حج کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی صورت نہیں ہے تو کسی اور کو حج کروا دے، لیکن خود باہر نہ نکلے۔

4 ...... کوئی شرعی رکاوٹ نہ ہو، مثلاً: آپ کے راستے میں کوئی کافر ملک ہے اور وہ آپ کو گزرنے نہیں دیتے۔ اگر خدانخواستہ راستے میں کوئی بھیڑیا یا کوئی ایسا جانور ہے جس کی وجہ سے جان کو خطرہ ہے تو پھر بھی حج فرض نہیں ہے۔

بعض لوگوں سے اگر پوچھا جائے کہ آپ کے پاس پیسے ہیں تو آپ نے حج کیوں نہیں کیا؟ تو وہ کہہ دیتے ہیں: جناب! میری بیٹیاں جوان ہیں اور بہنیں جوان ہیں۔ جب تک ان کا فرض ادا نہ ہو جائے میرا حج نہیں ہوگا۔ یہ بے وقوفی والی باتیں ہیں۔ شادی کرنا علیحدہ مسئلہ ہے اور حج علیحدہ مسئلہ ہے۔

ایک آدمی جوان ہے جو حج پر جانا چاہتا ہے، اس کے ماں باپ بوڑھے ہیں، اور ماں باپ کہتے ہیں کہ اگر تم حج پر جاتے ہو تو پیچھے ہمیں سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے تو ایسے شخص کو اسلام اجازت دیتا ہے کہ وہ ماں باپ کی خدمت کرے اور حج کو نہ جائے۔ جب اللہ تعالیٰ موقع دے تو حج پر چلا جائے۔

ایک آدمی اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ وہ سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ خود حج کو نہ جائے، لیکن اپنی جگہ کسی اور کو حجِ بدل کے لیے بھیج دے۔ اور اس آدمی کو بھیج دیا جائے جو شرعاً مسائلِ حج کو جانتا بھی ہو۔ اور جو مسائل کو نہیں جانتا اس کو حج پر نہ بھیجا جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ توفیق اور طاقت عطا فرمادے تو حج جوانی کے اندر کرنے کی کوشش کی جائے۔

اور حجِ بدل کرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ملاحظہ فرمائیں کہ جس آدمی کا حج کرنا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی پورے حج کا ثواب عطا فرمائیں گے اور جو حجِ بدل کرنے والا ہے اس کو بھی حج کا پورا پورا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ نہ حج کرنے والے کے حج کا ثواب کم ہوتا ہے اور نہ ہی حج کروانے والے کے حج کے ثواب میں کمی آتی ہے۔

حج کی اقسام:

حج کی تین اقسام ہیں: 1 ...... حجِ افراد، 2 ...... حجِ قران اور 3 ...... حجِ تمتع۔

حجِ افراد:

حج کے دنوں میں میقات سے صرف حج کا احرام باندھ کر حج کے لیے چلے جانا۔

حجِ قران:

قران کا معنی: دو چیزوں کو ملانا ہے۔ اصطلاحی معنی یہ ہے کہ حج اور عمرہ دونوں کو ملا کر اکٹھے نیت کرنا۔ یعنی جب میقات پر آئے تو کہے کہ یا اللہ! حج اور عمرہ دونوں کو ملا کر کروں گا۔ اب وہ پہلے عمرہ کرے گا، لیکن احرام نہیں کھولے گا، اسی احرام میں رہے گا، پھر حج کرے گا؛ اس لیے کہ اس نے دونوں کو ایک احرام میں جمع کیا ہے۔ پس وہ احرام آخر میں کھولے گا، یعنی جب وہ حج میں کنکری مارے گا، قربانی کرے گا اور بال منڈوائے گا پھر جا کر احرام کھولے گا۔ اس کا نام ''حجِ قران'' ہے۔

حجِ تمتع:

تمتع کا معنی نفع اٹھانا ہے۔ اصطلاحی معنی یہ ہے کہ آپ نے میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھا۔ مکہ میں آ کر

طواف کیا، صفا مروہ پر دوڑے، بال منڈوائے، احرام کھول لیا، کپڑے پہن لیے، کھاتے پیتے رہے اور منافع حاصل کرتے رہے۔ پھر جب حج کے دن آئے تو دوبارہ احرام باندھ لیا۔ اس درمیان میں جو نفع اٹھالیا اس کا نام ہی تمتع ہے۔

قرآن میں جہاں بھی حج فرض کا حکم ہے وہاں صرف حج کا ذکر ہے، عمرہ کا ذکر نہیں ہے، جیسے: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ﴾ [آل عمران:۹۷] لیکن یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ دونوں کا اکٹھے ذکر فرمایا ہے: ﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ﴾ [البقرۃ:۱۹۶] (اللہ تعالیٰ کے لیے حج اور عمرہ پورا کرو)۔ مطلب یہ ہے کہ فرض تو حج ہی ہے، لیکن اگر عمرہ کو شروع کر لیا جائے تو اس کا پورا کرنا بھی واجب ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ حج اور عمرہ دونوں کو پورا کرو۔ وہاں پر صرف حج تھا اور یہاں پر حج اور عمرہ دونوں کا ذکر ہے۔

حج نہ کرنے کی شدید وعید:

ایک یہ ہے کہ انکار تو نہیں کرتا، لیکن دولت مند اور صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود بھی حج پر جانے کی خواہش اور کوشش نہیں کرتا۔ تو اس کے لیے بھی حضور پاک ﷺ نے اتنا سخت لفظ استعمال کیا ہے کہ گویا اس کا یہ کام بھی کافروں والا ہے۔ جیسے کہ اس کی تفصیل حدیث مبارکہ میں بھی آگئی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ لَّمْ يَحْبِسْهُ مَرَضٌ أَوْ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ أَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ إِنْ شَاءَ يَهُوْدِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا)) [بیہقی:۲/۸۹۶۲]

تم میں سے جو طاقت رکھتا ہے اور (اس کے باوجود) حج نہیں کرتا، چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ یعنی اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ حج اتنا ضروری حکم ہے کہ اس میں تساہل اور تغافل اتنا شدید ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اور جمہور کا قول یہ ہے کہ وہ کافر تو نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے الفاظ ایسے استعمال فرمائے ہیں گویا کہ اس کا یہ عمل کافروں والا ہے۔ اس کے بغیر اگر موت آئی تو گویا ایسے موت آئی ہے جیسے یہودیت اور نصرانیت پر موت آتی ہے۔

اور یہ بھی سمجھ لیں کہ حج اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ جیسے نماز، روزہ الخ۔ حج فرض ہے اور عمرہ

سنت ہے۔ عمرہ کا بھی بہت بڑا ثواب ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ عمرہ گویا کہ چھوٹا حج ہے۔ خصوصاً وہ عمرہ جو رمضان المبارک میں نصیب ہو جائے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے رمضان المبارک میں عمرہ کیا گویا کہ اس نے میرے ساتھ حج کیا۔ کتنی بڑی سعادت ہے۔ تو عمرہ نفلی عبادت ہے۔ زندگی میں کبھی بھی نفلی عبادت ہوسکتی ہے اور کئی بار ہوسکتی ہے۔ اور حج زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے، اس کے بعد جتنی مرتبہ بھی ہو وہ نفل ہوگا۔

احرام، نیت اور تلبیہ کے مسائل:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ (حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے لیے پورا کرو) یعنی حج اور عمرے کا احرام جب باندھ لیا ہے تو اسے پورا کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ جب چاہا باندھ لیا اور جب چاہا کھول لیا۔ جب نیت کر لی ہے تو اسے پورا کرنا فرض ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دل کے ساتھ ساتھ زبان سے تلبیہ کہنا بھی ضروری ہے؛ اس لیے کہ ایک حدیث میں احرام کی بجائے کہ احلال کا لفظ ہے اور احلال کا معنی ہی تلبیہ ہے۔ اور عملِ رسول ﷺ بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ نے بھی زبان سے تلبیہ فرمایا، جبکہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک قلبی نیت کافی ہے، زبان سے تلبیہ کہنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ﴾ مثلاً: اگر تم نے احرام باندھا ہے اور احرام کے بعد تم چل پڑے، لیکن روک دیا گیا تو ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۚ﴾ [البقرة:۱۹۶] اب تم احرام نہیں کھول سکتے، جب تک کہ تم قربانی نہ کرو (اعلیٰ درجہ میں اونٹ ہے، درمیانی درجہ میں گائے ہے اور ادنیٰ درجہ میں بکری ہے) اور وہ بھی حرم کی حد میں آکر ذبح ہو۔ مثلاً: اگر آپ کو ایئرپورٹ پر روک دیا گیا تو آپ کسی ساتھی کو پیسے دیں گے کہ مجھے روک دیا گیا ہے، آپ مہربانی فرما کر میری طرف سے مکہ شہر میں جا کر قربانی کرو۔ مجھے فون کر کے اطلاع دو۔ اس اطلاع کے بعد سر منڈا کر احرام کھولو گے۔ یہ نہیں کہ جب چاہو احرام باندھ لو اور جب چاہو کھولو کہ جی! ہم تو جہاز پر آئے تھے، ہماری فلائٹ کینسل ہوگئی ہے تو ہم نے کھول دیا۔ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے احکام و مسائل ہیں۔

اور یہ بھی حکم ہے کہ آپ احرام اس وقت باندھیں جب آپ کو یقین ہو جائے کہ اب ہم جانے والے ہیں...... اِنْ

شاءَ اللہ!......۔مثال کے طور پر: آپ غسل بھی کرلیں، چادر بھی باندھ لیں، لیکن نیت نہ کریں۔ جب جہاز میں بیٹھ جائیں تو جہاز میں بیٹھے بیٹھے نیت کرلیں۔ کوئی دو رکعت پڑھنا ضروری نہیں ہوتا، احرام کی دو رکعت نفل ہوتی ہیں۔ بس میں بیٹھے بیٹھے نیت کر کے تلبیہ کہہ دو، بس احرام ہو گیا۔ اگر تم نے مسجد میں امام کے ساتھ نماز پڑھی، امام نے سلام پھیرا اور تم نے تلبیہ کہہ لیا تو بھی احرام ہو گیا۔ اب کوئی علیحدہ سے دو رکعت پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح مثلاً: آپ لاہور یا کراچی سے جہاز میں بیٹھ گئے۔ جہاز والوں نے بتایا کہ ابھی 20 (بیس) منٹ بعد میقات آنے والا ہے تو آپ نے دیکھا کہ میرے پاس تو چادر نہیں ہے اور میں نے احرام بھی باندھنا ہے تو اسلام اتنی رعایت دیتا ہے کہ وہیں بیٹھے بیٹھے قمیص اتار دو، شلوار میں بیٹھے رہو، قمیص کو چادر کی طرح کندھے پر ڈال دو اور وہیں بیٹھے بیٹھے نیت کر کے تلبیہ کہہ لو۔ اور اتر کر چادر باندھ لو، کوئی مسئلہ نہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ جب تک قربانی اپنی جگہ یعنی ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدۃ: ۹۵] کعبہ شریف تک نہ پہنچے۔ لیکن باقی آئمہ کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جب وہ احرام باندھ رہا ہے اور اسے احصار کا خوف ہے تو وہیں وہ یہ کہہ دے کہ اے اللہ! احرام تو باندھ رہا ہوں، لیکن جہاں مجھے روک دیا گیا تو مجبوراً میں رک جاؤں گا۔ تو یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اگر وہ وہیں قربانی ذبح کردے تو وہ احرام کھول سکتا ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہیں! قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ﴾ جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچے اور قرآن پاک میں ہے: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدۃ: ۹۵] یعنی حرم کے اندر پہنچے۔

جب آپ ﷺ عمرہ کے لیے تشریف لے آئے اور حدیبیہ میں کافروں کے مقام پر آپ ﷺ کو روک دیا گیا اور صلح ہوگئی کہ اگلے سال عمرہ قضا کریں تو آپ ﷺ جو جانور ساتھ لائے تھے وہیں پر ذبح کر دیئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ذبح کرنے کا حکم دے دیا۔ اور سر منڈایا اور احرام کھول دیا۔ تو وہ حضرات فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو یہ حکم نہیں فرمایا کہ مکہ جا کر جانور ذبح کرو، بلکہ وہیں ذبح کر دیئے۔ اس لیے حکم یہ ہے کہ جہاں آپ روک دیئے جائیں وہیں ذبح کر کے بال منڈوا لیں اور احرام کھول سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ جگہ جا کر دیکھ لو جس جگہ آپ ﷺ روک دیئے گئے تھے وہ حدِ حرم کا کنارہ ہے۔ لہٰذا حدِ حرم کے اندر ہی ذبح ہوا۔ جیسے کوئی منیٰ میں ذبح کرے تو اس نے حدِ حرم میں ذبح کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیں اور اس کے بعد روک دیئے جائیں تو آپ اس وقت تک احرام

نہیں کھول سکتے، جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر ذبح نہ ہو جائے۔

بعض فقہاء نے یہ بھی اندازہ کیا ہے کہ مثلاً: آپ رک گئے اور آپ نے کسی کو پیسے دے دیئے کہ میری طرف سے وہاں جا کر بکری وغیرہ ذبح کر دے۔ اور آپ نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مثلاً: ایک دن اور رات کے بعد فلاں وقت تک وہاں پہنچ کر ذبح کر دے گا تو آپ اندازے سے وقت کی تعیین کر کے اس وقت احرام کھول سکتے ہیں۔

احرام میں اگر بیمار ہو جائیں:

احرام باندھنے کے بعد بیمار ہو گئے یا کوئی تکلیف ہو گئی یا آپ کے سر میں اتنی جوئیں پڑ گئیں کہ وہ گر رہی ہیں اور تکلیف ہے تو اللہ تعالیٰ نے رعایت دی ہے کہ اس میں تین طریقے ہیں: 1 ...... یا تو روزے رکھ لو 2 ...... یا صدقہ کے ذریعے فدیہ دے دو 3 ...... یا قربانی کرلو۔ اب کتنے روزے رکھنے ہیں؟ اس کے لیے تفصیل حدیث مبارک میں آئی کہ روزے رکھو تو تین اور اگر فدیہ دے تو چھ مسکینوں کو صدقہ فطر کی مقدار دے گا، یعنی آپ کے حساب کے مطابق پونے دو سیر غلہ (گندم)۔

حج تمتع، قران اور افراد کے مسائل:

﴿فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ﴾ اب تمہارا دشمن چلا گیا اور اب تم امن میں آ گئے تو اب تم حج پر چلو۔ پس جس آدمی نے ایک سفر میں حج اور عمرہ دونوں کا نفع اٹھایا، مثلاً: اگر کسی نے حج کا احرام باندھا یا حجِ تمتع کا احرام باندھا تو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ شکر کے طور پر بکری ذبح کرو کہ اللہ پاک نے مجھے دونوں نعمتیں عطا کی ہیں۔

﴿فَمَن لَّمْ يَجِدْ﴾ اس کے پاس بکری کے پیسے نہیں ہیں اور اس کے پاس دمِ قران یا تمتع وغیرہ دینے کی طاقت نہیں ہے: ﴿فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ [البقرة:۱۹۶] تو تم تین روزے ایامِ حج میں رکھ لو۔ اور اس میں بہتر یہ ہے کہ آخری روزہ ۹ ذی الحجہ کو بن جائے اور چاہے تو اس سے پہلے بھی رکھ لو اور ۷ (سات) روزے گھر جانے کے بعد جب چاہو رکھ لو۔ ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ یہ ۱۰ (دس) روزے رکھنے سے تمہارے ذمہ جو ہدی (قربانی) تھی، اللہ پاک نے اس کا بدل عطا فرما دیا۔ مثلاً: ایک آدمی نے حج کے ایام میں ۳ روزے نہیں رکھے تو اب وہ روزے نہیں رکھ سکتا، اب اس کو بکری دینا لازمی ہے جب بھی استطاعت ہو جائے۔

وہ لوگ جو میقات کے اندر رہتے ہیں وہ تمتع اور قران نہیں کر سکتے، مثلاً: تمہارا میقات یلملم ہے، مدینہ کا میقات ذوالحلیفہ ہے، ادھر میقات طائف ہے اور جو لوگ میقات سے باہر رہتے ہیں وہ تمتع اور قران کر سکتے ہیں اور جو میقات کے اندر رہتے ہیں وہ حجِ افراد کریں گے۔ ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ﴾ [البقرۃ:۱۹۶] وجہ یہ ہے کہ وہ تو مکہ میں رہتے ہیں۔ وہ سال میں جب چاہیں عمرہ کر لیں گے، لیکن جو لوگ باہر سے آ رہے ہیں، معلوم نہیں کہ زندگی میں دوبارہ ان کو سفر نصیب ہوگا یا نہیں، اس لیے ان کو تمتع اور قران کی اجازت ہے۔

حنابلہ اور اہل حدیث حضرات کے نزدیک قران وہ شخص کر سکتا ہے جو قربانی کا جانور ساتھ لایا ہو۔ ان حضرات کے نزدیک بغیر جانور لائے حجِ قران ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جب حجِ قران کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ نے حجِ قران کیا تھا، لیکن آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں یہ حکم دیا تھا کہ تم عمرہ کر کے احرام کھول دو، اور پھر ۸ ذی الحجہ کو دوبارہ احرام باندھو۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جانور کا ساتھ لانا شرط نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ذبح کرنا مقصود ہے، ساتھ لانا مقصود نہیں۔ دوسرا وہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ تو جب عمرہ کے لیے آئے تھے تب بھی جانور ساتھ تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت جانور لانا آسان تھا اور جن کے پاس جانور موجود نہیں تھے ان کو یہ رعایت دے دی، تاکہ لوگوں کو یہ مسئلہ بھی سمجھ آ جائے کہ تمتع بھی ہو سکتا ہے اور قران بھی ہو سکتا ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾ [البقرۃ:۱۹۶] یہ نہ سمجھ لینا کہ اب تو میں حاجی ہو گیا ہوں، جو چاہوں کرتا پھروں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ حج میں بڑے خطرے ہوتے ہیں، عورتوں اور مردوں کا آپس میں اختلاط کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پیسے ہیں، یعنی آدمی بدنظری، ڈاکہ، زنا اور چوری وغیرہ جیسے گناہوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو۔ حج پر آ رہے ہو، اگر تم نے میرے گھر میں آنے کے بعد اور حج کی نیت کے بعد بھی حیا نہ کی تو پھر میرا عذاب بھی سخت ہے، اس کے لیے تیار ہو جاؤ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سعید بن جبیر اور سفیان بن سعید ثوری رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ حج اور عمرے کے اِتمام کا مقصد یہ ہے کہ تم اپنے گھر سے احرام باندھو، یعنی اپنے گھر سے صرف اسی نیت سے چلو۔ اور جب میقات پر پہنچو تو تلبیہ کہو، یعنی ابتداء تو آگے ہوگی، لیکن گھر سے جب نکلو تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے حج اور عمرہ کی نیت سے نکلو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی مقصد نہ ہو۔

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰاُولِي الْاَلْبَابِ ۝﴾ [البقرۃ:۱۹۷]

''حج کے چند مہینے متعین ہیں جس نے ان میں (احرام باندھ کر) اپنے پر حج لازم کر لیا تو نہ حج کے زمانہ میں مباشرت جائز ہے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا۔ اور جو تم صدقہ دو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔ اور زادِ راہ لے لیا کرو؛ کیونکہ بہتر زادِ راہ سوال کرنے سے بچنا ہے۔ اور اے عقلمندو! مجھ سے ڈرتے رہو۔''

(۱) حج کا موسم:

حج کے مہینے جانے پہچانے ہیں؛ اس لیے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی انہی مہینوں کو حج کے مہینے کہتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اس میں بھی وہی مہینے رہے، اس لیے فرمایا: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ﴾۔ ''اَشْهُر'' ''شَهْر'' کی جمع ہے۔ پس ''اَشْهُر'' کا معنی ہوا مہینے۔ اور وہ مہینے: شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن ہیں۔ چونکہ یہ تین ماہ تو نہیں لیکن جمع کا صیغہ ہے تو عربوں کے نزدیک کبھی کبھی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ ذی الحجہ کے بھی دس دن شامل ہیں، اس لیے اس کو بھی آقر یا اس میں بطور تیسرے مہینے کے شامل کر دیا۔ یہ ایک محاورے کی بات ہے۔ بہرحال اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اشہرِ حج: شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ ہیں۔ لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ذی الحجہ کا پورا مہینہ اشہرِ حج میں شامل ہے۔ یعنی رمضان المبارک کے ختم ہونے کے بعد اشہرِ حج شروع ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا نظام دیکھو کہ پہلے رمضان المبارک میں ہمیں صبر کی تعلیم دے دی۔ دن میں روزے رکھوا دیئے، رات کو تراویح میں کھڑا کر کے قرآن پڑھوا دیا۔ اور جب مہینہ ختم ہو گیا تو فرمایا کہ اے میرے بندے! اب تو اس قابل ہو گیا ہے کہ تم میرے گھر کی طرف دوڑ کے آئے اور میں تجھے حج نصیب کروں۔

(۲) حج کا احرام باندھنے کا وقت:

قواعدِ عربیہ کے اعتبار سے معنی یوں ہوگا: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ﴾ کہ حج وہ حج ہے جو ان معلوم مہینوں میں ہو۔ اس طرح معنی یہ ہوگا: ''اِحْرَامٌ بِالْحَجِّ فِيْهَا اَكْمَلُ مِنَ الْاِحْرَامِ فِيْمَا عَدَا'' یعنی حج کے مہینوں میں حج کا احرام

باندھنا تو اکمل، کامل اور افضل ہوگا، البتہ ماسوا میں بھی اس ترکیب کے مطابق جائز ہو جائے گا۔

''وَالْقَوْلُ بِصِحَّةِ الْإِحْرَامِ فِيْ جَمِيْعِ السَّنَةِ'' کہ سارے سال میں کوئی آدمی حج کا احرام باندھ لے تو کیا اس کا احرام صحیح ہوگا؟ مگر حج تو انہی دنوں میں ہوگا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اشہرِ حج سے پہلے بھی کوئی آدمی حج کا احرام باندھ سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حج کسی اور تاریخ میں بھی ہو سکتا ہے۔ حج تو نو (۹) ذی الحجہ کو عرفات میں ہی ہوگا۔ کوئی آدمی مثلاً: رمضان المبارک سے احرام باندھ لے، ابھی سے میں نے نیت کر لی ہے اور وہ حج تک اسی طرح احرام ہی میں رہے تو کیا اس کا احرام باندھنا درست ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تو حج سے پہلے احرام باندھنا درست ہی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ احرام منعقد ہی نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ حج کے دن شروع ہی نہیں ہوئے۔ اور باقی ائمہ کرام: امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راھویہ اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ وغیرہ سب کے نزدیک احرام تو صحیح ہے، لیکن اشہرِ حج میں احرام باندھنا افضل ہے؛ اس لیے کہ اللہ پاک نے سارے سال میں میقات بنائے ہیں، تو کسی وقت بھی احرام باندھا جا سکتا ہے۔

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾ کا معنی یہ ہے کہ ''وَقْتُ الْحَجِّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ'' یعنی حج کا وقت گنے ہوئے مہینے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ باقی مہینوں میں سے انہیں مہینوں کو اللہ پاک نے حج کے لیے خاص کیا ہے۔ جیسے نماز کا وقت نہ ہو اور کوئی آدمی نماز کی نیت کرے تو نماز منعقد نہیں ہوگی، اسی طرح حج کے مہینے ہی شروع نہ ہوں تو کوئی احرام باندھ لے تو اس کا حج بھی نہیں ہوگا۔ ''لَا يَنْبَغِيْ لِأَحَدٍ أَنْ يُّحْرِمَ بِالْحَجِّ إِلَّا فِيْ شُهُوْرِ الْحَجِّ مِنْ أَجْلِ قَوْلِهٖ تَعَالٰى'' (نہیں لائق کسی کو کہ حج کا احرام باندھے، مگر اشہر حج میں ہی اللہ تعالیٰ کے فرمان کی وجہ سے)۔ یعنی حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھنا درست نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کوئی امام بھی یہ نہیں فرماتے کہ تم حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھو، تمام ائمہ کرام رحمہم اللہ اس بات پر متفق ہیں کہ حج کے مہینے میں حج کا احرام باندھا جائے۔

رفث، فسوق اور جدال کا معنی:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس پر حج فرض ہو جائے احرام باندھے تو اس کو چاہیے کہ تین چیزوں سے بچے: ایک رفث، دوسرا فسوق اور تیسرا جدال۔

''رَفَثٌ'' کا معنی میاں بیوی کا ملنا یا شہوت انگیز بات یا کوئی شہوت انگیز کام کرنا ہے۔

''فُسُوْق'' کا معنی نافرمانی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے سارے کام منع ہو گئے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تو پہلے سے ہی حرام ہے، لیکن یہاں پر ''فُسُوْق'' کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں حج کے احکام دیئے ہیں، مثلاً: احرام باندھنا، احرام کی حالت میں بال نہ کٹوانا، خوشبو نہیں لگانی، بیوی سے مباشرت نہیں کرنی، ناخن نہیں کاٹنے اور سلے ہوئے کپڑے نہیں پہننے، یہ سارے کام ممنوع ہیں۔ اگر کرو گے تو نافرمانی ہے، لہٰذا ان احکام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو جو حج سے تعلق رکھتے ہیں۔

''جِدَال'' کا معنی یہ ہے کہ جیسے مکہ والوں نے کیا کہ وہ پہلے حج کرتے تھے تو عرفات جاتے تھے، لیکن بعد میں کہنے لگے کہ چھوڑو! یہ سارے لوگ حج کرتے ہیں اور عرفات میں جاتے ہیں اور ہم تو صرف مزدلفہ جائیں گے۔ وہ مزدلفہ میں جا کر ٹھہر جاتے، لوگ عرفات سے واپس آجاتے، وہ بھی مزدلفہ سے واپس آجاتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مکہ والے ہیں، کعبۃ اللہ کے مجاور ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کے گھر کے رکھوالے ہیں تو ہمارا لوگوں سے کوئی علیحدہ اعزاز تو ہونا چاہیے کہ لوگ بھی عرفات میں حج کریں اور ہم بھی تو دیگر لوگ اور ہم برابر ہو گئے، حالانکہ ہم تو خاص اللہ تعالیٰ کے دربار کے مجاور ہیں، لہٰذا ہم تو مزدلفہ میں رہیں گے، عرفات میں نہیں جائیں گے۔ پھر اس پر جھگڑے ہوتے تھے اور فسادات ہوتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حج میں جھگڑے نہ کرو، جیسے زمانۂ جاہلیت میں عادت ہوتی تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو پورا کرو۔

بعض علماء نے فرمایا کہ قدرتی بات ہے کہ ایک آدمی سفر میں تھک جاتا ہے، چڑچڑا ہو جاتا ہے اور سفر میں لڑائی کا امکان زیادہ ہوتا ہے، اور سفر کو سفر اس لیے کہتے ہیں کہ سفر کا معنی ''بند چیز کو کھولنا'' ہے؛ کیونکہ سفر میں آدمی کی اہلیت کھل جاتی ہے۔

اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی سے پوچھا کہ تم فلاں بندے کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ جی ہاں! میں جانتا ہوں، اچھا آدمی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ تمہارا ہمسایہ ہے؟ اس نے کہا کہ ہمسایہ تو نہیں ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی سفر بھی کیا ہے؟ اس نے کہا کہ سفر بھی نہیں کیا۔ فرمایا کہ پھر تم کیا جانتے ہو!؟ آدمی کا پتہ تو تب چلتا ہے جب کچھ عرصہ ہمسایہ رہا ہو اور اسی طرح جب تک آدمی کسی کے ساتھ سفر نہ کرے تو اس کے بارے میں کیا پتہ چلتا ہے؟ سفر میں بڑے بڑے راز کھل جاتے ہیں۔

تو اس لیے حکم تھا کہ جب سفر کرو گے تو لازمی بات ہے کہ حاجی حاجی کے ساتھ لڑ سکتا ہے اور چونکہ سیٹ پر، کرسی

پر، جہاز میں، بس میں، خیمے میں اور منیٰ میں حاجیوں کے لیے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں...... اللہ تعالیٰ معاف فرمائے...... بڑا امتحان ہوتا ہے کہ بندہ جھگڑے سے بچ سکے۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ حج میں لڑائی نہ کرو، برداشت کرو اور حلم سیکھو۔ وہ جو رمضان مبارک میں ہم نے تمہیں سبق پڑھایا تھا کہ سامنے پانی رکھا ہے، شربت رکھا ہے جب تک میرا حکم نہ ہو جائے، یعنی سورج نہ ڈوب جائے تو نہ پینا۔ تو کیا وہ صبر بھول گئے ہو؟ لہٰذا صبر پر عمل کرو اور لڑائی نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ نے نفی کے الفاظ استعمال کیے، نہی کے الفاظ استعمال نہیں کئے، یعنی ﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ فرمایا کہ رفث نہیں، فسوق نہیں اور جدال نہیں۔ ''لَا تَرْفُثُوْا'' نہیں فرمایا، ''لَا تَفْسِقُوْا'' نہیں فرمایا اور ''لَا تُجَادِلُوْا'' نہیں فرمایا۔ تو یہ نفی، نہیں کے معنی میں ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو باہر بھی منع ہیں، لیکن حج کے دنوں میں تو ان چیزوں کا وجود ہی نہیں ہونا چاہیے۔ گویا کہ یہ چیزیں تم سے اتنی دور ہو جائیں کہ یہ پائی ہی نہ جائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ نہیں فرمایا کہ جھگڑا مت کرو، نافرمانی مت کرو اور شہوت والے کام مت کرو، بلکہ فرمایا کہ ایسے حالات ہی پیدا نہ کرو کہ جھگڑا ہو جائے۔ یا بیوی سے باتیں کرتے کرتے شہوت اٹھ جائے۔ فرمایا: ایسی بات ہی نہ کرو، ایسا موقع ہی نہ آنے دو کہ پھر خوامخواہ پریشان ہوتے پھرو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے منع فرمادیا ہے۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ تمہاری ایک ایک حرکت اور سکون اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

حج میں سفرخرچ کا انتظام:

﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ [البقرۃ:۱۹۷]

''اور زادِ راہ لے لیا کرو اور بہترین زادِ راہ سوال کرنے سے بچنا ہے۔ اور اے عقلمندو! مجھ سے ڈرتے رہو۔''

''وَتَزَوَّدُوْا'' کا معنی حج کے لیے سامانِ سفر بھی ساتھ رکھو۔ اصل وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے زمانے میں یمن کے کچھ لوگ جب حج پر آتے تھے تو کوئی سامان وغیرہ ساتھ نہیں لاتے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم حج پر جا رہے ہو، سامان لے کر کیوں نہیں جا رہے؟ تو وہ کہتے کہ بھئی! کمال ہے! اللہ تعالیٰ کے گھر میں جا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مہمان بن کر جا رہے ہیں تو سامان رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ گھر سے تو یہ خوش ہو کر آتے اور جب مکہ مدینہ

پہنچتے تو بھیک مانگ کر گزارہ کرتے۔ یہ چیزیں بھی شریعت میں حرام ہیں۔

اس سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ آدمی یہ کہے کہ میں اسباب پر عمل نہیں کروں گا، میں توکل والا ہوں، بڑا متوکل ہوں۔ یہ اسلام کا مخالف ہے۔ یہ کوئی توکل نہیں کہ تم بیٹھے رہو کہ میں پانی نہیں پیوں گا یا آپ کہیں کہ ہم نے کھانا نہیں کھانا، ہمارا تو اللہ تعالیٰ پر توکل ہے، اللہ تعالیٰ خود کھلائے گا۔ تو...... ان شاء اللہ...... آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے 48 گھنٹوں بعد فوت ہو جائیں گے۔ کبھی یہ توکل کر کے دیکھ لو یہ اسلام کے خلاف ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ یہ توکل بزرگی نہیں ہوتی، یہ ناجائز ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ اسباب اختیار کرلو، پانی پی لو، لیکن یہ عقیدہ رکھو کہ پیاس بجھانے والا اللہ ہے۔ کھانا کھا لو، لیکن یہ عقیدہ رکھو کہ روٹی پیدا کرنے والا اللہ ہے اور اس کے منافع دینے والا بھی اللہ ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو میں غذا کھاؤں اور بیمار ہو جاؤں، میں غذا کھاؤں اور بدہضمی پیدا ہو جائے یا میرے لیے الٹا نقصان کا ذریعہ بن جائے۔ اسلام نے حکم دیا ''وَتَزَوَّدُوْا'' اپنے سفر کے لیے اسباب رکھو اور ضرورت کی سب چیزیں اپنے ساتھ رکھو۔

البتہ یہ یقین رکھو کہ اصل زادِ راہ تو اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے۔ اگر تقویٰ ہوگا تو تمہارے لیے ہم سارے مسئلے آسان کر دیں گے۔ ﴿وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ اگر تم عقل والے ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ ہر وقت ڈرنے کا حکم کیوں دیا ہے؟ اس لیے کہ حج میں مرد اور عورت نہ بھی چاہیں تو اکٹھے ہو جاتے ہیں، کبھی کمرے میں اکٹھے، کبھی طواف میں اکٹھے، صفا اور مروہ میں اکٹھے، منیٰ میں اکٹھے اور بسوں میں اکٹھے۔ اس لیے اللہ پاک بار بار فرماتے ہیں ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ...... وَاتَّقُوا اللّٰهَ'' (اللہ تعالیٰ سے ڈرو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو!) اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کرو! اس لیے کہ حالات ایسے ہیں کہ عورتیں اور مرد اکٹھے ہوتے ہیں، پھر حاجی بے چارے نئے نئے آتے ہیں، کسی کا پرس بھول گیا، کسی کے پیسے بھول گئے تو چوری کا بہت اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے بار بار ڈرایا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ میرا ڈر پیدا کرو۔ جب دل میں میرا ڈر پیدا ہو جائے گا تو گناہوں سے خود بخود بچ جاؤ گے۔ اللہ پاک آپ کو اور مجھے بھی اپنا ڈر نصیب فرمائے (آمین)۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾

[البقرۃ:۱۹۸]

''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ (زمانہ حج میں تجارت کر کے) اپنے رب سے رزق طلب کرو۔ پھر جب عرفات سے لوٹ کر (مزدلفہ) آؤ تو مشعرِ حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور اس کو ویسا یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں طریقہ سکھایا ہے۔ اور اگرچہ تم اس سے پہلے ناواقف تھے۔''

آیت کا شانِ نزول اور حج میں تجارت و ملازمت:

اسلام سے قبل اور آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے جاہلیت میں جہاں اور قسم کی چیزوں کو ایجاد کیا تھا وہاں ایک رواج یہ بھی تھا کہ انہوں نے حج کی عبادت کو میلا بنالیا تھا۔ چونکہ لوگوں کا بہت بڑا اجتماع ہوتا تھا تو وہ منیٰ میں بڑے بڑے بازار اور تجارتی میلے وغیرہ لگا لیتے تھے۔ اب اسلام نے جہاں جاہلیت کے تمام آثار کو مٹا ڈالا، ان کے عقائد سے لے کر ان کے اعمال تک کو ختم کر ڈالا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل میں خیال آیا کہ یہ منڈیاں، دکانیں، کاروبار اور تجارت وغیرہ تو زمانہ جاہلیت میں ہوتی تھی، اب اسلام کے اندر کیا ہوگا؟ ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب ہم حج کے دنوں میں تجارت وغیرہ کریں تو یہ جائز ہوگی یا نہیں؟

اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک آدمی آیا۔ اس نے پوچھا کہ ہمارے پاس اونٹ ہیں، ہماری یہ عادت اور کاروبار ہے کہ حج کے دنوں میں ہم اونٹ سواری کے لیے اور مال برداری کے لیے کرائے پر دیتے ہیں تو کیا ہم دے سکتے ہیں یا نہیں؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا تم عام حاجیوں کی طرح احرام نہیں باندھتے، طواف نہیں کرتے، رمی نہیں کرتے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: تم حاجی ہو۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ نبی کے پاس ایک آدمی آیا تھا اور اس نے یہی سوال کیا تھا تو آپ ﷺ خاموش رہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اونٹ کرایہ پر دے سکتے ہو، اس پر کوئی گناہ نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی آدمی حج کے دنوں میں ملازم ہے اور اس کی ڈیوٹی اور مزدوری بھی منیٰ میں ہے تو کیا وہ حج کے دنوں میں ڈیوٹی کر سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ کوئی منع نہیں ہے، اس کے حج میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔

اسی طرح اگر کوئی آدمی حج کے دنوں میں، مثلاً: مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عرفات یا منیٰ وغیرہ میں کوئی چیز لے کر بیچ لیتا ہے کہ میں حج بھی کرلوں اور روزی بھی کمالوں تو یہ بھی شریعت کے اندر منع نہیں ہے، لیکن اس کا ایک مسئلہ سمجھ لیں

کہ جب تم اپنے وطن سے آرہے ہو تو دیکھیں کہ سب سے پہلے تمہاری نیت کیا ہے؟ اگر تمہاری نیت کاروبار، تجارت یا مزدوری کی ہے اور حج آپ نے ضمناً کر لیا، یعنی آئے تو پیسے کمانے تھے، لیکن حج کے دن آگئے اور آپ نے حج بھی کر لیا، یعنی تمہارا مقصود حج پر آنا نہیں تھا۔ ایک صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے ملک سے حج کے دنوں میں آرہا ہے۔ صرف حج کے دنوں میں یہاں اس کی کوئی نوکری، کوئی کنٹریکٹ، کوئی سروس نہیں ہے، اب وہ آرہا ہے، لیکن اس کی غالب نیت یہ ہے کہ میں تجارت کروں گا، پیسے کماؤں گا اور حج بھی پڑھ لوں گا۔ تو علماء نے فرمایا کہ حج تو ہو جائے گا، لیکن وہ ثواب مرتب نہیں ہوتا جو کہ ہونا چاہیے؛ کیونکہ اس کی نیت میں کمانا حج سے مقدم ہے اور حج مؤخر ہے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ دونوں برابر برابر ہیں کہ تجارت بھی کر لیں گے اور حج بھی کر لیں گے تو اب بھی حج تو ہو جائے گا، لیکن پھر بھی وہ فضیلت اور ثواب مرتب نہیں ہوگا۔

اور ایک آدمی اپنے گھر سے خالص حج کے لیے چلا ہے، اس کی تجارت وغیرہ کی کوئی نیت نہیں ہے، لیکن حج میں آنے کے بعد یعنی جب یہاں پہنچا تو ضرورت پڑ گئی، پیسے گم ہو گئے۔ تو اس نے کہا کہ بجائے سوال کرنے کے بہتر ہے کہ میں مزدوری کر لوں۔ تو اب اس کا اصل مقصد حج تھا، لیکن وہ کام ضمناً کر رہا ہے، مجبوری کے پیش نظر یا مجبوری تو نہیں آئی، لیکن اس نے سوچا کہ مجھے یہاں پر کافی دن ٹھہرنا ہے اور وہ تاجر ہے، کاروباری تجربہ بھی ہے۔ اگر وہ آدمی چند کاروبار کرے گا تو کوئی حرج نہیں ہے، اس کی بھی اجازت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ تمہاری اصل نیت حج ہو اور مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہو، البتہ ضمناً تجارت وغیرہ بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ علماء کرام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم تجارت کرو، بلکہ فرمایا ہے: ﴿لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ أَن تَبۡتَغُواْ فَضۡلٗا مِّن رَّبِّكُمۡۚ﴾ [البقرۃ: ۱۹۸] اگر تم کچھ روزی کما لو تو کوئی گناہ نہیں ہے، کوئی تم پر حرج نہیں ہے، لیکن بہتر یہ تھا کہ تم حج کو خالص حج ہی رکھتے اور کوئی نیت اس میں شامل نہ کرتے۔

علماء نے ایک مسئلہ اور بھی بیان فرمایا ہے کہ کم از کم پانچ دن جو حج کے ہیں ان کو تو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے رکھ لو، ان میں کوئی اور مقصود نہ ہو، تاکہ توجہ خالص عبادت کی طرف لگ سکے۔ بہر حال جو لوگ اپنے گھروں سے خالص حج کے لیے آتے ہیں ان کے مرتبوں کا کیا کہنا!!

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تمہارا مقصود حج ہے اور ضرورت پیش آنے کی وجہ سے کوئی چیز خرید لی یا بیچ لی تو کوئی منع نہیں ہے اور اگر مقصود کمانا ہے اور حج ضمناً کرنا ہے تو حج تو ہو جائے گا، مگر حج پر وہ ثواب مرتب نہیں ہوگا اور وہ درجات

نہیں ملیں گے جو حج پر ملتے ہیں۔

میدانِ عرفات:

﴿فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ﴾

عرفات کو عرفات کیوں کہتے ہیں؟ اس میں علماءِ کرام کے مختلف اقوال ہیں، لیکن راجح بات یہ ہے کہ اس میں بندے کو اپنے رب کی معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اپنے رب کے حکم کے لیے دو چادریں باندھ کر، اپنے تکبر، دولت، غنا، اقتدار اور حاکمیت وغیرہ ہر چیز کو چھوڑ چھاڑ کے مٹی پر آکر بیٹھا ہوا ہے، ورنہ عرفات میں جانے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اور یہی وہ حکمتیں ہیں کہ اگر آپ غور کریں تو سارا مکہ پہاڑوں میں ہے، کالے کالے پہاڑ اور پہاڑ بھی ایسے کہ بالکل خشک، یعنی جن پر کوئی پتا، بوٹا، درخت اور سبزہ وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پہاڑ بھی سارے گرم، کوئی ٹھنڈا بھی نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کیا مشکل تھا!؟ یہاں سے ۱۰۰ کلومیٹر بعد طائف ہے۔ وہ کتنا ٹھنڈا ہے! ھدا کتنا ٹھنڈا ہے! شفا کتنا ٹھنڈا ہے!۔ جیسے جیسے آپ آگے بڑھتے جائیں گے، حتیٰ کہ بعض ایسی جگہیں ہیں، جیسے طائف کے انگور، انار اور گلاب کا پھول وغیرہ۔ پوری دنیا میں ان چیزوں کے مقابلے کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اتنی چیزیں ہیں! موسم ٹھنڈا ہے، سب کچھ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مکہ کی وادی کو عین گرم، خشک، کالے سیاہ پہاڑ۔ جدھر بھی آپ نظر ڈلیں آپ کو خشک پہاڑ نظر آئیں گے۔ پھر میدانِ عرفات کیا ہے؟ چٹیل میدان ہے بس۔ اس کے اندر کوئی اور دلچسپی کا سامان نہیں ہے۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ یہاں پر جو بھی آئے سوائے میری رضا کے اور کوئی نیت کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔ پس علماء کرام نے فرمایا کہ وہاں پر آدمی کو رب کی معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اے ربِّ کریم! تیری کیسی شان ہے کہ تو نے بے آب و گیاہ میدان میں ۲۰ لاکھ افراد کو جمع کر دیا ہے کہ شاہ ہیں، گدا ہیں، وزیر ہیں، گورے ہیں، کالے ہیں اور عرب ہیں، عجم ہیں۔ سب کا ایک لباس ہے، ایک ہی ترانہ اور ایک ہی مقصد ہے اور سب مٹی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس لیے علماءِ کرام نے فرمایا کہ ہر بات چونکہ معرفت کا مقام ہے، اس لیے اس کو ''عرفات'' کہتے ہیں۔

''عرفات'' کی وجہ تسمیہ:

اور بعض علماء نے یہ وجہ بھی لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو حج نصیب فرمایا، حضرت آدم علیہ السلام

کو حج کی تعلیمات دی گئی اور ان کو سارے واقعات سمجھانے گئے تو ان کو کہا گیا کہ "عَرَفْتَ؟" (کیا تو نے جان لیا؟)۔ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! میں نے سمجھ لیا اور مجھے پتہ چل گیا کہ کعبہ یہ ہے، منیٰ یہ ہے، عرفہ یہ ہے اور مزدلفہ یہ ہے۔ اس لیے بھی اس کو "عرفات" کہا جاتا ہے۔

اور بعض علماء کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے جنت سے نکالا تھا تو بی بی حوا رضی اللہ عنہا کو علیحدہ اتارا گیا اور آدم علیہ السلام کو علیحدہ اتارا گیا، پھر ان کا اللہ پاک نے لقاء بھی میدانِ عرفات میں کروا تھا۔

لیکن یہ ساری باتیں ایسی کتب متقدمہ سے ہیں جن کی تصدیق نہیں کی جاسکتی؛ اس لیے کہ یہ قرآن میں ہیں اور نہ ہی ہمارے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں۔

وقوفِ عرفات کی اہمیت:

یہ بھی یاد رکھیں کہ عرفات حج کا ایسا عظیم رکن ہے جس کے بغیر حج نہیں ہوسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نے احرام باندھ لیا، طواف کر لیا، صفا و مروہ دوڑ لیے اور منیٰ و مزدلفہ چلے گئے، سارے کام کر لیے، لیکن عرفات نہیں گئے تو حج نہیں ہوگا۔ اس لیے حدیث پاک میں بھی آگیا کہ میرے آقا سرکارِ مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: "مَا الْحَجُّ؟ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" (اے اللہ رسول! حج کس چیز کا نام ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلْحَجُّ عَرَفَاتٌ" کہ حج تو عرفات میں حاضری کا نام ہے۔

جو لوگ وہاں پر زوال سے پہلے یا زوال کے بعد چلے جائیں ان کو عرفات میں ۹ تاریخ کو سورج ڈوبنے تک رہنا ہے۔ جب تک سورج غروب نہ ہو وہاں عرفات کے میدان سے نہیں نکل سکتے اور جب سورج غروب ہو جائے، اب عرفات کے میدان سے چل پڑیں اور مشعر الحرام کی طرف آئیں۔

مشعر کا معنیٰ: شعار بمعنی علامت کے ہیں اور حرام کا معنیٰ حرمت کا ہے، یعنی یہ پہاڑ بڑی عظمت والا ہے۔ اس مسجد کے ساتھ جو اونچی جگہ ہے یہ مشعر الحرام ہے، لیکن اب اس کے ساتھ جتنا بھی میدان ہے وہ سارا اس کے تابع ہے، یعنی اگر آپ مزدلفہ میں کسی مقام پر چلے جائیں تو گویا آپ مشعر الحرام میں آگئے ہیں۔

اب آپ سمجھ لیں کہ آپ نے عرفات سے مزدلفہ میں آنا ہے۔ ﴿وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ﴾ اللہ پاک نے فرمایا کہ تم میرا ذکر کرو، لیکن اس طرح جس طرح تم کو بتایا اور سمجھایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ

چاہے کوئی کام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہماری رہنمائی فرمائی ہے اس طرح نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ کو قبول نہیں فرمائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اب حکم دیا ہے کہ تم دونوں نمازیں: مغرب اور عشاء مزدلفہ میں ادا کرو۔ حالانکہ حکم کا ظاہری تقاضہ یہ تھا کہ ہم مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھتے؛ کیونکہ ہمارا وقت تو عرفات میں ہو گیا تھا۔ اور عشاء کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھتے، لیکن اللہ پاک نے فرمایا: اگر تم اب اپنی عقل سے فیصلہ کرو گے تو میں تمہاری عبادت کو قبول نہیں کروں گا۔ تم پڑھ تو مغرب کے وقت میں رہے ہو، لیکن میرا حکم یہ ہے کہ تم مزدلفہ میں جا کر پڑھو۔ اگر تم راستے میں بھی پڑھو گے تو میں تمہاری نماز قبول نہیں کروں گا۔ اب آپ نے دونوں نمازیں مزدلفہ میں آکر پڑھنی ہیں۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے تجاوز کرو گے تو وہ قبول نہیں ہوگی۔

﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٩٩﴾﴾
[البقرۃ:۱۹۹]

''پھر طواف کے لیے چلو جہاں سے لوگ چلیں اور اللہ سے مغفرت طلب کرو۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

''ثُمَّ'' عطف اور ترتیب کے لیے ہے، یعنی جب آپ مزدلفہ میں آگئے تو دو نمازیں: مغرب اور عشاء مزدلفہ میں پڑھیں۔ اذان ایک ہوگی اور ہر نماز کی تکبیر علیحدہ ہوگی۔ اور رات مزدلفہ میں گزاریں، پھر صبح کی نماز مزدلفہ میں پڑھیں، صبح کے بعد لمبی دعا مانگیں اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے منیٰ کی طرف چل پڑیں۔ ﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں، جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوگئیں اور جو زمانۂ جاہلیت میں غلط باتوں پر عمل ہوتا رہا۔ اللہ پاک بخشنے والا اور مہربان ہے۔

﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ﴾ اصل میں یہ زمانۂ جاہلیت کی ایک رسم کا رد ہے کہ مشرکین مکہ جب حج کو جاتے تھے تو وہ مزدلفہ میں رک جاتے تھے اور عرفات میں حج کو نہیں جانتے تھے؛ اس لیے کہ ان کو تکبر تھا کہ ہم مکہ والے ہیں، ہمارے قریش ہیں اور حمس ہیں، لہٰذا ہم عرفات میں نہیں جائیں گے، جہاں عام لوگ جاتے ہیں۔ کیا ہم ان لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوں؟ ہماری تو شان علیحدہ ہے، ہم تو کعبۃ اللہ کے مجاور ہیں، ہم قریش ہیں اور یہاں کے سردار ہیں۔ اس لیے وہ مزدلفہ میں ٹھہر جاتے تھے اور عرفات میں جاتے ہی نہیں تھے۔ تو

اللہ تعالیٰ نے ان کی رسمِ جاہلیت کو مٹایا اور فرمایا: ﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ﴾ تم وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلتے ہیں، یعنی حج کا مقام عرفات ہے، یہ نہیں کہ کوئی مزدلفہ میں ٹھہر جائے اور کہے کہ میرا حج ہو گیا۔ عرفات سے چلو اور مزدلفہ میں آؤ۔ اس لیے فرمادیا گیا اور ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا۔

استغفار کی فضیلت:

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ﴾ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والے بھی ہیں اور نہایت مہربان بھی ہیں۔ استغفار بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک پیغمبر حبیب کبریا حضرت محمد مصطفی ﷺ معصوم اور گناہوں سے پاک ہیں، لیکن پھر بھی فرماتے ہیں کہ میں روزانہ سو (۱۰۰) مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ تو جو گناہوں سے معصوم ہیں وہ تعلیمِ امت کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ اور سید الاستغفار جو احادیث میں آتا ہے، بخاری شریف میں حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي؛ فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ)) [صحیح البخاری، رقم:۶۳۰۶، باب: أَفْضَلِ الاسْتِغْفَارِ]

اسی طرح آتا ہے:

((أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ هُوَ، الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ، وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ))

اسی طرح آتا ہے:

((أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيَ الْعَظِيْمَ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ)) [کنز العمال:۶، ۳۵۳، ۲۱۱۹۱]

اور اگر یہ سارا یاد نہ ہو تو ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ...... أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ'' کہتے رہیں۔

استغفار کے فوائد:

استغفار گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور غربت کو بھی مٹا دیتا ہے۔ استغفار کی وجہ سے اللہ پاک رزق میں برکت عطا فرماتے ہیں، اولاد میں بھی برکت عطا فرماتے ہیں، فصلوں میں برکت عطا فرماتے ہیں اور کاروبار میں برکت عطا فرماتے ہیں۔

اس لیے اللہ پاک نے حکم دیا کہ اب تم استغفار کرو، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ شاید حج کے اندر یا مناسک کے اندر تم سے کوئی کمی رہ گئی ہو یا کوئی غلطی ہوگئی ہو تو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والے اور مہربانی کرنے والے ہیں۔

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝﴾ [البقرة: ۲۰۰ تا ۲۰۲]

پھر جب حج کے کام (رمی، جمرہ عقبہ اور طواف) پورے کر چکو (اور منیٰ میں ٹھہرو) تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جیسے تم اپنے آباء و اجداد کو یاد کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔ پھر کوئی آدمی تو کہتا ہے: اے ہمارے رب! ہمیں (ہمارا حصہ) دنیا میں دے دے۔ اس کے لیے آخرت (کے ثواب) میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کوئی ان میں سے کہتا ہے: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں نعمت دے اور آخرت میں جنت اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ ایسے لوگوں کے لیے ثواب ہے، جو وہ (حج میں عمل اور دعا) کرتے تھے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔"

مزدلفہ میں کثرت سے ذکر کا حکم:

اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ تم منیٰ اور عرفات میں بھی پہنچے اور عرفات کے بعد تم مزدلفہ میں بھی آئے۔ اب جب تم نے حج کے مناسک پورے کر لیے ہیں تو اس کے شکر کا تقاضا یہ ہے کہ اب تم اس کا ذکر کرو۔ وجہ یہ ہے کہ حج کا ادا کرنا ایک بہت بڑا مقصد ہے۔ آدمی اپنے وطن کو، اپنے بچوں اور اپنے گھر کو چھوڑتا، پھر بدن، مال و دولت اور پیشہ وغیرہ، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے۔ اتنی بڑی محنت کے باوجود شاید کوئی کمی ہم سے رہ جائے یا ہم سے کوئی غلطی ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے تمہارے سارے مراحل طے کر دیے، اب اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اب تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔

یاد رکھیں! ہر عبادت کی ایک حد اور مقدار ہے، جیسے 24 گھنٹے میں پانچ نمازیں فرض ہیں، چھ نمازیں فرض نہیں

ہیں۔ہم اس کو چھ یا چار نہیں بنا سکتے۔اسی طرح رمضان المبارک کے روزے سال میں صرف ایک مہینہ فرض ہیں، ہم دو ماہ فرض نہیں بنا سکتے۔اسی طرح حد مقدار زکوۃ مقرر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو دولت عطا فرمائیں، وہ اپنے تمام اخراجات اور حسابات کے بعد وہ حساب کر کے اڑھائی فیصد ادا کرے۔اب اڑھائی فیصد کو تین فیصد بھی نہیں بنا سکتے اور دو فیصد بھی نہیں کر سکتے۔تو ہر عبادت کی ایک حد اور مقدار ہوتی ہے، جس کو آپ کم و بیش نہیں کر سکتے، لیکن اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں ہوتی، فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴾ [الاحزاب:۴۱]

''اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور ڈھیر سارا ذکر کرو۔''

اسی طرح:

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ [طٰہٰ:۱۴]

اور نماز بھی ذکر ہے، کلمہ بھی ذکر ہے، عبادت بھی ذکر ہے اور قرآن پاک بھی ذکر ہے، بلکہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے ''أَفْضَلُ الذِكْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' تو یہ سب ذکر ہیں، ان کی کوئی حد نہیں ہے۔اس لیے قرآن پاک کہتا ہے کہ میرے مومن بندے ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [آل عمران:۱۹۱] میرے مومن بندے کھڑے ہیں تو میرا ذکر کرتے ہیں، بیٹھے ہیں تو میرا ذکر ہے اور لیٹے ہیں تو میرا ذکر ہے۔یعنی کبھی قیام میں، کبھی رکوع میں اور کبھی سجدہ میں ہیں۔اور اگر کبھی لیٹے ہوئے ہیں تو پھر بھی میری صناعتوں میں فکر کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ [آل عمران:۱۹۱]۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: تم اللہ پاک کا اتنا ذکر کرو کہ ہر وقت تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے۔اللہ تعالیٰ کا ذکر دلوں کے لیے ایک صیقل ہے، یعنی دلوں پر جو زنگ لگ جاتا ہے اس کو ہٹانے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔اور جب دلوں پر میل جم جائے تو اس کا علاج بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔اگر انسان کسی مصیبت یا کسی الجھن میں پڑ جائے تو اس کا علاج بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام پر جب مصیبت آئی تو انہوں نے کہا ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ

﴿الظّٰلِمِیْنَ﴾ [الانبیاء:۸۷]۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جب مشکل وقت آیا تو انہوں نے کیا کہا؟ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ﴾ [آل عمران:۱۷۳]۔ ہاں! جہاں بھی آپ نظر ڈالیں گے۔ یاد رکھیں کہ جب تمہیں اللہ تعالیٰ کا ذکر نصیب ہو جائے تو سمجھو کہ اللہ پاک راضی ہو گئے۔

﴿فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾ [البقرۃ:۱۵۲] تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا۔ تم میرا ذکر بندوں میں کرو گے، میں تمہارا ذکر ملائکہ میں کروں گا۔ تو جب تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو یاد کرے گا۔ تو جب اللہ تعالیٰ کو یاد کریں گے تو صاف بات ہے کہ یہ اس کی رضا کی نشانی ہے۔ اس لیے سمجھیں کہ نماز میں آنا ذکر ہے۔ اللہ پاک نے اپنے گھر میں آنے دیا، نماز پڑھنے اور قرآن سننے دیا تو معنی یہ ہے کہ اللہ پاک ہم سے راضی ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ذکر کرو، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور جتنا اللہ پاک کا ذکر کر سکتے ہو کرو۔

لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ ہمارے بہت سے بھائی ہیں...... اللہ تعالیٰ ان کو بھی اور ہمیں بھی ہدایت عطا فرمائے کہ...... ان کا مقصد تو ذکر و عبادت ہوتا ہے، لیکن ان کو جیسے کسی آدمی نے بتا دیا کہ یہ فلاں کتاب ہے، یہ فلاں کتاب ہے۔ اس میں مجموعہ اذکار ہیں، اس میں فلاں فلاں ذکر ہے۔ وہ بے چارہ کرتا تو اللہ تعالیٰ کا ذکر چاہتا ہے، لیکن اس کو پتہ نہیں ہوتا کہ جو بس میں پڑھ رہا ہوں، کیا یہ صحیح بھی ہے یا کہ نہیں؟ اور جو میں پڑھ رہا ہوں یہ احادیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت بھی ہے یا نہیں؟ کیا جو میں ذکر کر رہا ہوں کہیں بجائے ذکر کے اور بجائے ثواب حاصل کرنے کے میں کوئی ایسی الفاظ تو ادا نہیں کر رہا جس سے بجائے ثواب کے مجھے گناہ حاصل ہو رہا ہے؟

ہمیشہ یاد رکھیں کہ ذکر بھی ان الفاظ کے ساتھ کیا کریں جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔ اپنی طرف سے لوگوں نے بہت ساری چیزیں لکھی ہیں۔ ان میں سے بعض صحیح ہوتی ہیں اور بعض غلط ہوتی ہیں۔ اس لیے عام آدمی کو پتہ نہیں چل سکتا کہ ان کلمات سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ لیکن جو چیز قرآن و حدیث میں ثابت ہے اس کے غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمیشہ جب بھی ذکر کریں یا ذکر کی کوئی کتاب اٹھالیں تو کتاب لینے سے پہلے تسلی کر لیا کریں کہ یہ کس ذمہ دار آدمی کی لکھی ہوئی ہے؟ اور اس کے اندر اس نے کن احادیث مبارکہ کے حوالے دیئے ہیں؟ اور اس پر کتنا اعتماد کر سکتے ہیں؟ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے علاقے کے کسی عالم سے اور کسی معتمد علم والے سے اس کے بارے میں تسلی کر لیا کریں۔

﴿كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ [البقرۃ:۲۰۰] اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جیسے تم اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہاں پر رسمِ جاہلیت کو مٹایا گیا کہ کفر کے زمانے میں انہوں نے حج کو بھی ایک کاروبار بنایا ہوا تھا کہ حج میں بازار اور منڈیاں لگتی تھیں اور دنیا کے بڑے بڑے تاجر آ کر اپنا تجارتی سامان بیچا کرتے تھے، تو لوگ اسی میں کھو جاتے تھے۔ اور دوسری بات یہ ہوتی تھی کہ وہ لوگ مزدلفہ اور عرفات سے واپس آ جاتے اور منیٰ میں آ جاتے اور منیٰ میں تین دن کا قیام ہوتا۔ اب وہ سارے عرب کے شعراء کو جمع کرتے اور مشاعرے ہوتے اور وہاں ادباء کو بلایا جاتا۔ ہر آدمی پھر اپنے باپ دادا کا حسب ونسب بیان کرتا کہ میں فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور میں فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا باپ اور میرا دادا اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ اور اپنے باپ دادا کے محاسن اور اوصاف کو ایسے طریقے سے بیان کرتے کہ اس سے مبالغہ اور تکبر ظاہر ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مسلمانو! تم ان جاہلیت کی رسموں سے بچ جاؤ۔ تم جب اللہ پاک کے احکام پورے کر لو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ یہ نہیں کہ تم اپنے باپ دادا کا ذکر کرو اور اسی طرح فخر و مباہات میں اسی طرح مبتلا ہو جاؤ جیسے زمانہ جاہلیت میں لوگ مبتلا ہو جاتے تھے، بلکہ تم اپنے باپ دادا کی بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔

اور اس میں بھی ایک سبق یہ ملا ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنے خاندان پر بلاوجہ فخر کرتا ہے اور اس کا اظہار کرتا ہے تو شریعت میں یہ ممنوع اور ناجائز ہے۔ اصل میں وجہ یہ ہے کہ عزت والا تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت والا ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت کا مدار تقویٰ ہے اور اعمال صالحہ ہیں، حسب ونسب نہیں ہے۔ ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ﴾ [الحجرات: ١٣] تو اللہ پاک نے فرمایا کہ تم اصل بات یعنی اللہ پاک کا ذکر کرو یہ نہیں کہ صرف اپنے باپ دادا کے ذکر میں پڑ جاؤ۔

﴿كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ﴾ [البقرۃ: ٢٠٠] لیکن علماء کرام نے اس کی اور توجیہ بھی بیان فرمائی ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو جب وہ آہستہ آہستہ بڑا ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ کہے گا: بابا! بابا! بابا!۔ یعنی عربی میں کہیں گے ''أَبٌ أَبٌ أَبٌ''۔ وجہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اب میری ضروریات کا مجازی طور پر متکفل میرا باپ ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ جب تم چھوٹے ہوتے ہو تو تمہاری نظر تمہارے ''اَب'' پر پڑتی ہے، اب میں تمہیں سبق دیتا ہوں کہ تمہاری ضروریات کا حقیقی متکفل چونکہ میں ہوں تو بجائے ''أَبٌ أَبٌ'' کرنے کے ''یا رب!'' پڑھو، تا کہ تم اصل منزل پر پہنچ جاؤ۔ اس لیے فرمایا کہ ﴿فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ﴾ [البقرۃ: ٢٠٠]

یہ نہیں کہ والدین کا ذکر منع ہے۔ والدین کا ذکر کرنا نعمت ہے۔ والدین کے لیے دعا کرنا، والدین کے لیے اچھے اچھے صدقات کا اہتمام کرنا بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اولاد بھی اچھی وہی ہوتی ہے جو والدین کے بعد ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے لیے دعا کرے، ان کے لیے مغفرت کے اسباب پیدا کرے، صدقاتِ جاریہ بنوادے، مساجد مدارس میں پانی کے انتظامات اور خیرات وصدقات وغیرہ۔ اسی لیے فرمایا گیا ''وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُو لَهُ'' [مسلم، رقم: ۱۶۳۱] کہ سب سے بڑی نعمت انسان کی صالح اولاد ہے جو اپنے والدین کے مرنے کے بعد دعائیں کرتی ہے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتی ہے: ﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ [الاسراء: ۲۴] اور ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ﴾ [ابراہیم: ۴۱]۔ اس لیے اصل یہ ہے کہ یہاں پر جو منع کیا گیا ہے وہ رسمِ جاہلیت کو توڑا گیا ہے کہ جو حج کے بعد صرف مشاعرے، مفاخر اور اپنے باپ دادے کے قصے کہانیوں میں وقت گزارتے تھے، اللہ پاک نے فرمایا کہ نہیں! تم صرف اپنے اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گزارو۔

اللہ سے مانگنے والوں کی اقسام:

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ [البقرۃ: ۲۰۰]

بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ سے دنیا تو مانگتے ہیں، یعنی مال واولاد سب دنیا کی چیزیں مانگتے ہیں، لیکن ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، یعنی آخرت کی طرف دھیان اور فکر نہیں ہے۔ صرف غرض ہے تو دنیا دنیا دنیا بس۔ ہر وقت اسی کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اور اسی میں غور کریں۔ تو ''فِي الدُّنْيَا'' کے ساتھ ''حَسَنَةً'' بھی نہیں ہے، یعنی وہ بس دنیا ہی مانگتے ہیں، چاہے جیسے بھی ملے، چاہے حرام ہو؛ کیونکہ ان کی نظر آخرت پر نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کا آخرت میں ذرے کے برابر بھی کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اس لیے علماء نے کرام نے فرمایا کہ کافر ایک تو وہ کافر ہیں جن کا آخرت پر کوئی عقیدہ ہی نہیں ہے۔ یعنی ان کا تو عقیدہ یہ ہے کہ جب تک ہم زندہ ہیں تو زندہ ہیں، سب کچھ اسی زندگی میں ہے۔ جب ہم مرجائیں گے تو ختم۔ مرنے کے بعد اگلا جہان نہیں ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے ﴿وَقَالُوا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ﴾ [الانعام: ۲۹] وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیا یہی ہمارا جینا اور مرنا ہے۔ کوئی مر گیا اور کوئی پیدا ہو گیا۔ مرنے کے بعد ہم دوبارہ قبروں سے نہیں اٹھائے جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی عالمِ آخرت نہیں ہے۔ چلو وہ تو کافر ہیں، ان کا آخرت پر کوئی عقیدہ

نہیں ہے۔لیکن علماء نے لکھا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان بھی رکھتے ہیں، آخرت پر بھی یقین ہے، ان کا مقصد کیا ہے صرف دنیا۔حج کرر ہے ہیں تو کیا کہتے ہیں کہ یا اللہ! رزق میں برکت عطا فرما، مال عطا فرما، پیسے عطا فرما، تجارت میں برکت عطا فرما، دکان میں برکت عطا فرما اور میرے بچے کو رزق اور نوکری عطا فرما۔اور کوئی غم نہیں، کوئی غم ہے تو صرف دنیا دنیا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔تو یہ لوگ بھی اللہ پاک کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔

اس لیے علماء کرام نے لکھا ہے کہ کوئی آدمی صرف اس لے سورۂ واقعہ پڑھ رہا ہے کہ مجھے پیسے ملیں، اس لیے قرآن پاک کی کوئی آیت یا کوئی وظیفہ کسی بزرگ سے پوچھتا ہے کہ مجھے وظیفہ بتادیں اور پڑھنے کا مقصد صرف دنیا ہے کہ مجھے دولت اور پیسہ وغیرہ ملے، یا کسی کو پیر اسی لیے بناتا ہے کہ اس سے کوئی دعا کراؤں گا، مجھے پیسے مل جائیں گے، یا کوئی وظیفہ لے لوں گا تو میرا کاروبار چل پڑے گا تو علماء کرام نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ چیزیں بھی پسند نہیں ہیں۔آدمی کو چاہیے کہ دنیا ہے تو اس میں بھی ''حَسَنَةً'' کو تلاش کرے اور آخرت کے لیے بھی ''حَسَنَةً'' کو تلاش کرے۔

اب دیکھیں کہ اللہ پاک نے فرمایا کہ انسانوں میں دو گروہ ہو گئے ہیں: ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾ [البقرة:۲۰۰،۲۰۱]

مؤمن کی جامع دعا:

اللہ پاک نے فرمایا کہ جو میرے ایمان والے نیک بندے ہیں وہ تو ہر وقت جب مانگتے ہیں تو دنیا میں بھی بھلائی مانگتے ہیں۔دنیا میں بھلائی کا معنی یہ ہے کہ صحیح عقیدہ عطا فرما، صراطِ مستقیم پر چلنا نصیب فرما، بدن میں صحت وقوت عطا فرما، صالح اور فرمانبردار اولاد عطا فرما۔یہ رزق، مال و دولت سب کچھ دنیا میں آ گیا، ''اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً'' میں آ گیا۔اور آخرت میں ہمیں بھلائیاں اور خوبیاں عطا فرما، یعنی جنت اور جنت کی نعمتیں عطا فرما، یعنی وہ دنیا میں بھی مانگ رہے ہیں اور آخرت کے لیے بھی مانگ رہے ہیں۔پھر دنیا میں بھی صرف دنیا نہیں مانگی، بلکہ ''فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً'' دنیا میں بھلائی مانگی اور آخرت میں بھی بھلائی مانگی۔اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ میرے بندے ہیں۔اس لیے علماء کرام نے لکھا ہے کہ یہ دعا بڑی جامع ترین دعا ہے کہ جس میں دنیا و آخرت کی سب بھلائیاں آ جاتی ہیں۔

اس لیے میرے آقا حبیب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے طواف کے دوران رکنِ یمانی سے لے کر حجرِ اسود تک جب بھی دعا کی تو یہی دعا کی: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [البقرۃ:۲۰۱]

رکنِ یمانی کو بوسہ نہ دیں:

اور ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب آپ طواف کریں اور رکنِ یمانی پر پہنچ جائیں، اللہ پاک موقع دے تو دایاں ہاتھ لگائیں؛ اس لیے کہ رکنِ یمانی کو بوسہ دینا حدیث پاک میں ثابت نہیں ہے۔ اور بعض روایات میں جو آتا ہے وہ روایت درجۂ صحت کو پہنچی ہوئی نہیں۔ بعض علماء کے اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں۔ صحیح روایات یہی ہیں کہ رکنِ یمانی کو آپ داہنے ہاتھ سے مس کرتے تھے۔ اور جو دعا ہے وہ یہی ہے: ''بِسْمِ اللهِ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ، اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ''۔ اس کے بعد ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [البقرۃ:۲۰۱]۔ یہ دعا بڑی جامع ترین دعا ہے۔ دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کے لیے یہ دعا بڑی تریاقِ اکبر ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ حدیث پاک کی روشنی میں ثابت ہے کہ آدمی جب دعا کرے تو اسے کم از کم تین مرتبہ دہرائے۔ یہ بھی احادیث میں آتا ہے کہ ''إِنْ لَمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكَوْا'' اگر تمہیں رونا نہیں آرہا تو عاجزانہ اور رونے والی شکل پیدا کرو۔ چونکہ جب تک عاجزی اور انکساری پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی رحمت نصیب نہیں ہوتی۔

عمرہ اور طواف میں ریا:

اگر کسی آدمی کو حج یا عمرہ نصیب ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کہتا پھرے کہ ہم نے تو بیس عمرے کیے ہیں، دس طواف کیے ہیں اور...... ماشاء اللہ...... میں تو ۱۹۷۰ء سے ہر سال حج کر رہا ہوں۔ یہ تکبر اور ریا ہے، جس سے عمل برباد ہو جاتا ہے اور دھیلے کا ثواب بھی نہیں ملتا۔ بلکہ آدمی کے اندر مزید انکساری اور تواضع آنی چاہیے کہ میرے مولا! اگر میں پہلے گناہگار تھا تو میں ایک تیرا عام بندہ تھا۔ اب تو نے مجھے کعبہ دکھا دیا، حج کروا دیا اور اب میں حاجی بن گیا ہوں، اب اگر میں گناہ کروں گا تو مولا! تیرے نام پر بڑا داغ لگے گا، اس لیے مجھے توفیق دے کہ میں نیکی کے کام کروں۔ ایسا نہ ہو کہ میں تجھے بدنام کرنے والا بن جاؤں۔ اگر میں مکہ اور کعبہ میں آکر بھی ٹھیک نہ ہوا اور مدینہ منورہ میں آکر بھی ٹھیک نہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تو تیرے گھر کے لیے ایک داغ بن گیا کہ عجیب بات ہے کہ شاید مکہ مدینہ میں کچھ نہیں رہا۔ اگر کچھ ہوتا تو ان سے تبدیلی کیوں نہ ہوتی؟ لوگ یورپ

میں جا کر واپس آتے ہیں تو آدھے انگریز نظر آتے ہیں۔ اگر وہاں کی یونیورسٹی میں ڈگری لے لیں تو پہچانے نہیں جاتے کہ نقلی کون ہیں اور اصلی کون ہیں؟ لیکن اگر ہم مکہ مدینہ حج کے لیے آئیں اور حج کے بعد ہمارے اوپر کوئی اثرات مرتب نہ ہوں اور زندگی میں کسی چیز کا کوئی فرق نظر نہ آئے تو مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے ہمیں الٹا محروم کر دیا۔ اس لیے حکم یہ ہے کہ جب بھی آپ دعا کریں تو عاجزی اور انکساری سے کریں، اللہ تعالیٰ کے آگے آپ گڑگڑائیں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہیں رونا نہیں آتا تو رونے کی شکل تو بنا سکتے ہو۔

اصل کامیابی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائے؛ کیونکہ جو جہنم سے بچ گیا اور جنت میں داخل ہو گیا، وہ کامیاب ہے۔

اللہ کا کمال علم:

وہ لوگ جو دنیا اور آخرت کی بھلائی مانگتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا حصہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سب سے جلد حساب لینے والے ہیں؛ اس لیے کہ اس کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ حساب تو اس کے لیے مشکل ہوتا ہے جس کو کوئی چیز یاد رہ گئی، کوئی چیز بھول گئی، کوئی لکھی گئی اور کوئی نہ لکھی گئی، کسی میزان میں بھول گیا یا کسی ضرب و تقسیم میں بھول گیا۔ اللہ کی ذات مبارک تو بھولنے سے پاک ہے۔ ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى﴾ جو بھٹکنے سے بھی پاک ہے اور بھولنے سے بھی پاک ہے۔ اس کا علم ذرے ذرے کو محیط ہے، کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَآ أَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ أَكْبَرُ إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ کہ مثقالِ ذرہ بھی آسمانوں اور زمینوں میں خدا سے چھپا ہوا نہیں ہے، نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز اور نہ کوئی بڑی چیز۔

حساب میں جلدی کا یہ عالم ہوگا جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ ساری کائنات کے اولین و آخرین جب جمع ہوں گے تو آدھے دن میں ان کا حساب پورا ہو جائے گا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ذات سریع الحساب ہے کہ تم وہ عمل کرو اور ہر وہ قدم اٹھاؤ جو شریعت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہو۔

سابقہ امتوں میں صدقات قبول ہونے کی علامات:

علماء کرام نے کچھ ہدایات اور علامات لکھی ہیں۔ فرمایا کہ مثلاً: ہم نے عمرہ کیا یا ہم نے حج کیا تو ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہماری یہ عبادت قبول ہوئی یا نہیں؟ کیونکہ پہلے دور میں یہ قاعدہ تھا کہ مثلاً: آپ خیرات کرتے تو طریقہ یہ

تھا کہ ایک بکرا ہے یا چاول ہیں یا کچھ بھی ہے، اس کو جا کر پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا جاتا تھا۔ قدرت کی طرف سے ایک آگ آتی تھی، وہ آ کر اس کو جلا دیتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خیرات منظور کر لی ہے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ ﷺ پر رحمت کے ذریعے ایک پردہ ڈال دیا؛ اس لیے کہ پہلے جس کی خیرات پڑی رہتی تھی اور اسے آگ نہیں جلاتی تھی وہ رسوا ہو جاتا تھا اور لوگ اس کو کہتے تھے کہ تم تو کتنے گندے آدمی ہو کہ تمہاری خیرات تک قبول نہیں ہوئی!؟ اور جس کی خیرات قبول ہو جاتی تو سمجھ لیا جاتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ کی امت پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا کہ اس کی خیرات قبول ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ کو پتہ ہے۔ لیکن علماء کرام نے فرمایا کہ اس کی کچھ علامات ہیں، جیسے بادلوں کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ بارش برسے گی، لیکن بعض اوقات بارش نہیں برستی اور ہمارے اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح علماء کرام نے فرمایا کہ یہ بھی محض اندازے ہی ہیں کہ اگر حج کرنے کے بعد یا عمرہ کرنے کے بعد تیرے اندر نیکی بڑھ گئی ہے اور تیرے اندر کوئی انقلاب آیا ہے کہ تو بے نمازی تھا تو اب نمازی بن گیا ہے، بے روزہ تھا تو اب روزے رکھنے والا بن گیا ہے، بے حیا تھا تو اب باحیا بن گیا ہے، بے شرم تھا تو اب شرم والا بن گیا، شرابی تھا تو شراب چھوڑ دی، زانی تھا تو زنا چھوڑ دیا اور توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف اور آخرت کی طرف ہو گئی تو سمجھو کہ میری حاضری منظور ہو گئی۔ اور فرمایا کہ حج کرنے کے بعد اگر تو اسی طرح رہا جیسے پہلے تھا تو سمجھو کہ میں ٹھکرا دیا گیا۔ اس لیے علماء کرام نے لکھا ہے کہ ہر عبادت کے بعد اپنے عمل پر خود نظر ڈالو کہ کیا میرے افعال واقوال میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟ اگر آ گئی ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور اگر نہیں ہوئی تو پھر توبہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے دروازے پر گر جائے کہ رحمت کا دروازہ بند نہیں ہوا اور توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا۔

قبولیتِ دعا پر مالک بن دینار رحمہ اللہ کا قول:

جیسا کہ مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میری جو دعا قبول ہوتی ہے مجھے پتہ چل جاتا ہے۔ ان کے شاگردوں اور مریدوں نے پوچھا کہ حضرت آپ کو کیسے پتہ چل جاتا ہے؟ فرمایا کہ دعا کرنے میں جب میرا دل لگ جائے اور دعا مانگنے میں مزہ آنے لگے اور دل چاہے کہ اور مانگوں، اور مانگوں، اور میرے آنسو بہنے شروع ہو جائیں اور بدن پر کپکپی طاری ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے ڈر سے میرے بال کھڑے ہو جائیں تو میں سمجھ لیتا ہوں

کہ اللہ پاک راضی ہو گیا ہے اور میری دعا منظور ہو گئی ہے۔ اور اگر میں دعا کر رہا ہوں اور زبان "رَبَّنَا! رَبَّنَا!" کہہ رہی ہے، لیکن دل نہیں لگ رہا، اس میں کوئی کشش پیدا نہیں ہو رہی اور کوئی لطف نہیں آ رہا تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ میری یہ دعا منظور نہیں ہوئی۔

دعا کی قبولیت کی دوسری نشانی:

اور بعض علماء کرام نے ایک دوسری علامت بھی لکھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک نیکی کے کرنے کے بعد تجھے ایک اور نیکی کی توفیق مل جائے تو سمجھو کہ پہلی نیکی قبول ہو گئی ہے۔ اور اگر ایک نیکی کے کام کرنے کے بعد خدانخواستہ کوئی گناہ کا کام ہو جائے تو سمجھو کہ پہلی نیکی مردود ہے، لیکن اگر گناہ بھی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوں کہ یہ یقین رکھیں کہ ہمارا رب غفور ورحیم ہے۔

جتنے بھی بندے ہیں اگر ہمارے سارے گناہ بھی اکٹھے کر لیے جائیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ایک قطرے کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ جب وہ بخشنے پر آئے تو کوئی دیر نہیں لگے گی، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔ مومن لاکھ گناہ گار ہو، لیکن اُس کی رحمت پر یقین ہوتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں جاؤں گا، اللہ پاک مجھے معاف فرما دیں گے۔ اس لیے ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار سمجھنا چاہیے اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۰۳]

"اور اللہ کو یاد کرو گنتے ہوئے (ایام تشریق کے تین) دنوں میں اور جس نے جلدی کی دوسرے دن میں تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے واپسی میں تاخیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم سب اس کے ہاں جمع ہو گے۔"

آیت کا شانِ نزول اور قیامِ منیٰ:

اس آیت مبارکہ میں ایک اور جاہلیت کی تردید ہے کہ ۱۰ تاریخ کو منیٰ میں آنے کے بعد بعض لوگ تو ۱۲ کو منیٰ

سے لازماً چلے جاتے تھے، یعنی ۱۰ کو بھی منیٰ میں اور ۱۱ اور ۱۲ کو بھی منیٰ میں اور ۱۲ کی شام کو منیٰ سے نکل آتے تھے۔ اور بعض لوگ ۱۳ کو بھی رہتے اور ۱۳ کی شام کو نکلتے۔ اب جو لوگ ۱۲ کو نکل آتے وہ کہتے کہ جو ۱۳ کو رہ رہے ہیں یہ گناہگار ہیں اور یہ لوگ بلا وجہ ۱۳ کو منیٰ میں رہ رہے ہیں۔ اور جو لوگ ۱۳ کو آتے وہ فتویٰ دیتے تھے کہ جو ۱۲ کو گئے ہیں انہوں نے بڑا گناہ کیا کہ حج کو نامکمل چھوڑ کر چلے گئے۔ تو اب ان قبائل میں جھگڑا ہوتا تھا کہ بارہ والے تیرہ والوں کو غلط کہتے اور تیرہ والے بارہ والوں کو غلط کہتے کہ یہ گناہ گار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ﴾ جو آدمی دو دنوں میں جلدی کرے یعنی ۱۲ کو کنکری مار کر چلا آئے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔ ﴿وَمَنْ تَاَخَّرَ﴾ اور جو آدمی دیر کر دے، تاخیر کر دے، یعنی تیرہ کو کنکری مار کر آئے ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ﴾ ان پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ رخصت ہے کہ اگر آپ ۱۲ کو آنا چاہیں تو آ سکتے ہیں اور اگر ۱۳ کو آنا چاہیں تو آ سکتے ہیں۔ اصل بات اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے اور اپنی طرف سے مسائل پیدا کرنا نہیں ہے۔

اب مسئلہ سمجھیں کہ جب آپ نے ۱۲ تاریخ کو کنکریاں مار لیں تو اب اسلام میں اجازت ہے کہ آپ واپس مکہ آجائیں، آپ کا حج الحمد للہ مکمل ہو گیا۔ لیکن علماء نے یہ فرمایا کہ اگر ۱۲ کا سورج منیٰ میں ڈوب جائے تو افضل یہ ہے کہ آپ ۱۳ کی کنکریاں مار کر آئیں اور اگر آپ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے حدِ منیٰ سے نکل گئے تو اب آپ کے لیے ۱۳ کے دن کی کنکریں مارنی ضروری نہیں ہیں۔ اور اگر ۱۳ کے دن میں کنکریاں ماریں تو زوال کے انتظار کی بھی ضرورت نہیں ہے، رات کو منیٰ میں رہ جائیں، صبح کو ۱۳ کے زوال سے پہلے ہی حسبِ سابق آپ تینوں جمرات کو کنکریاں مار کر واپس آئیں۔ لہٰذا قرآن مقدس نے بھی بات واضح فرما دی: ﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ﴾ کہ اگر وہ دو دنوں کے بعد یعنی ۱۰ کا دن تو یوم النحر یعنی عید کا دن ہو گیا، اس کے بعد دو دن ۱۱ اور ۱۲ ہوئے تو اگر وہ ۱۲ کو چلا آئے تو کوئی گناہ نہیں ہے اور ﴿وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ﴾ اگر کوئی شخص ۱۳ کو بھی رک جائے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ جاہلیت والے جو ایک دوسرے پر غلط الزام لگاتے ہیں کہ ۱۲ کو آنے والے گناہ گار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ۱۳ کو رہنے والے گناہگار ہیں، یہ غلط بات ہے۔

اور آخر میں اللہ تعالیٰ نے پھر ہدایت کی: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾۔ اصل بات یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ کا ڈر دلوں میں پیدا کرو۔ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ کہ جان لو! سب نے اسی کی طرف اٹھنا ہے اور جمع ہونا

ہے۔تو وہ رب کریم جس نے تمہیں عرفات میں جمع کیا، جس نے تمہیں مزدلفہ میں جمع کیا اور جس نے تمہیں منیٰ میں جمع کیا اسی طرح وہ تمہیں دوبارہ میدانِ حشر میں جمع کرے گا۔ اس حشر والے دن کو سامنے رکھو، پرہیزگاری اختیار کرو، چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑے نہ کرو اور ہر وقت اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے اندر مشغول رکھو؛ کیونکہ ذی الحجہ کے دس دن بڑے مبارک دن ہیں، یعنی انسان کو اعمالِ صالحہ کا ان دس دنوں میں جو ثواب ملتا ہے وہ کسی اور دنوں میں نہیں ملتا، لہٰذا ہر آدمی کو چاہیے کہ جب ایامِ حج آجائیں تو ان کے لیے پوری پوری تیاری کرے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''أَيَّامٍ مَّعْدُودٰتٍ'' سے مراد ذی الحجہ کے دس دن ہیں اور یہ ایامِ تشریق ''أَيَّامٍ مَّعْدُودٰتٍ'' ہیں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان دنوں کے اندر اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو، جیسے ہر نماز کے بعد ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ'' یہ ''تکبیراتِ تشریق'' کہی جاتی ہیں، اسی کا نام اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

ایامِ تشریق اور ایامِ قربانی:

امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''يَوْمُ عَرَفَةَ وَ يَوْمُ النَّحْرِ وَ أَيَّامُ التَّشْرِيْقِ عِيْدُنَا أَهْلَ الْإِسْلَامِ، وَهِيَ أَيَّامُ أَكْلٍ وَ شُرْبٍ وَ ذِكْرُ اللّٰهِ'' عرفات کا دن نحر، یعنی دسویں کا دن اور ایامِ تشریق، یعنی: گیارہ بارہ اور تیرہ، ہمارے مسلمانوں کے لیے عید کے دن ہیں۔ یہ دن اللہ تعالیٰ نے ہماری خوشی اور عید کے دن بنائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دن مسلمانوں کے کھانے اور پینے کے لیے بنائے ہیں کہ ہر غریب کے گھر بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے گوشت پہنچ جاتا ہے۔

آپ ﷺ نے عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو ایامِ تشریق کے دن بھیجا۔ انہوں نے اونچی آواز میں صدا لگائی: ''إِنَّ هٰذِهِ أَيَّامُ أَكْلٍ وَ شُرْبٍ وَ ذِكْرُ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ كَانَ عَلَيْهِ صَوْمٌ مِنْ هَدْيٍ'' کہ یہ کھانے اور پینے کے دن ہیں۔ ہاں اس شخص کو اجازت ہے جس نے قربانی کے بدلے روزہ رکھنا ہے، یعنی اگر کوئی بکری نہیں دے سکا تو اس کے لیے آپ ﷺ نے پڑھا تھا: ﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ﴾ کہ تین دن ایامِ حج میں روزہ رکھے اور سات دن بعد میں روزہ رکھے۔

اس میں افضل تو یہ ہوتا ہے کہ چھ، سات اور آٹھ کو روزہ رکھ لے، لیکن اگر کوئی آدمی پہلے روزہ نہیں رکھ سکا تو بعض ائمہ کرام کے نزدیک ایامِ تشریق میں بھی اس کو اجازت ہے کہ وہ گیارہ، بارہ اور تیرہ کو روزہ رکھ کر اپنے تین روزے پورے کرے۔ صرف اس کے لیے اجازت ہے، ورنہ کسی کو بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ ان ایام میں روزہ رکھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین دن ہیں: ایک دس کا دن اور دو دن بعد میں، یعنی گیارہ اور بارہ۔ ان تین دنوں میں جب چاہو ذبح کرلو، لیکن افضل یہ ہے کہ پہلے دن ذبح کرو، لیکن مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلا قول زیادہ مشہور ہے کہ دسویں کا دن اور اس کے بعد تین دن: گیارہ، بارہ اور تیرہ۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول زیادہ مشہور ہے اور آیت سے بھی تقریباً یہی واضح ہوتا ہے۔ اور علماء کرام نے یہ بھی فرمایا کہ تین دن میں ذکر سے مراد یہ ہے کہ جب آدمی اپنی قربانی کا جانور ذبح کرتا ہے تو کہتا ہے: ''بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

اسی طرح تشریق کی تکبیریں، جو ہم نے ہر نماز کے بعد کہنی ہیں، بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ صبح کی نماز عرفات والے دن، یعنی نویں تاریخ کو آدمی شروع کرے اور ایامِ تشریق کے آخری تین دن، یعنی تیرہ تاریخ کی عصر کو ختم کردے۔

ایک حدیث بھی اس کے بارے میں آئی ہے، لیکن اس کا مرفوع ہونا ثابت نہیں ہے کہ سیدنا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جب اپنے خیمہ میں کھڑے ہو کر تکبیر کہتے تھے تو باقی خیمے والے لوگ جب سنتے تھے تو وہ بھی سب کے سب اپنے خیموں میں تکبیر کہتے: ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' اور پورا منیٰ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کی تکبیروں سے گونج اٹھتا تھا۔

اور اسی طرح جب آپ کنکریاں ماریں گے تو ہر کنکری کے ساتھ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کہیں گے۔ یہ بھی ذکر ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے طواف اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا مقرر فرمایا اور اسی طرح کنکریاں مارنا مقرر کیا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر قائم ہو اور ہر حال میں آدمی ذاکر و شاکر ہو۔ جتنا ذکر میں آگے بڑھو گے اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنا ہی تقرب زیادہ ہوجاتا ہے۔ جب آدمی حج کے تمام افعال پورا کرنے کے بعد منیٰ میں آگیا، اس نے یوم النحر بھی گزار لیا، کنکریاں بھی مارلیں اور اب ۱۲ اور ۱۳ کو فارغ ہوکر اپنے ملک واپس لوٹ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تقویٰ اختیار کرو۔ تم سب نے لوٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف جانا ہے، ایسا نہ ہو کہ حج پڑھنے کے بعد اس کے دل میں کوئی تکبر پیدا ہوجائے کہ میں تو جناب! حاجی ہوگیا ہوں، نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۗ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾

[البقرۃ: ۲۰۴، ۲۰۷]

’’اور ایک وہ شخص ہے کہ اس کی بات دنیا کی زندگی کے کاموں میں آپ کو بہت پسند آتی ہے اور وہ اللہ کو اپنے دل کی بات پر گواہ بناتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور جب وہ (آپ ﷺ سے) پھر کر جاتا ہے تو زمین میں فساد کرتا ہے اور کھیتیاں اور جانیں ہلاک کرتا ہے۔ اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے کہا جائے اللہ سے ڈرو تو اس کو غرور گناہ پر کھینچ لاتا ہے۔ اس کو جہنم کافی ہے اور وہ بری آرام گاہ ہے۔ اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی میں بیچتا ہے (اور کھپاتا) ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔‘‘

شانِ نزول اور منافق کا معنی:

اس آیت میں مخلصین اور منافقین کا نمونہ بیان کیا ہے کہ ایک تو خالص مسلمان ہے اور ایک منافق ہے، لیکن یاد رکھیں کہ ایک تو منافقوں کی وہ جماعت ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے وہ تو عقیدے کے منافق تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہراً کلمہ پڑھتے تھے اور اندر کلمہ نہیں تھا، بلکہ پکے کافر تھے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝﴾ [المنافقون: ۱]

جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں: آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ کہنے والے جھوٹے ہیں، زبان سے کہہ رہے ہیں اور اندر ایمان اسلام وغیرہ کوئی نہیں ہے۔ یہ منافق حضور اکرم ﷺ کے مطلق اعتقادی منافق تھے، یعنی

عقیدے کے منافق تھے، یعنی ظاہراً زبان پر کلمہ ہے اور اندر سرے سے ایمان ہی نہیں ہے۔

کسی کو کافر و منافق کہنے میں احتیاط:

اور ایک وہ منافق ہیں جو موجودہ دور میں ہیں یا حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے بعد کے منافقین ہیں۔ آپ ﷺ کے زمانے میں تو قرآن کا نزول اور وحی کا اترنا تھا، اللہ پاک اپنے پیغمبر ﷺ کو بتا دیتے تھے کہ یہ منافق ہیں۔ لیکن ہمیں تو پتہ نہیں چل سکتا کہ کون مومن اور کون منافق ہے؟ کیونکہ دلوں کے بھید کو جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اب علماء نے فرمایا کہ ہم اس طرح کا فیصلہ تو کسی کے بارے میں نہیں کر سکتے کہ یہ منافق ہے یا یہ کافر ہے؛ کیونکہ ہمیں لوگوں کے دلوں کا کیا پتہ؟ یہی وجہ تھی کہ پہلے لوگ کفر کا فتویٰ دینے میں احتیاط کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ہم کسی کو کافر کہہ بیٹھیں اور اللہ کے ہاں وہ کافر نہ ہو تو یہ بہت بڑا جرم ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور اس نے آکر کہا کہ اے علی! خوارج کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟...... حالانکہ خارجی بڑا گمراہ فرقہ ہے۔ اللہ کے قرآن کو بدل ڈالا، اہلِ بیتِ رسول کے دشمن ہیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگیں لڑتے رہے اور...... نعوذ باللہ...... سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مسلمان ماننے کو بھی تیار نہیں تھے۔ اتنا بڑا فتنہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے باقاعدہ جنگیں لڑیں، لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ خوارج کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ وہ کافر ہیں یا مسلمان؟...... آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''هُمْ مِنَ الْكُفْرِ فَرُّوْا'' کہ وہ کفر کی طرف سے تو اسلام کی طرف بھاگ کر آئے ہیں، ان کو کافر کیسے کہہ دوں؟...... پوچھنے والا بھی سمجھدار تھا...... عرض کیا: اگر وہ کافر نہیں تو منافق ہوں گے؟ ''ءَ هُمْ مِنَ الْكُفَّارِ أَمْ هُمْ مِنَ الْمُنَافِقِيْنَ؟'' تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ منافق بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ منافق بھی نہیں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جی ہاں! وہ منافق بھی نہیں ہیں۔ ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٤٢﴾﴾ [النساء: ۱۴۲] کہ منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہے تو تھوڑا سا۔ لیکن ان کی زبانیں تو ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر ہیں۔ تو میں ان کو کیسے منافق کہہ دوں کہ یہ تو ہر وقت قرآن پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں؟ تو انہوں نے کہ عجیب بات ہے کہ کافر بھی نہیں اور منافق بھی نہیں تو پھر آپ رضی اللہ عنہ جنگیں بھی لڑ رہے ہیں، تلواریں بھی چل رہی ہیں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اِخْوَانُنَا بَغَوْنَا فَاتَلُوْنَا قَتَلْنَاهُمْ''۔ تھے تو

ہمارے بھائی، کلمہ پڑھنے والے، لیکن ہمارے خلاف تلوار اٹھائی تو ہم نے بھی تلوار اٹھالی ہے تو کیا کریں؟ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی احتیاط تھی کہ چونکہ ان سے دشمنی تھی، ان کے ساتھ قتال تھا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اتنی احتیاط کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا فتویٰ غصہ دشمنی کی بنا پر تصور کرلیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جھگڑا تھا، اس لیے ان کو کافر کہہ دیا تھا۔ اتنی احتیاط کرتے تھے۔

نفاقِ اعتقادی و نفاقِ عملی کا بیان:

اب بھی علماء کرام نے فرمایا کہ وہ منافق اعتقادی تو تقریباً باقی نہیں رہے۔ اب منافق ہیں، لیکن نفاقِ عملی والے منافق ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زبان پر کلمہ ہے اور کام کافروں والا ہے۔ مثلاً: نماز نہیں پڑھتے۔ پس نماز نہ پڑھنا یہ تو کفر کی علامت ہے۔ اس لیے صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ جو آدمی جماعت میں نہیں آیا تو ہم یہ اندازہ کر لیتے تھے کہ یا تو وہ بیمار ہے یا وہ منافق ہے۔

اب ایک آدمی تقریر تو لچھے دار کرتا ہے، اسلام اسلام کی آوازیں لگاتا ہے۔ جب نماز کا وقت آئے تو نماز غائب، زکوٰۃ کا وقت آئے تو زکوٰۃ غائب، صدقات کا وقت آئے تو صدقات غائب، حج کا وقت آئے تو حج غائب، بلکہ بیٹھ کر ایسی ایسی باتیں بھی کرتا ہے کہ ہمیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولویوں کا فلسفہ کہ بیس لاکھ آدمیوں کو منیٰ میں لے جاتے ہیں، ایک بکری بھی لگالو تو بیس لاکھ بکری ذبح کر کے پھینک دیتے ہیں۔ یہ کوئی عقل کی بات ہے کہ اتنا بڑا پیسہ ضائع کر دیا جاتا ہے۔ الٹا اسلام کے خلاف محاذ اور ٹھٹھا بناتے ہیں تو ان جیسے لوگوں کے بارے میں علماء کرام نے فرمایا کہ ان لوگوں کا نفاق نفاقِ عملی ہوگا کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا عمل تو منافقوں والا ہے۔ اسلام کا نام لیتا ہے اور کام کافروں والا کرتا ہے۔

ایک منافق کا واقعہ:

ایک منافق کا واقعہ پیش آیا کہ اخنس بن شریک ایک آدمی تھا۔ وہ بڑی لچھے دار تقریریں کرتا تھا، بڑا فصیح اللسان تھا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتا تو بس جناب! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر صدقے قربان ہو جاتا کہ حضور! میں تو غلام ہوں اور میں تو جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر نظر نہ پڑے تو مجھے چین نہیں ملتا۔ اور ایسی ایسی باتیں کرتا کہ سننے والے حیران ہو جاتے کہ یہ تو بالکل پکا عاشقِ رسول ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے مدنی! اس

کے دل کی کیفیت کا میں گواہ ہوں کہ یہ تو جھگڑالو اور دشمنِ اسلام ہے کہ جب آپ سے باہر جاتا ہے تو فساد کرتا ہے۔ ظاہراً تو آکر بڑی لچھے دار تقریریں کرتا ہے کہ ہم حضور پاک ﷺ پر قربان ہیں، لیکن اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾

[البقرة:۲۰۴]

اے میرے مدنی! بعض لوگ ایسے ہیں کہ جن کی باتیں آپ کو دنیوی زندگی میں بڑی اچھی لگتی ہیں اور پسند آتی ہیں۔ اور اللہ پاک گواہی دیتے ہیں کہ اس کے دل میں نفاق ہے اور وہ سخت جھگڑالو قسم کا آدمی ہے۔ یہ جھگڑالو اور فتنہ پرور ہے۔ صرف زبانی گفتار کے ذریعے آپ کی خدمت میں آکر ایسی باتیں کرتا ہے۔ یہ مخلص مسلمان نہیں ہے، بلکہ اس کا ایمان ہی نہیں ہے:

﴿وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ [البقرة:۲۰۵]

جب آپ سے یہ پھر کر جاتا ہے، آپ سے اعراض کر کے واپس جاتا ہے، یہ تو اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور یہ تو زراعت، نسل، یعنی مال مویشی کو تباہ و برباد کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔ یہ تو فسادی ہے، یہ تو موقع کی تلاش میں ہوتا ہے کہ اگر مسلمان کے مال مویشی مل جائیں تو انہیں مار ڈالتا ہے، مسلمانوں کے باغات مل جائیں تو ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کا پانی کاٹ دیا جائے۔ اس لیے کہ منافق کا تو معنی یہی ہے کہ جس کے دو رخ ہیں کہ ایک رخ ادھر ہے اور ایک رخ ادھر ہے۔ ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾ [البقرة:۱۴] یہ منافق ایسے ہیں کہ جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو پکے ایمان والے ہیں اور جب واپس چلے جائیں اور کافروں میں جا کر جماعت میں علیحدہ بیٹھیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو مسلمانوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں، ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ ہمارا ایمان سے کیا تعلق ہے؟ ہم تو ویسے ہیں ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان اقتدار پر آجائیں تو ہم فائدہ اٹھا لیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے اور اصل میں تو ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔

﴿وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾ [البقرة:۲۰۴]

یہاں سے یہ مسئلہ پتہ چلا کہ دل کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ جب اللہ پاک اپنے نبی ﷺ کو خبر نہ دیدے کہ میرا

مدنی بھی ظاہری بات سن کر اچھے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے خیر خواہ اور ٹھیک لوگ ہیں کہ یہ نماز کلمہ وغیرہ پڑھ رہے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے مدنی! آپ تو ظاہری بات جانتے ہیں، لیکن دلوں کا علم تو ہمارے پاس ہے۔ علمِ غیب اور دلوں کا بھید جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

''اَلَدُّ الْخِصَامِ'' جو انتہائی جھگڑا کرنے والا ہو تو اس کو عربی میں ''اَلَدُّ الْخِصَامِ'' کہتے ہیں۔

''وَاِذَا تَوَلّٰی'' جو آدمی لوگوں میں فساد مچائے، جو آدمی لوگوں کے کھیتوں کو برباد کرے اور جو آدمی لوگوں کے مال کو تباہ کرے تو سمجھ لو کہ وہ منافق ہے۔ کبھی بھی مسلمان ایسا نہیں کر سکتا۔

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ جب اس منافق کو کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو اس کا غرور اس کو اور گناہوں کی طرف دھکیلتا ہے کہ اچھا تم مجھے سمجھاتے ہو کہ میں غلط ہوں؟ اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے مدنی! فکر نہ کرو۔ بس اسے جہنم ہی کافی ہے، ان کا علاج آگ ہے۔ اور یہ کتنا برا ٹھکانہ ہے اور کتنا برا بچھونا ہے کہ نیچے سے بھی آگ اور اوپر سے بھی آگ۔ اور آگ بھی...... نعوذ باللہ...... جہنم کی تہہ کی آگ۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو جہنم سے بچائے۔

ایمان والے کی نشانی:

یہ تو منافق کی کہانی تھی اور اس کے مقابلے میں ایک بڑے ایمان والے مومن بندے کی بات بتاتے ہیں:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ [البقرۃ: ۲۰۷]

بعض لوگوں میں جو مومن بندے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنی جان بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں وہ مومن ہیں کہ جن کو جان کی بھی فکر نہیں ہے۔

محدثین اور مفسرین کرام رحمہم اللہ نے یہاں پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس، حضرت انس، حضرت سعید بن المسیب اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بہت بڑی جماعت فرماتی ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری ہے۔ حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت فرماتے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ جب مکہ شریف سے باہر گئے تو کفار قریش اکٹھے ہو گئے۔ ان کو پتہ چل گیا کہ صہیب جا رہا ہے۔ انہوں نے گھیر لیا کہ ہم تم کو نہیں جانے دیں گے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے ترکش سے سارے تیر نکالے، کمان ہاتھ میں لی اور آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے قریشیو!

جہاں کھڑے ہو وہیں کھڑے ہو جاؤ۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اے قریشیو! تم جانتے ہو کہ میں کتنا بڑا تیرانداز ہوں، میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ اور مجھے اس رب جلال کی قسم ہے جس کا میں نے کلمہ پڑھا ہے! جب تک ایک بھی تیر میرے ترکش میں باقی ہے تم میرے قریب نہیں آسکتے۔ اس کے بعد پھر میں تلوار سے لڑوں گا۔ جب تک میری زندگی ہے میں لڑوں گا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا دین قبول کیا ہے، میں اس سے کسی شکل میں ہٹ نہیں سکتا۔ اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو آؤ اور ایک تجارت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے جو ساری زندگی کمایا ہے وہ سارا کا سارا مکہ میں ایک جگہ دفن کر دیا ہے کہ جب مجھے موقع ملے گا، جب میں مکہ آؤں گا تو اپنی دولت نکال لوں گا، لیکن تم جو دنیا کے بھوکے ہو تو آج میرے ساتھ تجارت کا فیصلہ کرو۔ میرا راستہ چھوڑ دو، میں تمہیں اپنے مال کی جگہ بتا دیتا ہوں، تم جا کر دولت نکال لو۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں قبول ہے۔ آپ ہمیں جگہ بتا دیں، ہم آپ کا مال لے لیں گے اور آپ جائیں۔ انہوں نے کہا کہ فلاں جگہ میں نے مال دفن کیا ہے۔ تو ساری زندگی جو کمایا تھا وہ ان کو بتا دیا۔ انہوں نے جا کر سارا مال نکال لیا۔ جب آپ ﷺ کو اس بات کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''رَبِحَ یَا صُهَيْبُ! رَبِحَ یَا صُهَيْبُ!'' اے صہیب! تیرا سودا بڑا کامیاب ہو گیا۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے مدنی! دیکھو کہ سب کچھ لٹا کر آ گیا ہے کہ ساری زندگی کی کمائی جانے دی۔

اس سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ سامنے قریش ہیں، قاتل ہیں، لیکن ان کو بھی پتہ ہے کہ صہیب مسلمان ہے، جھوٹ نہیں بولے گا۔ دیکھو جی کہ اگر آپ کو کوئی کہے تو آپ تو حرم شریف میں بھی تین جگہ جھوٹ بول کر اپنا خزانہ چھپا لیں گے، لیکن وہ دشمن اور کافر ہیں، لیکن جانتے ہیں کہ صہیب جھوٹ نہیں بول سکتا۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ تم یہاں کھڑے رہو، ہم تمہیں گرفتار کرتے ہیں۔ اور ہمارا آدمی جائے گا، پہلے مال نکال لے گا۔ پتہ نہیں کہ تم صحیح کہہ رہے ہو یا غلط کہہ رہے ہو؟ تم ہم سے نکل جاؤ اور ادھر مال بھی نہ نکلے۔ بلکہ ان کو پتہ تھا کہ کلمہ پڑھنے والے کی زبان کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔

ابوجہل سے بڑا بھی کوئی دشمن ہے!؟ ایک مرتبہ طواف کر رہا تھا۔ اس کا ایک دوست اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ مکہ میں کوئی نبی پیدا ہوا ہے، جس کا نام محمد (مصطفیٰ ﷺ) ہے، کیا آپ اس کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ وہ تو ہمارے خاندان کا آدمی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ کیا وہ نبی سچا ہے؟ ابوجہل نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کے بعد بولا کہ سنو! ہے تو سچا، یعنی طواف کرتے ہوئے ابوجہل بھی جھوٹ نہ

بول سکا اور مسلمان؟ خود فیصلہ کرلو۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾
[البقرۃ:۲۰۸، ۲۰۹]

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ پھر اگر تم واضح دلائل آ جانے کے بعد پھسل گئے تو جان لو! اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

اسلام کی مکمل اتباع کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے مومنین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے۔ یہاں پر لفظ ''سلم'' ''سِلْمٌ'' یا ''سَلْمٌ'' دونوں کا معنی ملتا جلتا ہے۔ اس کا معنی صلح میں بھی آتا ہے اور اسلام میں بھی آتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ [الانفال:۶۱] اے میرے نبی! کافر صلح کی طرف نرم ہوں تو آپ بھی نرم ہو جائیں اور صلح کر لیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں۔ ''سَلْمٌ، سِلْمٌ، سَلَامٌ'' اور ''اِسْلَامٌ'' سب کا مادہ سلامتی سے ہے۔ اسلام بھی اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا جامع مانع، کامل اور مکمل دین ہمیں عطا فرمایا ہے کہ جو اپنے اندر ہر قسم کی سلامتی رکھتا ہے۔ پس یہاں پر لفظ ''سِلْمٌ'' ہے، ''سَلْمٌ'' نہیں تو یہاں پر مراد جمہور مفسرین کے نزدیک اسلام ہے۔ اور ''كَآفَّةً'' کا معنی ''جَمِيْعًا'' ہے۔

لیکن مفسرین کرام ﷭ نے اس کے دو ترجمے کیے ہیں: ایک ترجمہ تو یہ ہے کہ اللہ پاک نے حکم دیا ہے کہ اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہونے کا کیا معنی ہے؟ یوں سمجھو کہ اگر کسی آدمی کے اعضاء و جوارح تو اسلام کی تابعداری کر رہے ہیں، لیکن دل و دماغ مطمئن نہیں ہیں، یعنی جیسے انسان نماز بھی پڑھ رہا ہے، روزہ بھی رکھ رہا ہے، زکوٰۃ بھی دے رہا ہے اور اچھے کام بھی کر رہا ہے، لیکن بعض مسائل میں اس کے دل و دماغ مطمئن نہیں ہے۔ جیسے...... نعوذ باللہ...... آج کل بڑے بڑے لوگوں کی اکثریت ایسی ہے کہ نماز بھی ہے اور روزہ بھی ہے، لیکن سود کے مسئلہ میں وہ دل و دماغ کے ساتھ مطمئن نہیں ہیں۔ وہ

کہتے ہیں کہ جی! سود کے بغیر تو کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ یا ایک آدمی نماز بھی پڑھتا ہے، روزہ بھی رکھتا ہے، قرآن پاک بھی پڑھتا ہے، چومتا ہے اور بڑا احترام کرتا ہے، لیکن اس کا دل و دماغ اس بات پر مطمئن نہیں ہوتا کہ چودہ سو سال کے بعد آج بھی اسلام کے قوانین لاگو ہو سکتے ہیں۔ وہ مطمئن نہیں ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام میں پورا پورا داخل نہیں ہوا۔

اللہ پاک نے حکم دیا کہ اسلام میں داخل ہوتے ہو تو پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، یہ نہیں کہ دل و دماغ سے تو سمجھتا ہو کہ اسلام ایک سچا مذہب ہے، کلمہ بھی پڑھتا ہے، لیکن نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا، حج نہیں کرتا اور زکوۃ نہیں دیتا اور جب پوچھو تو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور مجھے حضور اکرم ﷺ سے بڑی محبت ہے، کعبۃ اللہ سے بڑی عقیدت ہے اور مدینہ منورہ سے بڑا پیار ہے، لیکن نہ نماز اور نہ روزہ۔ تو یہ بھی اسلام میں پورے کا پورا داخل نہیں ہوا کہ زبان اور دل و دماغ میں تو اسلام ہے، لیکن اعضاء و جوارح اسلام پر دلالت نہیں کر رہے۔ اس لیے اللہ پاک نے حکم دیا: اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے۔ یعنی تمہارا دل و دماغ، اعضاء و جوارح، قلب و نظر اور فکر و یقین سب اسلام کو کامل طور پر ماننے بھی اور جانے بھی اور عمل بھی کرے۔

اسلام اور ایمان کیا ہے؟

اسلام اور ایمان کی جامع ترین تعریف یہ ہے کہ دل میں بھی تصدیق ہو اور زبان پر بھی اقرار ہو اور اعمال اور ارکان اور جوارح بھی گواہی دیں، تب اسلام مکمل ہوگا۔ دل میں بھی اسلام پر عین پکی تصدیق ہے اور زبان پر بھی شہادتین ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کا اقرار ہے، جوارح اور ارکان، یعنی سر سے لے کر پاؤں تک سب اس کے مطابق عمل کر رہے ہیں تو اب اسلام مکمل اسلام ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ہم اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔

اور بعض علماء کرام نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا کہ ہم اسلام کو پورا پورا مان لیں۔ یہ نہیں کہ اسلام کے کچھ احکام تو مان لیں اور کچھ احکام نہ مانیں۔ اگر اپنی بیٹیوں کو جائیداد میں سے حصہ دینا پڑے تو اب جناب! ہم قرآن کا حکم نہ مانیں، اگر ہمیں سال بعد زکوۃ دینی پڑے تو اب ہم بہانے بنائیں اور اگر ہمیں زمین کا عشر دینا پڑے تو اب ہم بہانے بنائیں کہ جناب! ہم تو اتنا ٹیکس دیتے ہیں، ہمارے اوپر اتنے ٹیکسز ہیں۔ اور فلاں چیز اتنی مہنگی ہو گئی تو اب ہم

وہ ٹیکس ادا کریں یا زکوۃ ادا کریں؟

اور اسی طرح بعض آدمی سارے اسلام کو مانتے ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ اسلام نے معاشی مسئلہ حل نہیں کیا، یا اسلام نے ہمیں نظامِ حکومت چلانے کے بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی، یا اسلام نے ہماری اس بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی کہ ہمارے سیاسی مقاصد کیا ہونے چاہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو پورا تسلیم نہیں کیا کہ ہم نے اسلام کی کچھ باتیں مانی ہیں اور کچھ نہیں مانی۔ فرمایا کہ اسلام اس طرح مکمل نہیں ہوتا، بلکہ اسلام کو پورے کا پورا مانو، یعنی ''الف'' سے لے کر ''یاء'' تک اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی احکام ہیں، اللہ تعالیٰ شریعت ہے اور اوامر ونواہی ہیں سب پر ایمان رکھو۔ اور ایمان بھی ایسا کہ پھر دل میں کوئی الجھن باقی نہ رہے۔

ایک تو یہ ہے کہ آدمی یہ کہے کہ چلو جی! ہم مسلمان ہیں، کیا کریں کہ جی! آخر قرآن پاک کا انکار تو نہیں کر سکتے، لیکن جناب! دل مطمئن نہیں ہوتا کہ اسلام نے ایک مرد کو چار عورتوں کے ساتھ شادی کی اجازت دی ہے۔ یہ بات کوئی دل کو لگتی نہیں ہے۔ یورپ کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر کبھی وہ تعددِ ازدواج پر اعتراض کرے اور کبھی یہ اعتراض کرے کہ جناب! ٹھیک ہے کہ سود حرام ہے، لیکن یہ اس زمانے کا سود ہے جو مہاجنی سود تھا۔ اب تو دونوں طرف سود ہوتا ہے، بینک دیتے بھی ہیں اور لیتے ہیں بھی ہیں۔ یہ تو تجارت ہے، سود تو نہیں ہے۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اس طرح تمہیں مسلمان کہلانے کا حق نہیں پہنچتا۔

عمل میں ناقص مسلمان:

جیسے علماء کرام نے ہمیں مثال سے یہ بات سمجھائی ہے کہ ایک آدمی بڑا خوبصورت ہو، لیکن آنکھ ایک ہو تو آپ کہیں گے کہ بے چارہ کانا ہے۔ اور ایک آدمی بے انتہا خوبصورت ہو، لیکن ٹانگ ایک ہو تو آپ کہیں گے کہ یہ لنگڑا ہے۔ اور ایک آدمی بہت خوبصورت ہو، لیکن اس کا دماغ کام نہیں کرتا تو آپ کہیں گے کہ یہ پاگل ہے۔ دونوں آنکھیں کام نہیں کرتیں تو آپ کہیں گے کہ یہ اندھا ہے۔ اسی طریقہ سے آج کل ہمارا جو حال ہے وہ یہی ہے کہ ایک آدمی نماز تو پابندی سے ادا کرتا ہے، لیکن زکوۃ نہیں دیتا۔ اور ایک آدمی نماز بھی پابندی سے پڑھتا ہے اور زکوۃ بھی پابندی سے دیتا ہے، لیکن حج کی بات کرو تو کہتا ہے کہ جی! سمجھ میں نہیں آیا، کیا ضرورت ہے کہ آدمی سال بعد جا کر لاکھوں روپے خرچ کر دے؟ غریبوں مسکینوں کو دے دو، کسی غریب مسکین کی مدد کر دو، کسی بچی کی شادی کرا دو اور

کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم حج پر ہی جائیں۔ اسی طرح ایک آدمی نماز بھی پڑھتا ہے، روزے بھی رکھتا ہے، حج بھی کرتا ہے اور زکوۃ بھی دیتا ہے، لیکن سارا کاروبار سود پر ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے ایک آدمی ہاتھ نہ ہو، ٹانگ نہ ہو اور آنکھ نہ ہو تو جیسے وہ اندھا، کانا اور لنگڑا ہوتا ہے۔ ہمارا اسلام بھی اسی طرح اندھا اور کانا ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی لنگڑا ہے، کوئی اندھا ہے، کوئی کانا ہے اور کوئی دیوانہ ہے۔ صحیح معنی میں اسلام پر چلنا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے کہ تمام احکام پر عمل ہو جائے۔

اب آپ دیکھیں کہ بہت سے لوگ اسلام پر بھرپور کاربند ہیں، لیکن بیٹھ کر کبھی اس کا گلہ، کبھی اس کی غیبت شروع کر دیتے ہیں۔ اور پھر اگر اللہ تعالیٰ کے حرم میں ہوں تو اور بعض لوگ ہر لحاظ سے پکے مسلمان ہوتے ہیں، لیکن گھر کے اندر نہ نماز، نہ روزہ، نہ پردہ، نہ شرافت اور نہ شرم، اور باہر...... ماشاء اللہ...... نماز اور روزہ سب کچھ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ابھی پورے کے پورے اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔

شانِ نزول:

اس پر مفسرین نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دیگر لوگ تھے، بعض یہودیوں کے بڑے بڑے علماء جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام میں داخل کر دیا رضی اللہ عنہم۔ جب وہ اسلام میں آگئے تو ان کے ذہن میں ایک وسوسہ داخل ہو گیا کہ جب ہم یہودی مذہب پر تھے تو ہم ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے اور اونٹ کے گوشت کو حرام سمجھتے تھے؛ اس لیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کر دیا تھا تو ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جب یہودیت میں ہفتہ کے دن کی تعظیم موجود ہے اور اسلام میں ہمیں یہ حکم نہیں ملا کہ اسلام کی تعظیم کرو۔ اسی طرح جیسا کہ یہودیت میں ہم اونٹ کے گوشت کو حرام سمجھتے تھے اور اسلام میں ہمیں اونٹ کا گوشت کھانا فرض قرار نہیں دیتا تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم اسلام لانے کے بعد بھی ہفتہ کی تعظیم کریں اور اونٹ کا گوش بھی نہ کھائیں تو کیا حرج ہے؟ جب ذہن میں یہ وسوسہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی کہ اے میرے مدنی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ یہ نہیں کہ اپنے دماغ میں بیٹھ کر تاویلیں کرتے رہو اور اپنے دماغ میں بیٹھ کر دین کے مسائل خود گھڑتے رہو۔ اللہ پاک نے جب ایک چیز کو حلال کیا ہے، اس کے حلال کو عمداً چھوڑ دینا اس کے حلال ہونے کا انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ہم کو حکم دیا ہے کہ اس امت محمدیہ کے لیے سید الایام جمعہ کا دن ہے،

پھر ہفتہ کو وہی تعظیم دینا جو جمعہ کے دن کے برابر ہے، یہ کہنا کہ اسلام نے چونکہ منع نہیں کیا، یہ بات ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں اور اسلام کی پوری تعمیل کریں۔ اور اپنی طرف سے کوئی راستہ پیدا کر کے ذہن میں بلا وجہ تردد کو نہ آنے دیں۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ تم اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے راستے پر نہ چلو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

شیطان کی انسان سے عداوت:

سب سے بڑا دشمن شیطان ہے۔ پھر وہ کھلا دشمن ہے؛ اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک وہ ہمیں ہر قسم کی غلطیوں میں ڈالتا آیا ہے۔ اور کھلا اس لیے کہ اس نے کہہ دیا تھا: ﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝﴾ [ص: ۸۲، ۸۳] اے اللہ! مجھے تیری عزت وجلال کی قسم! میں تیرے سب بندوں کو گمراہی میں ڈال دوں گا، مگر جو تیرے خاص چنے ہوئے بندے ہیں ان پر میرا زور نہیں چل سکے گا۔ اس نے تو دشمنی کا کھلا اعلان کر دیا تھا اور اس کی دشمنی کوئی چھپی ہوئی تو ہے نہیں۔ اور یہ بھی کہہ دیا: ﴿ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۝﴾ [الاعراف: ۱۷] میں آگے سے بھی حملہ کروں گا اور پیچھے سے بھی حملہ کروں گا، دائیں سے بھی حملہ کروں گا اور بائیں سے بھی حملہ کروں گا۔ مطلب یہ ہے کہ میں بندوں کو زبان کے گناہوں میں مبتلا کر دوں گا، چہرے کے گناہوں میں مبتلا کر دوں گا، نظر کے گناہوں میں مبتلا کر دوں گا، ہاتھوں کے گناہوں میں مبتلا کر دوں گا، پاؤں کے گناہوں میں مبتلا کر دوں گا اور ہر طرف سے انہیں گناہوں میں گھیر لوں گا۔ اور میرے اللہ! تیرے بندوں کی اکثریت تیرا شکر کرنے والی نہیں ہوگی، بلکہ کفران (ناشکری) کرنے والی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ کبھی کبھی دین کے نام پر دھوکا دیتا ہے؛ اس لیے کہ شیطان کے حملے کرنے اور گمراہ کرنے کے راستے بھی عجیب ہوتے ہیں۔

شیطان کے گمراہ کرنے کے ڈھنگ:

دیکھیں! ایک عالمِ دین ہے اور وہ دین پڑھ رہا ہے تو شیطان اس کو اسی راستے سے دھوکہ دیتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں یہ بات ڈال دیتا ہے کہ تم تو بڑے مفسرِ قرآن ہو، تمہاری جو خدمات ہیں تمہارا تو مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ بس دماغ میں تکبر اور ریاء آیا اور سارا عمل برباد ہو گیا۔ کوئی آلِ رسول ہے تو اس کے دماغ میں یہ بات ڈال دی کہ

کوئی لاکھ عابد و زاہد بن جائے، لیکن نبی کی اولاد تو تم ہو۔ تم چاہے نماز بھی نہ پڑھو، تم آلِ رسول ہو، اس کو اس بات میں گمراہ کر دیا۔ دیکھیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے نبی پاک ﷺ نے کبھی نماز نہیں چھوڑی تو آلِ رسول کا کیا مطلب ہے کہ وہ نماز کو چھوڑ دے!؟ پس وہ (شیطان) کسی کو نسب کے اعتبار سے، کسی کو علم کے اعتبار سے اور کسی کو عبادت کے اعتبار سے گمراہ کر دیتا ہے۔ علماء کرام نے لکھا ہے کہ ابلیس کے ستر ہزار تو نورانی داؤ ہیں کہ ظاہر میں تو نورانی اور اچھی بات ہے، لیکن حقیقت میں گمراہ کرنے کا پھندا ہے۔

کیا آپ نے دیکھ نہیں لیا کہ چودہ سو سال کے بعد جہاد میں ایسے کارنامے انجام دے دیئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارنامے زندہ ہو گئے۔ اتنی بڑی قربانیاں دیں، اتنا بڑا کمال کیا اور اتنے بڑے اخلاص کے ساتھ جہاد کیا کہ جو واقعات ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق پڑھا کرتے تھے کہ کھانے کو بھی نہیں ملتا تھا، پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہوتے تھے، خندقیں بھی کھودتے تھے اور کفر کی طاقتوں کے ساتھ بھی لڑ رہے ہوتے تھے۔ عین وہی نقشہ پیش کیا کہ کھانا مل گیا تو ٹھیک ہے، نہیں ملا تو ٹھیک ہے۔ غاروں میں پڑے ہوئے ہیں، بم پھٹ رہے ہیں، نمازیں پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کو بھی یاد کر رہے ہیں اور عین اس مقام پر یعنی جب کامیابی کے آخری کنارے پر پہنچ گئے تو (شیطان نے ان کو) آپس میں لڑوا دیا تو شیطان تو ہمارا کھلا دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ خبردار! شیطان کے راستوں کی ہرگز پیروی نہ کرنا! کیونکہ شیطان کا کوئی ایک راستہ نہیں ہے۔ اور یہ بھی واضح فرما دیا کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾ [البقرة:۲۰۹] ''زَلَلْتُمْ'' کا معنی پھسلنا کہ اگر تم پھسل گئے اور راستے سے ہٹ گئے تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غالب بھی ہیں اور حکمت والے بھی ہیں۔ ان آیات میں کفار کے لیے تہدید ہے۔

﴿هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ [البقرة:۲۱۰]

''کیا لوگ یہی انتظار کرتے ہیں کہ ان پر اللہ بادلوں کے سائبانوں میں آئے اور فرشتے (بھی) اور (ان کی) ہلاکت کا فیصلہ ہو جائے؟ اور سب کام اللہ کی طرف لوٹتے ہیں۔''

﴿هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأْتِيَهُمُ﴾

میں نے اپنا مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ بھی بھیجا، قرآن پاک بھی اتارا، میں نے اپنے نبی کو معجزے بھی دیئے اور میں نے اپنے نبی کو کھلی نشانیاں بھی دے کر بھیج دیا، تاکہ کسی کو اسلام کی سچائی میں شبہ باقی نہ رہے، لیکن جو لوگ اب بھی اسلام نہیں لے آتے تو کیا وہ اس انتظار میں ہیں کہ میرا اللہ آئے؟ کیا وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب اللہ پاک بادلوں میں، سائبانوں میں اور ملائکہ کی جماعتوں میں خود تشریف لائیں گے فیصلہ کرنے کے لیے؟ کیا تم اس دن کا انتظار کر رہے ہو، یعنی قیامت کا؟

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق محفوظ ترین عقیدہ:

یادرکھو کہ قرآن پاک میں جہاں تک اللہ تعالیٰ کے آنے کا تعلق ہے کہ اللہ پاک تشریف لائیں گے یا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے چہرے کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہے، اس میں سب سے محفوظ طریقہ یہ ہے کہ ہمارا اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ اور تمام صفات پر ایمان ہے بغیر کسی تشبیہ کے، بغیر تمثیل کے اور بغیر کسی تکلیف کے۔ جو اللہ پاک نے فرمایا "آمَنَّا" (ہم اس پر ایمان لائے)۔ جیسے اس کی ذات کی کوئی مثل نہیں ہے، اسی طرح اس کی صفات کی بھی کوئی مثل نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ عرش سے آسمانِ دنیا پر تشریف لاتے ہیں اور جب رات کا آخری حصہ ہوتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ آسمانِ دنیا پر تشریف لاکر فرماتے ہیں: "هَلْ مِنْ سَائِلٍ؟ فَأُعْطِيَهُ" کیا ہے کوئی مانگنے والا جس کا میں سوال پورا کروں ہے؟ کوئی رزق مانگنے والا ہے؟ کوئی اولاد مانگنے والا ہے؟ اور کوئی خیرات مانگنے والا؟ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ رحمت والا وقت رات کا آخری حصہ ہے، یعنی رات کو اگر چھ حصوں میں تقسیم کر دو تو جو سدس الاخیر ہے، وہی رحمت کی گھڑی، تہجد کا وقت ہے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا وقت ہے۔ اب جب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر تشریف لاتے ہیں اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قضائے فصل کے لیے آسمانِ دنیا پر تشریف لائیں گے تو اب مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ پاک کا قرآن بھی حق ہے اور فرمانِ رسول بھی حق ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کیسے تشریف لاتے ہیں؟ تو اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی رحمت انسانوں کے بہت زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اس لیے علماء کرام نے فرمایا کہ آدمی کو یوں کہنا چاہیے کہ اے اللہ! تیری ذات اور صفات پر ہمارا ایمان ہے۔ جو تو نے اپنی صفات قرآن میں بیان فرمائی ہیں یا فرمانِ رسول میں بیان فرمائی ہیں، ہم اس کی کوئی مثال بھی نہیں دیں گے، کوئی تشبیہ بھی نہیں دیں گے اور انکار بھی نہیں کریں گے، بلکہ جو تو نے ذکر کیا اس پر ہمارا ایمان ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جیسے بعض لوگ انہی الجھنوں کا شکار ہو کر گمراہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصے میں تشریف لاتے ہیں۔ رات آخری حصہ تو ہر ملک کا علیحدہ ہے، جیسے مثال کے طور پر مکہ میں چار بجے ہیں تو پاکستان میں چھ بجے ہوں گے۔ اور کسی ملک میں ابھی دو ہوں اور کہیں آٹھ بجے ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ جی! رات کا آخری حصہ تو ہر ملک میں علیحدہ ہے، پھر اللہ پاک کس وقت تشریف لاتے ہیں؟ اور انہوں نے کہا کہ جب عرش سارے آسمانوں پر محیط ہے، جب کرسی سب آسمانوں سے بڑی ہے اور عرش کرسی سے بھی بڑا ہے اور تمام آسمانوں کو اس نے اپنے اندر لیا ہوا ہے تو آسمانِ دنیا پر تشریف لانے کا کیا مطلب؟ اور وہ لوگ الجھنوں میں پھنس گئے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز سے اعلیٰ اور بلند یعنی عرش پر ہیں تو جب وہ نیچے تشریف لے آئیں گے تو عرش ان کے اوپر آ جاتا ہے یا نیچے آتا ہے۔ یہ تمام بحثیں ایسی ہیں کہ انہی کی وجہ سے لوگ کفر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے قرآن سے ہٹ جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم انسان ہیں، بندے ہیں اور ہم ناقص العقل ہیں۔ میں اگر پرائمری پڑھا ہوا ہوں اور آپ مجھے ایم اے کا کوئی سوال کریں تو میں اس کو کیسے حل کر سکتا ہوں؟ جب ساری مخلوق کی عقول ناقص ہیں، ہم مخلوق ہیں تو خالق کے بارے میں ہم کیسے بحث کر سکتے ہیں؟ ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۖ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ﴾ [الانعام: ۱۰۳]۔

ہم تو ابھی تک مخلوق کی باتیں بھی نہیں سمجھ سکے۔ کتنے علماء پیدا ہوئے کہ ان کی کتابیں ابھی تک بھی نہیں سمجھی جا سکیں۔ یعنی آپ حیران ہوں گے کہ حضرت قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے ایک کتاب ''آبِ حیات'' لکھی ہے اور ایک کتاب ''تحذیر الناس'' لکھی ہے، اسی طرح ان کی اور کتابیں بھی ہیں جو کہ اردو میں لکھی ہوئی ہیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ بڑے بڑے علماء ان کی اردو کی لکھی ہوئی کتابیں بھی اگر دس مرتبہ پڑھ لیں تو ایک حصہ بھی سمجھ نہیں آتا جب تک کہ وہ اس آدمی سے نہ پڑھی جائے کہ جس نے خود اپنے استاذ یعنی حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے نہ پڑھا ہو، یعنی جس نے ان سے پڑھا اور سمجھا تھا، وہ تو سمجھا سکتا ہے؛ کیونکہ اس کے پاس تو وہ علم تھا کہ اس نے سمجھا دیا، لیکن صرف اس بنا پر کہ میں اردو پڑھا لکھا ہوں، سمجھ لوں گا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور آپ اندازہ کریں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری شریف لکھی اور اس کے ابواب لکھے۔ اب ان ابواب کے

تراجم ایسے ہیں کہ محدثین کی زندگیاں گزر گئیں کہ علماء کرام نے بخاری کے تراجم پر کتابیں لکھ ڈالیں، پھر بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ہم بخاری کے تراجم میں جو مقصد امام بخاری کے دل میں تھا اس تک پہنچے ہیں یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ تو ہمیں انسانوں کی لکھی ہوئی کتابیں سمجھ نہیں آتیں۔

بعض شعراء کے اشعار ایسے ہوتے ہیں...... اقبال کے اشعار نہیں دیکھتے کہ اس کے کلام کی کتنی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ اقبالیات پر کتنی اکیڈمیاں بن گئیں، مختلف لوگوں نے تشریحات کی ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی وہ کہتے ہیں کہ علامہ صاحب کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ اتنی محنت کے باوجود بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ صحیح معنوں میں علامہ صاحب کا بھی یہ مطلب اور مقصد تھا جو ہم نے بیان کیا ہے۔ تو اگر ہم بندے کا کلام سمجھنے سے قاصر ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ذات میں ایسی بحثیں کر کے نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم خود جہنم اور ہلاکت میں گر جائیں گے۔ ورنہ سیدھی بات ہے کہ اس کی ذات بھی بے مثل اور بے مثال ہے اور اس کی صفات بھی بے مثل اور بے مثال ہیں۔

﴿وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ [البقرۃ: ۲۱۰] سب کے سب کام اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ایمان لانا ہے تو دنیا میں ایمان لے آؤ۔ یہ دنیا دار العمل ہے۔ تم اس گھڑی کا انتظار کر رہے ہو جب قیامت آئے گی؟ وہ تو دار الجزاء ہے، پھر تمہارے ماننے یا نہ ماننے کا کیا فائدہ ہے؟ قیامت آنے کے بعد تو تمام کا فر مان لیں گے، تمام مشرکین اور تمام یہود بھی مان لیں گے۔

لہٰذا ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ ہم سر سے پاؤں تک پورے کے پورے احکامِ اسلام میں داخل ہو جائیں اور پورے کے پورے اسلام کو قبول کر لیں اور شیطان کے راستے سے بچ جائیں۔ تب ہم کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ اگر ہم یہ کریں کہ ''آدھا تیتر اور آدھا بٹیر'' نماز بھی پڑھ لی اور شراب بھی پی لی، کلمہ بھی پڑھ لیا اور زبان سے گالیاں بھی دے دیں۔ اسلام تو کہتا ہے کہ ''یا سراسر موم ہو جاؤ یا سراسر سنگ ہو جاؤ'' یا پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ یا پورے کے پورے اسلام سے نکل جاؤ۔ اسلام کے لیے بدنامی کا باعث نہ بنو۔

حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ ایک جملہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر غور کرو! ایمان ہو تو صدیق کا ہو اور اگر کفر ہو تو ابوجہل کا ہو۔ یہ درمیان میں آدھا ایمان اور آدھا کفر، آدھا یہودی اور آدھا مسلمان، یہ اسلام نہیں ہے۔ یا پورا اسلام مان لیں یا پورا اسلام چھوڑ دیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیوں کامیاب ہو گئے!؟ اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے مدنی! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی میں گواہی دیتا ہوں ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الانفال: ۴] یہ پکے مومن ہیں، اندر باہر سے

ایمان والے ہیں، یہ ایمان کا نمونہ ہیں، یہ حزب اللہ ہیں اور یہ کامیاب ہیں۔ اسی لیے ان کو سرٹیفکیٹ مل گیا" رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ" کا (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی)۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے نمونہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور پورے کا پورا اسلام میں داخل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

﴿سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٢١١ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝٢١٢﴾ [البقرۃ:٢١١،٢١٢]

"(اے محمد ﷺ!) بنی اسرائیل سے پوچھ لیجیے! ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں دی تھیں!؟ اور جو اللہ کی نعمت کو اس کے پہنچنے کے بعد (کفر کی صورت میں) بدل ڈالے تو اللہ کا عذاب سخت ہے۔ کافروں کو دنیا کی زندگی پر فریفتہ کر دیا گیا ہے۔ یہ مومنین پر ہنستے ہیں، حالانکہ جو لوگ پرہیزگار ہیں قیامت کے دن ان سے اوپر ہوں گے۔ اور اللہ جس کو چاہے بے شمار رزق دیتا ہے۔"

بنی اسرائیل کے لیے نصیحت اور فضیحت:

(اے نبی ﷺ!) ان بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنی بڑی نشانیاں عطا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا، حضرت ہارون علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بڑے بڑے معجزات عطا فرمائے: تورات عطا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے عصا عطا فرمایا، فرعونیوں کو دریا میں غرق کر دیا اور ان کے لیے دریا میں راستے بن گئے اور اللہ پاک نے ان پر اتنا انعام کیا اتنا انعام کیا کہ تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں بھیجے۔ تو اتنا بڑا انعام کہ کسی قوم میں اللہ پاک نے اتنے زیادہ انبیاء کرام نہیں بھیجے۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَاۗءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ڰ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝٢٠﴾ [المائدۃ:٢٠] اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہارے لیے اتنی کھلی نشانیاں اور اتنی آیات بینات دیں، جن کے دیکھنے کے بعد تم حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے مخالف بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پھر ہم نے ان کو کتنی نعمتیں عطا فرمائیں کہ بنی اسرائیل فرعون کی قید میں تھے، فرعون ان کے بچوں کو قتل کرتا تھا، ان کی لڑکیوں سے خدمت اور

بے گار لیتا تھا اور ان کو ذلیل کرتا تھا اور ان کو غلام بنا کر رکھتا تھا۔ ہم نے ان کو ان کی غلامی سے چھڑایا۔ اور اللہ پاک نے فرمایا کہ انہوں نے نافرمانی کی تھی، ہم نے ان کو معافی عطا کی۔ آسمان سے من وسلویٰ اتارا۔ اتنی نعمتیں عطا فرمائیں، لیکن انہوں نے ان نعمتوں کا جواب کفر اور ناشکری سے دیا؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر جب کوئی ناشکری کرے تو وہ نعمت چھین لیتے ہیں۔ اس لیے فرمایا: ﴿سَلْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ كَمْ آتَيْنٰهُم مِّنْ آيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ [البقرۃ:۲۱۱] ایسی کھلی نشانیاں ان کو دکھائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایسے کھلے معجزات تھے، جیسا کہ ید بیضا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قبطیوں پر ایسے ایسے عذاب بھیجے کہ کبھی "جَرَاد"، کبھی "قُمَّل"، کبھی "ضَفَادِع" اور کبھی "دَم" بھیجے۔ اور یہ ساری کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی انہوں نے شکر ادا نہیں کیا۔ اور فرمایا: اے میرے مدنی! ﴿وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ جو شخص میری نعمت کے ملنے کے بعد اس کو بدل ڈالے، یعنی شکر ادا نہ کرے، کفر کرے کہ اللہ تعالیٰ نے صحت دی تھی کہ تو اس سے عبادت کر اور وہ اس (صحت) کا فائدہ نافرمانی سے اٹھا رہا ہے۔ اللہ پاک نے آنکھیں دیں کہ تو حق کا راستہ دیکھے، تو آنکھوں سے گندی فلمیں دیکھتا ہے۔ اللہ پاک نے ذکر کرنے کے لیے زبان دی تھی اور تو زبان سے گندی گالیاں نکالتا ہے۔ اللہ پاک نے پاؤں دیئے تھے کہ تو میرے راستے پر چل اور تو شراب خانے کی طرف چلتا ہے۔ اللہ پاک نے دماغ دیا تھا کہ میری تقدیر اور میری آیات میں غور کر، تو نے اس دماغ کو حرام کھانے اور رشوت کمانے اور ظلم کرنے میں صرف کیا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ جو میری نعمت کو بدلتا ہے تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

اپنے اوپر خرچ کرنا بھی اسلام کا حکم ہے:

لہٰذا جب نعمت کا شکر کرو۔ اور شکر کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ زبان سے کہہ دو کہ اللہ تیرا شکر ہے۔ شکر کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس نعمت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو دولت دی ہے تو زکوٰۃ دو، غریبوں کی مدد کرو، مساجد و مدارس میں خرچ کرو اور دین کے کاموں میں خرچ کرو۔

میرے آقا سرکار مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا کہ میاں بیوی جب ملتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ صدقہ کا ثواب دیتے ہیں۔ اور اگر وہ غیر عورت پر خرچ کرتا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ملتی یا نہ

ملتی؟ اس نے کہا: حضور پھر تو زنا ہے، ضرور سزا ملتی۔ فرمایا: اس طاقت کو جب حلال پر خرچ کیا تو اللہ تعالیٰ اس پر اجر عطا فرمائیں گے۔

اب یہ مسئلہ سمجھو کہ اگر تم نے اپنی طاقت اور جوانی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں استعمال کی، تم کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی، تم نے کہا کہ بالکل۔ اللہ پاک نے یہ تو نہیں فرمایا کہ آپ کھائیں پئیں نہیں، صاف کپڑے نہ پہنیں، اچھے نہ رہیں۔ یہ تو کبھی بھی اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا، بلکہ حضور اکرم ﷺ نے تو جب ایک صحابی کو دیکھا کہ میلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ادھر آؤ!۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تم غریب آدمی ہو؟ اس نے کہا: یارسول اللہ! میں غریب آدمی تو نہیں ہوں، مجھے تو اللہ پاک نے ہر قسم کی نعمتیں دی ہیں۔ میرے پاس اونٹ ہیں، بکریاں اور گائیں ہیں اور...... ماشاء اللہ!...... ہر قسم کا مال میرے پاس ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''فَلْيُرَ أَثَرُ نِعْمَةِ اللهِ عَلَيْكَ'' [سنن ابی داؤد، رقم: ۴۰۶۳]۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اثر تیرے اوپر نظر تو نہیں آتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی نعمتیں دی ہیں تو پھر یہ کیا ہے کہ تم فقیر بنے ہوئے ہو؟ اللہ پاک اس بات سے منع نہیں کرتا ہے کہ تم اچھا کھاؤ، اچھے کپڑے پہنو اور بیوی بچوں کو اچھے کپڑے پہناؤ۔ اسلام تو حکم دیتا ہے کہ اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرو، گھر پر خرچ کرو اور مہمانوں پر خرچ کرو، لیکن معصیت اور گناہ میں نہیں، بلکہ خیر میں خرچ کرو۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری نعمتوں کو نہ بدلنا۔ اگر میری نعمتوں کو بدلو گے تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

﴿زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ [البقرۃ: ۲۱۲] کافروں کے لیے دنیا کی نعمتیں ان کی آنکھوں میں مزین کر دی گئیں۔ انہیں دنیا کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ان کا مقصد ہی دنیا، زندگی بھی دنیا اور موت بھی دنیا، ہر وقت دنیا دنیا۔ وہ اسی چکر میں یا لباس میں یا مکان میں یا کھانے پینے میں۔

مسلمان کفار پر غالب ہوں گے:

﴿وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [البقرۃ: ۲۱۲] (وہ ایمان والوں سے ٹھٹھا اور مخول ہوتے ہیں)۔

ایک صحابی تلوار بنانے کا کام کرتے تھے، یعنی لوہار تھے۔ انہوں نے ایک کافر سردار کو تلوار بنا کر دی۔ پھر اس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے ذمہ میری مزدوری کے اتنے پیسے ہیں۔ مہربانی کر کے میری مزدوری کے پیسے دے دیجیے۔ تو وہ ہنسنے لگ گیا اور کہنے لگا: عجیب بات ہے کہ تم تو کہتے ہو: اگلی دنیا میں ایک لاکھ ملے گا، تو تم وہیں مجھ سے

ملتا، میں وہاں آپ کو دے دوں گا۔ یعنی مزاق کر رہا تھا، آخرت پر ایمان تو ہے نہیں۔ اور اس کے بعد یہ مذاق کرتے ہیں کہ جہاں سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ گزرتے، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ گزرتے تو یہ کافر دیکھ کر ٹھٹھا اور مخول کرتے: دیکھو جی کہ نبی (پاک ﷺ) کے ساتھیوں کی حالت تو دیکھو کہ لباس نہیں، کپڑے نہیں، ٹوپی نہیں، شلوار نہیں، یہ چلے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم پوری دنیا پر حکومت کریں گے۔ کھانے کو ملتا نہیں اور یہ پوری دنیا پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

اللہ پاک نے فرمایا: میرا بھی فیصلہ ہے ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾ [البقرۃ:۲۱۲] جو مجھ سے ڈرنے والے ہیں آج وہ دنیا میں جتنے بھی غریب اور بدحال ہوں، لیکن قیامت میں ان کو اونچا کر دوں گا۔ وہ جنت کے محلات میں رہیں گے اور یہ کافر جہنم میں پڑے ہوئے ہیں گے۔ اس دن پھر یہ عالم ہوگا کہ جنت والے جن سے یہ مذاق کرتے تھے وہ مومن ان کو پکار پکار کر کہیں گے: ﴿وَنَادٰٓي اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ﴾ جنت والے پکار کر کہیں گے: او جہنمیو! او کافرو! او مشرکو! ﴿فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ﴾ [الاعراف:۴۴] کیا تم کو وہ مل گیا جو اللہ پاک نے تم سے وعدہ کیا تھا؟ جو میرے نبی پاک ﷺ نے سنایا تھا پورا ہو گیا؟ اور پھر یہ عالم ہوگا کہ مومن جنت میں ہوں گے اور کافر جہنم میں پڑے ہوں گے۔ اللہ پاک پردے ہٹا دیں گے کہ مومن جنت میں ہیں: ﴿وَنَادٰٓي اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاۗءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ﴾ جہنم والے چیخ چیخ کر کہیں گے: اے جنت والو! مہربانی فرما کر اگر ہمیں برتنوں میں نہ سہی اوپر سے ہمارے اوپر پانی کا کوئی قطرہ ٹپکا دو کہ ہم پانی تو پی لیں۔ کوئی روٹی کا ٹکڑا پھینک دو کہ ہم کھا لیں۔ ﴿قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ [الاعراف:۵۰] وہ کہیں گے: بدبختو! یہ جنت کی نعمتیں ہیں۔ اللہ پاک نے کافروں پر حرام کر دی ہیں، تمہیں نہیں مل سکتیں۔ اور قرآن پاک کہتا ہے کہ آج تم ایمان والوں سے مخول کرتے ہو، لیکن قیامت کے دن پھر یہ تمہارے ساتھ وہی کریں گے۔ اس لیے فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [البقرۃ:۲۱۲]۔ اللہ پاک جس کو چاہتے ہیں بغیر حساب کے دنیا میں رزق عطا فرما دیتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ ﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ﴾ [العنکبوت:۶۲] اللہ تعالیٰ جس کا رزق چاہیں کھول دیں اور جس کا رزق چاہیں تنگ کر دیں۔ دینے پر آئے تو آدمی مٹی میں ہاتھ ڈالے تو وہ سونا بن جائے اور اگر لینے پر آئے تو سونے میں ہاتھ ڈالے تو مٹی بنا دے؛ اس لیے کہ رزق کے خزانے اللہ پاک کے ہاتھ میں ہیں۔ اور اللہ پاک جب جنت میں دینے پر

آئیں گے تو جس کو چاہیں رزق عطا فرمائیں گے اور اتنا رزق عطا فرمائیں گے کہ جس کا کوئی حساب نہیں کر سکتا اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ پاک ہمیں بھی دنیا میں آسانی اور مبارک رزق اور بغیر حساب کے جنت الفردوس عطا فرمائے۔ (آمین)

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۖ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۗ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۱۳]

''لوگ ایک دین پر تھے، پھر اللہ نے خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (پیغمبر) بھیجے اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری، تاکہ لوگوں میں جس بات میں وہ جھگڑا کریں فیصلہ کرے۔ اور کتاب میں جھگڑا نہ ڈالا، مگر ان لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی، ان کے بعد کہ ان کو صاف حکم پہنچ چکے تھے آپس کی ضد کی وجہ سے۔ پھر اللہ نے اپنے حکم سے ایمان والوں کو ہدایت دی اس سچی بات کی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہے سیدھی راہ بتاتا ہے۔''

امت کا معنی ومفہوم:

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں کہ لوگ ایک امت تھے۔ امت کا معنی جماعت ہوتا ہے۔ اگر کافی لوگ ایک نظریے پر جمع ہو جائیں گے تو یہ بھی ''امت'' کہلاتے ہیں، چاہے وہ نظریہ کیسا بھی ہو، ان پر ''امت'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر بعض لوگ ایک قوی لحاظ سے جمع ہو جائیں تو ان پر بھی ''امت'' کا اطلاق ہوتا ہے، یعنی عقائد وافکار کی بنا پر اگر ایک طریقے پر جمع ہو جائیں تو وہ بھی ''امت'' کہلاتے ہیں۔ قومی، وطنی اور نسبی لحاظ سے اگر ایک ہو جائیں گے تو ان پر بھی ''امت'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایک فرد پر بھی ''امت'' کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً﴾ [النحل: ۱۲۰] ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات میں گویا ایک ''امت'' تھے۔

اب اللہ پاک نے ان آیات میں بتادیا کہ امت پر لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا کہ وہ ایک ہی طریقے پر تھے، ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ اب ایک طریقہ پر ہونے کا کیا معنی ہے؟ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ سب کا ایک رنگ تھا اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ سب کی صورت اور شکل ایک تھی۔ تو ایک ہونے کا معنی یہ ہے کہ ایک دور ایسا بھی تھا کہ وہ عقیدے اور نظریے کے اعتبار سے ایک تھے، ان میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ جس نظریے پر تھے کیا وہ نظریہ حق تھا یا باطل تھا؟ تو قرآن پاک کی آیات مبارکہ سے مفسرین اور سلف صالحین نے جو سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ ایک عقیدے، ایک طریقے اور ایک نظریے پر تھے باعتبار حق کے، یعنی حق پر تھے اور ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور کوئی جھگڑا بھی نہیں تھا۔ اب سمجھیں کہ وہ کونسا دور تھا؟

✽...... حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جو قرآن پاک کے بہت بڑے قاری اور جلیل القدر صحابی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا کہ ایک امت ہونے سے اس دور کی طرف اشارہ ہے جب اللہ پاک نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی تمام اولاد کی ارواح کو نکالا اور ان سے یہ ارشاد فرمایا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ﴾ [الاعراف:۱۷۲] (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کہ آپ بالکل ہمارے رب ہیں)۔ ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں تھا، سب کے سب ربوبیتِ خداوندی پر متفق تھے۔ اب یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے، اس وقت حضرت حواء بھی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ صلبِ آدم میں جتنی بھی اولاد تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی پشت سے تمام ارواح کو نکالا۔ یہ عالَم ''عالَم ارواح'' کہلاتا ہے، جس میں تمام مخلوق کی ارواح کو اللہ پاک نے جمع کیا...... چونکہ کئی قسم کے عالَم ہیں: جیسے ''عالَمِ ارواح'' ہے، اسی طرح ''عالَمِ دنیا'' ہے، جس میں آپ موجود ہیں، اس کے بعد ایک ''عالَمِ برزخ'' ہے، یعنی دنیا اور آخرت کے درمیان جو مرنے کے بعد ہم قبر میں رہیں گے وہ ''عالَمِ برزخ'' کہلاتا ہے۔ ''عالَمِ برزخ'' کے بعد پھر ایک عالَم ''عالَمِ آخرت'' ہے۔ اور وہ عالَم ایسا عالَم ہے جس کے بعد فنا نہیں آئے گی، وہ عالَم ہمیشہ رہے گا۔ اللہ پاک جب مردوں کو دوبارہ زندہ کریں گے تو پھر ان پر موت نہیں آئے گی...... تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق یہ ہے کہ یہ ''عالَم ارواح'' کی طرف اشارہ ہے کہ اس عالَم میں تمام ارواح ایک عقیدہ پر تھیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اور اس کی تائید ایک حدیث مبارکہ اور قرآن پاک کی ایک آیت سے بھی ہوتی ہے۔ اللہ پاک نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ﴾ [الروم:۳۰] اور حدیث پاک میں آتا ہے:

"كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ" ہر بچہ دینِ حق اور فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ "فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ" [بخاری، رقم:۱۳۸۵] تو اس کے ماں باپ اگر یہودی ہیں تو اس بچے کو یہودی بنا دیتے ہیں، نصرانی ہیں تو نصرانی بنا دیتے ہیں، اگر مجوسی ہیں تو مجوسی بنا دیتے ہیں اور اگر ہندو ہیں تو ہندو بنا دیتے ہیں۔ ورنہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی پیدا ہونے کے بعد اگر اس کو کوئی مسخ نہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم ہوگا اور مسلمان ہوگا۔

اس لیے ایک قول تو یہ ہوگیا کہ عالمِ ارواح میں سب امتیں ایک تھی، ان میں کوئی جھگڑا نہیں تھا، وہ سب ایک عقیدے پر تھیں کہ اللہ پاک ہی الٰہ ہے، اس کی ربوبیت کاملہ ہے اور اسی کی الوہیت کاملہ ہے۔ اس کے سوا کوئی رب اور کوئی پالنے والا اور کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ تو یہ سارا مسئلہ ایک لفظ میں آگیا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ﴾ [الاعراف:۱۷۲]

❁...... ایک قول تو یہ ہوگیا، لیکن حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: اس سے مراد "عالمِ ارواح" نہیں ہے؛ اس لیے کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾ [البقرۃ:۲۱۳] اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ تو اللہ پاک نے انبیاء کرام کو "عالمِ ارواح" میں تو نہیں بھیجا۔ قرآن پاک کی آیت خود دلالت کر رہی ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ جب انبیاء کرام "مُبَشِّرِيْن" اور "مُنْذِرِيْن" بن کر ہماری دنیا والے عالم میں آئے ہیں تو پھر اس سے "عالمِ ارواح" کا کیا تعلق ہے؟ روزہ بھی نہیں ہے۔ "عالمِ ارواح" میں تو صرف روح تھے اور اللہ پاک نے ہم سے اقرار لے لیا، لیکن "عالمِ ارواح" میں کوئی عالمِ تکلیف تو نہیں تھا۔ عالمِ تکلیف تو فقط عالمِ دنیا ہے۔ تو ان کے قول کے مطابق لوگوں کے ایک امت ہونے سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کا زمانہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام تک کے زمانے میں سب لوگ ایک عقیدے پر تھے، توحید کو ماننے والے تھے اور حضرت آدم علیہ السلام کے عقیدے پر تھے، سوائے قابیل یا چند قابلِ ذکر لوگوں کے، جن کے ذکر کی کوئی حیثیت نہیں تھی، باقی سب لوگ ایک عقیدے پر تھے۔

جب سب لوگ ایک عقیدے اور ایک نظریے پر تھے تو یہ تقریباً حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح تک کوئی دس قرن کا زمانہ گزرا ہے۔ دس قرن کا مطلب دس صدیاں ہیں۔ یعنی ایک قرن ایک صدی ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ایک ہزار سال۔ یعنی ایک ہزار سال تک کوئی اختلاف نہیں تھا، سب کے سب توحید کے علمبردار تھے، سب اللہ پاک

کی الوہیت کے قائل تھے، اسی کی ربوبیت کے قائل تھے، اس کے علاوہ کسی کی عبادت کو روا نہ سمجھتے تھے، پوری اولادِ آدم ایک نظریے اور ایک عقیدے پر تھی۔ جب وہ ایک عقیدے پر تھے تو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪﴾ [البقرۃ: ۲۱۳] اللہ پاک نے نبی بھیجے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے۔

﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ﴾ پھر ان لوگوں نے اختلاف کیا، اعتراض کیا۔

سوال: آپ کے دماغ میں تو یہ بات آتی ہے کہ پہلے وہ ایک عقیدے پر تھے، نبی آئے تو ان میں اختلاف پڑ گیا۔ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ لوگ ایک عقیدے پر تھے، اللہ پاک نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے نبی بھیجے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری، تا کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور نہ جھگڑے میں پڑے، مگر وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی۔ جب آ گئی ان کے پاس کھلی نشانیاں باعتبار حسد کے تو اب بظاہر...... نعوذ باللہ...... یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ تو ایک عقیدے اور ایک طریقے پر تھے، لیکن جب نبی بھیجے گئے تو اس کے بعد اختلاف ہوا۔

جواب: یہ بات نہیں۔ اصل میں قرآن پاک کا اسلوبِ بیان کچھ اس طرح سے ہے کہ جب تک تمام سلف صالحین کے طرز پر سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو قرآن پاک سمجھ میں نہیں آ سکتا؛ اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، بندے کی کتاب نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا شانِ نزول، پسِ منظر، سببِ نزول اور وہ زمانہ اور اس زمانے کے لوگوں کے بارے میں سمجھنا ضروری ہے۔ یہ کوئی تاریخ اور جغرافیائی کتاب تو نہیں ہے۔ یہ تو ایک ہدایت کی کتاب ہے اور ایک ایسی جامع اور مانع کتاب ہے جو قیامت تک کے لیے سراپا ہدایت ہے۔ اس کا اپنا ایک اسلوب بیان ہے۔ اس میں صرف اتنی بات ذکر کی جاتی ہے جتنی ضرورت ہوتی ہے اور جس بات کی ضرورت نہیں ہوتی اور جو بات آیات سے خود بخود مفہوم ہو رہی ہوتی ہے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

مثال کے طور پر: حضرت یوسفؑ جب قید میں چلے گئے، مدت گزر گئی۔ اس زمانہ کے بادشاہِ مصر نے خواب میں دیکھا، موجودہ لوگوں سے خواب کی تعبیر پوچھی، لیکن بادشاہ کو اطمینان نہ ہو سکا تو جو آدمی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید میں تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی تھی کہ کل تم رہا ہو جاؤ گے، اس کو یاد آیا کہ تعبیر کا بہت بڑا عالم جیل میں بیٹھا ہوا ہے۔ تو قرآن پاک صرف اتنی بات ذکر کرتا ہے ﴿يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ﴾ [یوسف: ۴۶] (وہ آدمی آیا اور اس نے کہا کہ) اے یوسف! آپ مہربانی فرمائیں اور ہمیں اس

بات کی تعبیر دیں۔ اب باقی قصہ کو ذکر نہیں کیا گیا؛ اس لیے کہ باقی سارا قصہ سمجھ میں آ رہا ہے۔

اسی طرح سے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ لوگ ایک عقیدے پر تھے۔ جب ایک عقیدے پر تھے تو نبیوں کے بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۱۳] مطلب یہ ہے کہ وہ ایک عرصہ تک ایک عقیدے پر رہے، لیکن ایک مدت گزرنے کے بعد ان میں اختلاف شروع ہو گیا۔ اب اس اختلاف کا قرآن پاک نے ذکر نہیں فرمایا؛ اس لیے کہ بات واضح تھی اور ضرورت ہو تو اللہ پاک نبی بھیجے گا اور اگر ضرورت نہ ہو تو اللہ پاک نبی کیوں بھیجے گا؟ اور اللہ کے نبی کیوں آتے ہیں؟ جب قومیں بگڑ جاتی ہیں اور کفر و ضلالت کے اندھیروں اور گمراہیوں میں ہوتی ہیں اور بھٹک جاتی ہیں تو اللہ پاک اپنے نبی، اپنے رسول اور اپنے داعیوں کو بھیج دیتے ہیں۔ یہ کھلی بات ہے۔

اللہ پاک نے فرمایا کہ امت ایک تھی، پھر ایک ہزار سال کے بعد ان میں اختلاف پیدا ہونے شروع ہوئے اور طرح طرح کے افکار پیدا ہو گئے۔ بت پرست کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں، سورج کا پجاری کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں، آگ کا پجاری کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں۔ اسی طرح سے جتنے بھی افکار پیدا ہوتے گئے اللہ پاک نے ان سب کی اصلاح کے لیے انبیاء کرام اور رسولوں کو بھیجا، تاکہ یہ حضرات ان لوگوں کے اختلاف کو مٹا دیں کہ یہ اللہ پاک کا فرمان ہے۔ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے، یہ صدق ہے اور یہ کذب ہے، یہ نور ہے اور یہ ظلمت ہے اور یہ دن ہے اور یہ رات ہے۔ اس طریقے سے انبیاء و رسل نے قوموں کے درمیان محنت کی، تاکہ اللہ پاک ان لوگوں کو ہدایت عطا فرما دیں۔

گمراہ کرنے کے شیطان کے حربے:

بعض حضرات نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام تک تو امت ایک تھی، ان میں کوئی جھگڑا اور اختلاف نہیں تھا، سب کے سب اللہ پاک کی توحید کے ماننے والے تھے۔ اب حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے لوگ بدلنے شروع ہوئے اور سب سے پہلے شیطان نے لوگوں کو بت پرستی کے ذریعے گمراہ کرنا شروع کیا۔ جو اچھے اچھے اللہ والے لوگ تھے، جن کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ فلاں اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، وہ فوت ہو گیا ہے۔ اس نے لوگوں کے دماغوں میں یہ بات ڈالی کہ دیکھو! یہ اللہ والے جب فوت ہو گئے تو تم کو

ان کی یاد آئے گی تو تم ان کو دیکھ نہیں سکو گے تو تم کیسے کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے، پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تو اس نے کہا کہ ایک طریقہ ہے کہ ہم ان کی صورتیں بنا لیتے ہیں اور ان کا ایک مجسمہ بنا لیتے ہیں، چاہے وہ لکڑی کا ہو یا مٹی کا پتھر کا، تا کہ ہمیں پتہ چل سکے کہ یہ فلاں بزرگ کا مجسمہ ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو بنانا نہیں آتا۔ اس نے کہا: پھر میں ہی محنت کر کے تمہیں بنا دیتا ہوں۔ تو اس نے ان کو ان بزرگوں کی صورتیں بنا کر ان کے گھروں میں رکھوا دیں۔ تو اللہ تعالیٰ کا قرآن فرماتا ہے: ﴿وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴾ [نوح: ۲۳] لگتا ہے یہ بھی پنجتن پاک تھے، یہ کوئی لکڑی نہیں تھے، بلکہ یہ اللہ والے لوگ تھے۔ جب یہ مر گئے تو شیطان نے ان کی صورتیں بنا کر گھروں میں رکھوا دیں کہ بھئی! ان کو دیکھا کرو، تا کہ یہ تمہیں یاد آئیں اور عبادت اللہ ہی کی کیا کرو، بس ان کو دیکھا کرو کہ...... سبحان اللہ!...... دیکھو جی کہ یہ بزرگ تھے۔ یہ رات کو سو نوافل پڑھا کرتے تھے۔ تو چلو میں بھی پڑھوں۔

جب ان کی وہ نسل ختم ہوگئی اور ان کی اولاد پیدا ہوئی تو ان کے دماغوں میں یہ بات ڈالی کہ بے وقوفو! یہ جو کچھ دولت، دنیا اور پیسہ وغیرہ تمہارے ماں باپ کو ملا تھا وہ سب ان کی عبادات کی وجہ سے ملا تھا۔ اگر ان کی عبادت کرو گے تو تمہیں بھی سب کچھ ملے گا اور اگر ان کو ناراض کر دو گے تو تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ تو ابتدا یہاں سے شروع ہوتی ہے، جیسا کہ جب آپ کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کا فوٹو جیب میں رکھتے ہیں ناں! ابتدا ہمیشہ فوٹو سے ہوتی ہے۔

اب لوگ اتنے بڑھ گئے کہ قرآن مقدس کے پہلے صفحہ پر اپنے پیر کا فوٹو لگایا ہوتا ہے اور پہلے اس کی زیارت کرتے ہیں اور پھر تلاوت شروع کرتے ہیں۔ کوٹھیوں اور گھروں میں فوٹو لگانا تو عام بات ہے اور پھر عقیدہ یہ ہے کہ اس پیر کے فوٹو کی برکت سے ہمارے گھر میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ ان کے گھروں میں قرآن پاک کی برکت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا نام لکھ دیں تو اس کی برکت نہیں ہوتی، لیکن کسی بزرگ کا فوٹو لگا دو تو اس کی برکت ہو جاتی ہے اور اس کی برکت سے سارے حوادث اور مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔

یہ عقیدے قوم میں داخل ہوئے تو قوم شرک میں مبتلا ہوگئی۔ جب قوم شرک میں مبتلا ہوگئی تو اللہ پاک نے پہلا رسول حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا۔ سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام آئے اور حضرت نوح علیہ السلام نے (۹۵۰) ساڑھے نو سو سال تک قوم کو توحید کی دعوت دی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار پچاس سال (۱۰۵۰) تھی۔ یہ جو قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا﴾ [العنکبوت: ۱۴] پچاس کم ایک ہزار سال تو یہ (۹۵۰)

ساڑھے نو سو سال کی مدت دعوت ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت سنائی، لیکن قوم شرک میں مبتلا رہی۔ حضرت نوح علیہ السلام جب مایوس ہو گئے تو آخر میں انہوں نے اللہ پاک سے دعا مانگی: اے اللہ! میں نے اس قوم کو ظاہر میں، باطن میں، کھلے میں، گھروں میں، محفلوں میں اور مجلسوں میں، ہر جگہ تیری توحید پہنچائی ہے، لیکن یہ قوم ہدایت پر آنے والی نہیں ہے، میں ان سے مایوس ہو چکا ہوں۔ ﴿رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ [نوح:۲۶] اے میرے رب! ان کا کوئی گھر زمین پر نہ بچے۔ ﴿إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ﴾ [نوح:۲۷] اگر آپ نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو مزید گمراہ کریں گے۔ تو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول ہو گئی اور حضرت نوح علیہ السلام کی ساری کی ساری قوم ختم ہو گئی۔ باقی وہ لوگ بچے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے۔ وہ تقریباً اسی آدمی تھے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں میں سے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے: حام، سام اور یافث۔ آگے پھر ان تینوں کی نسل ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اب جتنے بھی لوگ ہیں: کوئی حامی ہے، کوئی سامی ہے اور کوئی یافثی ہے۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے رشتے سے بھی ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کے رشتے سے بھی ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ باقی لوگوں کی اولاد نہیں ہوئی۔

لیکن لوگوں کو پتہ نہیں کیا ہو گیا کہ آج بھائی بھائی کا دشمن ہے، باپ بیٹے کا دشمن ہے، ماں بیٹی کی قاتلہ ہے اور خونِ مسلم کی ارزانی ہے۔ جہاں نظر ڈالو وہاں مسلم کا ہی خون بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ سب ہمارے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ پاک کی ناراضگی ہے۔

جب ساری قوم غرق ہو گئی اور کشتی میں حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھ ایمان والے بچ گئے تو اب پوری دنیا میں ایک امت بچ گئی اور وہ بھی ساری ایک عقیدے پر تھی۔

اصل میں اگر غور کریں تو تمام اقوال اپنی اپنی جگہ درست ہیں، اس لیے کہ عالمِ ارواح میں بھی ہم سب ایک عقیدے پر تھے اور آدم علیہ السلام کے زمانے سے حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک اختلاف نہ ہوا۔ پھر کفر و شرک آیا، اللہ پاک نے پہلا رسول حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا، لیکن قوم نہ مانی۔ اللہ پاک کا عذاب آیا، قوم غرق ہو گئی۔ پھر جو بچے حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے بھی ایک عقیدے پر، ایک امت اور ایک جماعت تھی۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ تو اب جب وہ اختلاف میں پڑے تو اللہ پاک نے انبیاء کرام کو بھیجا، تاکہ ان کے اختلاف کو ختم کیا جائے۔

﴿وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ﴾ ہم نے صرف انبیاء کرام ہی نہیں بھیجے، بلکہ ان کے ساتھ کتابیں بھی بھیجیں۔ اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل بھیجی اور صحائف بھیجے اور سب سے آخر زمانہ میں سب سے آخری دور آیا تو اللہ پاک نے نبی بھی آخری بھیجا اور کتاب بھی آخری بھیجی، جو قیامت تک کے لیے کافی ہے، لیکن فرمایا: ﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ﴾ سب سے پہلے جھگڑے میں وہ لوگ پڑے جو علم والے تھے، جن کو کتاب دی گئی تھی، لیکن انہوں نے سب سے پہلے اختلاف کیا اور اَن پڑھ جاہل ان کے پیچھے چلتے رہے؛ کیونکہ اختلاف تو پڑھے لکھے ہی کرتے ہیں اور ہر کسی کا ایک حلقہ ہوتا ہے، جو ان کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ اور ان کے اختلاف کی وجہ عناد پرستی اور ذاتی جاہ تھی کہ میں بڑا اور میں بڑا ہوں۔ وہ حبِ جاہ میں مبتلا ہو گئے۔

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کو ہدایت دی جو ایمان لے آئے اس اختلاف کے بعد، اس لیے کہ ہدایت دینے والا اللہ پاک ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۱۳] اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتے ہیں، اس لیے کہ ہدایت دینا اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے۔ پھر اللہ پاک جن لوگوں سے راضی ہوئے ان کو ہدایت اور ایمان نصیب فرمایا اور وہ صراطِ مستقیم پر آ گئے اور جن کے مقدر میں گمراہی تھی انہوں نے انبیاء کرام کی مخالفت کی۔

اب سمجھیں کہ جس سے نبوت کا سلسلہ شروع ہوا تو قوم دو حصوں میں منقسم ہو گئی: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ﴾ [التغابن: ۲] ہم نے مخلوق کو پیدا کیا اور وہ دو حصے بن گئے: ایک مومن اور ایک کافر۔ اسی طرح ایک نبیوں کو ماننے والا اور دوسرا انکار کرنے والا۔ اور یہ سلسلہ چلتا آیا۔

اصل بات یہ ہے کہ دعوت بھی ایک اور داعی بھی ایک تھا، لیکن انبیاء کرام علیہم السلام مختلف اور کتابیں مختلف آئیں۔ وجہ یہ تھی کہ جیسا کہ تندرستی ایک ہوتی ہے، آگے شرک و کفر کی بیماریاں علیحدہ ہوتی ہیں۔ جس طرح ہر بیماری کا علاج علیحدہ ہے، اسی طرح اللہ پاک نے ہر بیماری کے علاج کے لیے نبی اور کتابیں مختلف بھیجیں۔ اور جب آخری زمانہ آ گیا تو اللہ پاک نے کامل نسخہ شفا بھیج دیا، جو اللہ پاک کا قرآن ہے اور اللہ پاک نے کامل نبوت اور رسالت بھیجی جو رسالت و نبوت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اللہ پاک نے اپنا آخری نبی خاتم الانبیاء امام المرسلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلہ خلفاء اور علماء کے ذریعے قیامت تک چلتا رہے گا۔ تو اللہ پاک نے اس آیت کے ذریعے فرمایا کہ جیسے پہلے عقیدہ اور امت ایک تھی تو اب چاہیے کہ پھر اسی طریقہ پر لوٹ جائیں اور

پھر ایک ہی عقیدے اور راستے پر رہیں، جو انبیاء کرام نے بتایا ہے، جس کی ہدایت اللہ پاک نے قرآن پاک میں فرمائی ہے۔

ایک تو ہدایت یہ ہوتی ہے کہ آپ کسی کو دین کے بارے میں ہدایت کر دیں، جیسے آپ تقریر کر دیں، دعوت دے دیں یا وعظ کر دیں۔ اور ایک ہدایت یہ ہے کہ اس کو اللہ پاک توفیق بھی دے دے۔ یہ ہدایت اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے۔ جتنے بھی انبیاء کرام تشریف لائے اور ان کے بعد خلفاء تشریف لائے، تابعین اور علماء کرام تشریف لائے، ان کی ذمہ داری دعوت، تبلیغ، وعظ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے، لیکن کسی کو ہدایت دینا اور اس کو ہدایت نصیب ہو جائے یہ اللہ پاک کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت عطا فرما دیں اور جس کو چاہیں ہدایت عطا نہ فرمائیں۔ ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾[البقرۃ: ۲۱۳]

اس لیے اللہ پاک نے دوسرے مقام پر واضح طور پر ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾[القصص: ۵۶] اے نبی پاک! توفیق ہدایت آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ آپ جس کو چاہیں ہدایت عطا فرما دیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ جس کو چاہیں ہدایت دے دیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ پاک نے فرمایا: ''فَهَدَى اللّٰهُ'' ایمان والوں کو ہم نے ہدایت دی۔

ایک شبہ اور اس کا جواب:

لیکن یاد رکھو کہ ایک تو اللہ پاک کی صفت ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾[الحدید: ۳] وہ ایسا اوّل ہے کہ اس سے پہلے کوئی چیز نہیں ہے، ''لَيْسَ قَبْلَهُ شَيْءٌ''۔ اور ایسا آخر ہے کہ اس کے بعد کوئی چیز نہیں، ''لَيْسَ بَعْدَهُ شَيْءٌ''۔ اس لیے بعض لوگ بے چارے اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ دیکھو جی! حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی تو آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اوّل بھی میں ہوں اور آخر بھی میں ہوں۔ تو لہٰذا اللہ پاک کی صفت بھی آ گئی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بھی آئی ہے۔

لیکن بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ ﴾ جیسے سمیع اور بصیر اللہ پاک کی بھی صفت آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت جیسے: ﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾[الشوریٰ: ۱۱] اور بندے کی صفت: ﴿فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾[الانسان: ۲] (ہم نے اس کو سننے اور دیکھنے والا بنایا)، لیکن کہاں عام مخلوق کا سننا اور دیکھنا اور کہاں خالق کا سننا اور دیکھنا!!؟ اس لیے اللہ پاک کی جو صفت ہے: ''اَلْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ'' وہ اس کی شان کو

زیبا ہے۔ اور مدنی پاک کے بارے میں جو آیا ہے ہم تمام امت میں اوّل بھی ہیں اور آخر بھی ہیں تو صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا: ہم کیسے اوّل بھی ہیں اور آخر بھی؟ تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا: آخر تو اس اعتبار سے کہ ہم آئے تمام انبیاء اور تمام امتوں کے بعد ہیں اور اوّل اس اعتبار سے کہ جنت میں اللہ پاک سب سے پہلے میری امت کو داخل فرمائیں گے۔ لہٰذا ''نَحْنُ الْأَوَّلُوْنَ وَالْآخِرُوْنَ'' تو یہ مطلب ہے اوّل و آخر ہونے کا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ امت بھی اوّل آخر ہو جائے اور خدا بھی اوّل و آخر ہو جائے اور نبی بھی اوّل و آخر ہو جائے۔ اور خدانخواستہ آدمی شرک تک پہنچ جائے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم سب سے آخر میں بھی ہیں اور سب سے اوّل بھی ہیں۔ یعنی ہم آئے تو دنیا میں سب سے آخر میں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے۔ حالانکہ ان کو اللہ پاک کی کتابیں ہم سے پہلے ملی تھیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتاب سب سے آخر میں ملی، لیکن اللہ پاک نے ہمیں ہدایت عطا کر دی اس چیز کے بارے میں جس میں وہ جھگڑا کرتے رہے۔ تو یہ دن دیکھو! جس میں پہلی قوموں نے جھگڑا کیا اور اللہ پاک نے ہمیں ہدایت نصیب فرما دی، حالانکہ ہم سب سے آخر میں آئے۔

اور اللہ پاک نے ہمیں فضیلت کا دن سب سے پہلے نصیب فرمایا، یعنی جمعہ کا دن۔ اور فرمایا کہ جمعۃ المبارک اللہ پاک نے ہمیں عطا فرمایا اور ہمارے بعد والا دن یہود کے لیے اور اس کے بعد والا دن یعنی اتوار نصاریٰ کے لیے ہے۔ تو یہاں پر بھی اللہ پاک نے ہمیں صحیح دن پر پہنچا دیا۔ اس لیے علماء کرام نے فرمایا کہ ہفتہ میں سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے اور سال میں سب سے افضل دن عرفات کا دن ہے اور اگر اللہ پاک ان دونوں کو جمع کر دے تو سبحان اللہ!! دو برکتیں اور دو رحمتیں جمع ہو جائیں گی۔

باقی لوگوں نے جو حجِ اکبر کا مسئلہ بنایا ہے، اس کا قرآن و حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے کہ جمعہ کے دن تو حجِ اکبر ہوتا ہے اور اگر جمعہ کا دن نہ ہو تو حج چھوٹا ہو جاتا ہے۔ یہ لوگوں کی طرف سے رواج بن گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے دو عیدیں اکٹھی ہو گئی ہیں: ایک جمعہ کے دن کی عید اور ایک عرفات کے دن کی عید۔ ایک عرفات کے دن کی فضیلت اور ایک جمعہ کے دن کی فضیلت۔

ہفتے کے دنوں کی ترتیب:

ایک روایت میں آتا ہے کہ ان لوگوں نے اختلاف کیا کہ ہم کونسا دن اختیار کریں؟ یہود نے سبت یعنی ہفتہ کے

دن کو چن لیا اور نصاریٰ نے اتوار کا دن۔ اصل میں یہ لوگ کہتے تھے کہ اللہ پاک نے آسمان وزمین کو چھ دنوں میں بنایا۔ سب سے پہلے جس دن کام شروع کیا وہ یوم الاحد یعنی اتوار کا دن تھا، اس کے بعد یوم الاثنین یعنی پیر کا دن، اس کے بعد یوم الثلاثاء (منگل) تیسرا دن ہے، اس کے بعد یوم الاربعاء (بدھ) چوتھا دن، اس کے بعد یوم الخمیس (جمعرات) پانچواں دن آگیا، پھر یوم الجمعہ (جمعہ) چھٹا دن آگیا، تو چھٹے دن اللہ پاک نے ساری کائنات پیدا کر دی اور فارغ ہوگیا، لہٰذا اللہ پاک نے چھ دن کام کیا اور ساتویں دن یوم السبت چھٹی ہوگئی، اس لیے انہوں نے اپنی عقل کے مطابق یہ بات سمجھی کہ ہفتہ کے دن اللہ پاک نے چھٹی کی تھی تو مخلوق کو بھی چھٹی کرنی چاہیے...... اگر خالق کائنات اور اس کائنات کا رکھوالا بھی چھٹی کرے تو کائنات برباد ہوجائے۔ آپ اگر دفتر میں ایک چھٹی کرلیں تو اگلے دن آدھا کام غبن ہوتا ہے۔ یہ تو اس کی شان ہے: ﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۵۵] وہ ایسا زندہ ہے جس پر کبھی موت نہیں آئے گی اور وہ ایسی ذات ہے جو سب کو سنبھالنے والی ہے۔ وہ ایسی ذات ہے جو اونگھ اور نیند سے بھی پاک ہے۔ یہ اس کی صفات ہیں...... بہرحال یہود کا فلسفہ تھا کہ اللہ پاک نے چھ دن کام کیا اور ساری مخلوق کو بنایا اور پھر ساتویں دن چھٹی ہوگئی، لہٰذا انہوں نے ہفتہ کے دن کو چن لیا۔

مسلمانوں کا افضل دن جمعہ ہے:

اور نصرانیوں نے کہا کہ نہیں، بلکہ ابتداء عالم اور تخلیق کائنات یوم الاحد (اتوار) سے شروع ہوئی تو ہم ابتداء والے دن سے چھٹی کرتے ہیں۔ لیکن خدا کی قدرت دیکھیں کہ ان چھ دنوں میں جو سب سے افضل دن تھا اس کی ان کو ہدایت نہ ہوئی۔ اس کو نہ یہود نے چنا اور نہ نصاریٰ نے چنا۔ اللہ پاک نے وہ دن امت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے باقی رکھ لیا؛ اس لیے کہ ''خَیْرُ اُمَّةٍ'' امت محمدیہ ﷺ ہے۔

یہود ونصاریٰ اور مسلمانوں کے قبلہ میں فرق:

اسی طرح انہوں نے نماز میں بھی اختلاف کیا۔ بعض نے کہا کہ ہم رکوع تو کریں گے، لیکن سجدہ نہیں کریں گے۔ اور بعض نے کہا کہ ہم سجدہ کریں گے، لیکن رکوع نہیں کریں گے۔ اللہ پاک نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت کو ایسی نماز عطا فرمائی کہ جس میں رکوع بھی ہے، سجدہ بھی ہے اور قیام بھی ہے۔ پس آپ ﷺ کی امت کو جامع ترین نماز نصیب ہوئی۔

نماز کے طریقے میں بھی اختلاف:

اور نماز کے طریقے میں بھی اختلاف ہوا۔ بعض لوگ نماز پڑھتے تھے اور باتیں بھی کرتے تھے۔ اور بعض لوگ نماز بھی پڑھتے تھے اور چلتے پھرتے بھی رہتے تھے۔ لیکن اللہ پاک نے امتِ محمدیہ ﷺ کو سب سے افضل ترین طریقہ نماز کا طریقہ عطا فرمایا کہ جب نماز پڑھیں گے تو قبلہ بھی ابراہیمی اور نماز میں قیام، رکوع، سجود، خشوع، خضوع اور قرآن پاک بھی ہے۔ اللہ پاک کا ذکر بھی ہے، نبی پاک ﷺ پر درود وسلام بھی ہے اور آخر میں دعا بھی ہے۔

یہود ونصاریٰ و مسلمانوں کے روزوں میں فرق:

انہوں نے روزوں میں بھی اختلاف کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم آدھا آدھا دن روزہ رکھیں گے اور پچھلے آدھا دن روزہ نہیں رکھیں گے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ پہلا آدھا دن کھاتے پیتے رہو اور پچھلے آدھے دن روزہ رکھ لو۔ اور بعض نے کہا کہ روزہ کا معنی ہے بند ہونا ہے تو ٹھیک ہے، ہم فلاں چیز کھائیں گے اور فلاں چیز نہیں کھائیں گے۔ مگر روزہ کا افضل ترین طریقہ اللہ پاک نے امت محمدیہ ﷺ کو عطا فرمایا: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ﴾ [البقرۃ:۱۸۷]

حضرت ابراہیم علیہ السلام ملتِ حنیف پر تھے:

اللہ پاک نے فیصلہ فرما دیا: ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾ [آل عمران:۶۷] حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودیت پر تھے، نہ ہی نصرانیت پر تھے اور نہ مشرکین کے ساتھ تھے، بلکہ وہ تو سب کو چھوڑ کر خالص مسلمان تھے، اسلام اور ایمان پر تھے۔ لہٰذا اس پر بھی امت محمدیہ مصطفیٰ ﷺ کو ہدایت ملی۔

امتِ محمدیہ ﷺ ہدایت پر:

پہلی قوموں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی اختلاف کیا، یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور کہا کہ وہ...... نعوذ باللہ...... یوسف نجار کی اولاد ہیں اور ان کی والدہ محترمہ پر زنا کی تہمت لگائی۔ اور نصرانیوں نے آپ کو اتنا بڑھایا کہ...... نعوذ باللہ...... آپ کو اللہ کا بیٹا بنا دیا۔ حالانکہ اللہ پاک نے تو فرمایا کہ ہم نے تو ان کو "کلمۃ اللہ" اور "روح اللہ" ہونے کا لقب دیا ہے، وہ اللہ کا رسول اور نبی ہے۔ ہم نے اس کو بغیر باپ کے پیدا کیا ہے۔

اس میں بھی امت محمدیہ ﷺ کو ہدایت کا راستہ ملا کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رسول ہونے کے قائل ہیں اور آپ کے نبی ہونے کے قائل ہیں۔ تو یہ حق کا راستہ بھی ملا ہے تو امت محمدی مصطفیٰ ﷺ کو ملا ہے۔ یہودی بھی بھٹک گئے، نصرانی بھی بھٹک گئے اور ہدایت ملی تو امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملی۔

یہ عظمت اور شان بھی امت محمدیہ ﷺ کو ملی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بات میں ان کو اس طریقہ پر رکھا جو سب سے پہلا طریقہ تھا، یعنی اللہ پاک کے دین پر چلنا۔ ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ [البقرۃ: ۲۱۳] اللہ پاک نے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں سب کو ہدایت پر رکھا تھا، اسی طریقے سے اللہ پاک نے امت محمدیہ ﷺ کو بھی وہی ہدایت عطا فرمائی اور باقی لوگ اختلاف میں الجھتے چلے گئے۔ حالانکہ یہود بھی اہلِ کتاب اور نصاریٰ بھی اہلِ کتاب، ان کے پاس بھی ستر ہزار انبیاء کرام تشریف لائے، لیکن وہ اِفراط وتفریط کا شکار ہوتے چلے گئے اور بھٹک گئے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہدایت عطا فرمائی۔

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۗ أَلَآ إِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۱۴]

''کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جیسے تم سے پہلے کے لوگوں پر آئے تھے کہ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور ہلا دیئے گئے، یہاں تک کہ پیغمبر اور جو اس کے ساتھ ایمان والے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ یاد رکھو! اللہ کی مدد نزدیک ہے۔''

آیات کا ماقبل سے ربط:

اللہ پاک نے ان آیات میں یہ بیان فرمایا کہ پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو ایمان کے مقابلے میں کتنے امتحانات تکالیف اور مشقتیں آئیں۔ ان آیات میں مومنین کے لیے ایک طرح کی تسلی کا ذکر ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر ایمان لانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت جو شمع رسالت کے سب سے پہلے پروانے ہیں، جب وہ ایمان لے آئے تو ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اپنے بھی مخالف اور بیگانے بھی مخالف۔ اور پھر ایمان

لانے والے چند ایک افراد ہیں، کفر کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے اور لڑائی بھی نہیں کر سکتے تو جب ظلم و ستم سے پالا پڑے تو لازمی بات ہے کہ انسان کے دل میں ایک غم اور پریشانی آتی ہے۔

جنت کی وسعت:

تو ان آیات میں اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا کہ اے مدنی! آپ اپنی امت کو سمجھا دیں کہ کیا آپ کی امت نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم ایسے ہی جنت میں چلے جائیں گے اور ہم پر کوئی امتحان نہیں آنے کا؟ یعنی اتنی بڑی نعمت کہ جنت جیسی عظیم نعمت، جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کیا چیز ہے؟ اور جس جنت کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اگر سات آسمانوں کو بچھا دیا جائے اور سات زمینوں کو بچھا دیا جائے تو ایک جنت کا عرض بنے گا طول کا علم تو اللہ پاک کو ہی ہے۔ اور پھر ایک جنت بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں تو کئی جنتیں ہیں۔ جیسے قرآن مقدس میں کہیں جنت الفردوس کا ذکر ہے، کہیں جنت الماویٰ کا ذکر ہے، کہیں جنت النعیم کا ذکر ہے اور کہیں جنت الخلد کا ذکر ہے۔

اتنی بڑی جنت کہاں ہے؟

سوال: اتنی بڑی جنت جو آسمانوں سے بھی بڑی ہے اور زمین سے بھی بڑی ہے، وہ کہاں ہے؟

جواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ تشریف فرما تھے کہ آپ کی خدمت میں ایک یہودی آیا۔ اس نے بھی یہی اعتراض کیا: آپ کا عقیدہ ہے کہ اللہ پاک نے جو جنت بنائی ہے وہ آسمانوں اور زمینوں سے بھی بڑی ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بالکل ہمارا ایمان ہے۔ اس نے کہا: پھر وہ کہاں ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے یہ بتاؤ کہ اب اس وقت دن ہے یا رات؟ اس نے کہا: دن ہے۔ آپ نے فرمایا: پھر رات کہاں ہے؟ اب وہ چپ کر کے بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا: رات کہاں چلی گئی؟ اگر رات آجاتی تو پھر دن کہاں چلا گیا۔ اور خداوند قدوس کلام پاک میں فرماتے ہیں: ﴿يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ [الحج: ۶۱] ہم رات کو دن میں داخل کر دیتے ہیں اور دن کو رات میں داخل کر دیتے ہیں۔ تو اگر رات ہے اور دن نہیں ہے اور دن ہے تو رات نہیں ہے۔ تو جو اس بات پر قادر ہے وہ جنت پر بھی قادر ہے۔ انہوں نے فرمایا: تم عجیب آدمی ہو! تمہارے اور ہمارے سامنے تو فقط کرۂ ارض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو پتہ نہیں کتنی مخلوقات ہیں!! جن تک ہمارا علم نہیں پہنچا۔

کائنات کے عجائبات:

یعنی اتنی ترقی کے باجود، اتنے کمالات کے بن جانے کے باوجود اب بھی جدید ماہرینِ فلکیات یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ایسے ایسے ستارے بھی موجود ہیں، جن کی روشنی ابھی تک زمین پر بھی نہیں آئی۔ اور پھر یہ کرہ مشتری ہے، کرہ زحل ہے، عطارد ہے۔ اتنے بڑے کرات ہیں کہ آپ جیسی سات زمینیں بھی ان کے اندر آجائیں۔ اور بعض کرات تو اللہ پاک نے ایسے بھی بنائے ہیں کہ دیکھیں کہ سارا آسمان و زمین کے لیے ایک چاند ہے اور بعض کرات ایسے ہیں جہاں پر اس جیسے سینکڑوں چاند ہیں۔ تو پھر یہ اعتراض تو ہم اس لیے کرتے ہیں کہ ہم جاہل ہیں اور ہمارا علم ناقص ہے، ہماری معلومات وہاں تک نہیں جاسکتیں۔ ورنہ جنت بھی حق ہے اور جہنم بھی حق ہے۔ اور جنت کی اللہ پاک نے صرف خبر ہی نہیں دی، بلکہ نبی پاک ﷺ تو خود جنت کے اندر جا کر دیکھ آئے، یعنی اللہ پاک نے قرآن پاک میں فرما دیا اور نبی پاک ﷺ نے آنکھوں سے سیر بھی کر لی۔

تو کیا اتنی بڑی نعمت بغیر مشقت کے مل جائے گی؟ اب دنیا میں چھوٹا سا گھر بنانے کے لیے اتنی محنت و مشقت پڑے گی تو کیا تم بغیر محنت کیے جنت میں چلے جاؤ گے؟ تم ایک چھوٹی سی دنیا آباد کرنے کے لیے اور چھوٹا سا باغ لگانے کے لیے اتنی محنت کرتے ہو۔ ایک مربع زمین میں باغ لگانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کرتے ہو، مالی رکھتے ہو، بیلدار رکھتے ہو، دیواریں بناتے ہو، پودے لگواتے ہو، مٹی بدلتے ہو، زمین میں کھاد دیتے ہو، نالیاں بناتے ہو، سردی اور گرمی سے بچانے کے انتظامات کرتے ہو۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ ایک چھوٹا سا باغ اور وہ بھی دنیا کا حقیر سا باغ! اس کے لیے اتنی محنت کرتے ہو تو وہ جنت کا باغ ہے جس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے، وہ تمہیں بغیر کسی محنت اور ابتلاء کے کیسے حاصل ہو جائے گا؟

امتوں کی آزمائش:

بہرحال اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا کہ کیا تم گمان کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تم پر وہ حالات نہیں گزریں گے جو تم سے پہلے لوگوں پر گزرے؟ یعنی جو امتیں پہلے گزر چکی ہیں ان کو ایسا فقر و فاقہ پہنچا اور ایسی شدید بھوک آئی اور ابتلاء آیا کہ کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا اور اس کے بعد ایسی ایسی بیماریاں اور تکلیفیں آئیں اور وہ امتحان میں ایسے ہلائے گئے اور ایسے جھنجھوڑے گئے کہ اللہ پاک کے رسول اور ایمان لانے والے کہنے لگے: اللہ

پاک کی مدد کب آئے گی؟ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔ یعنی یہ امتحان کی آخری حد ہے کہ اللہ پاک کے رسول بھی گھبرا جائیں اور ایمان والے بھی گھبرا جائیں اور گھبراہٹ میں اور شدتِ اضطراب میں یہ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد پتہ نہیں کب آئے گی؟ یہ اعتراض نہیں تھا، بلکہ یہ انتہائی مجبوری کا کمال تھا کہ مجبوری کی ان آخری حدود کو پہنچ گئے، ورنہ وہ اللہ پاک کی مدد میں کوئی شک تو نہیں کرتے۔ اللہ کی مدد میں شک کرنا تو...... نعوذ باللہ...... کفر ہے۔ اللہ پاک کا تو وعدہ ہے کہ میں مومنین کی مدد کروں گا اور میں رسولوں کی مدد کروں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آخری حد ہوگئی۔ یعنی اس سے بڑا کام اور کیا ہوگا کہ اللہ پاک کا پیغمبر ایک درخت کی اوٹ میں آجائے اور دشمن سر پر آرا رکھے اور سر پر آرا چل کر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائیں، اس سے بڑا ابتلاء اور کیا ہو سکتا ہے!؟

حضور ﷺ کو سب سے زیادہ تکالیف پہنچائی گئیں:

آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَشَدُّ بَلَاءً اَلْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ)) [کنز العمال:۳۲۵۵]

سب سے زیادہ مصیبتیں اور امتحان انبیاء کرام پر آئے ہیں اور انبیاء کے بعد پھر جیسے کسی کی شان بڑی ہوتی ہے اتنا ہی اس کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وَلَقَدْ أُوذِيتُ فِي اللّٰهِ وَمَا يُؤْذٰى أَحَدٌ'' [سنن الترمذی، رقم: ۲۴۷۲] (اللہ کے راستے میں اتنی تکلیفیں مجھے پہنچائی گئی ہیں کہ کسی کو اتنی تکلیفیں نہیں پہنچیں)۔

سب سے زیادہ شان محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے، اس لیے سب سے زیادہ امتحان بھی محمد رسول اللہ ﷺ کا ہوا۔ اور تصور کریں کہ نبی پاک ﷺ کعبہ شریف کے اندر ہوں اور کافر نے گلے کے اندر کپڑا ڈال کر کھینچا کہ آپ ﷺ کی آنکھیں مبارک باہر کو نکل آئیں۔

تصور کریں کہ آپ ﷺ سجدے میں گئے اور سر مبارک سجدہ میں ہے اور ابوجہل نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر باہر سے ایک مردہ جانور کا اوجھ اٹھا کر حکم دیا کہ آپ ﷺ کے گردن پر رکھ دو۔ اور آپ ﷺ سجدہ میں ہیں اور کسی کو جا کر اسے ہٹانے کی جرات بھی نہیں ہو رہی؛ اس لیے کہ سامنے کفار کے بڑے بڑے سردار کھڑے ہیں، غریب مسلمان کی کیا جرات ہو سکتی ہے کہ ان سے مقابلہ کرے؟ آخر ایک انسان کو اتنا جذبہ ہوا کہ اس نے جا کر چپکے سے آپ ﷺ کے گھر میں اطلاع دے دی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو چھوٹی بچی تھیں وہ دوڑ کر آئیں اور انہوں

نے آ کر اس اوجھ کو ہٹایا۔ اس کے بعد دعا کی کہ یا اللہ! ان لوگوں پر لعنت کر جن لوگوں نے محمد مصطفیٰ ﷺ کا حیا بھی نہ کیا، انہوں نے تیرے نبی پاک ﷺ کے ساتھ اتنا ظلم کیا۔ اور جس راستے سے آپ ﷺ گزرتے تھے اس راستے پر کانٹے بچھا دیے جاتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آزمائش اور ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ'' کا پروانہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انگاروں پر لٹا دیا گیا۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی ٹانگوں میں ابوجہل بدبخت نے رسے ڈالے اور ایک رسا اونٹ کو باندھا اور دوسرا رسا دوسرے اونٹ کو باندھا اور دو مختلف سمتوں میں اونٹ کھڑے کیے اور وہ ظالم سامنے کھڑا ہے۔ ادھر اونٹوں کو دوڑانے کا حکم دیا اور ادھر حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے بدن میں نیزہ مارا۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ بغیر آزمائش اور امتحان کے ویسے جنت حاصل نہیں ہوجاتی، البتہ اللہ پاک اپنی شانِ رحمت کا نظارہ کر کے بعض لوگوں کو بغیر مشقت کے بھی جنت دے دیتا ہے کہ کوئی عمل بھی نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ راضی ہوگیا۔ کلمہ پڑھا اور موت آگئی، نماز پڑھنے کا اور روزہ رکھنے کا موقع بھی نہیں ملا اور جنت میں چلے گئے۔ یہ واقعات استثنائیہ ہوتے ہیں، ورنہ سنت الٰہی یہ ہے کہ یہ دنیا دار العمل اور دار الامتحان ہے۔ یہاں پر قدم قدم پر آزمائش ہوگی۔ جتنا ایمان بڑا ہوگا اتنا ہی امتحان بڑا ہوگا۔

اللہ پاک نے قرآن میں یہ نقشہ کھینچا کہ اے میرے محبوب! یہ اتنی تکالیف آپ پر ہی نہیں آئیں، آپ سے پہلے جو ایمان والے گزرے ہیں ان پر بھی تکالیف اور امتحانات آئے ہیں۔ اور ان کو تو امتحانوں نے اتنا جھنجوڑ ڈالا کہ اضطراب میں وہ یہ الفاظ کہنے لگے: ﴿مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾ (اللہ کی مدد کب آئے گی؟) جواب ملا: ﴿اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾

لیکن جو امتحانوں میں پاس ہو کر گزر جائے، ایمان پر قائم رہے تو ان کا مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے بلال! معراج کی رات میں نے تمہارے چلنے کی آواز جنت میں سنی ہے۔ آپ کو انگاروں پر لٹایا گیا اور توحید پر ثابت قدم رکھا گیا تو اللہ پاک نے انہیں بھی مرتبہ عطا کیا۔ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمر! میں نے جنت میں ایک سفید موتیوں کا محل دیکھا۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا ''لِمَنْ هٰذَا؟'' یہ کس کا محل ہے؟ تو جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: حضور! یہ آپ کے ساتھی عمر کا محل ہے۔ پھر جو لوگ

آزمائشوں اور امتحانات میں ثابت قدم رہتے ہیں اللہ پاک ان کو مرتبہ بھی ایسے ہی عطا فرماتے ہیں اور ان کو اسی طرح کے بدلے بھی عطا کرتے ہیں۔

امتحان اور آزمائش کی صورتیں:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّٰبِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر:۱۰] وہ کبھی تو شدید قسم کی بیماری دے کر امتحان لیتا ہے، کبھی درد اور کبھی مصائب۔ تو یہ آزمائش کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اللہ پاک نے جیسے اس دنیا کو دار العمل اور دار الامتحان بنایا، اسی طرح وہ اپنے بندوں کا بھی امتحان لیتے ہیں۔ تو امتحان میں جو پاس ہو گیا وہ کامیاب ہو گیا اور جو فیل ہو گیا وہ ناکام ہو گیا۔ اب اس امتحان اور آزمائش کے کئی طریقے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾
[البقرة:۱۵۵]

ہم تمہاری آزمائش کرتے ہیں خوف سے بھی کہ دشمن چڑھ دوڑا، ہر وقت خوف ہے، جنگ ہے اور قتل ہے۔ تو آدمی خوف و عذاب میں مبتلا ہے۔ اور کبھی فصلیں برباد ہو گئیں، کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ اور کبھی مال میں بیماری آ گئی، مال ختم ہو گیا۔ کبھی باغات میں بیماری آ گئی، باغات ختم ہو گئے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے امتحان کے مختلف طریقے ہیں، لیکن ان امتحانات میں کھرا ہو کر جو نکل جائے، یعنی جس نے صبر کیا اور جزع فزع نہیں کی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہا تو فرمایا کہ ان کو خوشخبری دے دو جنہوں نے صبر کیا۔ اور اللہ پاک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّٰبِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر:۱۰] جو مصائب پر صبر کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو قیامت میں بغیر حساب کے بدلہ عطا فرماتے ہیں، یعنی اس کا کوئی حساب اور کوئی حد نہیں ہوگی۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ہر عمل کے لیے کوئی میزان ہوگا، نماز کے لیے علیحدہ میزان، روزہ کے لیے علیحدہ میزان اور خیرات کے لیے علیحدہ میزان۔ سب کو اس کے میزان کے مطابق اجر ملے گا۔ ہر چیز کی ایک حد اور حساب ہے، لیکن جب صبر والے آئیں گے تو اللہ پاک فرمائیں گے کہ صبر والوں کو بلاؤ اور حکم ہوگا کہ ان پر میرا ثواب انڈیل دو، ان سے کوئی حساب نہیں۔ اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے: کل جب صبر والے دیکھیں گے

کہ ان کو اتنا ثواب مل گیا تو وہ کہیں گے کہ ہائے کاش! دنیا میں ہمارے بدنوں کو مقراض (قینچیوں) کے ساتھ کاٹ دیا جاتا اور ہمارے بدنوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے تو آج ہمیں اس کا اور بھی زیادہ اجر ملتا۔

اللہ پاک کبھی دولت دے کر آزماتے ہیں اور کبھی دولت چھین کر آزماتے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم پر پہلے تو فقر و فاقہ کا امتحان آیا کہ غربت اور تکلیف کہ اسلام میں چند لوگ ہوتے تھے، کھانے کو نہیں مل رہا، تکلیفیں ہیں اور پریشانیاں ہیں۔ اندازہ کریں کہ ہم لوگوں کو تو ایک دن بھی کھانا نہ ملے تو ہمارا اگلا پچھلا سارا ختم ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں کہ کیا قیامت ٹوٹ گئی کہ تقدیر ہمارے ہی گلے میں پڑ گئی ہے؟ اور وہاں یہ عالم تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ'' حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے کبھی پیٹ بھر کھجوریں بھی نہیں کھائیں جب تک خیبر فتح نہیں ہوا۔ اسی طریقہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: دو دو مہینے گزر جاتے کہ میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اماں جان! اس کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا: کچھ ہو تو پکائیں گے۔ آگ کس کے لیے جلائیں؟ گھر میں نہ گوشت ہے، نہ سالن ہے اور نہ دال ہے تو آگ کس کے لیے جلائی جائے؟ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: پھر گزر کیسے ہوتا تھا؟ تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کھجور کے دو دانے مل گئے، ان کو کھا لیا اور پانی پی کر شکر ادا کیا۔

میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا یہ عالم تھا اور ابتلاء کا یہ عالم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ ایک صحابی گزرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رونے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو مبارک آ گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: حضور! کیا بات ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ آدمی ہے کہ جب تک کافر تھا تو ایک ایک دن میں دو دو تین تین جوڑے بدلتا تھا اور جب مسلمان ہوا تو یہ اس حالت میں آپ کے سامنے ہے۔ اور یہ امتحان ہے کہ لباس پہننے کو بھی کچھ نہیں ملتا تھا۔ یہ امتحان کی حالت ہے کہ میں اس کی سابقہ حالت کو دیکھ کر رو پڑا۔

شریف لوگ پریشان اور دوسرے خوش کیوں؟

جتنا ایمان مضبوط ہوگا اتنا ہی امتحان بھی سخت ہوگا اور جتنا ایمان کمزور ہوگا اور جتنا اسلام سے دور ہوگا اس پر کوئی مشقت نہیں آتی۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ کفار کتنے مزے کر رہے ہیں؟ کھانا، پینا، دولت اور اقتدار کی کرسی، سب کچھ ان کے پاس ہے۔ اور پھر مسلمانوں کو دیکھو کہ ہر مقام میں ابتلاء اور پریشانی میں ہیں۔ اور جو جتنا زیادہ پکا مسلمان ہے اتنی بڑی پریشانی ہے، یعنی آپ گھر میں دیکھ لیں کہ وہ لڑکیاں جن کا کردار ٹھیک نہیں ہے، جو عریانیت

کی عادی ہیں، موجودہ ماڈرن ائز طبقے میں مکمل رل گئی ہیں، نہ ان میں حیا ہے، نہ ہی شرم اور نہ ہی شرافت ہے، جینز پہنتی ہیں، ڈانس کرتی ہیں، غیر محرم مردوں کے ساتھ کلبوں میں جا کر کھیلتی ہیں، ان کے گھر بڑے آباد ہیں، شوہر بھی ان کے بڑے فرمانبردار ہیں، ان کی سوسائٹی میں بھی بڑی تکریم ہے۔ اور جو عورت نماز، روزہ اور قرآن پاک کی پابند ہے، وہ ماں باپ کے گھر میں بیٹھی رو رہی ہے۔ تجربہ کر لو جو جتنا بے حیا ہے وہ اتنا مزے میں ہے۔ جتنا ایمان ہے اتنا ابتلاء ہے۔ اسلام پر کوئی مضبوط ہے اتنا ہی امتحان ہے۔ یہ اللہ پاک کی حکمتیں ہیں۔

لیکن یاد رکھیں! یہ کبھی تو عذاب میں رگڑے جاتے ہیں؛ کیونکہ جب آگ جلتی ہے تو جب سوکھی لکڑیاں جلتی ہیں تو گیلی لکڑیاں بھی ساتھ جل جاتی ہیں۔ تو پھر قیامت کے دن ہر کوئی اپنے عمل پر کھڑا ہوگا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی بڑا مؤمن اور بڑا صالح اور عابد ہے، لیکن امتحان ہے، جیسے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ پر امتحان آیا۔ قید میں ڈالے گئے، کوڑے مارے گئے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر کتنے امتحان آئے کہ جیل میں موت آئی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہ جن کی کتاب کو اللہ تعالیٰ نے یہ مرتبہ دیا کہ اللہ پاک کے کلام کے بعد ان کی کتاب کو روایت حدیث میں اصح الکتب کہا جاتا ہے۔ ان (امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ) کا یہ عالم تھا کہ وہ اللہ پاک سے دعا مانگنے لگے: یا اللہ! تیری زمین مجھ پر تنگ ہوگئی ہے، میں کہاں جاؤں؟ کسی ملک میں مجھے پناہ نہیں ملتی، کوئی ملک مجھے رہنے نہیں دیتا۔ جس ملک میں جاتا ہوں مجھے نکال دیتے ہیں۔ اب میں مبتلا ہوگیا ہوں، اے اللہ! کیا تیری زمین مجھ پر تنگ ہوگئی ہے؟ یا اللہ! تو مجھے اٹھا لے اور مجھے موت دے دے، تاکہ میں اطمینان سے قبر میں تو آجاؤں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مشکلات:

اہل بیت رسول پر کتنے امتحانات آئے!؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں پر کتنے امتحانات آئے!؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلفائے راشدین پر کتنے امتحانات آئے!؟ آپ اندازہ کریں کہ مدینہ منورہ کا شہر ہو اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت ہو اور پورے شرقاً غرباً اسلام کا جھنڈا لگ چکا ہو اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو پینے کے لیے پانی نہ ملے، حالانکہ وہ خلیفۃ المسلمین ہیں، خلافت ان کی ہے۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتوحات بڑی ہوئیں کہ اسلام نے کتنے ملک فتح کیے!؟ اور ان کے پاس فوج ہے، قوت ہے اور طاقت ہے، لیکن یہودیت کی ایک لابی نے ایک سازش کی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بغیر کسی گناہ کے الجھا دیا اور آپ کو گھیر لیا۔ اور گھر کے باہر باغی

کھڑے ہیں، کھانا بند ہے، پانی بند ہے، خوراک بند ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ گھر میں محصور ہیں۔ اور وہ ایسے مظلوم ہیں کہ دیوار سے سر نکال کر خطاب کیا کہ اے لوگو! تمہیں یاد ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: مدینے میں میٹھا پانی نہیں ملتا۔ اگر کوئی اس یہودی سے کنواں خرید کر مدینہ والوں کے لیے وقف کر دے تو میں اس کی جنت کا ذمہ دار ہوں؟ کیا تم لوگوں کو یہ بات یاد ہے؟ انہوں نے کہا: بالکل یاد ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کنویں کو کس نے خریدا تھا؟ تو انہوں نے کہا کہ آپ نے خریدا تھا۔ آپ نے فرمایا: میں نے خرید کر پورے مدینے والوں کو پانی پلایا، کیا تم مجھے پانی نہیں دیتے ہو؟ اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک ایک بات گنوادی۔ فرمایا: جس دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فوت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دوسری بیٹی کا نکاح دے دیا۔ جب دوسری بیٹی کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عثمان! کاش! اگر آج میری کوئی اور لڑکی بھی ہوتی تو میں تجھ سے اس کو بیاہ دیتا۔ لیکن پانی بند ہے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ قرآن پڑھ رہے ہیں اور قرآن پاک کی تلاوت کے دوران انہیں شہید کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ امتحان ہے۔

اللہ تعالیٰ امتحان کیوں لیتے ہیں؟

اللہ پاک امتحان کیوں لیتے ہیں؟ حالانکہ اللہ پاک کو پتہ ہے کہ یہ کھوٹا ہے یا کھرا ہے؟ امتحان تو وہ آدمی لیتا ہے، جس کو پتہ نہ ہو۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: مجھے تو پتہ ہے کہ میں دنیا والوں پر یہ بات کھولنا چاہتا ہوں، تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ میرا دوست کون ہے اور دشمن کون ہے؟ ایمان والا کون ہے اور کافر کون ہے؟ میرے علم میں تو سب کچھ ہے، چاہے میں امتحان لوں یا نہ لوں۔ (اور اس لیے بھی امتحان ہوتا ہے کہ ایسے حضرات کے اخروی درجات مزید بڑھا دیئے جائیں)۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۱۵، ۲۱۶]

''آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں: کیا چیز خرچ کریں؟ آپ فرما دیجئے: جو مال بھی تم خرچ کرو تو ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے۔ اور تم جو بھلائی کرو گے بے شک وہ اللہ کو معلوم ہے۔ جہاد کرنا تم پر فرض ہے، حالانکہ وہ تمہیں ناگوار ہے۔ شاید کہ تمہیں ایک چیز بری لگے اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور شاید کہ تم کسی چیز کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

انفاق فی سبیل اللہ کی مقدار اور مواقع:

ان آیات مبارکہ میں انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کا بیان ہے کہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ اس میں علماء کرام نے فرمایا کہ اب سوال کا یا تو آپ یوں کہیں گے کہ گویا کہ ان سوالات کے بارے میں فتویٰ دینے والی ذات اللہ پاک ہے کہ اللہ پاک نے اپنے عرش سے فتویٰ جاری کیا، یا یوں کہیں کہ اللہ پاک نے وحی کے ذریعے مدنی پاک ﷺ کے دل میں القاء کیا اور فتویٰ دینے والی ذات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہے اور حکم دینے والی ذات رب العلیٰ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ﴿مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ اب چند آیتوں کے بعد پھر یہی سوال آئے گا۔

گویا کہ یہاں چند سوالات اور ان کے جوابات کا ذکر ہے۔ سوال ایک ہے اور اس کے دو جز ہیں: پہلا جز یہ ہے کہ کیا خرچ کریں؟ اور دوسرے جز کا مطلب یہ ہے کہ کہاں خرچ کریں؟ اس آیت مبارکہ میں تو اس جز پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ کہاں خرچ کریں؟ اور کیا خرچ کریں اس کے بارے میں اشارہ آ گیا کہ ﴿مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۱۵]۔ اور دوسری جگہ پر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۱۹] کہ جو کچھ زیادہ ہے وہ خرچ کرو۔

تو اب یہ سمجھیں کہ کیا خرچ کریں؟ کونسا مال خرچ کریں؟ اور کہاں خرچ کریں؟ جہاں تک پہلے سوال یعنی مال میں سے کیا خرچ کرنے کا ہے، اس کا تو بڑا اجمالی جواب ہے کہ جو بھی تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں بھلائی اور اچھے کام کرو گے اللہ پاک جانتے ہیں، یعنی چاہے تم پیسہ خرچ کرو، سونا خرچ کرو، چاندی خرچ کرو، کپڑا خرچ کرو، مال خرچ کرو، جو بھی خرچ کرو۔ اس میں ایک تو عموم آ گیا اور دوسری آیت مبارکہ میں یہ آ گیا کہ خرچ تو کرو، لیکن وہ خرچ کرو جو زائد ہو، یعنی تمہاری ذاتی ضروریات اور گھر کے خرچ سے جو زیادہ بچی ہوئی ہو۔ یہ معنی نہیں کہ تمہارے بیوی بچے

بھوکے بیٹھے ہوئے ہوں اور تم ان کو کہو کہ ہم نے خیرات کر دیا ہے۔ یہ شریعت میں حرام ہے۔ شریعت اس کی کوئی اجازت نہیں دیتی۔ شریعت جہاں ہمیں توکل کا سبق دیتی ہے وہاں اسباب پر عمل کرنے کا بھی سبق پڑھاتی ہے کہ اسباب پر عمل کرو، لیکن توکل میری ذات پر کرو۔ اونٹ کو رسی سے بھی باندھو، پھر بھروسہ بھی اللہ پاک کی ذات پہ کرو۔ اپنی طرف سے محنت، مزدوری اور نوکری کرو، لیکن توکل اللہ پاک کی ذات پہ کرو۔ اگر اللہ کے نبی پاک ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو سال کا خرچہ دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت میں یہ حکم ہے کہ آدمی اپنے بیوی بچوں کے لیے خرچ کا پورا پورا انتظام کرے اور اپنی ذاتی ضروریات سے جو چیز بچ جائے اس میں سے خیرات کرے۔

اور یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ مثلاً: ایک آدمی پر قرضہ ہے اور اللہ پاک نے اس کو پیسے دے دیئے، وہ خیرات کر رہا ہے تو یہ ناجائز ہے۔ اس کے ذمے ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنا قرضہ ادا کرے، پھر اس کے بعد خیرات کرے؛ اس لیے کہ قرضہ حقوق العباد میں سے ہے، جو توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا، جب تک کہ قرضہ لینے والا معاف نہ کرے۔ تو قرضہ سر پر موجود ہو اور کوئی خیرات کرے تو یہ نیکی شمار نہیں ہوگی۔ اسلام نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ خرچ کرو، لیکن جو تمہارے پاس زیادہ بچے، پہلے بیوی بچوں کا اور اپنا خرچہ قرضہ ادا کرنے کے بعد زائد مال بچ جائے، اس سے خرچ کرو وغیرہ۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تو یہ عالم تھا کہ جیسے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور بھی بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے تھے کہ ﴿قُلِ الْعَفْوَ ۔﴾ کا معنی یہ ہے کہ جو تمہارے خرچ سے زائد بچے وہ سب خیرات کر دو۔ مثلاً: اگر تمہارے پاس کپڑوں کے دو جوڑے ہیں تو ایک پہن لو اور دوسرا خرچ کر دو، اسے رکھنے کا تمہیں حکم نہیں ہے۔ اگر تم نے کھانا کھایا ہے اور ایک روٹی بچ گئی ہے تو اسے فوراً خیرات کر دو، اسے رکھنا نہیں ہے۔ لیکن یہ ان کا اپنا اجتہاد تھا، فتویٰ اس پر نہیں ہے۔ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم، جمہور تابعین اور جمہور علماء رحمہم اللہ کا فتویٰ یہ ہے کہ انسان اللہ کے حق اور بندوں کے حق ادا کرنے کے بعد اگر جائداد رکھے تو یہ جائز ہے، کوئی منع نہیں ہے۔

اللہ پاک نے ہمیں حکم دیا کہ خرچ کرو اور کہاں کرو؟

۞..... اللہ پاک نے فرمایا کہ سب سے زیادہ حق والدین کا ہے۔ اور علماء کرام فرماتے ہیں کہ دادا دادی اور نانا نانی وغیرہ سے بھی زیادہ حق والدین کا ہے۔ اور علماء کرام فرماتے ہیں کہ دادا دادی اور نانا نانی وغیرہ سب والدین

کے ضمن میں آجاتے ہیں۔

❁......سب سے زیادہ حق والدین کا ہے اور والدین کے بعد رشتہ داروں کا حق ہے۔ اور رشتہ دار جتنا زیادہ قریبی اتنا زیادہ حق رکھتا ہے۔

❁......اور اس کے بعد یتیم تمہاری خیرات کے حق دار ہیں۔

❁......اور اس کے بعد مساکین، یعنی محتاج، لیکن ایسے محتاج جو کسی سے سوال نہیں کرتے اور ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی حاجت کو اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھتے ہیں۔

❁......اور اس کے بعد مسافر یعنی سفر میں آنے والے، چاہے سفر میں کوئی امیر ہے، لیکن پیسے گر گئے یا جیب کٹ گئی، نقصان ہو گیا تو وہ بھی تمہارے خرچ کے حق دار ہیں۔

ان باتوں کو سمجھیں کہ پہلا ذکر والدین کا، دوسرا رشتہ داروں کا، تیسرا یتیموں کا، چوتھا مساکین کا اور اس کے بعد مسافروں کا آیا ہے۔ اسی بات سے یہ مسئلہ سمجھیں کہ ایک تو اللہ پاک نے ہم پر زکوٰۃ فرض کی ہے کہ ہم اپنے مال میں سے سالانہ زکوٰۃ ادا کریں، لیکن ان آیات میں زکوٰۃ کا مسئلہ نہیں ہے۔ زکوٰۃ آدمی اپنے والدین کو نہیں دے سکتا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ تیرے مال کی صفائی کا ایک ذریعہ ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ کیا تم اپنے والدین کو اپنے مال کی میل کچیل کھلاؤ گے؟ اور دوسری بات فقہاء کرام نے یہ لکھی ہے کہ ''أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيْكَ'' (تم اور تمہارا مال تمہارے والد کا ہے)۔ وہ چاہیں تو تمہارا مال بقدر احتیاج لے سکتے ہیں، چہ جائے کہ تم ان کو زکوٰۃ دو، لہٰذا والدین کو تو تم زکوٰۃ نہیں دے سکتے، لیکن والدین کو اپنی خدمت کی مد سے ادائیگی کرو، زکوٰۃ اپنی اولاد کو بھی نہیں دے سکتے، اسی طرح نابالغ بچے کو بھی نہیں دے سکتے اور نہ ہی نابالغ بچے پر زکوٰۃ فرض ہے، اسی طرح خاوند اپنی بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا۔ اگر خاوند محتاج ہو تو بیوی اس کو زکوٰۃ دے سکتی ہے، باقی رشتہ داروں کو تم زکوٰۃ دے سکتے ہو۔

اسی طرح ائمہ کا اختلاف ہے کہ کیا خاوند اپنی بیوی کو زکوٰۃ دے سکتا ہے یا بیوی اپنے خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے؟ لیکن اکثر اسی پر ہیں کہ اگر بیوی مالدار ہے اور شوہر غریب ہے تو بیوی دے سکتی ہے، لیکن اگر بیوی غریب خاندان سے ہے اور شوہر مالدار ہے تو وہ اپنی بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا؛ اس لیے کہ بیوی کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہے، لیکن بیوی کے ذمہ شوہر کا خرچہ نہیں ہے، اس لیے بیوی اپنے شوہر کو زکوٰۃ دے سکتی ہے۔ اور والدین کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا، البتہ والدین اور اولاد کے علاوہ جتنے بھی رشتہ دار ہیں سب کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

صدقہ وزکوٰۃ کی برکت سے مال بڑھتا ہے:

اس لیے علماء کرام نے فرمایا کہ ان آیات میں جو حکم ہے وہ زکوٰۃ کے علاوہ صدقاتِ نافلہ کا حکم ہے۔ اور جو خرچ ہم اللہ کے راستے میں کرتے ہیں، والدین پر خرچ کرتے ہیں، رشتہ داروں، غریبوں اور فقیروں پر یعنی کسی قسم کا خرچ بھی ہم کرتے ہیں اللہ پاک کا قرآن پاک میں وعدہ ہے: ﴿وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُۥ﴾ [السبا: ۳۹] کہ جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا بدل میں دوں گا۔ اس کے بدلے کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ بدلہ دیں گے تو جیسے تم کسی بادشاہ کے پاس مثلاً: کوئی ہدیہ لے کر جاؤ تو تم ہدیہ اپنی طاقت کے بقدر لے کر جاؤ گے، بادشاہ اپنی شان کے مطابق بدلہ عطا کرے گا۔ یہ نہیں دیکھے گا کہ یہ تو ایک گلاس لے کر آیا ہے، میرے پاس بیس روپے کا، چلو بھئی! اس کو پچاس روپے دے دو۔ نہیں! بلکہ وہ اپنی شان کے مطابق بدلہ دے گا۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے تو جو تم خرچ کرو گے ﴿فَهُوَ يُخْلِفُهُۥ﴾ وہ بدلہ دے گا تو وہ بدلہ بھی اپنی شان کے مطابق عطا فرمائے گا۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''مَا نَقَصَ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ قَطُّ''[1] (اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات کرنے سے مال کبھی بھی کم نہیں ہوتا)۔ یعنی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہزار روپے میں سے مثلاً: سو روپے کم ہو گئے، لیکن اللہ پاک ایسی برکت عطا فرماتے ہیں کہ صدقہ کرنے والے کا مال کم نہیں ہوتا۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ پاک روزانہ دو فرشتے بھیجتے ہیں۔ جن کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ یہ دعا کرتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ! أَعْطِ كُلَّ مُنْفِقٍ خَلَفًا وَأَعْطِ لِكُلِّ مُمْسِكٍ تَلَفًا''[2] (اے اللہ! جس نے بھی تیرے راستے میں خرچ کیا اس کو اور زیادہ عطا فرما اور جس نے بخل کیا اے اللہ! اس کے مال میں ہلاکت و بربادی ڈال دے)۔

مال میں برکت کی صورتیں:

1 ......اب بدلہ دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو آپ نے مثلاً: ایک سو ریال خیرات کیے اور ہزار ریال مل گئے۔

2 ......اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ نے مثلاً: ایک سو ریال خرچ کیے، جو باقی آپ کے پاس پیسے بچے اللہ پاک اس میں برکت ڈال دیتے ہیں کہ چیز تو بظاہر تھوڑی ہوتی ہے، لیکن اللہ پاک اسی تھوڑے میں برکت ڈال دیتے

[1] [مجمع الزوائد: ۳/ ۲۷۵، معجم صغیر للطبرانی: ۱/ ۵۲، ۱۰۲]

[2] [الجامع الصغیر: ۱/ ۱۱۸]

ہیں۔ جیسے ہم نے ہزار ریال میں سے سو روپے صدقہ کیے، باقی نو سو بچ گئے۔ اب بظاہر ایک سو روپے کم ہو گئے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان میں ایسی برکت ڈال دیتے ہیں کہ وہ ختم ہی نہیں ہوتے۔

3 ......اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ صدقہ کا بدلہ یوں عطا فرماتے ہیں کہ کوئی آنے والی مصیبت یا بیماری ٹال دیتے ہیں کہ اگر ہم اس کا علاج کرواتے تو بہت سا مال لگ جاتا تو اللہ پاک اس بیماری کو ٹال دیتے ہیں۔ تو یہ بھی ایک بدلہ ہوتا ہے، لیکن بظاہر ہمیں نظر نہیں آتا، ہمیں سمجھ نہیں آتی، لیکن مولا اس کا ہمیں بدلہ دے چکا ہوتا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو تم نے کھا لیا فنا ہو گیا، جو تم نے پہن لیا وہ بوسیدہ ہو گیا اور جو تم نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر دیا وہ تمہارا اللہ تعالیٰ کے ذخیرہ میں محفوظ ہو گیا۔

❁......اللہ پاک نے ان آیات میں سب سے پہلے فرمایا: "فَلِلْوَالِدَيْنِ" والدین پر خرچ کرو۔

❁......پھر فرمایا: "وَالْأَقْرَبِينَ"۔ رشتہ داروں کو دینے میں دو ثواب ہیں: صدقہ کا ثواب اور دوسرا صلہ رحمی کا ثواب۔

اور اس کے بعد فرمایا: ﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝﴾ اور جو بھی تم بھلائی کا کام کرتے ہو اللہ پاک اس کو جاننے والے ہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ تم نے کیا ہو اور اللہ پاک کو پتہ بھی نہ ہو نہیں، بلکہ ہر چیز اللہ پاک کے علم میں ہے۔ تو اللہ پاک اس کا تمہیں پورا بدلہ دیں گے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ﴾ [البقرة:۲۱۶] تم پر جہاد فرض کر دیا گیا۔ ابتدائے اسلام میں خاتم الانبیاء سرکار دو جہاں ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالیں تو آپ ﷺ کی پہلی زندگی جب آپ ﷺ نے دعوت کی ابتدا کی، لوگ اسلام لانے لگے تو ابتدائے اسلام میں صبر کا حکم تھا۔ اور صبر بھی اتنا کہ اگر کافر ایذاء اور تکالیف بھی پہنچائیں تو ان کا کچھ دفاع بھی نہیں کرنا، بلکہ برداشت کرنا ہے۔ اور یہ عالم رہا کہ آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ ﷺ نے صبر فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شہید کیا گیا، پھانسیوں پر لٹکایا گیا اور انگاروں پر لٹایا گیا، لیکن صبر کیا۔ یہ ابتدائے اسلام کی کیفیات کا ذکر ہے۔ اور اسی صبر میں آپ ﷺ کی پوری مکی زندگی گزری ہے۔ اس لیے اگر آج بھی کوئی مصلح اور کوئی انقلابی انسان اگر کسی ملک یا کسی خطے میں، کسی قوم میں انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے تو حضور اکرم ﷺ کے منہج سے ہٹ کر اور حضور پاک ﷺ کے طریقے سے ہٹ کر کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

کسی بھی ملک پر آپ نظر ڈالیں! آپ کو مسلمانوں کے ملک تو نظر آئیں گے، لیکن آپ اس کو اسلام کا ملک یا اسلامی ملک نہیں کہہ سکتے۔ اگر کہتے ہیں تو رسمی بات ہے۔ چونکہ اس میں مسلمان رہتے ہیں، لہٰذا اسلامی ملک کہلائے

گا۔اس لفظ کا اطلاق اس زمانے میں اگر ہوسکتا ہے تو صرف سعودی عرب پر ہوسکتا ہے کہ یہاں اسلامی ملک بھی ہے اور اسلامی حکومت کا قیام بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب اور حضور اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ اور قضا بھی ہے اور حدود اللہ کا اجرا بھی ہے۔

داعی کی صفات:

اب حضور اکرم ﷺ کا طریقہ کیا تھا کہ سب سے پہلے تو آپ ﷺ نے دنیا کے سامنے یہ بات رکھی کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ میری دعوت اور میرا پروگرام کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ اپنی زندگی کو بطور نمونہ پیش کیا اور فرمایا: اے مکہ والو! میں نے پوری زندگی تمہارے سامنے گزاری ہے۔ میری ولادت کے دور سے لے کر چالیس سال کی عمر تک جو عین قوت کی عمر ہے، یعنی ولادت، رضاعت، بچپن، جوانی اور سارا دور تم لوگوں کے سامنے ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے ان کو چیلنج کیا کہ اگر میں تم کو خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے تمہارا دشمن آرہا ہے جو تم پر حملہ کر دے گا تو کیا تم میری بات نان لو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ کیسے نہیں مانیں گے؟ ہمارے تجربے میں آپ سچے بھی ہیں، امانتدار بھی ہیں اور آپ تو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ تو ہمیں کیا سبق ملا کہ جب کوئی مبلغ، واعظ، مرشد، مصلح اور لیڈر قوم کے سامنے کوئی مقصد لے کر کھڑا ہو تو سب سے پہلے اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر دکھائے کہ اس کی زندگی خود بھی اس کی دعوت کے مطابق مطابقت رکھتی ہے یا نہیں؟ یہ بنیادی بات ہے۔ آپ پورے قرآن مقدس کا مطالعہ کریں کہ اللہ پاک نے جتنے بھی انبیاء کرام بھیجے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے کر آقا خاتم الانبیاء ﷺ تک جتنے بھی انبیاء کرام تشریف لائے، جب تک داعی کی زندگی کامل نہیں ہوگی اس وقت تک دعوت بھی کامیاب نہیں ہوگی۔ اس لیے اللہ پاک نے اپنے نبیوں کو پاک بنایا کہ کوئی شخص میرے انبیاء کرام کی طرف انگلی نہ اٹھا سکے، کوئی شخص میرے نبی پر اعتراض نہ کر سکے۔ تو سب سے پہلے داعی کا خود باکردار اور باعمل ہونا ہے۔ دوسرا یہ کہ مقصد واضح ہونا چاہیے کہ تم کیا چاہتے ہو؟

جیسے ہمارے ہاں (پاکستان میں) دیکھ لو کہ ۶۹ سال ہو گئے سب کچھ آیا، لیکن نہیں آیا تو اسلام نہیں آیا! کیونکہ ایک کہتا ہے کہ نظامِ مصطفیٰ آنا چاہیے۔ دوسرا کہتا ہے کہ نظامِ مصطفیٰ نہیں، بلکہ اسلامی نظام۔ ایک کہتا ہے کہ نہیں، نظامِ اسلامی۔ چوتھا اٹھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ نہیں، بلکہ اسلامی دستور۔ ایک اور اٹھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ نہیں، یہ سارے جھوٹ بول رہے ہیں، بلکہ آئین وشریعت۔ ۶۹ سال سے یہ اپنی دعوت کا فیصلہ نہ کر سکے کہ تم کیا چاہتے ہو؟ جب تم

الفاظ کے جھنجھٹ میں پڑے ہو تو دعوت کیسے دو گے؟ اور پھر جو اسلام کا نام لیتا ہے اس کے اپنے گھر میں اسلام نہیں ہے، اس کے اپنے چھ فٹ کے بدن پر اسلام نافذ نہیں ہے۔ جب ہم اپنے چھ فٹ کے بدن پر اسلام نافذ نہیں کر سکے تو پھر ہم پورے ملک میں کیسے اسلام نافذ کر لیں گے؟

لہٰذا سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگر کامیابی چاہتے ہو تو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دروازے پر آؤ کہ سب سے پہلے حضور پاک ﷺ اٹھے تو ابوجہل جیسا دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یعنی جو نبی کریم ﷺ کا سب سے بڑا دشمن ہے، وہ کعبہ شریف کا طواف کر رہا ہے اور ایک آدمی نے آکر پوچھا کہ ہم نے سنا ہے کہ یہاں پر اللہ کے ایک نبی مبعوث ہوئے ہیں، تمہارا ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی آدمی بات تو نہیں سن رہا۔ اس نے کہا: تم میرے دوست ہو، سچی بات پوچھتے ہو تو وہ اللہ کا سچا نبی ہے۔ اس نے کہا کہ اچھا! کیا وہ سچا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! وہ بالکل سچا ہے۔ اس نے کہا کہ تمہیں کیسے پتہ کہ وہ سچا ہے؟ اس نے کہا کہ عجیب بات کرتے ہو! اس کے ایام ولادت سے لے کر چالیس سال تک ہمارے سامنے گزرے ہیں۔ عبد اللہ کے گھر پیدا ہوا، عبد المطلب کے گھر میں تربیت لی، ابوطالب کے گھر میں جوانی گزاری اور ساری زندگی ہمارے سامنے ہے۔ جس نے کبھی کسی بندے پر جھوٹ نہیں بولا وہ خدا پر کیسے جھوٹ بول سکتا ہے؟ اس نے کہا: جب وہ سچا ہے تو کلمہ پڑھ لو!! اس نے کہا کہ یہ ہمارا خاندانی جھگڑا ہے۔ کبھی ان کا امیر بنتا ہے اور کبھی ہمارے خاندان کا امیر بنتا ہے۔ کبھی ان کا وزیر بنتا ہے اور کبھی ہمارا وزیر بنتا ہے۔ یہ ہمارا خاندانی مسئلہ ہے۔ ویسے وہ سچا ہے۔

لہٰذا سب سے پہلے داعی کی اپنی زندگی پاک ہونی چاہیے۔ دوسرا یہ کہ دعوت واضح ہونی چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یَا أَیُّهَا النَّاسُ، قُوْلُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا'' [المستدرک علی الصحیحین للحاکم، رقم: ۳۹] فرمایا کہ میں تمہیں صرف کلمہ توحید کی دعوت دیتا ہوں اور کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل بن جاؤ، میری رسالت کے قائل بن جاؤ، اللہ تعالیٰ کے احکامات کی فرمانبرداری کرلو، جو تمہارا خالق بھی ہے، مالک بھی ہے، رازق بھی ہے اور آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا بھی ہے۔ یہ دعوت کتنی واضح ہے!!

اور پھر حکم ہے کہ صبر کرو۔ تکلیفیں اور مشقتیں آئیں گی برداشت کرو۔ اسی لیے آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی میں اوّلاً اعلان ہے، پھر دعوت ہے اور پھر صبر ہے۔ یعنی اتنی تکالیف ہوئیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انگاروں پر لٹا دیا گیا، پھانسیوں پر لٹکایا گیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیویوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، گھسیٹا گیا، مارا گیا، ستایا گیا اور حضور

پاک ﷺ کو حرم میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا، لیکن اللہ پاک نے فرمایا کہ میرے مدنی! صبر ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الاحقاف:۳۵] (آپ بھی صبر کریں، جیسے پہلے عظمت والے رسولوں نے صبر کیا ہے)۔

مکہ سے حضور ﷺ کی ہجرت کی وجہ:

پس جب صبر والا مرحلہ گزر گیا تو حکم ملا کہ اب ہجرت کریں؛ اس لیے کہ اب مکی زندگی میں رہنے کے بعد کامیابی نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وطن نہ چھوڑیں، گھر اور اولاد نہ چھوڑیں۔ آپ ﷺ جب جانے لگے تو مکہ کے سامنے کھڑے ہو کر رونے لگے، فرمایا: ''وَاللهِ! إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللهِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللهِ إِلَى اللهِ، وَلَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ'' ''اللہ کی قسم! تو روئے زمین میں سب سے بہترین زمین ہے۔ اگر میری قوم مجھے مجبور نہ کرتی تو میں کبھی بھی تجھے چھوڑ کر نہ جاتا۔ کیونکہ سبق ملا ہے کہ اگر کسی ملک میں تم اسلام کے فرائض کو ادا نہیں کر سکتے ہو تو پھر حکم ہے کہ ہجرت۔ اگر نماز نہیں پڑھ سکتے، روزہ نہیں رکھ سکتے اور شریعت پر عمل نہیں کر سکتے تو پھر اس ملک کو چھوڑ دو۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ میری زمین بہت وسیع ہے۔ جب تم میرے لیے سب کچھ چھوڑ دو گے تو آگے میں تمہارے لیے انتظام کروں گا، لیکن ہجرت اللہ کے لیے ہو، پیسے کے لیے نہیں۔

مدنی زندگی میں جہاد کا حکم:

مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد جب جماعت بن گئی، انصار مل گئے اور طاقت مل گئی تو اللہ پاک نے حکم دیا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ [البقرۃ:۲۱۶] کہ اے میرے مدنی! اب ہم آپ کو قتال کا حکم دیتے ہیں۔ اب وہ مرحلے گزر گئے، اب آپ پختہ ہو گئے اور کھری جماعت مل گئی۔ جنہوں نے بچے بھی چھوڑ دیے، وطن بھی چھوڑ دیا اور مکہ جیسی سرزمین بھی چھوڑ دی۔ اور آگے انصار جیسے کھرے ساتھی مل گئے، جنہوں نے اپنا سب کچھ مکے کے مہاجرین پر قربان کر دیا۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ پکے اور سچے مومن ہیں: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الانفال:۴] کہ ان کے ایمان کی گواہی عرشِ معلّٰی سے میں دیتا ہوں۔ تو اب جہاد کا حکم ہے۔ تو اللہ پاک نے جہاد کو بھی فرض کیا۔

جہاد کا معنی اور فوائد:

جہاد کا معنی یہ ہے کہ انسان خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کفار سے جہاد کرے اور تمام

---

[1] [السیرۃ الحلبیۃ: ۳/ ۱۹۵، الخصائص الکبریٰ: ۲/ ۳۰۲]

شرائط کے مطابق، یعنی ایک امیر المومنین ہو، اس کی قیادت ہو اور کفار کو باقاعدہ یہ لکھا جائے کہ اگر تم اسلام قبول کرتے ہو تو ٹھیک ہے، نہیں کرتے تو جزیہ دو اور اگر جزیہ بھی نہیں دیتے تو پھر جہاد ہوگا۔ اور سیف اور جہاد میں کوئی ذاتی غرض نہ ہو کہ ہمیں اقتدار مل جائے یا ہمیں ملک مل جائے اور زمین ہمیں مل جائے۔ تو وہ اسلام کے نقطۂ نظر میں جہاد نہیں ہوتا۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے جہاد وہ ہوتا ہے جو صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہو۔ اور جب یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت آجاتی ہے۔

اور مجاہدین کا بہت بڑا درجہ ہے کہ اگر وہ زندہ رہیں تو غازی اور مر جائیں تو شہید ہیں۔ اور شہید کا اتنا بڑا مقام ہے کہ نصِ قطعی میں فرمادیا کہ اسے مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، تم ان کی حیات کو سمجھ نہیں سکتے ہو۔ چونکہ وہ حیات عالمِ برزخ سے تعلق رکھتی ہے اور اس عالم کو ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے تو اس پر تو فقط ایمان بالغیب ہی ہوگا۔ جیسے عالمِ ارواح ہم نے نہیں دیکھا، عالمِ مثال ہم نے نہیں دیکھا، عالمِ برزخ ہم نے نہیں دیکھا اور عالمِ آخرت ہم نے نہیں دیکھا تو ہمارا تو بس اتنا ہی ایمان ہوگا جتنا اللہ اور اس کے رسول کا فرمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد اس لیے فرض کیا تھا کہ مسلمانوں کی حفاظت، مسلمانوں کی عزت اور مسلمانوں کی شوکت اسی (جہاد) کے اندر ہے۔

اب امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اَلْجِهَادُ وَاجِبٌ'' جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے، چاہے وہ جہاد کرے اور غازی بنے یا بیٹھا رہے، تب بھی اس پر فرض ہے، لیکن اس بیٹھنے والے پر ضروری ہوگا کہ جب مجاہد کو مدد کی ضرورت پڑے تو اس کی مدد کرے، جب اس کو بلائے تو اس کے بلانے پر پہنچے اور اگر اس کی ضرورت نہ پڑے تو پھر گھر میں بیٹھا رہے، لیکن جہاد فرض ہے اور سب کے لیے ہے۔

صحیح حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِالْغَزْوِ مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقِ الْجَاهِلِيَّةِ))[1] (جو شخص اس حال میں مر گیا کہ اس نے جہاد نہیں کیا اور نہ ہی اس کے دل میں جہاد کا خیال آیا (یعنی کبھی خیال بھی نہیں گزرا کہ میں جہاد کروں) تو وہ ایسے مرا گویا کہ وہ جاہلیت اور کفر پر مر گیا)۔

یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان اسی وجہ سے مر رہا ہے کہ اس نے جہاد کے سبق کو بھلا دیا، ورنہ جب مسلمان جہاد کا سبق یاد کر لیتا ہے تو کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ مجاہدین اسلام نے جہاد کا سبق یاد کیا تو اللہ پاک نے پھر کیسے مدد کی؟ کہ اتنی بڑی طاقت اور مقابلہ کرنے والے کون تھے؟ یہی مجاہد تھے اور جناب ...... ماشاء اللہ...... خالص مذہبی

[1] [الجامع الصغیر للالبانی: ۳/۵۷، مستدرک حاکم: ۲/۸۸، ۲۳۴۶]

لوگ۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کے نام سے اپنے پرائے سب ڈرتے ہیں کہ پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں؟ وہ جذبہ جہاد پر آئے تو اللہ پاک نے کفر کو شکست دی اور کفر کی دیواریں ٹوٹ گئیں۔ بہر حال جہاد ایسی چیز ہے کہ آدمی ہر وقت نیت رکھے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ''[1] (فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے)، لیکن جہاد قیامت تک باقی ہے، اس کی نیت جاری رکھو۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں پکا ارادہ رکھو کہ جب ہمیں جہاد کے لیے بلایا گیا تو فوراً نکلیں گے۔

جہاد کا حکم:

جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ تو جمہور کا مذہب یہ ہے کہ یہ فرضِ کفایہ ہے، یعنی اگر امت میں سے ایک جماعت جہاد کر رہی ہے تو باقی امت گناہگار نہیں ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں تو ہے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ [البقرۃ:۲۱۶] اور دوسری آیت میں ہے ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ [التوبۃ:۱۲۲] کیوں نہیں تم میں سے ایک جماعت ایسی کہ باقی اگر جہاد پر چلے جائیں تو ایک جماعت دین حاصل کرے اور دین کی سمجھ حاصل کرے۔ یعنی اگر ہر بندے پر جہاد فرض ہوتا تو اس جماعت کو نہ کہا جاتا کہ تم دین پڑھنے کے لیے رک جاؤ۔

اور اس طرح بخاری اور مسلم کی روایت میں موجود ہے کہ ایک آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا کہ حضور! آپ میرا نام جہاد میں لکھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''هَلْ مِنْ اَبَوَيْكَ حَيٌّ؟''. (کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟) تو اس نے کہا کہ ہاں! حضور! میرے والدین زندہ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وَجَاهِدْ فِيْهِمَا'' (جاؤ اپنے والدین کی خدمت والا جہاد کرو)۔ تو آپ ﷺ نے اس کو اجازت دے دی کہ والدین کی خدمت کرو اور جہاد پر نہ جاؤ۔ تو اس لیے علماء کرام نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص جہاد پر جانا چاہے تو والدین کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا خاوند چاہتا ہے کہ جہاد کے لیے جائے تو وہ اپنی بیوی سے بھی پوچھے (یعنی اس کے گھریلو اور ذاتی ضروریات کا انتظام کر کے جائے) گا؛ اس لیے کہ اس کے بھی حقوق کی ادائیگی کے مسائل ہیں۔

تو علماء کرام نے فرمایا کہ جہاد تو جاری ہے: ''اَلْجِهَادُ مَاضٍ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ''[2] لیکن فرضِ کفایہ ہے، فرض عین

---

[1] [الادب المفرد: ۵۷/ ۴۴۴، کنز العمال: ۶/ ۱۷۰]

[2] [سنن ابی داؤد: ۱/ ۳۴۳، کتاب الجهاد، باب الغزو مع ائمۃ الجور]

نہیں ہے۔

اور بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ جہاد فرضِ کفایہ اس وقت تک ہے جب تک کوئی کافر ہم پر حملہ نہ کردے۔ اگر کوئی کافر ہم پر چڑھ آئے اور تنفیرِ عام ہو جائے تو ہر آدمی پر فرضِ عین ہے، پھر تو ہر مرد و عورت اور ہر بچے کو جہاد کرنا پڑے گا۔

اور جہاد ایسی نعمت ہے کہ بظاہر تو بڑی مشقت والا کام لگتا ہے، لیکن تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری اصلی عزت اسی جہاد کے ساتھ ہے؟ جس دن تم جہاد چھوڑ دو گے تمہاری عزت ختم ہو جائے گی۔ آپ اندازہ کریں کہ مسلمانوں میں خیر القرون میں اللہ پاک نے جو اسلام کو عزت اور عظمت دی تھی وہ اس لیے تھی کہ وہ جہاد کا سبق یاد دلا رہے تھے۔ اللہ پاک نے ان کو اتنی عزت اور عظمت دے دی کہ مسلمانوں کا نام سن کر کافر کانپتا تھا۔ آج دیکھیں کہ پورے عالم میں اور پوری دنیا میں تمام کفر اکٹھا ہو رہا ہے۔ اس کو اگر خطرہ ہے تو صرف اسلام سے ہے۔ ان کو پتہ ہے کہ یہ شیر ہیں، لیکن ابھی یہ سرکس کا شیر بنا ہوا ہے۔ اس کو اپنی قوت کا پتہ نہیں ہے، لیکن جس دن مسلمان جاگ جائے گا اور اس کو پتہ چل جائے کہ اچھا میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اولاد ہوں، میں تو حضرت ابو بکر صدیق، عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی اولاد ہوں تو میں اپنے اسلاف کے کارنامے زندہ کرنے والا ہوں۔ تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ اس لیے وہ خائف ہیں، وہ سازشیں کرتے ہیں اور وہ ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں، لیکن ہم بھٹکے ہوئے ہیں اور آپس میں لڑتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کفر ڈر رہا ہے اور کانپ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ ہمارے ماضی پر نظر ڈالتا ہے اور ہماری تاریخ پر نظر ڈالتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دریاؤں پر گھوڑے دوڑا ڈالے، یہ وہ لوگ ہیں جو ہواؤں اور طوفانوں میں بھی گزر گئے، انہوں نے تو کسی چیز کو نہیں دیکھا اور یہ تو وہ لوگ ہیں کہ اگر ان کو کوئی مظلوم لڑکی پکارے تو عرب سے سندھ تک کفر کو تہس نہس کر دیتے ہیں، لیکن ابھی یہ سوئے ہوئے ہیں، پتہ نہیں کہ کب جاگ جائیں؟ اور جب ہم خوابِ غفلت سے اٹھ جاتے ہیں تو کفر کی کوئی طاقت ہمارے سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی۔

کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ اسلام کے نوجوانوں نے کیا کر دکھایا!؟ سرخ ریچھ (یعنی روس) کو مار کر بھگا دیا۔ اب دیکھ لو کہ شیشان میں کیا ہو رہا ہے؟ جتنا ہی اندر جاتے ہیں ان کا قبرستان بن جاتا ہے، حالانکہ لڑنے والوں کے پلے میں کچھ بھی نہیں، لیکن نعرہ تکبیر ہے، اللہ پاک کا نام ہے اور دل میں یقین ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ تم نہ ڈرا کرو، ہم نے جہاد تمہاری عظمت کے لیے لکھا ہے۔ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ﴾

[البقرۃ:۲۱۶] یہ تمہارے لیے مشقت ہے۔

اور فرمایا: ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ﴾ [البقرۃ:۲۱۶] ایک چیز کو تم اپنے لیے بظاہر برا سمجھتے ہو، لیکن اس میں تمہارے لیے بھلائی ہوتی ہے۔ جیسے تمہیں پھوڑا ہو جائے تو ڈاکٹر کہتا ہے کہ اس کو کاٹو۔ بظاہر یہ کتنا برا لگتا ہے! لیکن جب وہ کاٹ دیتا ہے اور پٹی باندھ دیتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ بڑا اچھا ہو گیا۔ اسی طرح اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ جو جہاد ہے، اس میں ڈرا نہ کرو کہ ہم مر جائیں گے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ اسی میں تو ہم نے تیری عظمت چھپائی ہوئی ہے کہ یہ ایسا لفظ ہے جہاد کا کہ یہ لفظ سن کر کافروں کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پتہ نہیں یہ جہاد کیا بلا ہے!؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے کہ اگر میں مر گیا تو شہید ہو جاؤں گا اور واپس آیا تو غازی کہلاؤں گا تو ایسے آدمی کو کون شکست دے سکتا ہے جو موت کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہو؟ موت کو اپنے لیے حیات سمجھتا ہو؟ اور موت کو اپنے لیے زندگی سمجھتا ہو؟ تو اس کو کون شکست دے سکتا ہے؟ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم کسی چیز کو محبوب سمجھتے ہو، لیکن وہ تمہارے لیے بری ہوتی ہے۔ تم گھر بیٹھنے کو محبوب سمجھتے ہو، دولت، پیسہ اور دنیا کو محبوب سمجھتے ہو، لیکن اسی دولت کی کثرت نے تمہیں ذلیل کر دیا ہے اور اسی مال کی کثرت نے تمہیں کمزور کر دیا ہے، انہی محلات میں رہ رہ کر تم اپنی قوت کو ختم کر چکے ہو۔ فرمایا کہ بعض اوقات ایک چیز تم اپنے لیے پسندیدہ سمجھتے ہو، لیکن وہ تمہارے لیے بری ہوتی ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۱۶] (اللہ پاک جاننے والے ہیں اور تم نہیں جانتے ہو)۔ جب اللہ پاک نے جہاد کا حکم دیا ہے تو تمہاری بہتری اور تمہاری بھلائی اسی کے اندر مضمر ہے۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ ھَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۲۱۷، ۲۱۸]

''وہ آپ سے حرمت والے مہینہ میں لڑائی کرنے کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے: اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ کا انکار اور مسجد حرام سے (روکنا) اور مسجد حرام کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہیں اور لوگوں کو دین سے پھیرنا قتل سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ تم سے جنگ کرنے میں ہی لگے رہیں گے، حتیٰ کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کا بس چلے۔ تو تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھرے گا اور پھر کفر مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور وہ دوزخ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

ربطِ آیات:

ماقبل آیات میں جہاد کا حکم دیا تھا، اب یہاں چند مہینوں میں جہاد کی ممانعت کا ذکر ہے کہ ان مہینوں میں جہاد نہ کرنا۔ اللہ پاک نے چار مہینے ایسے رکھے ہیں جن میں قتال بند ہے۔ وہ چار مہینے ''اشہرِ حرم'' کہلاتے ہیں۔ ﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ان اشہرِ حرم میں قتال کرنا کیسا ہے؟ وہ چار مہینے جن میں قتال کرنا منع ہے تین تو مسلسل ہیں ایک جدا ہے۔ وہ یہ ہیں: ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب۔

حرام کے دو معنی:

ان چار مہینوں میں قتال منع ہے۔ یہ چار مہینے اللہ تعالیٰ نے حرمت والے بنائے ہیں، یعنی عزت اور عظمت والے۔ جیسے حرم کو حرم کہتے ہیں۔ اب جو حرم ہے مادہ تو وہی حرم والا ہے جیسے اِحْرَام، حَرَمَ، حُرِمَ، مُحْرِم، مُحْرَم۔ سب کا مادہ ایک ہے، ان سب کا مادہ وہی ہے، یعنی حرام۔

مطلب یہ ہے کہ حرام دو وجہ سے ہوتا ہے: یا تو حرام ہوتا ہے خست و دناءت کی وجہ سے، جیسے خنزیر حرام ہے۔ یا عظمت کی وجہ سے حرام ہے، جیسے انسان کا گوشت عظمت کی وجہ سے حرام ہے۔ اب خنزیر بھی حرام ہے، لیکن دونوں کی حرمت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جیسے احرام کو احرام کہتے ہیں کہ جو چیز تیرے حلال تھی وہ ہمارے لیے حرام ہو گئی، اس لیے اس کو ''احرام'' کہا گیا۔ اور ''حرم'' کو بھی اس لیے حرم کہا گیا کہ جو چیزیں حرم کے باہر جائز

ہیں وہ حرم میں جائز نہیں ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے جہاد پر کفار کے اعتراض:

اشہرِ حرم میں ابتدائے اسلام میں اور زمانہ جاہلیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے قبل جو لوگ تھے وہ بھی ان مہینوں میں قتال نہیں کرتے تھے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی کافروں سے لڑائی ہوگئی۔ صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ آج جمادی الثانی کی تیس تاریخ ہے، حالانکہ وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی، اس لیے کافروں سے لڑائی ہوگئی، لیکن حقیقت میں وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی۔ اب کافروں کو موقع ملا اسلام پر اعتراض کرنے اور مسلمانوں کو طعنہ دینے کا کہ دیکھو! یہ کیسے مسلمان ہیں جو اشہرِ حرم میں بھی قتال کرتے ہیں؟ حالانکہ ان مہینوں میں قتال بند ہے۔ اصل جواب تو یہ تھا کہ مسلمانوں نے یہ غلطی عمداً نہیں کی تھی۔ انہوں نے تو جمادی الثانی کی آخری تاریخ سمجھی تھی تو اگر انسان بھول جائے تو اللہ پاک معاف فرما دیتے ہیں اور خاص طور پر چاند کے معاملے میں تو عام طور پر انسان سے غلطیاں ہو جاتی ہیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مدار چاند پر رکھا ہوا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کئی دفعہ عید میں جھگڑا ہو جاتا ہے اور یہ کوئی بڑے اختلاف نہیں ہیں۔

آیت کا شانِ نزول...... پہلا واقعہ:

تفسیر ابن کثیر میں واقعہ اس طرح سے لکھا ہے کہ حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت بھیجی اور ان پر امیر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو بنا کر بھیجا۔ اس کے بعد وہ ابھی اس مقام پر نہیں پہنچے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روکا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو دوسرا امیر مقرر کر کے بھیجا اور ان کو لکھ کر حکم نامہ بنا کر دیا کہ یہ بھی حکم دیا کہ میرے اس خط کو نہ پڑھنا جب تک کہ فلاں مقام پر نہ پہنچ جاؤ۔ جب انہوں نے وہاں جا کر پڑھا اور ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ اپنے ساتھیوں کو مجبور نہ کرنا کہ سب میرے ساتھ چلو۔ جو جائے خوشی کے ساتھ جانا، اگر کوئی مجبور ہے تو اس کو مجبوری کے ساتھ مت لے جانا۔ جب انہوں نے جا کر خط پڑھا تو بہرحال انہوں نے ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھا اور یہ کہا: ''سَمْعًا وَّطَاعَةً لِّلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ'' اللہ اور اس کے رسول کا جو حکم ہے ہم نے اس کی تعمیل کرنی ہے۔ اور اس کے بعد انہوں نے اپنی جماعت

کو خبر دی اور ان کے سامنے حضور پاک ﷺ کا فرمان پڑھا تو دو آدمی تو واپس آ گئے اور باقی جو تھے وہ ان کے ساتھ رہ گئے۔ پس وہ ابن الحضرمی کو ملے تو اس کو قتل کر دیا۔

اصل میں خط اس کے بارے میں تھا۔ اس شخص نے جو عمل کیا تھا اس کا پتہ صرف حضور اکرم ﷺ کو ہی تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پتہ نہیں تھا۔ جب انہوں نے اس کو قتل کر دیا اور ان کو یہ بھی نہ پتہ چل سکا کہ یہ رجب کا پہلا دن ہے یا جمادی الثانی کا آخری دن ہے۔ اصل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سمجھا کہ یہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن ہے اور وہ رجب کا پہلا دن تھا۔ تو اب مشرکین کو اعتراض کرنے کا موقع ملا کہ دیکھو! تم اسلام اور دین کا دعویٰ کرتے ہو اور تم نے تو اشہرِ حرم میں قتل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیات نازل فرمائیں۔

شانِ نزول کا دوسرا واقعہ:

حضور پاک ﷺ نے ایک جماعت بھیجی، اس میں سات آدمی تھے اور ان کے امیر حضرت عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ تھے، اس میں حضرت عمار بن یاسر، حضرت ابوحذیفہ، حضرت عتبہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عتبہ بن غزوان السلمی، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت واقد بن عبداللہ الیربوعی رضی اللہ عنہم، یہ سب حضرات ساتھ تھے۔ حضور پاک ﷺ نے ابن جحش رضی اللہ عنہ...... جو امیر تھے...... کو خط لکھ کر دیا اور فرمایا کہ جب تک تم بطنِ نخلہ نہ پہنچ جاؤ اس وقت تک تم اس خط کو نہ پڑھنا۔ جب وہاں اترے تو اس کے بعد حکم ملا کہ تم بطنِ نخلہ میں جاؤ اور ساتھیوں سے کہا کہ مجھے حضور پاک ﷺ کا حکم ہے اور یہ بڑی خطرناک مہم ہے جس پر ہم جا رہے ہیں۔ پس جو میرے ساتھ جانا چاہے اور جو وصیت کرنا چاہے کرے کہ پتہ نہیں کہ ہم زندہ واپس لوٹیں گے یا نہیں۔ تو جو واپس جانا چاہے اسے اجازت ہے، وہ واپس جا سکتا ہے، لیکن میں تو جاؤں گا؛ اس لیے کہ حضور پاک ﷺ کا حکم ہے۔ دو صحابی پیچھے رہے: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ بھی اس لیے پیچھے رہ گئے، کیونکہ ان کی اونٹنی گم ہو گئی تھی، اس کو تلاش کرتے کرتے ان کو دیر ہو گئی۔ تو باقی جو اصحاب تھے وہ پہنچ گئے۔ جب وہاں پر پہنچے تو وہاں جا کر عمرو کو قتل کیا۔ اس کو حضرت واقد بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔ بہرحال یہ پہلی لڑائی اور پہلا سریہ تھا جو حضور اکرم ﷺ نے بھیجا تھا۔ اس میں...... الحمدللہ!...... اللہ پاک نے مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی۔ کافر قتل ہوئے، مالِ غنیمت ملا اور یہ سب کچھ لے کر وہ واپس مدینہ منورہ آ گئے۔ تو اب مشرکین نے سوچا کہ ہمارے جو دو قیدی ہیں ان کو ہم مسلمانوں کو فدیہ دے کر چھڑا لیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے ساتھ میں یہ اعتراض بھی کیا کہ حضور پاک ﷺ تو کہتے تھے

کہ میں اللہ پاک کے حکم کا تابع ہوں اور اشہرِ حرم میں تو اللہ پاک نے قتال بند کیا ہوا ہے، لیکن انہوں نے اشہرِ حرم میں قتال کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیات مبارکہ نازل فرمائیں۔

اللہ پاک نے ایک تو یہ جواب دیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے غلطی ہوئی، ہم نے معاف کر دی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بدبختو! تم جو یہ اعتراض کرتے ہو کہ مسلمان اشہرِ حرم میں قتال کرتے ہیں تو اشہرِ حرم میں قتال کرنا زیادہ جرم ہے یا اللہ تعالیٰ کی مسجد حرام میں بت خانہ بنانا زیادہ جرم ہے؟ یا جو مسلمانوں نے غلطی کی وہ بڑا ظلم ہے؟ تم کعبہ میں ظلم کرو یہ زیادہ ظلم نہیں ہے اور جو ان سے باہر غلطی ہو جائے وہ بڑا ظلم کیسے ہو سکتا ہے؟

کیا اشہرِ حرم میں جہاد ہمیشہ کے لیے حرام ہے؟

اب مسئلہ یہ ہے کہ اشہرِ حرم میں قتال ہمیشہ کے لیے منع ہے یا نہیں؟ بعض علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ اشہرِ حرم میں قتال ہمیشہ کے لیے منع ہے، یعنی کبھی بھی قتال نہیں کیا جائے گا۔ اور جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم پہلے تو تھا، لیکن جب اللہ پاک نے حکم دیا: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ [التوبۃ:٥] (کافروں اور مشرکوں کو قتل کرو جہاں بھی اور جب بھی تم ان کو پاؤ)۔ اس میں حکم مکان اور زمان سب کے لیے آ گیا تو لہٰذا پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اب چاہے وہ چار مہینے بھی ہوں تو قتل کرنا، لڑائی کرنا سب کچھ جائز ہو گیا۔ اسی طرح بعض علماء کرام نے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی القعدہ میں طائف کا محاصرہ کیا تھا، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ قتال کے منع کا حکم منسوخ ہو گیا اور قتال جائز ہو گیا۔

لیکن بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ حکم تا حال ابھی باقی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کے لفظوں میں یہ بات ملتی ہے ﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ﴾ اللہ پاک نے جب سے آسمان و زمین کو پیدا فرمایا ہے، بارہ مہینے بنا دیے۔ محرم سے ابتدا ہو گئی اور ذی الحج پر ان کی انتہا ہو گی۔ اور اسی آیت میں ہے: ﴿مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ﴾ [البقرۃ:٣٦] ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرم والے ہیں۔ تو بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اشہرِ حرم کی حرمت کو برقرار رکھا۔ اور پھر اسی آیت میں ہے جو نظامِ عالم اور نظامِ کل پر دلالت کر رہی ہے کہ بارہ مہینے اور ان میں چار حرمت والے مہینے ہیں۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ ان چار مہینوں کا حکم اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں جہاد قتال وغیرہ بند ہے۔ وہ کہتے

ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے طائف کا جو محاصرہ کیا تھا وہ ذی القعدہ میں نہیں کیا تھا، بلکہ شوال میں کیا تھا اور شوال تو اشہر حرم میں شامل ہی نہیں ہے۔

البتہ ایک مشکل ہے کہ اگر ان چار مہینوں میں کوئی کافر ہم پر چڑھ آئے تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اشہر حرم ہیں، بلکہ اس وقت تو ہماری طرف سے دفاع ہوگا۔ پھر ہم مہینے نہیں دیکھیں گے، بلکہ ہمیں اجازت ہے کہ ہم اپنا بھرپور دفاع کرنے کے لیے لڑائی کریں۔

بہرحال جمہور کا مذہب یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ اب اللہ پاک نے اجازت دے دی ہے کہ مسلمان ہر مہینے میں جہاد کر سکتے ہیں۔

مسئلہ ارتداد:

ارتداد کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو جائے، یعنی اسلام سے نکل جائے، اس کو "مرتد" کہتے ہیں۔ مرتد کی سزا یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ" [1] جو شخص مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو جائے تو اسے قتل کر دو۔ لہٰذا مرتد کی سزا قتل ہے۔

مرتد مسلمان ہونے کے بعد حج دوبارہ کرے:

مسئلہ: ایک آدمی مسلمان تھا، اس نے حج کیا، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے اور سب کچھ کیا، پھر مرتد ہو گیا۔ اب مرتد ہونے کے بعد پھر مسلمان ہو گیا تو اب اس کا پہلا حج باقی ہے یا نہیں؟ اس پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہیں، اب وہ دوبارہ حج کرے گا، اس کا پہلا حج برباد ہو گیا؛ اس لیے کہ قرآن کہتا ہے: ﴿فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ [البقرۃ: ۲۱۷] کہ ہم اس کے اعمال دنیا اور آخرت میں برباد کر دیتے ہیں، لہٰذا وہ حج بھی دوبارہ کرے اور اپنے فرائض دوبارہ ادا کرے، اس کے پہلے والے اعمال کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے دو قول ہیں: ایک قول میں امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو دوبارہ کرنا چاہیے۔ اور دوسرے قول کے مطابق فرماتے ہیں کہ اس کا وہی پہلا حج کافی ہو جائے گا۔

مسئلہ: ایک آدمی کافر ہے اور کفر کی حالت میں اس نے خیراتیں کیں، مدرسے بنوائے، مسجدیں بنوائیں اور

---

[1] [سنن النسائی: ۴۰۶۰، ۴۰۶۵، حاکم: ۶/ ۳۲۲]

بڑے بڑے کام کیے۔اب مسلمان ہو گیا تو اس کے پہلے جو اعمال ہیں اللہ پاک اس کے تمام اعمال قبول فرمالیں گے اور سب کا اس کو ثواب عطا فرمادیں گے۔

اگر کوئی مرتد ہو جائے اور ارتداد کی حالت میں اس کو موت آجائے تو ﴿فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾[البقرة:۲۱۷]اس کے اعمال برباد ہو گئے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔دنیا میں کیسے برباد ہو گئے؟ کہ اگر دنیا میں مثلاً بیوی مسلمان ہے تو اس کا نکاح نہیں رہا؛ اس لیے کہ وہ مرتد اور کافر ہو گیا تو اس کا نکاح ختم ہو گیا۔اور نہ مسلمان اس کا وارث بنے گا اور نہ یہ مسلمان کا وارث بنے گا۔ دنیا میں بھی اس کے اعمال برباد ہو گئے اور آخرت میں بھی اس کے سابقہ اعمال کی بھی کوئی جزا نہیں ملے گی، بلکہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾[البقرة:۲۱۸]

اصل میں اس آیت کی وجہ وہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی غلطی تھی کہ انہوں نے تیس تاریخ سمجھی تھی، جبکہ وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرائے ہوئے تھے کہ ایک جواب تو آگیا کہ اے ظالمو! تم جو اشہرِ حرم والا اعتراض کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی مسجد سے روکنا، اللہ والوں کو مسجد حرام سے نکالنا اور مسلمانوں سے جنگ لڑنی تو سب سے بڑا جرم ہے۔لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرائے ہوئے تھے کہ دشمن کو جواب تو مل گیا، لیکن ہماری غلطی کے بارے میں کوئی وضاحت نہ آئی کہ ہمارا کیا ہوگا؟ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ﴾ (جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت کی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ راستے میں جہاد کیا وہی لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں)۔﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (اللہ تعالیٰ بخشنے والے مہربان ہیں)۔اس میں اشارہ کر دیا کہ اگر تم سے ایک دن کی تاریخ میں جو غلطی واقع ہوئی ہے تو تم ایمان والے ہو، مہاجر ہو اور تم جہاد کرنے والے ہو تم میری رحمت کے امیدوار ہو اور میں غفور و رحیم ہوں، تم کیوں فکر کرتے ہو؟ میں نے تو تم کو معاف کر دیا۔تو ان آیات مبارکہ میں گویا ان کی اس بات کا بھی اللہ تعالیٰ نے جواب عطا فرمادیا، تاکہ مسلمان بھی اس میں مطمئن ہو جائیں۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١٩﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٠﴾﴾ [البقرۃ:۲۱۹،۲۲۰]

''اور وہ آپ سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں۔فرما دیجیے: ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں۔اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔اور آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کرے؟ فرما دیجیے: جو ضرورت سے زائد ہو۔اسی طرح سے اللہ تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے، تاکہ تم فکر کرو دنیا اور آخرت کی باتوں میں۔اور آپ ﷺ سے یتیموں کا حکم پوچھتے ہیں۔فرما دیجیے: ان کے کام کا سنوارنا بہتر ہے۔اگر تم ان کا خرچ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔اور خرابی کرنے والے اور سنوارنے والے کو اللہ جانتا ہے۔اور اگر اللہ چاہتا تو تم پر مشکل ڈال دیتا۔اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔''

شراب اور جوئے کی حرمت:

ان آیات میں اللہ پاک نے خمر (شراب) اور جوا کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔اس کے بعد پھر وہی سوال جو پیچھے گزرا کہ ہم کیا خرچ کریں؟ اس کا جواب بھی اسی آیت مبارکہ میں اللہ پاک نے ذکر فرما دیا۔اور یتامیٰ کی ہمدردی کے بارے میں بھی ارشاد ہے۔ان تمام احکامات پر آیت مبارکہ مشتمل ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور پاک ﷺ سے جو سوالات پوچھے، ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ شراب اور جوئے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ کی شریعت کو اللہ تعالیٰ نے اتنا کامل اور مکمل بنا دیا ہے کہ قیامت تک کے لیے جتنی ضرورتیں ہمیں پیش آ چکی ہیں یا آئندہ آئیں گی، ان کا حل بھی اللہ پاک نے اپنے قرآن اور اپنے دین میں رکھ دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ عالمِ انسانیت کے جتنے بھی ملک ہیں ان کے قوانین پر نظر ڈالیں تو اگر آپ منصف مزاج ہیں، کسی تعصب کا شکار نہیں ہوئے تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلام سے زیادہ جامع دین کوئی نہیں آیا ہے اور نہ ہی آئے گا۔

مثلاً: یہی آیت مبارکہ ہے کہ جس میں اللہ پاک نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔اب اسی کو دیکھ لیں کہ وہ ملک جنہوں نے شراب پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی اور جن کے ہاں شراب ایک عام مشروب اور ایک عام چیز ہے،جن کے معاشرے میں اس کا پینا اور استعمال کرنا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا اور وہ اس پر بڑا فخر کرتے ہیں،وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں اور ان کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے کہ شراب بری چیز ہے، یہ نہیں پینی چاہیے۔وہ بھی مجبور ہو گئے۔اب آپ کافر کے ملکوں میں جائیں تو آپ کو قدم قدم پر بورڈ لگے نظر آئیں گے،جن کے ذریعے وہ آپ کو اس کے نقصانات بتائیں گے کہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے!!اس سے بچیں!

زمانہ جاہلیت میں شراب ایک عام مشروب اور ایک عام چیز سمجھی جاتی تھی۔اس کے پینے اور اس کے استعمال کرنے کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔اور ظاہری طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جوئے اور شراب میں کچھ فائدہ اور نفع بھی معلوم ہوتا تھا۔مثلاً: شراب پینے سے طاقت آگئی اور کچھ گرمی آگئی اور پینے کے بعد کچھ سرور اور نشہ آگیا اور پریشانی بھول گئے۔اور جوا کھیلنے سے بعض اوقات وہ جیت جاتے تھے اور بغیر مشقت و تکلیف کے کچھ پیسہ آجاتا تھا۔کچھ ایسی چیزیں تھی جو انہیں بظاہر فائدہ مند نظر آتی تھیں،لیکن جو عقلِ سلیم اور قلبِ سلیم رکھتے تھے ان کو بہرحال یہ ناگوار گزرتی تھی۔پس وہ کافر ہونے کے باوجود شراب نہیں پیتے تھے،کافر ہونے کے باوجود وہ زنا نہیں کرتے تھے اور کافر ہونے کے باوجود وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

لیکن جو شراب اور جوئے میں پڑے ہوئے تھے، وہ اتنے عرصے سے سمجھتے تھے کہ اس میں ہمارا فائدہ ہے، ہمارے لیے قوت ہے، طاقت ہے، ہمیں چستی آجاتی ہے، کھانا ہضم ہو جاتا ہے، ہمیں نیند صحیح آجاتی ہے۔جوئے میں بیٹھے بیٹھے اتنا پیسہ مل جاتا ہے کہ ہم مہینے میں اتنا پیسہ نہیں کما سکتے،لیکن اللہ پاک نے فرمایا کہ اس میں فائدے تو ہیں جو تم نے سوچے ہوئے ہیں،لیکن فائدے سے نقصان والا پہلو بھی غور کریں کہ وہ تو اس سے بھی زیادہ ہیں۔تم صرف منافع پر نظر رکھ رہے ہو،لیکن مضرت پر نظر نہیں رکھ رہے۔تو اسلام نے ایک ایسی بات کی جو اس کے دماغ میں اتر جائے۔

اسلام نے سب سے پہلا حکم دیا کہ شراب میں تمہیں کچھ فوائد نظر آتے ہیں،لیکن اس کے مضرات اس سے زیادہ ہے۔کچھ لوگوں نے تو اسی آیت کے آنے کے بعد شراب چھوڑ دی کہ جب گناہ بڑا ہے تو کیا فائدہ ہے؟ کہ چھوٹے سے فائدے کے لیے گناہ سامنے رکھیں۔ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک دعوت کی اور اس میں ان کے دوست تشریف فرما تھے۔دوستوں نے بیٹھ کر شراب پی۔جب نماز کا وقت آگیا تو انہوں

نے کہا کہ نماز پڑھاؤ۔ سب نے ایک کو امام بنایا۔ وہ جب مصلے پر کھڑے ہوئے تو سورۃ الکافرون پڑھی تو ﴿لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ [الکافرون: ۲] کی بجائے ﴿أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ﴾ پڑھا، ''لَآ'' بھول گئے، اسی حالت میں نماز پڑھادی۔ امام بھی نشہ والا اور مقتدی بھی۔ اب حالت ایسی ہوگئی کہ امام نشے میں اور مقتدی بھی نشے میں۔ اب غلطی کون نکالے؟ نماز اسی حالت میں پڑھی تو دوسرا حکم آگیا۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی﴾ [النساء: ۴۳] اس حال میں نماز نہ پڑھو جب تم نشہ میں ہو۔ اب یہ دوسری آیت نازل ہوگئی کہ نشہ کی حالت میں عقل کرو، اللہ کا کلام پڑھ رہے ہو۔ اور پھر آدمی نشہ میں تو پتہ نہیں لگتا کہ ہاں کہہ رہا یا نہ کہہ رہا ہے، زبر کی زیر کہہ رہا ہے۔ عقل تو نہیں ہے۔ اس لیے ایسی حالت میں نماز نہ پڑھا کرو۔ اب کچھ لوگ اس آیت کی وجہ سے رک گئے کہ چھوڑو کہ جب نماز جیسی عبادت اس بلا کی وجہ سے صحیح نہیں ہوسکتی تو اس کے استعمال کی کیا ضرورت ہے؟

حرمتِ شراب پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آراء:

لیکن کچھ لوگوں نے کہا کہ حکم یہ ہے کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ ٹھیک ہے، ہم نماز کے وقت نہیں پئیں گے، عشا کے بعد پی کر سو جائیں گے، صبح نماز کے وقت نشہ اتر جائے گا۔ لہٰذا وہ پیتے رہے۔ اب دو مقامات آگئے: کچھ لوگ تو پہلی آیت پر رک گئے، کچھ لوگ دوسری آیت کے وقت رک گئے اور کچھ لوگ ابھی اسی حال پر باقی رہے۔

نشہ کی حالت کا ایک واقعہ:

اب ایک صحابی نے دعوت کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس میں اکٹھے ہوئے۔ جب نشہ کیا گیا تو ایک انصاری آدمی نے ایک اونٹ کی ہڈی پڑی تھی، اٹھا کر ایک صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سر پر ماردی اور وہ زخمی ہوگئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا تو اس نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ بھی نشہ میں تھا اور وہ بھی نشہ میں تھا۔ جان بوجھ کر تو نہیں مارا ہے، نشہ کی حالت میں بات بڑھ گئی۔ تو اس نے شراب کی حالت میں...... جس سے انسان کو عقل وشعور باقی نہیں رہتا اسی حالت میں...... حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو مارا۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اونٹنی کاٹنے کا واقعہ:

آپ دیکھیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دو اونٹنیاں پالی ہوئی تھیں اور میرا ارادہ تھا کہ ان اونٹوں پر

میں لکڑیاں لاؤں گا اور بازار میں بیچوں گا اور فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی شادی میں خرچ کروں گا، لیکن میں نے اپنی دونوں اونٹنیاں بٹھائیں اور اپنے گھر کی طرف چلا گیا، تاکہ میں رسے وغیرہ لے آؤں، تاکہ جنگل سے لکڑیاں باندھ کر لے آؤں۔ حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، وہ بیٹھے شراب پی رہے تھے، محفل جمی ہوئی تھی اور ایک لڑکی گا رہی تھی۔ تو اس نے گاتے گاتے کہہ دیا کہ پہلے زمانے میں جو سردار ہوتے تھے وہ اپنے دوستوں کو اونٹنیوں کی زبان کاٹ کر کباب بنا کر کھلاتے تھے...... چونکہ اونٹ کا گوشت عرب میں بڑا مرغوب ہے۔ عرب لوگوں کو اونٹ کے گوشت سے بڑی محبت ہے۔ خاص طور پر چھوٹا اونٹ اور پھر اس کی کوہان کا گوشت ہو تو لازمی بات ہے کہ وہ نرم ہوتا ہے اور پھر اس کے کباب بنے ہوئے ہوں...... تو اس لڑکی نے گانے میں ترنگ میں آکر ایک شعر کہہ دیا تو سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ چونکہ نشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ اٹھے اور جا کر تلوار سے اونٹنیوں کی کوہان کاٹ لائے۔ یہ اونٹنیاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تھیں، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اونٹنیوں کی کوہان کاٹ کر حکم دیا کہ سب کو کباب بنا کر کھلاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب واپس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اونٹنیاں ذبح ہو چکی ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ذبح کی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رونے لگ گئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا ہوا؟ فرمایا: کمال ہے! نشہ میں میری اونٹنیاں ذبح کر ڈالیں اور اس کے کباب بن رہے ہیں اور ان کو پکا کر لوگوں کو کھلا رہے ہیں اور میں تو لٹ گیا۔ آپ مہربانی فرمائیں کہ مجھے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے اونٹنیاں لے کر دیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم چلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے اور صحابہ بھی ساتھ تھے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اسی طرح نشہ کی حالت میں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حمزہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: حمزہ! ''مَا ذَا فَعَلْتَ؟'' تم نے یہ کیا کیا؟ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نشہ کی حالت میں تھے تو سر اٹھا کر کہنے لگے: ''هَلْ أَنْتُمْ إِلَّا عَبِيْدُ آبَائِيْ'' اچھا! تم تو میرے باپ کے نوکر اور غلام تھے۔ اب آ گئے ہو ہمارے اوپر رعب ڈالنے کے لیے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس مڑ گئے کہ وہ عقل میں ہی نہیں ہے، اس سے کیا بحث کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! واپس آ جاؤ اور تمہاری اونٹنیاں میں ادا کروں گا۔ میں اپنے چچا کو کیا کہوں؟

یہ بات اس زمانے کی ہے جب شراب حرام نہیں تھی تو کوئی آدمی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض نہیں کر سکتا۔

حرمتِ شراب کا واضح حکم:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی: ''اَللّٰهُمَّ! بَيِّنْ لَنَا بَيَانًا شَافِيًا'' اے اللہ! شراب کے بارے میں واضح فیصلہ فرما

دیجیے۔ اور امیر المومنین نے بھی اسی طرح دعا فرمائی "اَللّٰهُمَّ! بَيِّنْ لَنَا بَيَانًا وَاضِحًا شَافِيًا" اے اللہ! شراب کے بارے میں مہربانی فرما اور ہمارے لیے واضح حکم عطا فرما۔ تو اللہ پاک نے تیسری آیت نازل فرمائی: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [المائدۃ:۹۰] (اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور وہ تیر جو تم بتوں پر جا کر ڈالتے ہو یہ سب نجس ہیں، یہ شیطانی عمل ہیں۔ ان سے بچ جاؤ، ہٹ جاؤ اور ان کو چھوڑ دو)۔

حرمتِ شراب کے اعلان پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تاثرات:

اب جب حکم آیا تو بات واضح ہوگئی کہ شراب حرام ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا: "مُنَادِيٌ يُنَادِيْ فِيْ سِكَكِ الْمَدِيْنَةِ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ مدینہ کی گلیوں میں آواز اور ندا لگاؤ کہ اللہ پاک نے شراب حرام کردی۔ تو جب شراب کی حرمت کا حکم آیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بارش میں ندیاں بہتی ہیں، ایسے شراب مدینہ کی گلیوں میں بہہ رہی تھی۔ اور کئی دن تک اس کے پانی کے اثرات گلیوں میں باقی رہے۔ اگر کسی کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ تھا تو وہیں پھینک دیا، بس اب حکم آگیا، آج کے بعد شراب نہیں۔ تو اللہ پاک نے ایک تدریجی حکم نازل کیا؛ اس لیے کہ ایک عادت کو ایک دم بدلنا مشکل تھا۔ تو جب حکم آیا تو شراب ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی اور قیامت تک کے لیے حرام ہے۔

شراب کا نام بدل کر پینے والی قوم کا حال:

شراب کا معنی نشہ دینے والی چیز ہے، چاہے قلیل ہو یا کثیر ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمادی۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ اللہ پاک کے قرآن میں بہانے بنائیں گے، تاویلات کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت پر ایک وقت آئے گا کہ وہ ریشم کو حلال بنالیں گے اور لوگ شراب کے نام بدل ڈالیں گے اور کہیں گے کہ یہ حلال ہے۔ یعنی کہیں گے کہ جو حرام ہے وہ تو خمر ہے اور خمر اس کو کہتے ہیں جو انگوروں سے نچوڑا جائے اور خمر کہتے ہیں کہ "مَا خَامَرَ الْعَقْلَ" جو عقل کو اپنے راستے سے ہٹا دے۔ ہم تو جناب! انگوروں کی بجائے گڑ سے بناتے ہیں، ہم تو گندم سے بناتے ہیں اور ہم تو سیب سے بناتے ہیں۔ ہم انگور سے تو نہیں بناتے۔ اور حرام تو وہ تھا جو انگور سے بنایا جاتا تھا اور جو خمر کہلاتا تھا۔ اور ہم جو بناتے ہیں یہ

تو بیئر کہلاتا ہے، وسکی کہلاتا ہے۔ اس کے تو نام علیحدہ ہیں، یہ تو شراب نہیں ہے۔ تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ میری امت پر ایک وقت آئے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حرام کو حلال بہانے بنا کر بنائیں گے، لیکن فرمایا: یاد رکھو! اور مسئلہ سمجھ لو! "کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ" ہر وہ چیز جو نشہ آور ہو...... چاہے وہ انگور سے پیدا ہو یا گڑ سے پیدا ہو، چاہے وہ گندم سے پیدا ہو چاہے، وہ سیب سے پیدا ہو یا کھجور سے پیدا ہو، کسی بھی چیز سے پیدا ہو جب مسکر ہو جائے، یعنی نشہ آور ہو جائے...... تو وہ حرام ہو جائے گی۔ "قَلِیْلُهٗ وَ کَثِیْرُهٗ حَرَامٌ"۔

شراب تھوڑی بھی حرام...... زیادہ بھی حرام:

میرے آقا ﷺ نے وضاحت فرما دی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کہے کہ جناب! میں نے شراب بنائی ہے، لیکن ہم نے تو بڑی لائٹ چیز بنائی ہے۔ اگر دو گلاس پی لی جائے تو نشہ آتا ہے، اگر تھوڑی سی پی جائے تو نشہ نہیں آتا۔ اور ایسی شرابیں بھی عورتوں کے لیے علیحدہ ہے اور مردوں کے لیے علیحدہ ہیں۔ پھر شرابوں کی اپنی اپنی حیثیتیں ہیں اور اس میں اتنی طاقت ہے اور اس میں اتنی طاقت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، نشہ تو نہیں ہو رہا۔ جب نشہ کی حد تک پہنچے گا تو حرام ہوگا، لہٰذا معمولی سا سرور تو جائز ہے۔ ہم تو شراب پئیں گے جس میں سرور آئے اور نشہ نہ آئے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے سارے دروازے بند کر دیئے۔ ایک تو قاعدہ یہ فرمایا: "کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ" (ہر نشہ آور چیز حرام ہے)۔ اور فرمایا: "قَلِیْلُهٗ وَ کَثِیْرُهٗ حَرَامٌ" (تھوڑی بھی حرام اور اس سے زیادہ مقدار بھی حرام ہے)۔ اگر دو پیالے حرام ہیں تو ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی پیشاب کا گلاس بھر کر پئے تو حرام ہو اور دو قطرے حلال ہوں، چونکہ تھوڑا ہے۔ جب وہاں تھوڑے اور زیادہ کا فرق نہیں کرتے تو حرام میں تھوڑے اور زیادہ کا فرق کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بعض لوگ بہانہ بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شراب تو حرام ہے جب نشہ کرے۔ جو لوگ عادی ہو جاتے ہیں، ان کو آپ ایک بوتل، دو بوتل اور تین بوتلیں بھی پلا دیں وہ ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں گاڑی چلا کر گھر چلا جائے گا۔ اس کے مقابلے میں اگر آپ وہی کسی اونٹ کو پلا دیں تو وہ مر جائے گا۔ تو وہ پیتے پیتے بدن کے اندر قوت مدافعت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے سرد ملکوں کے لوگ سردی برداشت کر لیتے ہیں اور گرم علاقوں کے لوگ گرمیوں میں گرمی برداشت کر لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جی! اس کو نشہ نہیں ہوتا۔ نہیں، بلکہ شریعت یہ کہتی ہے کہ اگر ایک عام آدمی کو دیا

جائے اور اس کو نشہ آ جائے تو وہ سب کے لیے حرام ہے۔ یہ نہیں کہ ہم تمیز کریں گے کہ یہ عادی ہے اور یہ غیر عادی ہے۔ دو بوتلوں سے اس کو نشہ ہوتا ہے۔ جب چیز حرام ہے تو اس کی قلت بھی حرام ہے اور کثرت بھی حرام ہے۔

شراب پینے پلانے، بنانے اور بیچنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت:

اور پھر یاد رکھیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شراب بنانے والے پر بھی لعنت ہے، بیچنے والے پر بھی لعنت ہے، لانے والے پر بھی، لاد کر لے جانے والے پر بھی اور اس کو رائج کرنے والے پر بھی۔ جیسے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کے معاملے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے، اسی طرح شراب کے معاملے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے۔ ایک آدمی خود تو نہیں پیتا، لیکن دوسرے کو لا کر پہنچا دیتا ہے۔ یہ بھی اتنا ہی مجرم ہے۔ ایک آدمی دوسرے ملک سے لا کر پہنچا رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم تو جی بزنس کر رہے ہیں، ہم تو کوئی شراب وغیرہ نہیں پیتے، ہمارا تو ایک بزنس ہے۔ آرڈر ہوا تو ہم نے وہاں سے مال بھیج دیا۔ تو یہ بھی اسی طرح کا برابر کا مجرم ہے، اسی طرح برابر کی لعنت کا حقدار ہے کہ وہ حرام کے پھیلانے میں مدد کر رہا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ﴾ [المائدۃ: ۲] نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہوں اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ تو شراب ہر لحاظ سے حرام ہے۔

الکحل کا حکم:

اب شراب کی جتنی بھی اقسام ہیں سب حرام ہیں، البتہ ایک بحث باقی ہے کہ جو دواؤں میں الکحل کا استعمال ہوتا ہے اس میں علماء کرام نے اتنی گنجائش رکھی ہے کہ اگر کوئی طبیب یعنی مسلمان ڈاکٹر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس مرض میں اس کے علاوہ کوئی متبادل دوا نہیں ہے تو بطور مجبوری مرض اتنی مقدار استعمال کرنی جائز ہوگی، لیکن اگر مجبوری نہ ہو اور متبادل دوا مل رہی ہو تو پھر اس کا استعمال کرنا ناجائز ہے۔ اور بلکہ ایک حدیث پاک میں وضاحت بھی آئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ پاک نے حرام میں شفا نہیں رکھی۔ پھر کوئی کہے کہ ان حرام دواؤں سے فائدہ ہوتا ہے تو جواب یہ ہے کہ ان دواؤں میں حلال چیزیں بھی تو ہوتی ہیں، سارا حرام تو نہیں ہوتا۔ تو اصل بات یہ ہے کہ ایسی ادویات سے بچنا چاہیے جن میں الکحل یا شراب یا اس کی کوئی قسم ہے؛ اس لیے کہ یہ تمام چیزیں لوگوں کو اس کا عادی بنا دیتی ہیں۔

نبیذ کا مسئلہ:

نبیذ کا معنیٰ یوں سمجھیں کہ عرب میں ایک رواج تھا اور ہے بھی۔ وہ ایسا کرتے ہیں کہ جیسے کھجور ہے، اس کی گٹھلی وغیرہ نکال کر اس کو اچھی طرح سے ہاتھوں سے مل لیتے ہیں اور بھگو دیتے ہیں۔ اب وہ دس بارہ گھنٹے پڑی رہے گی۔ اس کے بعد اس کو صاف کیا اور اس کا شربت پی لیا۔ اس کو ''نبیذ'' کہا جاتا ہے۔ کبھی کبھی لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ اس کو پانی میں بھگو دیا جیسے املی ہوتی ہے، کھجور ہوتی اور چیزیں بھی ہوتی ہیں، بہرحال ان کو بھگو دیا اور دس بارہ گھنٹے کے بعد اس کو آگ پر گرم کرنے کے بعد اس کو صاف کر لیا اور صاف کر کے پی لیا۔ اس کو ''نبیذ'' کہا جاتا ہے۔

اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر اس میں شدت پیدا ہو جائے، یعنی نشہ کے اثرات پیدا ہو جائیں تو یہ بھی حرام ہے۔ اگر نشہ کے اثرات نہ ہوں تو جیسے کھجور کو ویسے بھگو دیں اور اس کا شربت بن جائے یا کسی کشمش املی وغیرہ کا تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اصل بات سکر ہے، نشہ ہے۔ اگر وہ نشہ کی حد تک پہنچ جائے تو میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس میں شدت معلوم ہوتی ہو تو اس میں پانی اور زیادہ کر دو، تاکہ وہ شربت کا پانی رہ جائے۔ اب اگر آپ مثلاً: کھجور کو بھگو کر رکھ دیں اور دو تین دن تک رکھا رہنے دیں تو لازمی بات ہے کہ اس میں خمر پیدا ہو جائے گا اور اس میں نشہ پیدا ہو جائے گا، اس لیے پھر اس حد تک پہنچ جائے تو وہ حرام ہو جائے گا۔

شراب کے برتنوں کا حکم:

پہلے تو اسلام نے اتنی پابندی لگائی ہے کہ جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی تو حکم یہ تھا کہ ان برتنوں کو بھی توڑ ڈالو، ان برتنوں کو بھی استعمال نہ کرو۔ بعض برتن ایسے ہوتے تھے کہ وہ مٹی کے بنے ہوتے تھے اور اندر سے ان پر روغن چڑھا ہوا کرتا تھا، جیسے عام طور پر پنجاب میں مٹی کے برتن ہوتے ہیں اور وہ روغنی ہوتے ہیں، جن میں آپ کھانا وغیرہ پکاتے ہیں۔ اور ہندوستان میں بھی ایسے برتن ہوتے ہیں۔ ان میں کھانا بڑا لذیذ بنتا ہے۔ وہ خالص مٹی ہوتی ہے اور اندر بس روغن لگا ہوتا ہے کہ وہ خراب نہیں ہوتا۔ تو ایسے مٹکے خاص طور پر شراب کے لیے بنائے جاتے تھے، ان میں شراب رکھی جاتی تھی۔ اسی طرح کھجور کے درخت کو بھی اندر سے کاٹ کر مٹکے کی شکل بنا دیتے تھے اور اس میں شراب بند کرتے تھے۔ تو ان سب چیزوں کے بارے میں اسلام نے حکم دیا کہ ان کو توڑ ڈالو۔ یہ برتن بھی استعمال نہ کرو، تاکہ خواہ مخواہ کسی کا ذہن شراب کی طرف نہ جائے، لیکن جب حرمت معلوم ہو گئی اور شراب اسلام سے

نکل گئی تو پھر ان برتنوں کے استعمال کی اجازت ہو گئی کہ بھئی! یہ برتن ہیں، پاک ہیں، حلال ہیں۔ دھو کر استعمال کر لو کوئی بات نہیں ہے، کوئی منع نہیں ہے۔

اسی طرح بعض لوگ دشمنان اسلام اور ہمارے بعض نئے پڑھے لکھے نوجوان ان کے دماغ میں ایک بڑی خلش ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ دیکھو جی! مولوی انگور تو کھا جاتے ہیں اور اس کی شراب کو منع کرتے ہیں۔

تمہاری بیٹی بھی ایک عورت سے پیدا ہوئی ہے اور تمہاری بیوی بھی ایک عورت سے پیدا ہوئی ہے تو پھر فرق کیا ہے؟ تمہاری بیٹی بھی ایک ماں کے بطن سے پیدا ہوئی ہے اور تمہاری بیوی بھی ایک ماں کے بطن سے پیدا ہوئی ہے، دونوں عورتوں میں یہ حلال ہے، یہ حرام ہے کیوں؟ یہ حلال وحرام مولوی نے کیا ہے؟ اگر تم بہن اور بیوی میں تمیز نہیں کر سکتے تو یہاں بھی انگور اور شراب میں تمیز کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ اگر تم وہاں تمیز کرو گے جو اللہ پاک نے حکم دیا ہے کہ بہن بہن ہے، ماں ماں ہے، بیٹی بیٹی ہے اور بیوی بیوی ہے۔ اور بیوی بھی اس وقت تک حلال ہے جب تک نکاح ہے اور شرعاً تعلق قائم ہے، طلاق نہیں ہوئی۔ اب طلاق ہو جائے تو وہی حلال حرام ہو جاتا ہے۔

اب انگور کھانا علیحدہ بات ہے اور اس سے شراب نکالنا علیحدہ چیز ہے۔ کھجور کھانا علیحدہ بات ہے اور کھجور سے شراب بنانا علیحدہ بات ہے۔ یہ سب اسلام کے احکام ہیں، ان میں مذاق اڑانا اور استہزاء کرنا آدمی کو کفر تک پہنچ دیتا ہے۔ ایک آدمی ہے، گناہگار ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی تعمیل نہیں کر رہا۔ اور ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا مذاق اڑا رہا ہے کہ دیکھو! جناب! انگور حلال ہے تو شراب کیوں حرام ہے؟ کھجور حلال ہے تو پھر شراب کیوں حرام ہے؟ یہ استہزاء ہے، جو کفر ہے۔

اب تو وہ لوگ بھی جن کو شراب کی گھٹی لگائی گئی ہے وہ بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ شراب بڑی خطرناک چیز ہے۔ وہ یہ بات بھی مانتے ہیں کہ شراب کا عادی آدمی زیادہ بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔ اور یہ بات بھی مانتے ہیں کہ شراب کی وجہ سے کئی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ بہر حال ہم تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔

جوئے کا معنیٰ اور اقسام:

دوسرا مسئلہ "مَیْسِر" کا ہے۔ "مَیْسِر" کا معنیٰ جوا ہے۔ جوئے کی کئی شکلیں تھیں: کوئی تاش پر جوا کھیلتا تھا،

کوئی شرط لگائی کہ یہ گھوڑا دوڑ رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ جیتے گا اور وہ کہتا ہے کہ یہ نہیں جیتے گا، اس نے کہا کہ اگر یہ جیتے گا تو اتنا اور اگر یہ جیتے گا تو اتنا۔ یا کسی نے مشین لگائی کہ جناب! اس کو چکر دو۔ اگر یہ فلاں نمبر پر رک جائے تو فلاں جیت گیا اور اگر فلاں نمبر پر رک جائے تو فلاں جیت گیا۔ یہ سب جوا ہے۔ بعض لوگ انعام مقرر کر دیتے ہیں کہ اگر یہ گلاس خرید وا ور اگر تیرے پاس دس نمبر نکل آیا تو تجھے ایک لاکھ روپے ملے گا۔ یہ بھی جوا ہے۔ اور بعض لوگ معمے حل کراتے ہیں کہ یہ معمہ ہے، سوال ہے، اس کو حل کرو گے تو اتنا انعام ہے۔ یہ سب جوئے کی اقسام ہیں، بری ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ کوئی معزز جوا ہے، جو کلبوں میں کھیلا جاتا ہے اور کوئی عام گندا جوا ہے، جو غریب سڑک پر بیٹھ کر کھیل رہے ہوتے ہیں۔ یہ بڑا پلید جوا ہوتا ہے، وہ بڑا پاک جوا ہے جو کلبوں میں بیٹھ کر بڑے بڑے سرمایہ دار، صنعت کار، جاگیردار اور بڑے بڑے آفیسر کھیل رہے ہوتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: جی! وہ تو جوا نہیں ہے، وہ تو کلب میں بیٹھ کر انجوائے کرتے ہیں۔ کیونکہ رشوت کا مال جو ہے، آخر اس کو کہیں تو خرچ کرنا ہے ناں!؟ اب ایک آدمی بیٹھے بیٹھے دس لاکھ روپے کمائے، اس کو کیسے خرچ کرے گا؟ وہ پھر اسی طرح خرچ ہوتا ہے: کچھ جوئے میں، کچھ مجرے میں، کچھ گانے میں اور کچھ شراب میں۔ آدمی کے پاس لعنت ہی لعنت رہ جاتی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ حرام سے لعنت ہی مل سکتی ہے، کبھی رحمت نہیں ملے گی۔ حرام کا انجام حرام ہی ہوگا، حلال نہیں ہوسکتا۔ تو یہ جتنی قسمیں ہیں یہ ”مَیْسِر“ اور جوا ہی ہیں۔ اللہ پاک نے اس کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

جوئے اور انعام میں فرق:

البتہ ایک ہوتا ہے انعام۔ انعام ایک طرف ہوتا ہے، دو طرف نہیں ہوسکتا۔ جیسے کوئی کہے کہ جو لڑکا ہماری کلاس میں فرسٹ آئے گا ہم اس کو ایک ہزار روپے ریال انعام دیں گے۔ تو یہ انعام ہے، یہ جوا نہیں ہوتا؛ اس لیے کہ اگر وہ فرسٹ بھی آتا تو اس کو تو کچھ بھی نہیں دینا پڑتا۔ جوئے میں تو یہ ہے کہ دونوں طرف سے رقم متعین ہوتی ہے کہ اگر میں جیت گیا تو تم پیسے دو گے اور اگر تم جیتے تو میں تمہیں پیسے دوں گا۔

اب آپ اس کو مثال سے سمجھیں کہ مثلاً: آپ نے ایک گلاس ایک ریال میں خریدا۔ جس کو انعام ملا اس نے بھی ایک ریال کا خریدا ہے، اس کو ایک لاکھ مل گیا اور جی ہمارا کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔ اللہ کے بندے! یہ ایک لاکھ کا گلاس جو بکا ہے تو دو لاکھ والوں کا نقصان ہو گیا! کیونکہ انہوں نے تو اسی لیے لیا ہے ناں کہ انعام نکلے!؟ انہوں نے

اپنے استعمال کے لیے تو نہیں خریدا۔ اور جو تمہارے لیے انعام رکھتے ہیں وہ پاگل تو نہیں ہوتے؟ انہوں نے مثلاً: ایک لاکھ کا انعام رکھا ہے تو پہلے وہ...... ان شاء اللہ...... دس لاکھ کے گلاس بیچیں گے تو پھر ایک نمبر نکلے گا، تا کہ ان کو نو لاکھ کا فائدہ ہوا اور ایک لاکھ کا انعام میں دیں گے۔ ان کا کوئی دماغ تو خراب نہیں ہو گیا کہ اپنے گھر سے تمہیں ایک لاکھ روپے ریال دے دیں؟ وہ اتنے پاگل تو نہیں ہوتے؟ وہ تو ضرب و تقسیم والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ تو اپنے چیزوں کو بیچنے کا ایک طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ مثلاً: ہماری ایک چیز پرانے ماڈل کی ہو گئی ہے۔ ہم نے لیا تھا ترانوے میں اور اب پچانوے آ گیا ہے۔ اور جوں جوں پیچھے جائے گا تو یہ ٹیپ کوئی خریدا گا نہیں۔ تو وہ انعام میں رکھ دیتے ہیں: اچھا بھئی! ایک لاکھ نمبر نکل آئے تو ایک لاکھ ریال انعام نکلے گا، تا کہ ان کے سارے ٹیپ بک جائیں، نقصان سے بچ جائیں۔ دس لاکھ کما لیا اور تمہاری کمائی سے تمہارے منہ پر تھپڑ مار کر ایک بھائی کو ایک لاکھ ریال انعام دے دیا تو اب جو اس نے لاکھ لوٹا ہے وہ کہاں گیا؟ اس لیے اسلام نے ایسی ساری صورتوں کو حرام قرار دیا ہے کہ یہ سب چیزیں جوے کے اندر آ جاتی ہیں۔

اور جوئے کی کئی اقسام ہیں۔ اور جوئے کی جتنی اقسام ہیں سب کی سب حرام ہیں اور ان کے حلال ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

انشورنس اور بیمہ پالیسی کا حکم:

اسی طرح ہمارے ہاں جو انشورنس کمپنیاں ہوتی ہیں کہ جناب! آپ کی دس لاکھ کی پالیسی ہے، میں نے دس ہزار روپے سالانہ قسط دینی ہے۔ میں نے دس ہزار روپے قسط دی اور مر گیا تو میرے بچوں کو دس لاکھ مل گئے اور کہتے ہیں: جی! یہ تو اس لیے بنائی ہے کہ کل کو اگر آپ مر گئے تو آپ کے بچوں کا کیا ہوگا؟ تو ان کے لیے ہم نے یہ پالیسیاں بنائی ہیں کہ آپ کی بیوی بے چاری بیوہ ہو گئی، آپ کے بچے یتیم ہو گئے، ان کے لیے نہ سکول کے پیسے ہوں گے اور نہ ہی مکان کا کرایہ ہوگا۔ یہ تو ہم نے آپ کی مدد کے لیے بنایا ہے۔

ان ظالموں سے پوچھیں: آپ بوسنیا اور شیشان میں مدد کیوں نہیں کرتے جہاں پر مسلمانوں کے بچے مر رہے ہیں؟ اگر ان کو مدد کا بڑا شوق ہے تو یہ سارا پیسہ وہاں لگا دیں۔ یہ مدد نہیں کرتے، یہ ڈاکو ہیں، لیکن بڑے خوبصورت انداز میں ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ ایک ڈاکو وہ ہوتا ہے جس نے تالا توڑ دیا، تمہارے گھر میں گھس گیا، دیواریں توڑ

ڈالیں۔ پکڑا گیا تو جوتے کھائے، جیل میں چلا گیا۔ اور ایک یہ بڑا مہذب ڈاکو ہے کہ ان کو تو کوئی پکڑ نہیں سکتا؛ کیونکہ یہ آپ کی خدمت میں بچھے جا رہے ہیں ناں! یہ سب کچھ آپ کے لیے کر رہے ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ مثلاً: میری پالیسی دس لاکھ کی ہے۔ انہوں نے ایک لاکھ آدمی سے دس دس ہزار روپے لیا ہوا ہو تو ان کے پاس سال میں کتنا آیا؟ اور سال میں کتنے مریں گے؟ دو چار پانچ دس۔ اور پھر بھی یہ انکوائری کریں گے کہ کس کا کتنا بنتا ہے؟ حقدار بھی ہے کہ نہیں؟ اصل میں تو کہہ دیں گے کہ بنتا ہی نہیں۔ غلط بات ہے، کوئی کیڑا نکال دیں گے ٹیکنیکل طور پر۔ اور اگر آپ کی مان بھی لیں تو سال میں ایک لاکھ آدمی سے پیسے لیے اور دس آدمیوں کو واپس کیے تو ننانوے ہزار نوسو نوے آدمیوں کی کمائی ان کی جیب میں گئی۔ اور ایک آدمی کو دے دیئے تو فرق کیا پڑ گیا؟۔ تو یہ سب جوا ہے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے اپنے بچوں کے لیے آخر کچھ تو کرنا ہے! تو آپ ان کے لیے کوئی پلاٹ لے کر ڈال دیں، آپ ان کے لیے سونا خرید کر کے دے دیں اور وہ حفاظت کے ساتھ کہیں رکھ دیں۔ اور کئی حلال کے ذریعے بھی ہو سکتے ہیں۔ کوئی ضروری تو نہیں ہوتا کہ آپ بچوں کے لیے حرام ہی چھوڑ کر جائیں کہ مرنے کے بعد بھی لوہے کے گرز آپ کو لگتے ہی رہیں کہ پیسے وہ کھائیں اور عذابِ قبر آپ بھگتیں۔ ایک تو زندگی میں آپ نے بھگتا کہ شریف بیٹے ہوتے تو انشورنس کیوں کرواتے؟ اللہ پاک پر یقین رکھتے اور پھر مرنے کے بعد بھی عذاب آپ نے بھگتا۔ تو وہ مزے کر رہے ہیں، ان کو تو دس لاکھ مل گیا ہے، وہ تو جناب! عیش اڑا رہے ہیں اور آپ قبر میں لوہے کے گرز کھا رہے ہیں اور آخرت میں بھی لوہے کے گرز کھا رہے ہیں۔ تو اس کے لیے حلال کے ذرائع بھی ہو سکتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک دوست نے مشورہ دیا کہ آپ نے تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں سب کھلا دیا، آپ کے بچے آپ کے بعد کیا کریں گے؟ آپ مہربانی کریں، آپ خلیفۃ المسلمین ہیں، اپنے بیٹوں کے لیے کوئی جاگیر، کوئی جائیداد اور کوئی چیز تو دے دیں کہ بادشاہ کے بیٹے اور کل کو بھیک مانگیں گے؟ ان کے پلے میں تو دو دو ریال بھی نہیں ہیں۔ حضرت عمر بن العزیز رحمہ اللہ مسکرائے اور فرمایا کہ تمہارے مشورے کا شکریہ! لیکن میری اولاد یا تو صالح ہوگی یا طالح ہوگی۔ اگر بری ہوگی تو ان کے گناہوں کا میں ذمہ دار ہوں اور اگر اچھی ہوگی تو اللہ پاک کا وعدہ ہے کہ میں اچھوں کا ذمہ دار ہوں۔ ﴿وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ﴾ [الاعراف: ۱۹۶] ان کی حفاظت میرا رب کرے گا۔

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ اے میرے مدنی! آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ اللہ پاک نے

فرمایا: ﴿قُلِ الْعَفْوَ ﴾[البقرۃ:۲۱۹] وہ خرچ کرو جو تمہارے پاس زائد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی سخاوت نہیں کہ تمہارے بیوی بچے تمہارے گھر میں بھوکے بیٹھے ہوئے ہوں اور تم عمرے پر چل پڑو، تمہارے بیوی بچوں کے پاس کپڑے نہ ہوں اور تم غریبوں کو کپڑے دے رہے ہو، تمہارے گھر والے محتاج ہیں اور تم لوگوں کو خیرات کر رہے ہو۔ شریعت یہ حکم نہیں دیتی۔ سب سے پہلے اپنے گھر کو سنبھالو اور اپنے گھر والوں کا خیال کرو۔ ﴿فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾[البقرۃ:۲۱۵] پھر خیرات کے مراحل ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ جو تم سے زیادہ بچے۔ جو تم سے نہ بچے تمہارا آپس میں پورا ہو جاتا ہے، تمہارا کھانا پینا، تو تمہیں آگے دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جیسا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ وہ اتنے بڑے زاہد تھے! وہ فرماتے تھے کہ اللہ پاک کا حکم ہے: ﴿قُلِ الْعَفْوَ ﴾[البقرۃ:۲۱۹] جو زیادہ ہے وہ دے دو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس دو کپڑے ہیں: ایک ہم نے پہن لیا اور ایک زیادہ ہے تو وہ دے دو۔ اور دو روٹیاں تھیں: ایک کھالی اور دوسری بچ گئی تو اسے دے دو۔ وہ تو اس بات کے قائل تھے کہ کوئی زیادہ چیز گھر میں رکھنی ہی ناجائز ہے، مطلقاً حرام ہے۔ وہ تو ڈنڈا لے کر آجاتے تھے کہ پتہ لگا ہے کہ اس کے پاس دو کپڑے ہیں۔ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے منت کی کہ آپ مدینہ منورہ سے باہر بیٹھیں، آپ کا فتویٰ تو بڑا سخت ہو گیا ہے۔ ہر آدمی اس مقام پر گزر راہ نہیں کر سکتا۔

بہر حال جمہور کا مسلک ہے کہ جائیداد رکھنی جائز ہے، حلال سے کمائی ہوئی چیز ضرورت سے زائد رکھنی جائز ہے۔ جب تم زکوٰۃ ادا کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرتے ہو تو تمہارے لیے جائیداد رکھنی جائز ہے۔ اور خرچ اتنا کرو جتنا تم سے زیادہ ہو سکے، جو بچے۔ اور اگر نہیں بچتا ہے تو کوئی ضروری نہیں ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ وہ ہے کہ سارے خرچے کے بعد، سارے اخراجات کے بعد اور قرضے ادا کرنے کے بعد، مثلاً: میرے اوپر ایک لاکھ کا قرضہ ہو اور میں خیرات کرتا پھروں تو یہ تو بے وقوفی ہے۔ سب سے پہلے حکم ہے کہ میں پہلے قرض ادا کروں۔ مجھے خیرات کرنے کا حکم نہیں ہے۔ میں تو خیرات تب کروں گا جب میرے ذمہ کسی کی کوئی چیز نہ بچتی ہو۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ﴾[البقرۃ:۲۱۹]۔

یتیموں کے مال کا حکم:

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ﴾[الانعام:۱۵۲] (یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ)۔ ﴿اِنَّ

﴿الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ﴾ [النساء:۱۰] (جو لوگ زیادتی کر کے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ جہنم کی آگ سے اپنے پیٹ کو بھر رہے ہیں)۔ تو جب یہ حکم آ گیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے پاس یتیم بچے بھی ہیں، ان کی جائیدادیں بھی ہیں اور ان کا کھانا پینا بھی ہے۔ ہم تو بڑی مشکل میں آ گئے کہ خدانخواستہ ہم ایک نوالہ بھی اپنے حق سے زیادہ کھا گئے تو ہم نے تو اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھر لیے۔ اب ہم کیا کریں؟ لہٰذا ہم اب یتیموں کو علیحدہ کر لیں کہ ان کا کھانا الگ، پینا الگ، آٹا اور دال الگ، الگ برتن، ہر چیز الگ...... اور یہ بھی بڑا مشکل مسئلہ تھا کہ ایک گھر میں اگر ایک یا دو یتیم بچے ہیں تو ان کے لیے ہر چیز علیحدہ کرو، آٹا علیحدہ، پانی علیحدہ اور روٹی کپڑا علیحدہ، سب علیحدہ کرو......

تو اللہ پاک نے اجازت دے دی اور فرمایا کہ یتیم تمہارے بھائی ہیں، ان کو اپنے ساتھ ملا لو، اپنے کھانے پینے میں ملا لو، کوئی بات نہیں۔ اللہ پاک نیتوں کو جانتے ہیں کہ کس کی نیت اچھی ہے اور کس کی نیت بری ہے؟ کون ہے جو ملا کر یتیم کے مال کو کھانا چاہتا ہے اور کون ہے جو ملا کر یتیم کی مدد کرنا چاہتا ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں جو اچھے لوگ ہیں۔ مثلاً: آپ کے مہینے کا خرچ دس سیر آٹا ہے اور یتیم کے ذمے میں ایک سیر بنتے تھے اور یتیم کے پاس آدھا سیر تھا تو آپ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، آدھا سیر اسی میں ڈال دو کوئی بات نہیں، اللہ پاک اسی میں برکت ڈال دے گا۔ تو اللہ پاک یہ بھی جانتے ہیں۔ اور اللہ پاک یہ بھی جانتے ہیں کہ تمہارا خرچہ تو ہے دس سیر اور یتیم کا خرچہ ہے ایک سیر۔ تو تم نے کہا کہ جناب! پانچ سیر تم کھاتے ہو، لہٰذا پانچ سیر تمہارے ذمے اور پانچ سیر ہمارے ذمہ۔ تو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۲۰] اللہ پاک مفسد کو بھی جانتے ہیں اور مصلح کو بھی جانتے ہیں۔ یہ اللہ پاک نے مہربانی کر دی۔ ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۲۰] اگر اللہ پاک چاہتے تو تمہیں بڑی مشقت میں ڈال دیتے کہ ہر چیز علیحدہ کرو۔ اب ہر چیز علیحدہ کرنا تو بڑی مشقت ہے، لیکن اللہ پاک غلبے والے ہیں، اللہ تعالیٰ حکمت والے ہیں۔

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾﴾ [البقرۃ:۲۲۱]

''اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں اور البتہ مسلمان لونڈی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، اگر چہ وہ تمہیں اچھی لگے۔ اور مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائے، البتہ غلام مسلمان بہتر ہے کسی بھی مشرک سے، اگر چہ وہ تمہیں اچھا لگے۔ وہ لوگ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور لوگوں کو اپنے احکام بتاتا ہے، شاید کہ وہ چوکس ہو جائیں۔''

مرد کے نکاح میں چار عورتوں کا جواز:

اس آیت میں مشرک عورت سے نکاح کے بارے میں مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ نکاح مسلمانوں کے لیے حلال بھی ہے، سنت الانبیاء والمرسلین بھی ہے، توالد و تناسل کا ذریعہ بھی ہے اور انسانوں کے سکون اور طمانیت حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم ترین ذریعہ بھی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تو اللہ پاک نے اپنے بندوں کو حکم دیا: ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ﴾ [النساء: ۳] تم نکاح کرو اور نکاح میں بھی اللہ پاک نے اجازت دے دی کہ تم چاہو تو ایک سے، دو سے، تین سے اور چار سے، یعنی ایک آدمی بیک وقت چار عورتوں تک کو نکاح میں رکھ سکتا ہے۔

کن عورتوں سے نکاح جائز نہیں؟

اور کن عورتوں سے نکاح ہو سکتا ہے اور کن سے نکاح نہیں ہو سکتا؟ سورۃ النساء میں تفصیل کے ساتھ یہ آیت آگئی کہ:

1. ......ماں سے نکاح حرام ہے،
2. ......بیٹی سے نکاح حرام ہے،
3. ......بہن سے نکاح حرام ہے،
4. ......خالہ سے نکاح حرام ہے،
5. ......پھوپھی سے نکاح حرام ہے،
6. ......ان عورتوں سے جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، یعنی رضاعی ماں کے ساتھ نکاح حرام ہے،

7 ......جس بچی کے ساتھ تم نے دودھ پیا ہے وہ بھی تمہاری رضاعی بہن ہے، اس کے ساتھ نکاح حرام ہے،

8 ......اور اسی طرح ایک وقت دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، یعنی ایک آدمی دو بہنوں سے اکٹھی شادی کر لے یہ حرام ہے۔

البتہ ایک بہن سے شادی کر لی، اس کی موت ہوگئی یا طلاق ہوگئی، اس کی عدت گزرنے کے بعد اگر اس کی دوسری بہن کے ساتھ نکاح کرنا چاہا تو یہ جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی ایک بیٹی کی شادی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے کرائی۔ اس کے بعد جب وہ فوت ہوگئیں تو آپ ﷺ نے دوسری بیٹی بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو عطا فرمادی۔

حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی نکاح کرتا ہے تو یا تو دین کی وجہ سے کرتا ہے، یا اس عورت کے حسن و جمال کی وجہ سے کرتا ہے، یا اس عورت کے خاندان کی وجہ سے کرتا ہے اور یا دولت مندی کی وجہ سے کرتا ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ''فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ'' دین والی لڑکی اختیار کرو، چاہے وہ شکل وصورت میں اتنی اچھی نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں ایک بڑی خوبصورت لڑکی ہے، لیکن دین دار نہیں ہے تو دین والی کو ترجیح دو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اسی دین کے اندر تم کو برکت عطا فرمائیں گے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم فقیر ہو تو شادی کرو ''إِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ'' اللہ پاک تمہیں برکت عطا فرمادیں گے۔

چار سے زائد نکاح انبیاء کرام علیہم السلام کی خصوصیات:

انبیاء کرام علیہم السلام کے کچھ خصائص ہوتے ہیں، جیسے حضور پاک ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے چار سے بھی زیادہ نکاح کی اجازت دی ہے۔ آپ ﷺ کے گیارہ نکاح ہوئے، لیکن آپ ﷺ کے گھر میں بوقتِ وفات نو بیبیاں موجود رہیں۔ تو یہ خصوصیتِ انبیاء ہے۔ اس سے کوئی حجت نہیں پکڑ سکتا کہ......نعوذ باللہ...... نبی کی نو بیبیاں ہیں تو میں بھی نو نکاح کر لوں۔ اللہ پاک نے قرآن پاک میں اجازت دے دی، وہاں نو کے بعد پابندی لگا دی: ﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ﴾ [الاحزاب: ۵۲] کہ بس اب اس کے بعد آپ اور کسی عورت سے نکاح نہیں کر سکتے اور نہ یہ کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک عورت کو طلاق دے کر ایک اور نکاح کر لیں۔

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ﴾ [البقرۃ: ۲۲۱] اب لفظ ''الْمُشْرِكٰتِ'' کو اپنے عموم پر لیں تو پھر اس سے اہل کتاب مستثنیٰ کریں گے؛ کیونکہ اہل کتاب کی لڑکیوں سے نکاح جائز ہے، لہٰذا ''الْمُشْرِكٰتِ'' اگر اپنے عموم پر رہے تو ان میں اہل کتاب کی لڑکیاں مستثنیٰ ہوں گی۔

دوسری آیت کے ساتھ اللہ پاک نے مسلمانوں کو اجازت دی دے کہ اہل کتاب کی لڑکیوں کے ساتھ نکاح جائز ہے، لیکن یہ مسئلہ سمجھ لیں کہ اہل کتاب کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت ہے، حکم نہیں ہے۔ حکم یہ ہے کہ تم مسلمان کے ساتھ نکاح کرو اور مومنہ عورت کے ساتھ نکاح کرو۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ جیسے آج کل بعض لوگ یورپ کی عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں۔ یہ شادی نہیں ہوتی، یہ تو بالکل حرام اور ناجائز ہے؛ کیونکہ آج کل تو وہاں پر نہ کوئی عیسائی ہے اور نہ کوئی یہودی ہے۔ وہ تو مذہب ہی بھول گئے ہیں کہ نہ کسی کتاب پر ایمان، نہ ہی کسی مذہب پر ایمان ہے اور نہ ان کا اپنے نبی پر کوئی ایمان ہے۔ یہ تو ملحد لوگ ہیں، زندیق لوگ ہیں۔ ان پر تو ''اہل کتاب'' کا اطلاق بھی نہیں ہوتا، لہٰذا ان لڑکیوں سے شادی کرنا حرام ہے۔

اہل کتاب کا معنی یہ ہوتا ہے کہ کم از کم اس کا تورات پر ایمان ہو، اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تو اس کا ایمان ہو اور آخرت پر اس کا ایمان ہو۔ ہمارے نبی پاک ﷺ کو نہیں مانتا، لیکن اپنے نبی کو تو مانے۔ جو آدمی تورات کو بھی نہیں مانتا، انجیل کو بھی نہیں مانتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی نہیں مانتا تو ان سے نکاح کرنے کی شریعت نے کوئی اجازت نہیں دی۔ ان کی اجازت بھی کیوں دی گئی؟ اس لیے کہ ان کا آخرت پر ایمان ہے، اللہ پاک کے ایک نبی پر ایمان ہے اور اللہ پاک کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان ہے تو معاملہ نرم ہے۔

ایک آدمی بظاہر مسلمان ہے، لیکن وہ قبروں پر سجدہ بھی کرتا ہے، حضور پاک ﷺ کو عالم الغیب بھی سمجھتا ہے تو وہ بھی مشرک ہے، چاہے لاکھ وہ کہتا رہے کہ میں مسلمان ہوں، اس کے ساتھ بھی نکاح جائز نہیں ہے۔

مشرک عورت سے نکاح کیوں منع ہے؟

پہلا سوال: یہ ہے کہ قرآن پاک میں حکم آیا کہ مشرکہ عورتوں اور مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو، تاکہ وہ تمہیں مشرک نہ بنا دیں، لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم نکاح کرو، تاکہ تم ان کو موحد بنا دو۔

اور دوسرا سوال: مستشرقین کی طرف سے ہے کہ یہ خطرہ تو لڑکی والوں کو بھی ہونا چاہیے کہ ہم جو اپنی لڑکی

مسلمان کو دے رہے ہیں، کہیں یہ مسلمان نہ ہوجائے۔ جب وہ خطرہ محسوس نہیں کر رہے ہیں تو تم کیوں ڈر رہے ہو؟ بلکہ نکاح کرنے کے بعد تم ان کو مسلمان کرلو، لہٰذا اسلام نے یہ پابندی کیوں لگائی ہے؟

جواب: یہ ہے کہ اصول یہ ہوتا ہے کہ ایک دفعِ مضرت ہوتی اور ایک جلب منفعت ہوتی ہے۔ مثلاً: ہم نے دکان شروع کی اور اس میں ایک لاکھ ریال ڈال دیئے۔ اب سب سے پہلے عقل مند تاجر نقصان سے بچنے کی فکر کرے گا۔ وہ پہلے یہ کوشش کرے گا کہ جو میں نے ایک لاکھ ریال ڈالا ہے وہ تو آئے ناں! تاکہ میرا اصل سرمایہ نہ ڈوبے۔ اپنے کاروبار کو نقصان سے بچانے کے بعد نفع کی سوچے گا۔ لہٰذا نقصان سے بچنا پہلے ہوتا ہے، نفع کے بارے میں سوچنا بعد میں ہوتا ہے۔ اب نقصان سے بچنے کو ''دفعِ مضرت'' کہتے ہیں اور نفع حاصل کرنے کی کوشش کو ''جلب منفعت'' کہتے ہیں۔ اچھا ایک نفع کی امید تو تھی کہ مشرکہ نکاح کے بعد مومن بن جائے، لیکن خطرہ یہ ہے کہ وہ تمہیں مشرک نہ بنادے۔ تو خطرہ سے بچنا مقدم ہوتا ہے نفع کی امید کرنے سے۔

جیسا کہ بزرگوں نے مثال دی ہے کہ تریاق تو آدمی یقین کے ساتھ پی لیتا ہے اور جس چیز میں زہر کا اندیشہ ہو اور ذرا سا شک بھی ہو تو اس کو نہیں پیتا۔ تو جہاں ضرر کا شبہ ہوجائے وہ لوگ استعمال نہیں کرتے۔ جیسا کہ بزرگ کہتے ہیں کہ حکیموں کے کشتے نہ کھایا کرو کہ کہیں تم خود کشتہ نہ کھاؤ۔ کیا پتہ کوئی زہر ہو؟ نفع کا سوچتے رہو اور مصیبت تمہارے گلے میں پڑ جائے۔ تو مشرکہ عورتوں کو گھر میں لانے کا نقصان یقینی ہے اور اس کا اسلام لانا صرف ایک امید ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس راستے کو بھی بند کر دیا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم اس کو پتہ نہیں اسلام سکھاؤ گے؟ وہ تمہارے گھر میں شرک کا گڑھ نہ بنا ڈالے، وہ تیرے گھر کے اندر مشرکانہ رسوم نہ داخل کر دے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھ لیں کہ کوئی ایسے نوجوان ہیں جنہوں نے ہندو لڑکیوں سے شادی کر لی اور اب اسلام کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اور کتنی لڑکیاں ایسی ہیں کہ جو عائشہ سے عوشہ بن گئیں، نام بدل ڈالے، اسلام ختم ہوگیا اور ان میں اور ہندو لڑکی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک پابندی لگائی ہے کہ اللہ پاک جس چیز سے منع فرماتے ہیں اس میں بندے ہی کا فائدہ ہے۔

﴿وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ﴾ [البقرۃ:۲۲۱] مومنہ باندی، مشرکہ سے زیادہ بہتر ہے، یعنی مومنہ کنیز ہے اور اس کے مقابلے میں حرہ (آزاد عورت) ہے، لیکن وہ مشرکہ ہے تو کنیز بہتر ہے۔

اس آیت مبارکہ کا سبب نزول یہ تھا کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی ایک باندی تھی اور سیاہ رنگ کی تھی۔ کسی

بات پر غصہ آیا تو آپ نے تھپڑ مار دیا اور اس کے بعد گھبرائے اور حضور پاک ﷺ کی خدمت میں آکر سارا واقعہ بتایا کہ یا رسول اللہ! میری ایک کنیز ہے۔ اس نے ایسی بات کی کہ میں نے اس کو غصہ میں تھپڑ مار دیا۔ اور میری باندی نماز پڑھتی ہے، روزہ بھی رکھتی ہے، وضو بھی کرتی ہے اور گواہی بھی دیتی ہے: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کی۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''هٰذِهٖ مُؤْمِنَةٌ'' وہ تو مومنہ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ گواہ ہو جائیں کہ میں اس کو آزاد بھی کرتا ہوں اور اس کے ساتھ شادی بھی کرتا ہوں۔ جب آپ رضی اللہ عنہ نے شادی کر لی تو لوگوں نے طعنہ زنی شروع کر دی کہ دیکھو جی! کالی باندی تھی، اپنی کنیز تھی، سیاہ رنگ کی لڑکی تھی اور اس سے شادی کر لی۔ مطلب یہ تھا کہ اس کے بجائے کوئی حسب نسب میں مشرکین کی لڑکیاں بھی مل سکتی تھیں تو کیا ضرورت تھی ایک سیاہ فام لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی؟ اللہ پاک نے فرمایا کہ وہ سیاہ فام لڑکی ان مشرکہ عورتوں سے زیادہ بہتر ہے۔ اس کو جو اللہ پاک نے ایمان کی دولت عطا کی ہے، اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ رنگ و روپ تو عارضی ہیں اور یہ تو اس دنیا تک ہیں، مرنے کے بعد سارے رنگ و روپ ویسے ہی اڑ جائیں گے، قبر میں جا کر کسی کا رنگ و روپ کیا بچے گا؟ ان کی ہڈیاں بھی مٹی ہو گئیں، پتہ نہیں کہ کیا حال گزرے گا؟ جسم صحیح سالم رہتا ہے یا نہیں؟ اور جب قیامت میں آئیں گے تو اللہ پاک ان عورتوں کو حوروں سے بھی زیادہ حسن عطا فرمائیں گے۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لَا تَنْكِحُوْا النِّسَاءَ لِحُسْنِهِنَّ فَعَسٰى حُسْنُهُنَّ أَنْ يُّرْدِيَهُنَّ وَلَا تَنْكِحُوْهُنَّ عَلٰى أَمْوَالِهِنَّ فَعَسٰى أَمْوَالُهُنَّ أَنْ تُطْغِيَهُنَّ وَانْكِحُوْهُنَّ عَلَى الدِّيْنِ فَلَأَمَةٌ سَوْدَاءُ خَرْمَاءُ ذَاتُ دِيْنٍ أَفْضَلُ''[1] تم صرف حسن سے نکاح نہ کیا کرو کہ جی بڑی حسین ہے، آخر وہ حسن ڈھل جائے گا؛ اس لیے کہ جب وہ حسین ہو گی تو لوگوں کی نظریں بھی تو اس کی طرف اٹھیں گی۔ تو وہی حسن اس کی ہلاکت کا باعث بن جائے گا۔ تم دولت کی وجہ سے شادی نہ کیا کرو کہ وہ دولت ان کو سرکش بنا دیتی ہے کہ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں اور تم کیا ہو؟ تم تو میرے نوکروں کی طرح ہو، تمہارا باپ تو ہمارے باپ کا نوکر تھا۔ میں تو اتنی دولت اور مال والی ہوں۔ فرمایا کہ دین والی عورت سے شادی کرو، اگرچہ وہ بے چاری سیاہ فام ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہ زیادہ بہتر ہے؛ کیونکہ ایمان والی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا

---

[1] [سنن کبریٰ للبیہقی: ۷/ ۸۰، درمنثور: ۱/ ۲۵۷]

وَلِجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ "[1] جب عورت کے ساتھ نکاح کیا جاتا ہے تو چار چیزیں دیکھی جاتی ہیں: یا تو مال دیکھا جاتا ہے، یا اس کا حسب ونسب دیکھا جاتا ہے، یا حسن دیکھا جاتا ہے یا دین دیکھا جاتا ہے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: تم دین والی عورت کو ترجیح دو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تیرے ہاتھ مٹی میں ہوں۔ یہ پیار کا کلمہ ہے۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: "اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ ، وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ"[2] دنیا سب نفع اٹھانے کا سامان ہے اور سب سے بہتر نفع اٹھانا یہ ہے کہ اللہ پاک پاکباز اور صالحہ عورت عطا فرمائے۔

اللہ پاک نے حکم دیا کہ مشرکین کے مرد مومن عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کریں، اگر چہ مشرک بڑا سردار ہی کیوں نہ ہو، حسب نسب والا کیوں نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں غلام چاہے غریب سیاہ فام ہو وہ زیادہ بہتر ہے؛ کیونکہ کافر جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ آؤ جہنم چلو! آؤ جہنم چلو! بلکہ ایسے اعمال کرواتے ہیں جو تمہیں جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ ان سے جب تمہارا اٹھنا بیٹھنا ہوگا، شراب خنزیر سب ہوں گے تو نتیجہ کیا نکلے گا......؟ جہنم۔

جب تم دنیا دار کافروں کے ساتھ بیٹھو گے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ آخرت بھول جاؤ گے اور پھر انجام بڑا خطرناک اور خراب ہوگا۔ ﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلاتے ہیں۔ "بِاِذْنِهٖ" کا معنی اپنی شریعت ہے کہ اللہ پاک نے ایسی شریعت نافذ کی، ایسے اوامر نافذ فرمائے اور ایسے نواہی نازل فرمائے کہ جن پر عمل کرو تو جنت ملے گی اور جہنم سے دور ہو جاؤ گے۔ ﴿وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾[البقرۃ:۲۲۱] اللہ پاک اپنے احکام کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، تاکہ تم اللہ کے حکموں سے نصیحت پکڑ سکو۔

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ ھُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾[البقرۃ:۲۲۲،۲۲۳]

[1] [صحیح البخاری، رقم:۵۰۹۰، باب: الأكفاء في الدين، صحیح مسلم: ۱۴۶۶، باب: استحباب نكاح ذات الدين]
[2] [صحیح مسلم: ۱۴۶۷، باب: خير متاع الدنيا المرأة الصالحة]

''اور آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔ فرما دیجیے: وہ گندگی ہے۔ تم عورتوں سے حیض کی مدت میں الگ رہو اور ان کے نزدیک نہ جاؤ، جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں۔ پس جب وہ اچھی طرح پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور گندگی سے بچنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں۔ جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔ اور اپنے لیے آگے کی تدبیر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم نے اس سے ملنا ہے۔ اور ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔''

یہ حیض کی حالت کے بارے میں سوال ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے تھے: سب سے بہتر جماعت کائنات میں اصحاب رسول اللہ رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے کہ انہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے سوالات نہیں کیے جو مشکلات کا باعث بن جائیں، بلکہ انہوں نے ایسے سوالات کیے ہیں جو تقریباً بیس یا اکیس سوالات بنتے ہیں اور وہ سوالات ایسے ہیں جن کا پوری امت کو قیامت تک فائدہ ہوگا۔

- ان میں سے ایک سوال یہ ہے: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ [البقرۃ:۲۱۹] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شراب کے بارے میں اور جوئے کے بارے میں سوال کیا کہ ان کا کیا حکم ہے؟
- اسی طرح سوال کیا: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ:۲۱۷] کہ حرمت والے چار مہینوں کا کیا حکم ہے؟
- اسی طرح: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ [البقرۃ:۱۸۹] کہ چاند کا چھوٹا ہونا یا بڑا ہونا، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے کیا احکام ہیں؟
- اسی طرح سوال کیا: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۱۹] کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کیا خرچ کریں؟

اسی طرح: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى﴾ [البقرۃ:۲۲۰] یتیموں کے بارے میں سوال کیا۔

اسی طرح اگر سارے قرآن پاک میں اسئلۂ صحابہ پر غور کیا جائے تو وہ ایسے سوالات ہیں کہ قیامت تک پوری امت کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہیں۔

اسی طرح ان سوالوں میں سے یہ ایک سوال تھا: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ﴾ [البقرۃ:۲۲۲] حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ عورت جب حیض کی حالت میں ہو تو اس وقت اس کے ساتھ مباشرت کرنے کا کیا حکم ہے؟

مسائلِ حیض:

سب سے پہلے یہ سمجھیں کہ عورتوں کو دو قسم کے خون آتے ہیں: ایک حیض کہلاتا ہے اور ایک نفاس کہلاتا ہے۔
حیض اس خون کو کہا جاتا ہے جو ہر مہینہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نظامِ قدرت سے عورت میں رکھا ہے کہ عورت جب بالغہ ہوتی ہے تو اس کو حیض آتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلٰى بَنَاتِ آدَمَ''[1] اللہ تعالیٰ نے بناتِ آدم پر یہ چیز لازم کر دی ہے۔ اس میں اس کی بہت بڑی حکمتیں ہیں۔ آپ دیکھیں کہ اگر ایامِ حیض بند ہو جائیں تو عورتوں کے لیے بہت ساری تکالیف پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب عورت کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو اس کے ایام منقطع ہو جاتے ہیں اور اس کا پورا نظام تبدیل ہو جاتا ہے اور جسم ناکارہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

حیض کی مدت:

حیض کی مدت کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک کم سے کم تین دن ہے، یعنی تین دن سے کم حیض نہیں ہو سکتا۔ اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔ اگر دس دن کے بعد بھی خون نہ رک رہا ہو تو وہ استحاضہ کا خون ہوگا، بیماری ہوگی۔ اکثر عورتوں کی عادت متعین ہوتی ہے، یعنی کسی عورت کی عادت پانچ دن کی اور کسی کی چھ دن کی عادت ہوتی ہے۔

حیض کی حالت کے احکام:

حالتِ حیض کے اندر عورت نہ تو نماز پڑھ سکتی ہے، نہ مسجد کے اندر داخل ہو سکتی ہے، نہ تلاوت کر سکتی ہے، نہ قرآن کو ہاتھ لگا سکتی ہے اور اسی طرح روزہ رکھنا بند ہو گیا، مگر باقی ذکر اذکار کر سکتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: اس کے اندر یہ احتیاط ہے کہ عورت ایامِ حیض میں اللہ تعالیٰ کے مفرد اسماء کا ذکر کرتی رہے؛ کیونکہ وہ ان دنوں میں پاک نہیں۔ اگر کوئی پڑھانے والی استانی ہے۔ اگر کوئی بچہ غلط پڑھ رہا ہو تو آیت کا کوئی حرف بتا سکتی ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں: اگر زبانی یاد ہو تو ہاتھ لگائے بغیر پڑھ سکتی ہے؛ اس لیے کہ حیض سے نکلنا اس کے اپنے ہاتھ میں تو نہیں۔ جنابت کی حالت میں عورت قرآن نہیں پڑھ سکتی اور مرد بھی جنابت کی حالت میں قرآن نہیں پڑھ سکتا جب تک غسل نہ کر لیں۔ کیونکہ جنابت سے نکلنا مرد اور عورت کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا حیض کی حالت میں عورت اللہ تعالیٰ کا

[1] [مسند احمد: ۲۶۵۳۸۵، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۹۵۰۷]

ذکر کر سکتی ہے، دعائیں بھی مانگ سکتی ہے، حتیٰ کہ ایامِ حج آجائیں تو وہ احرام بھی باندھ سکتی ہے۔ صرف نماز نہیں پڑھے گی اور طواف نہیں کرے گی؛ کیونکہ طواف بھی نماز کے حکم میں ہے۔ اور دوسرا یہ کہ طواف مسجد الحرام کے اندر ہوتا ہے اور عورت ناپاکی میں مسجد میں داخل نہیں ہوسکتی۔

حالتِ حیض میں عورت روزے بھی نہیں رکھ سکتی اور نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت یہ ہے کہ عورت روزے کی قضا کرے گی، لیکن نماز قضا نہیں کرے گی؛ کیونکہ زیادہ ہونے کی وجہ سے نمازوں کی قضا مشکل تھی تو اللہ تعالیٰ نے وہ معاف کردیں۔

ایام مکمل ہونے کے بعد غسل میں تاخیر نہ کرے:

ایک عورت کی عادت پانچ دن کی تھی۔ پانچ دن گزر گئے، خون بند ہوگیا اور نماز کا وقت موجود تھا۔ اب وہ عورت سستی اور غفلت کر رہی ہے کہ کام سے فارغ ہوکر ایک ہی دفعہ نہا لوں گی۔ یہ غلط بات ہے۔ جب عورت کے دن مکمل گزر جائیں، نماز کا وقت آئے تو فوراً غسل کرے؛ کیونکہ اگر اس نے نماز چھوڑ دی تو ترکِ صلوٰۃ کی مرتکب ہوجائے گی۔ اور اس سے بڑا گناہ اور وعید میں آجائے گی کہ جب بلیڈنگ بند ہوگئی تو اس پر فرض ہے کہ فوراً غسل کر کے نماز ادا کرے، تاکہ ذمہ سے نماز رہ نہ جائے اور قضا نہ ہوجائے۔ اسی طرح مثلاً: ایک عورت رات بارہ بجے پاک ہوگئی، اب وہ سستی کر رہی ہے کہ ابھی میں نے خاوند کے لیے سحری پکانی ہے، بچوں کے لیے کھانا بھی پکانا ہے، اس لیے میں صبح نہا دھولوں گی۔ یہ غلط بات ہے۔ اگر یہ روزہ چھوڑ دے گی تو گناہ گار ہوگی؛ کیونکہ اب وہ مجبور نہیں ہے، اس پر بھی قضا ہوگی اور گناہ بھی ہوگا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بلا وجہ چھوڑ دیا۔ اس لیے اس پر لازم ہے کہ وہ رات کو پاک ہوئی تو وہ روزہ کی نیت کرلے، اگرچہ صبح ہونے کے بعد غسل کرے۔

نفاس کے مسائل:

نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو بچہ پیدا ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ اسقاطِ حمل ہوگیا تو خون جاری ہوگیا تو اس کو نفاس کہتے ہیں۔ اس کی اقل مدت متعین نہیں ہے۔

آج اغلاط العوام سے ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اگر عورت کے ہاں بچہ پیدا ہو تو چالیس دن گزارنا ضروری ہے، چالیس دن کے بعد وہ پاک ہوگی۔ یہ بالکل جہالت ہے۔ لوگوں نے یہ مسئلہ اپنی عقل سے خود گھڑا ہوا ہے۔ اصل

مسئلہ یہ ہے کہ بچہ ہونے کے بعد جب خون بند ہو جائے، چاہے ایک دن کے بعد بھی خون بند ہو جائے تو وہ عورت پاک ہو جائے گی، نماز پڑھے گی، روزے رکھے گی اور میاں بیوی ملیں، کوئی پابندی نہیں۔

چالیس دن کا مسئلہ یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد خون آ رہا ہے، اسی طرح چالیس دن تک ہم انتظار کریں گے۔ اگر چالیس دن کے اندر خون بند ہو جائے تو عورت پاک ہو جائے گی اور اگر خون بند نہ ہو تو چالیس دن تک دیکھیں۔ اگر چالیس دن کے بعد بھی خون بند نہ ہوا تو چالیس دن کے بعد عورت غسل کر کے پاک ہو جائے، چاہے خون آ رہا ہو۔ اب وہ خون نفاس کا نہیں ہے، بلکہ یہ بیماری کا خون ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں بعض عورتیں ایسی تھیں کہ غسل کرنے کے لیے برتن میں بیٹھتیں تو برتن خون سے بھر جاتے تھے، لیکن چالیس دن کے بعد وہ روزہ رکھتی اور نماز پڑھتی تھیں، چاہے اس کے بعد خون آ رہا ہو؛ کیونکہ وہ خون بیماری کا ہے، نفاس کا نہیں ہے۔ جیسے مرد کو اگر بواسیر کا خون آ رہا ہو تو وہ نماز نہیں چھوڑ سکتا، اسی طرح کسی عورت کو بیماری ہو گئی تو فرق کیا جائے گا ایامِ حیض کے احکام کا، ایامِ نفاس کا اور استحاضہ کے احکام کا کہ اگر دس دن گزرنے کے بعد بھی خون آ رہا ہو تو اب نماز بھی پڑھے گی اور روزہ بھی رکھے گی۔ اگر عورت کو ایامِ حیض میں دس دن گزرنے کے بعد بھی خون آ رہا ہو تو وہ بیماری شمار ہوگی، حیض شمار نہیں ہوگا؛ کیونکہ دس دن سے زیادہ حیض نہیں ہو سکتا اور تین دن سے کم بھی حیض نہیں ہوگا۔

حیض کے ایام میاں بیوی کے مسائل:

سوال کرنے کی وجہ کیوں پیش آئی؟ جب حضور اکرم ﷺ کے صحابہ مدینہ منورہ میں تشریف لے آئے۔ حضور پاک ﷺ کے آنے سے پہلے مدینہ کے اندر یہودی آباد تھے: بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع وغیرہ۔ ان کے بڑے قبائل آباد تھے، جو شام سے ہجرت کر کے مدینہ آباد ہوئے تھے۔ (کیونکہ انہوں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ ایک نبی پیدا ہوں گے، جن کا نام محمد رسول اللہ ﷺ ہوگا وہ یہاں ہجرت کر کے تشریف لائیں گے تو وہ اس لیے شام سے مدینہ آئے، تاکہ ہم ان کے ہاتھ پر بیعت ہو کر مسلمان ہو جائیں اور اسلام لے آئیں، لیکن جب حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تو یہودی حسد کا شکار ہو گئے کہ نبوت بنی اسرائیل سے نکل گئی۔ بہر حال یہ یہودی مدینہ منورہ کے اندر رہتے تھے اور یہ اقتصادی طور پر مضبوط تھے۔) یہود کی یہ عادت تھی کہ جب عورت کو حیض آ جاتا تو

یہود عورت کو بالکل علیحدہ کر دیتے تھے کہ اس کا کمرہ بھی الگ، اس کے برتن بھی الگ، اس کا کھانا پینا بھی الگ اور اس کا لباس وغیرہ ہر چیز الگ کر دیتے تھے کہ یہ عورت ناپاک ہوگئی ہے۔ اس کا کسی چیز کو ہاتھ لگ گیا تو وہ چیز بھی ناپاک ہو جائے گی۔ جب عورت پاک ہو جاتی تو اس کی استعمال شدہ ہر چیز پھینک دی جاتی تھی اور عورت گھر میں آجاتی تھی۔

ہندوؤں میں بھی اب تک ایسی باتیں موجود ہیں۔ اور بعض مسلمانوں میں بھی کہ بچوں کو چیچک نکل آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس کے بچے کو سامنے نہ آنے دو، ورنہ اس کی بیماری بڑھ جائے گی۔ یہ ساری باتیں مسلمانوں کے اندر ہندوؤں سے آئی ہیں؛ کیونکہ ہندو اور مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ مسلمانوں کی تہذیب نے ان پر اثر نہیں کیا؛ کیونکہ کچھ لوگ تو نام کے مسلمان تھے، لیکن ان ہندوؤں کی تہذیب ان کے اندر داخل ہوگئی۔ ہندوؤں کا آج بھی یہی عقیدہ ہے کہ حیض والی عوت کو دور کر دو، اب عورت سامنے نہ آئے۔ اس کے برتن علیحدہ، کھانا علیحدہ، کپڑے علیحدہ، اٹھنا، بیٹھنا اور لیٹنا سب علیحدہ ہو؛ کیونکہ اب وہ عورت ناپاک ہے۔

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ پہنچے تو اب دو خیال پیدا ہوئے کہ ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ کیونکہ حضور اکرم ﷺ جب مکہ میں تھے وہاں زیادہ توحید کا درس ہوتا رہا۔ مدینہ منورہ جانے کے بعد شریعت کے احکام آئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ حالتِ حیض میں ہم اپنی عورتوں کے ساتھ کیا برتاؤ کریں؟ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم یہودیوں کے دشمنی میں اتنے سخت ہو گئے تھے کہ انہوں نے کہا: یہ یہودی حالتِ حیض میں عورت کو بالکل علیحدہ کر دیتے ہیں، ہم ان کی مخالفت کرتے ہیں، اس لیے ہم حالتِ حیض میں اپنی بیویوں سے جماع کر لیا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! اپنے صحابہ کو بتا دو: یہودیوں کی دشمنی کا معنی یہ نہیں کہ اپنی شریعت بدل ڈالو۔ اگر عورت حیض میں ہے تو اس کے ساتھ کھانا جائز، لیٹنا جائز، بیٹھنا جائز، میاں بیوی کا پیار کرنا اور محبت کرنا جائز اور ایک رضائی کے اندر لیٹنا جائز ہے، لیکن جماع نہیں کر سکتے۔ ''قُلْ هُوَ أَذًى'' کیونکہ وہ خون گندگی ہے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو گندگی سے دور رکھا ہے۔ اور اس کا معنی یہ بھی نہیں کہ یہودیوں کی طرح عورت کو نکال دو کہ ناپاک ہوگئی۔

اب جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ پہنچے تو ان کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ ایک تو خیال یہ پیدا ہوا کہ انہوں نے سوال کیا: ہم کیا کریں؟ ہمارے لیے کیا حکم ہے کہ جب عورت حیض میں آجائے تو ہم اپنی عورتوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کریں؟ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہودیوں کی دشمنی میں اتنا سخت ہو گئے تھے کہ انہوں نے حضور پاک ﷺ سے

سوال کیا کہ یہ یہود حالتِ حیض میں عورتوں کو بالکل علیحدہ کر دیتے ہیں، ہم ان کی مخالفت کیوں نہ کریں؟ اور ہم حالتِ حیض میں ان کے ساتھ جماع بھی کرلیا کریں، حالتِ حیض میں میاں بیوی مجامعت کر سکتے ہیں یا نہیں کر سکتے؟

اب دیکھیں کہ اسلام کتنا پاک مذہب ہے کہ اس کی ہر چیز میں پاکی ہے کہ عورت کے ایامِ حیض جب ختم ہو گئے، مثلاً: چھ دن کی عادت ہے اور رات پوری ہونے پر پاک ہونے والی ہے۔ رات گزرے گی تو وہ فارغ ہو جائے گی، تو آخر میں حکم یہ ہے کہ عورت کپاس اپنے بدن میں رکھے، تا کہ تسلی ہو جائے کہ کوئی خون یا سفید رنگ کے علاوہ کا پانی باقی تو نہیں۔ اور اس کے بعد پھر خوشبو والی کپاس رکھے، تا کہ اندر کی بدبو نچڑ جائے اور اس کا بدن صاف ہو جائے۔ اسی طرح جیسے عرب کے اندر رواج ہے کہ انگارے جلا کر اس پر عود یا لوبان وغیرہ رکھتے ہیں، اس سے خوشبودار دھواں پیدا ہوتا ہے تو یہ جلا کر عورت اس کے اوپر کھڑی ہو جائے، تا کہ پورے بدن کے اندر خوشبو آ جائے اور عورت کا گندا پانی نیچے گر جائے اور عورت پاک ہو جائے۔ تو اسلام نے کتنا نظافت والا نظام دیا ہے۔

اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے محبوب! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتا دو کہ یہودیوں کی دشمنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی شریعت بدل لیں، بلکہ وہ اِفراط میں پڑ گئے ہیں۔ اگر عورت حیض میں ہے تو اس کے ساتھ کھانا جائز، لیٹنا جائز، بیٹھنا جائز، میاں بیوی کا محبت پیار کرنا جائز، ایک رضائی کے اندر اکٹھے لیٹنا جائز اور بوسہ دینا جائز، صرف جماع نہیں کر سکتے۔ حالتِ حیض میں میاں بیوی ہر عمل کر سکتے ہیں، لیکن جماع نہیں کر سکتے؛ کیونکہ وہ خون ہے، گندگی ہے اور اللہ پاک نے مسلمانوں کو گندگی سے دور رکھنا ہے۔ اور یہ معنی بھی نہیں کہ یہودیوں کی طرح عورت کو گھر سے نکال دو کہ جی! ناپاک ہو گئی۔ اگر عورت حیض میں ہے اور اس نے کھانا پکایا ہے تو کھاؤ؛ کیونکہ اس کے ہاتھوں میں حیض تھوڑی ہے۔

حدیث: حضور سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مجھے مصلی دے دو۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''أَنَا حَائِضٌ''۔ یارسول اللہ! میں حیض میں ہوں، تو میں مسجد سے مصلی کیسے اٹھاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمہارے ہاتھوں میں حیض ہے؟ کمرے میں بیٹھے بیٹھے مصلی اٹھالو (کیونکہ کمرہ مسجد کے قریب تھا)۔ اسلام نے عدل والا حکم دیا ہے کہ نہ تو یہودیوں کی طرح حالتِ حیض میں عورت سے نفرت کرو اور نہ حد سے تجاوز کرو کہ حالتِ حیض میں بھی جماع کرلو۔

اگر حالت حیض میں جماع کرلیا تو توبہ کریں اور ایسے گناہ سے بچنے کی کوشش کریں جس سے اللہ تعالیٰ نے قرآن

میں منع کیا ہے۔ اور فرمایا کہ گندگی ہے، اس سے بچو۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر میاں بیوی نے غلطی کی تو توبہ بھی کریں اور کچھ صدقہ بھی کریں، حتیٰ کہ بعض علماء نے بعض احادیث کے پیشِ نظر یہ بھی لکھا ہے کہ دیکھا جائے کہ انہوں نے غلطی کب کی ہے؟ جب حالتِ حیض کا زور تھا یا ختم ہونے والا تھا؟

حیض کے غسل سے قبل حقوقِ زوجیت ادا کرنا:

عورت کا حیض رات کو پورا ہو گیا، لیکن ابھی عورت نے غسل نہیں کیا۔ میاں بیوی کہتے ہیں کہ غسل تو ویسے بھی کرنا ہے، چلو مجامعت بھی کرلیں، صبح غسل حیض والا بھی ہو جائے گا اور مجامعت والا بھی ہو جائے گا۔ یہ بھی حرام ہے۔ جب تک وہ پاک نہ ہو جائے میاں بیوی کا لیٹنا حرام ہے؛ کیونکہ حکم ہے کہ ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ [البقرۃ:۲۲۲] جب عورتیں پاک ہو جائیں۔ اور وہ غسل کریں گی تو پاک ہوں گی۔

ہاں! اگر عورت کا حیض اس کی پوری مدت پر ختم ہوا ہے تو غسلِ حیض سے پہلے بھی جماع کرنا جائز ہے۔ ویسے بھی طبی نقطۂ نظر سے باقاعدہ کتابوں میں یہ بات ثابت ہے کہ اگر حالتِ حیض میں میاں بیوی ملیں تو دونوں کو ایک خطرناک بیماریاں ہو جاتی ہیں، مثلاً: سوزاک آتشک ہو جاتی ہیں، کبھی ایسی بیماریاں ہو جاتی ہیں کہ عورت بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ مجامعت کے وقت اگر کچھ گندا خون مرد کے عضوِ تناسل میں داخل ہو گیا تو اس سے سوزاک ہو جاتی ہے۔ اس لیے اسلام نے اس سے منع فرمادیا کہ ایسا کام نہ کریں۔ اور اس کے بعد صدقہ خیرات بھی کردیں اور آئندہ ایسی حرکت بالکل نہ کریں۔

مسئلہ: ﴿فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۲۲] جب وہ عورت پاک ہو جائے تو اب تم اپنی بیوی سے جماع کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے۔ آگے اس حکم کی وضاحت فرمادی: ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ؗ﴾ [البقرۃ:۲۲۳] کہ تمہاری بیویاں تمہارے لیے ایسی ہیں جیسے کھیتی ہوتی ہیں۔ جیسے کھیتی میں بیج ڈالتے ہو اور پھل آتا ہے، اسی طرح نطفہ تخمِ انسانی ہے۔ اور جب اس سے بچہ بچی ہوگی تو وہ پھل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اپنی کھیتی والی جگہ سے تم اپنی عورت سے جماع کرو جس طرح چاہو۔

اس سے بعض لوگوں نے یہ لے لیا ہے کہ دبر میں بھی جماع جائز ہے۔ وہ لفظ ''اَنّٰى'' سے دلیل پکڑتے ہیں، حالانکہ اسی آیت کے اندر دو لفظ ہیں: ایک ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ﴾ اور دوسرا لفظ: ﴿حَرْثٌ

لَّكُمْ﴾ ہے۔ الٹی طرف کھیتی کی جگہ ہی نہیں، وہاں سے تو بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ تو الٹی جگہ جانا بھی حرام ہے۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''مَلْعُوْنٌ مَنْ أَتَى امْرَأَةً فِيْ دُبُرِهَا'' وہ آدمی لعنتی ہے جو اپنی عورت سے الٹی طرف سے جماع کرتا ہے۔[1]

اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا: یہ عمل قوم لوط کا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ فاعل ومفعول دونوں کو قتل کر دو۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں: قتل کرنے کے بعد آگ میں ڈال دو۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی لواطت کرے یا خاوند اپنی عورت کے دبر میں لواطت کرے تو اس پر تعزیر یعنی شریعت میں کوئی مقرر سزا نہیں ہے، حاکم جو مناسب سمجھے سزا دے سکتا ہے اور اس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔

﴿أَنّٰى شِئْتُمْ﴾ کا معنی:

باقی ﴿أَنّٰى شِئْتُمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ یہ تمہارے لیے پابندی نہیں ہے کہ تم لیٹ کر مجامعت کرو، تم کروٹ کے بل مجامعت کرو، تم کھڑے ہو کر مجامعت کرو، تم بیٹھ کر مجامعت کرو اور عورت کو اپنے اوپر لٹا کر مجامعت کرو، وہ تمہاری مرضی ہے جس طرح تم چاہو اس سے لذت حاصل کرو۔ خبردار! جگہ وہی استعمال کرنی ہے جو کھیتی والی ہے۔ اگر اس کے علاوہ تم نے تجاوز کیا تو تم پر لعنت بھی ہوگی اور تم عذاب کے مستحق بھی ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر بات ہمیں سمجھا دی ہے، تاکہ ہم قیامت تک کسی غلطی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

آج کل جو فلمیں اور بلیو پرنٹ کے عذاب آئے ہیں...... دعا کریں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے گھرانوں کی حفاظت فرمائے! اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمانوں کے بچوں اور بچیوں سب کی حفاظت فرمائے! ان کو ہدایت دے اور قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق دے...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... اب تو ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے جاتے ہیں، شیطان وہاں سے خود بھی بھاگ جائے کہ یہ تو میرے بھی باپ ہیں، مجھے یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے!!

بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ لوگ فسق و فجور میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ پہلے شیطان ان کو بہکانے کا انتظار کرتا تھا، لیکن اب شیطان ان کے پاس روزانہ حاضر ہو کر کام سیکھتا ہے کہ مجھے حکم دو: آج میں کیا ڈیوٹی دوں؟ اب تو انسان اتنا آگے جا چکا ہے...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... ایسی ایسی باتیں ہیں سن کر شرم آتی ہے کہ کتنے لوگ

[1] سنن ابی داؤد، رقم: ۲۱۶۲، باب: في جامع النكاح

آکر مسئلہ پوچھتے ہیں کہ اگر بیوی کا دودھ حلق میں چلا جائے تو اس کا کیا مسئلہ ہے؟ جبکہ آج سے تیس سال پہلے اگر خاوند ایک برتن میں دودھ پیا ہوتا اس برتن میں بیوی کو دودھ بھی نہیں پینے دیتے تھے، (حالانکہ یہ شریعت کے اندر حرام نہیں تھا) وہ اتنا ڈرتے تھے کہ میں کیسے پی لوں؟

یاد رکھیں! لذت بھی حلال میں ہے اور اسلام کے طریقوں کے اندر ہے۔ اگر آپ عورت کو عریان کر کے بٹھا دو تو اس کو کتنی دیر تک دیکھو گے؟

حضرت بلھے شاہ فرماتے تھے: اگر عورت تجھ پر مہربان ہو جائے تو آخری مہربانی یہی کرے گی کہ پیشاب کا برتن تمہیں دے گی کہ آؤ! تم بھی اس سے جو حاصل کرنا چاہو حاصل کرلو۔

صحبت کے وقت کی دعا:

﴿وَقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ﴾ یعنی جب تم میاں بیوی مجامعت کرو تو اس قت دعا کرو: ''بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ! جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا'' [بخاری، رقم:۱۴۱] اے اللہ! شیطان کے حملے سے ہمیں بچانا اور اس سے جو اولاد پیدا ہو اس کو بھی شیطان کے حملہ سے بچانا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جان لو کہ تم نے اپنے اللہ کے آگے جانا ہے۔ تیری ہر حرکت اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تم بیوی کو کیسے استعمال کرتے ہو کہ تم نے اس کو بیوی بنایا ہوا ہے یا گھر میں طوائف اور کنجری بنایا ہوا ہے؟

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۲۳] کہ میرے مدنی! ایمان والوں کو خوشخبری دے دو۔ دعا کریں! اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایمان والا بنائے، اللہ تعالیٰ ہمارے بچوں کو بھی ہدایت دے اور اللہ تعالیٰ سب کو اطاعتِ والدین نصیب فرمائے۔

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۲۴، ۲۲۵]

''اور اللہ کو اپنی قسمیں کھانے کا نشانہ نہ بناؤ کہ نیکی کرنے سے اور پرہیزگاری سے اور لوگوں کے درمیان صلح کرانے سے بچ جاؤ۔ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ اللہ تمہاری ناکارہ قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرے گا، لیکن اس قسم پر مؤاخذہ کرے گا جس کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا ہے۔ اور اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مسئلہ سمجھایا ہے کہ تم اپنی قسموں کو ڈھال نہ بناؤ جو تمہاری نیکی سے اور اصلاح کرنے سے حجاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

قسم کے مسائل:

بعض اوقات آدمی قسم کھا بیٹھتا ہے کہ میں اپنی بیوی سے بات نہیں کروں گا، حالانکہ بیوی کے ساتھ بات کرنے کا حکم ہے، جیسا کہ عورت کے ذمہ مرد کے حقوق ہیں کہ مرد کی اطاعت کرے۔ جب اس پر مرد کی نظر پڑے تو مرد کو خوشی حاصل ہو، یعنی وہ اپنے لباس کو اور اپنی شکل کو اچھا رکھے، تاکہ مرد کو خوشی میسر ہو۔ اور اگر مرد غائب ہو جائے تو اس کے مال کی حفاظت کرے، بچوں کی نگرانی کرے، ان کو وقت پر مدرسہ کے لیے، سکول کے لیے تیار کرنا ہے۔ اسی طرح خاوند کے ذمہ ہے کہ بیوی کے نان نفقہ کا خیال رکھے، اس کے لباس کا خیال رکھے، اس کی رہائش کا خیال رکھے اور اس کے جائز اخراجات ادا کرے۔

اگر کوئی آدمی قسم کھالے کہ میں بیوی سے بات نہیں کروں گا، یا قسم کھالے کہ میں بھائی کے گھر نہیں جاؤں گا، یا قسم کھالے کہ میں اپنے فلاں بھائی کی مدد نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کر نیکی سے رکنا چاہتے ہو اور قسموں کو ڈھال بنانا چاہتے ہو کہ اب میں نے تو قسم کھالی ہے، اب میں کیا کروں؟ اگر کوئی آدمی اسے کہے کہ تم ہمیشہ غریب کی مدد کرتے تھے، اب کیا وجہ ہے کہ تم نے اس کی مدد کرنا چھوڑ دی ہے تو وہ کہے کہ مجھے اس سے تکلیف ہوئی تو میں نے قسم کھالی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قسموں کو ڈھال مت بناؤ کہ اس کی وجہ سے تم نیکی کے کام چھوڑ دو۔

روایات میں آتا ہے جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہودیوں نے تہمت لگائی تو اس زمانہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس پروپیگنڈا کا شکار ہو کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے، جیسے حضرت مسطح رضی اللہ عنہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ شریک ہو بیٹھے، حالانکہ وہ عدول صدوق ہیں، ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ'' ہیں، لیکن یہ فطری بات ہے کہ جب آپ کوئی بات چھیڑ دیں،

چاہے وہ بات جھوٹی ہے، لیکن اس کے اثر میں بعض لوگ آجاتے ہیں۔ بہر حال...... الحمد للہ...... بات ختم ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل کردی جو قیامت تک قرآن میں پڑھی جائے گی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی مدد فرماتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غصہ میں آگئے کہ آج کے بعد ان کی مدد نہیں کروں گا؛ کیونکہ وہ میری بیٹی پر تہمت لگانے میں شریک ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں۔

احادیث میں ایک اور واقعہ بھی آتا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاں مہمان آئے، مگر آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دیر ہوگئی۔ گھر والوں نے مہمانوں کو کھانا بھجوایا تو انہوں نے کہا: ''لَا نَأْكُلُ حَتّٰى يَأْتِيَ أَبُوْبَكْرٍ'' (ہم کھانا نہیں کھائیں گے جب تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہ آجائیں)۔ گھر والوں نے کہا: ان کو دیر ہوسکتی ہے؛ کیونکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہیں۔ آدمی جب اپنے محبوب کی خدمت میں ہوتا ہے تو کیسے دل چاہے گا کہ اس کو چھوڑ کر چلا جاؤں؟ مہمانوں کو جب اصرار کیا گیا تو انہوں نے کہا: ''وَاللّٰهِ! لَا نَأْكُلُ'' ہمیں اللہ تعالیٰ کی قسم ہے! ہم اس وقت تک کھانا نہیں کھائیں گے جب تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف نہ لائیں گے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھر میں تشریف لائے تو گھر والوں سے سب سے پہلے یہی پوچھا کہ کیا مہمانوں کو کھانا مل گیا؟ انہوں نے عرض کیا: مہمان نہیں کھاتے، ہم نے بڑا زور لگایا، لیکن انہوں نے قسم کھالی کہ اللہ کی قسم ہے! ہم نہیں کھائیں گے جب تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف نہ لے آئیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی غصہ میں آگئے، کہنے لگے: میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھا۔ یہ اچھے مہمان ہیں کہ قسم کھالی۔ میں ان کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر آجاتا؟ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی قسم کھا کر فرمایا: مجھے اللہ کی قسم ہے! میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اگر میری وجہ سے نہیں کھاتے تو میں بھی نہیں کھاتا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیوی نے بھی قسم کھالی کہ جب مہمان بھی کھانا نہیں کھاتے، گھر کا مالک بھی کھانا نہیں کھاتا، لہٰذا مجھے بھی اللہ کی قسم ہے! میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گی۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو احساس ہوا کہ یہ عجیب بات ہوگئی کہ میں بھی بھوکا رہوں، گھر والے بھی بھوکے رہیں اور مہمان بھی بھوکے رہیں، لہٰذا میں قسم توڑتا ہوں۔ کھانا لے آؤ، کھانا کھاتے ہیں۔ مہمانوں کے پاس کھانا لے آئے اور کھانا کھایا۔ صبح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر یہ سارا واقعہ عرض کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے اچھا کیا۔ اگر کوئی آدمی ایسے قسم کھا بیٹھے تو اس کو ایسی قسم توڑ

دینی چاہیے۔

قسم کا کفارہ:

ایسی قسم توڑنے کی صورت میں اسلام نے کفارہ رکھا ہے۔ یاد رکھیں! بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے مرضی آئے قسم کھالیں، بعد میں کفارہ دے دیں گے۔ یہ غلط بات ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ......نعوذ باللہ...... استہزاء اور کھیلنے والی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ قسم توڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ایسی قسم کھائی، اس کام کے متعلق جس کا کرنا ضروری تھا اور تم نے بے وقوفی کر کے قسم کھالی کہ میں نہیں کروں گا، مثلاً: قسم کھالی کہ میں باپ کے گھر میں نہیں جاؤں گا۔ اگر کوئی آدمی ایسی غلطی کر بیٹھے تو اسلام نے اس سے نکلنے کا حل رکھا ہے: ﴿فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ﴾ [المائدۃ:۸۹] کہ تم دس مسکینوں کو کھانا کھلا دو اور آئندہ ایسی بات نہ کرو۔

لغو قسم کے مسائل:

ان آیات کے اندر دوسرا مسئلہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ﴾ آدمی کی قسم کھانے کی نیت نہیں تھی، لیکن بلا وجہ قسم کھالی، یا ایسے کام پر قسم کھالی یا قسم کھانے کا ارادہ نہیں ہے، لیکن قسم کھا بیٹھا اور یہ سمجھتا تھا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں، حالانکہ وہ حقیقت میں سچ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ ایسی قسموں پر تمہیں نہیں پکڑیں گے، سزا نہیں دیں گے: ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ لیکن وہ قسمیں جو تم نے دلی طریقے سے عزم کے ساتھ کھائی ہیں کہ جان بوجھ کر تم نے جھوٹی قسم کھائی، اس پر اللہ تعالیٰ پکڑتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھیں کہ قسم کھانے سے بچیں، بلا وجہ بھی قسم نہ کھائیں، لغو قسموں پر چاہے اللہ تعالیٰ نہ پکڑیں؛ کیونکہ یہ پسندیدہ عمل نہیں ہے۔

اگر کسی بات پر قسم کھائی ہے اور وہ بھلائی کا کام ہے تو اس قسم کا کفارہ ادا کریں اور بھلائی کا کام نہ چھوڑیں۔ جیسا کہ کسی کو کہا جائے کہ مسجد میں نماز کے لیے جاؤ تو وہ کہے گا: میں نہیں جاتا؛ کیونکہ میرا اس مولوی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے قسم کھائی تھی، میں اس مسجد میں نہیں جاؤں گا۔ یعنی قسم سے ڈر رہا ہے اور نماز کا تارک بن رہا ہے۔ جیسا کہ آج کل لوگ بعض چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تو بچتے ہیں اور بڑی چیزوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو ایسی قسم کو توڑ

دے، اس کا کفارہ ادا کرے اور نماز کے لیے مسجد میں جائے۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ [البقرة:٢٢٥] اللہ تعالیٰ بخشنے والے بھی ہیں اور حلم والے بھی ہیں، یعنی جلدی سے ہمیں گناہوں پر سزا نہیں دیتے۔ اگر ہمیں ہر گناہ کی سزا دیں تو کوئی آدمی ہمیں زمین پر چلتا پھرتا ہوا نظر نہ آئے۔

قسم کھانے سے ہمیشہ بچیں! ہمارے دیہاتوں میں ایک مسئلہ بڑا مشہور ہے کہ قسم نہ کھا ناحق ناحق لگی ہے۔ یہ خدا پر کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ وہ تو لغو قسم پر نہیں پکڑتے تو اگر ہم سچی بات پر قسم کھائیں تو وہ کیوں ناراض ہوں گے؟ بلکہ اس میں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت آتی ہے کہ ہم نے سچی بات کی ہے۔ جھوٹی قسم پر اللہ تعالیٰ پکڑتے ہیں اور پکڑنے میں دیر بھی ہوسکتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ آدمی نے جھوٹی قسم کھائی اور اسی وقت ہلاک ہوا اور بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ آدمی نے جھوٹی قسم کھائی، مدت گزر گئی، بندہ بھول گیا، اس وقت اس کو سزا ملی اور اس کو یاد بھی نہیں کہ مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔

ظالم کو سانپ کھا گیا:

(واقعہ) ہمارے اپنے علاقے کی عدالت میں قتل کا مقدمہ پیش ہوا، چونکہ مثل میں کچھ نہیں تھا، عدالت مجبور ہوتی ہے؛ کیونکہ وہ آن ریکارڈ فیصلہ کرتی ہے کہ گواہ کیا کہتے ہیں؟ جج نے سب وکلاء کے سامنے کہا: چونکہ ریکارڈ میں اس قاتل کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں اس کو سزا دے سکوں، لیکن میری تحقیق میں یہ قاتل ہے۔ اور اس قاتل کو کہا: میں تجھے بری کر رہا ہوں، تمہارا مقدمہ ختم ہوگیا، لیکن ایک بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ مظلوم کا بدلہ خود لیتے ہیں۔ جب تک ورثاء مقتولین معاف نہ کردیں۔ بہر حال وہ تو اس قسم کا آدمی تھا، وہ بری ہوگیا۔ عدالت کے باہر اس کے دوست اس کا شاندار استقبال کرتے ہوئے اسٹیشن پر لے آئے۔ جہاں اترے وہاں دو میل کے فاصلے پر ان کا گھر تھا۔ رات کو ٹرین پہنچی۔ وہاں مشورہ ہوا کہ ساری پارٹی پیدل چلے۔ کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ سانپ نے اس کو ڈس لیا اور وہ قاتل موقع پر ہی مر گیا۔

غیر اللہ کی قسم کھانے کا حکم:

قسم صرف اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ساتھ کھا سکتے ہیں، اس کے علاوہ کی کوئی قسم کھائے تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ شرک کیا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں بعض جاہل لوگ پیر کی قسم، پیر کے آستانے کی قسم کھاتے

ہیں، یا اپنی اولاد کی قسم کھاتے ہیں۔ اور یہ بات تو عام ہے کہ مجھے اپنے رزق کے اڈے کی قسم ہے! یہ شرک ہے، چھوٹا گناہ نہیں ہے۔

''مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ كَفَرَ'' اور ایک روایت میں ہے ''أَشْرَكَ'' [1] کہ شرک بن جاتا ہے؛ کیونکہ قسم اس چیز کی کھائی جاتی ہے جس کی دل میں عظمت ہو۔ اگر دل میں عظمت نہ ہو تو آدمی اس کی قسم نہیں کھاتا۔ آپ نے کبھی پلاسٹک کے گلاس کی قسم نہیں کھائی، آپ کعبہ کی قسم کھائیں گے؛ کیونکہ اس کی دل میں عظمت ہے۔ آپ قرآن کی قسم کھائیں گے کہ دل میں اس کی عظمت ہے۔

جب آدمی قسم کھاتا ہے اس کے دل میں یقین ہوتا ہے کہ اگر میں نے جھوٹی قسم کھائی تو لازماً مجھے نقصان ہوگا۔ اور نفع ونقصان دینے والا اللہ ہے۔ اب اگر کسی نے پیر کے مزار کی قسم کھائی، پیر کی قسم کھائی تو اس کا عقیدہ یہ بن گیا کہ اگر میں نے جھوٹی قسم کھائی تو پیر نقصان دے گا۔ اور بعض لوگوں کا تو...... نعوذ باللہ...... یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جھوٹی قسم کھالو، پھر بھی کچھ نہیں ہوتا، پیر کے نام کی جھوٹی قسم نہ کھانا وہ فوراً مار دیتا ہے۔ اندازہ لگائیں کہ اگر ایک آدمی کو کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کی قسم کھاؤ وہ دس قسمیں کھالے گا اور اگر اس کو کہا جائے کہ بیٹے کے نام کی قسم کھاؤ تو نہیں کھائے گا کہ میرا بیٹا مر جائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ بیٹے کی عظمت خدا کی عظمت سے بڑھ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تو آدمی نے جھوٹی قسم کھالی اور دوسرا کافر ومشرک بن گیا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان چیزوں سے منع فرما دیا۔

ربطِ آیات کی اہمیت:

اس سے پہلے حیض کا مسئلہ تھا اور اب قسم کا مسئلہ ہے۔ اصولی بات یاد رکھیں کہ قرآن ایک دن میں نہیں اترا، بلکہ تئیس سال کی مدت میں قرآن اترا ہے اور اس انداز میں اترا ہے کہ جہاں جہاں کوئی واقعہ پیش آیا اللہ تعالیٰ نے قرآن اتار دیا۔ اس لیے ہمیں ربط کے ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قرآن میں اوامر ہیں، اس میں نواہی ہیں۔

دیکھیں! ایک بادشاہ کے دربار میں سارا دن بہت سارے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ اب اگر شام کو کوئی ان سارے احکامات کی لسٹ بنا کر ربط بنا تا رہے تو وہ کہے گا: عجیب بات ہے کہ ایک آرڈر میں ہے کہ اس کو قتل کر دو اور

[1] [جامع الترمذی: ۱/ ۲۹۰، سنن ابی داود، رقم: ۳۲۵۱]

دوسرے میں ہے کہ اس کو بلڈنگ دے دو، جبکہ سمجھدار آدمی کہے گا کہ یہ تو بادشاہ کا آرڈر ہے۔ جیسے جیسے فائلیں پیش ہوتی گئیں، حکم آتا گیا۔ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جیسے جیسے واقعات آتے گئے اللہ تعالیٰ ان کا حل بیان فرمادیا۔ علماء نے لکھا ہے کہ پہلے تو ہمیں ایسے واقعات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ ایک صحابی نے آکر پوچھا: ﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة:۲۱۷] کہ شہر حرام میں جہاد کے کیا معنی ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے وہ آیت اتار دی۔ اور کسی صحابی نے پوچھا: ﴿يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ﴾ [البقرة:۲۱۵] کہ ہم کتنی خیرات کریں؟ اور کسی نے پوچھا: ﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ﴾ [البقرة:۱۸۹] کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں کیا حکمت ہے؟

قرآن کی ایک ترتیب نزولی ہے اور ایک ترتیب قراءت ہے۔ نازل ہونے کی ترتیب الگ ہے اور پڑھنے کی ترتیب الگ ہے۔ لیکن بعض علماء نے ربط کی کوشش کی ہے؛ کیونکہ مستشرقین اعدائے اسلام، خاص طور پر: یہودی، نصرانی، ہندو، بڑے بڑے دہریے اور بڑے بڑے شیوعین جو اللہ تعالیٰ کے قرآن کے دشمن ہیں، اسلام کے دشمن ہیں وہ ایسی باتیں کر کے نوجوان نسل کے دماغوں کو خراب کرتے ہیں کہ قرآن اگر اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس میں تو ربط ہی نہیں ہے۔ پہلے حیض والی عورتوں کا قصہ جارہا تھا، آگے قسم کے بارے میں آگیا ہے۔ حالانکہ ایک عالم آدمی ہو، اس کے کلام میں بھی جوڑ ہوتا ہے۔ اور مسلمان کہتے ہیں: قرآن خدا کا کلام ہے تو اس میں ربط کیوں نہیں ہے؟ اس لیے بعض علماء نے محنتیں فرمائی ہیں اور اس پر باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں اور ایک سورت کا دوسری سورت کے ساتھ ربط پیدا کیا ہے اور اسی طرح اوّل سورت کا آخری سورت کے ساتھ ربط کیا ہے؟ اور آیات میں آپس میں کیا تعلق ہے؟ اس پر علماء نے تفسیریں لکھی ہیں۔ جیسے ایک مشہور حدیث ہے: ''نَظْمُ الدُّرَرِ فِي رَبْطِ الْآيَاتِ وَالسُّوَرِ'' اب طبع ہو چکی ہے، جو کبھی نادر تھی۔

علماء نے یہاں بھی ربط بیان فرمایا کہ جب ایامِ حیض ہوتے ہیں تو میاں بیوی میں وہ قربت نہیں ہوتی جو حالتِ طہارت میں ہوتی ہے۔ اور آگے قسم کا بیان ہے۔ اس میں آگے جب آپ پڑھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ مسئلہ ایلاء عورتوں کے متعلق آرہا ہے اور حیض کے مسئلے کا تعلق بھی عورت کے ساتھ ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا قرآن آپس میں جڑا ہوا ہے، جیسے موتی جڑے ہوئے ہوں۔ ان کے اندر تو کسی نقص کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح علماء نے بیان فرمایا کہ عام طور پر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایامِ حیض میں میاں بیوی کی قربت نہیں ہو رہی ہوتی تو کبھی کبھی وہ قسمیں کھا بیٹھتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں سوؤں گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان قسموں کا مسئلہ بیان

فرمایا، تاکہ اگر کوئی قسم کھا بیٹھے کہ بیوی سے بات نہیں کروں گا یا کوئی قسم کھا بیٹھے کہ بیوی کے ساتھ نہیں لیٹوں گا، یہ غلط بات ہے۔

اسی طرح آدمی لغو قسمیں بھی کھاتا رہتا ہے۔ ان کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے سمجھا دیا کہ اگر تم نے قسم کھائی جو تم نے اپنے دل کے ارادے سے قسم کھائی اس پر تمہارا مواخذہ ہوتا ہے، لیکن اگر توبہ کر لو اللہ تبارک وتعالیٰ بخشنے والے بھی ہیں اور رحم فرمانے والے بھی ہیں۔

حدیث: امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ'' [1] کہ اللہ تعالیٰ نے باعتبار زمانہ کے سب سے آخر میں ہمیں بھیجا، لیکن اللہ تعالیٰ قیامت والے دن جنت میں سب سے پہلے ہمیں بھیجیں گے۔ اور فرمایا: اگر کوئی آدمی قسم کھا لیتا ہے کہ میں بیوی سے بات نہیں کروں گا۔ اور یہ قسم اس کو الجھانے والی بن جائے کہ میں اپنی بیوی سے کیسے بات کروں؟ میں نے قسم کھالی تھی کہ میں بیوی سے نہیں بولوں گا۔ یہ نہیں ہوتا کہ اگر تم نے کسی نیکی کے کام پر قسم کھالی ہے تو اس پر جمے رہو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے قسم کا جو کفارہ فرض کیا ہے، کفارہ ادا کرنے کے بعد اس بھلائی کے کام کو اختیار کرو۔ اور وہ کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائیں، چاہے دس مسکینوں کو اکٹھا بلا کر کھانا کھلا دیں یا آپ چاہیں ایک ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ نہ تو اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا ہو اور نہ ایسا ہو کہ ایک ایک روٹی ان کو پکڑا دو، بلکہ درمیانہ کھانا جو تمہاری حیثیت ہے کھلا دو۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی آدمی نے کھائی کہ اپنے اہل خانہ کے پاس نہیں جاؤں گا، والدین کی خدمت پیش کروں گا۔ تو اس نے غصہ کے اندر ایسی کوئی قسم کھالی تو گناہ گار ہو اور کفارہ بھی اس کی معافی کا ذریعہ نہیں بنے گا، بلکہ وہ توبہ اور استغفار بھی کرے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ والدین سے احسان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد ان کا ذکر کیا: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ [النساء: ۳۶] میری عبادت کرو اور اس کے ساتھ شرک نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کرو۔ اب آدمی اس حکم کو بھول جائے کہ میں نے تو قسم کھائی ہے کہ باپ کے پاس نہیں جاؤں گا، میں قسم کیسے توڑوں؟ یعنی اللہ کی قسم کو بہانہ بنا کر اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑ رہا ہے۔

[1] [صحیح البخاری: رقم: ۱/ ۲۹۹، صحیح مسلم: ۲/ ۵۸۶]

ہماری زندگیوں میں جو اکثر خلا اور ناکامیاں ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ بنیادی چیزوں کو تو ہم نے چھوڑ دیا ہے اور جو غیر ضروری چیزیں ہیں ان کو ہم نے مضبوطی کے ساتھ پکڑا ہوا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا، امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہ کافر ہے، باقی ائمہ کے نزدیک وہ فاسق و فاجر ہے۔ اب یہ ہے کہ ہم نماز کے مسئلے کو ایک طرف رکھ دیں اور اولی، اعلیٰ، راجح اور مرجوح مسئلے پر لڑتے رہیں۔

اصل مسئلہ تو یہ ہے بے نمازی کو نمازی بنائیں، عقیدے کی اصلاح کریں۔ اب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: والدین سے اچھا سلوک کرو، بیوی کے حقوق ادا کرو۔ اب کوئی آدمی کہے: میں نے تو قسم کھائی ہے، میرا بیوی سے جھگڑا ہے، میں کیسے قسم توڑ دوں اور بیوی سے بات کروں؟

(حدیث) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''إِنِّي وَاللهِ! إِنْ شَاءَ اللهُ لَا أَحْلِفُ عَلَى يَمِينٍ فَأَرَى غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا إِلَّا أَتَيْتُهُ'' میں بھی کسی اچھے کام سے رکنے کی قسم کھالوں اور پھر مجھے یقین ہو کہ اس کام کا کرنا بہتر ہے تو میں کفارہ دے کر اس کام کو کر دوں گا۔ (بخاری ومسلم) یعنی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات گرامی کی مثال بیان فرما دی، اس کے بعد کسی کو سوچنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عہدہ طلب نہ کرو:[1]

حدیث: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: اے عبدالرحمن! تم اپنی طرف سے سوال نہ کرنا کہ مجھے حاکم بنا دو، مجھے قاضی بنا دو؛ کیونکہ اگر تمہیں یہ عہدہ تمہارے سوال کے بغیر مل گیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریں گے اور اگر تم نے سوال کر کے حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے حوالے کر دیتے ہیں کہ تم جانو اور تمہارے کام جانے؛ کیونکہ تم نے خود مانگا ہے، اب خود ہی اس سے نکلو۔ اور جب آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد نہ ہو تو کیسے کامیاب ہو سکتا ہے؟

موجودہ دور میں جو ہمارے ملکوں میں کافروں کا نظام چل رہا ہے، ہم...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... اس میں صرف درخواستیں نہیں دیتے، بلکہ کروڑوں روپے خرچ کر کے اس عہدے کو حاصل کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ آنے کے بعد سب سے پہلے وہ اپنا حساب پورا کرے گا، پھر آئندہ آنے والے کے لیے بھی تیاری کرنی ہوتی ہے وہ بھی جمع کر کے رکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ لوٹ کھسوٹ ہے۔ جو بندہ بھی کرسی پر بیٹھتا ہے، بہت کم لوگ ہیں، جو اللہ

[1] مسند احمد: رقم: ۲۰۶۲۸، ۱۹۳۵۳۸، کنز العمال: رقم: ۱۴۶۰۳۲

تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں، ورنہ یہی ہے کہ چیڑ اسی سے لے کر اوپر تک چلے جائیں سب کا مقصد صرف اپنے مفاد حاصل کرنا ہے۔ جبکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ تم عہدے کے متلاشی نہ بنو۔ ہاں اگر علاقے کے لوگوں نے اور برسراقتدار لوگوں نے سمجھا کہ یہ بندہ عہدے کے قابل ہے اور انہوں نے تمہاری طلب کے بغیر عہدہ دیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ مدد کرتے ہیں۔ اور صاف ظاہر ہے کہ ایسا آدمی عدل بھی کرے گا؛ کیونکہ اس نے اس عہدے کے لیے کچھ خرچ نہیں کیا اور کسی کا احسان نہیں لیا۔ اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بغیر مانگے ہوئے عہدہ دیا ہے۔

اس لیے دیکھیں کہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں جن لوگوں کو عہدے ملتے تھے وہ کئی کئی دن تک روتے رہتے تھے۔ ہم تو امتحان میں آ گئے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا حساب بھی ہمارے سر پر آ گیا، ہم قیامت میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟

آپ اندازہ کریں! سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ...... جن کے عدل وانصاف کا ڈنکا آج بھی ساری دنیا میں بج رہا ہے، جن کا انصاف ضرب المثل ہے اور جن کے فیصلے ایسے ہوتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے قرآن اتار کر کے تائید فرما دی، لیکن...... جب خلافت کا آخری وقت آیا تو وہ کہتے تھے کہ یا اللہ! میں نے جو یہ دس سال حکومت کی ہے، اس میں نہ مجھے ثواب ملے اور نہ عذاب ملے، برابر کر کے چھوڑ دیں تو میں راضی ہوں۔

اس لیے یاد رکھیں کہ یہودیت اور نصرانیت نے ایک ایسا کھیل کھیلا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے کافرانہ نظام میں ایسے الجھا دیا ہے کہ اب آپ اس سے کبھی کوئی خیر اور بھلائی کی توقع نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسا جال ہے کہ اس سے کوئی آدمی بچ کر نہیں نکل سکتا۔ مثلاً: آپ الیکشن میں کھڑے ہوں، ایک آدمی نے آپ کو ووٹ دیا۔ اب وہ آدمی جرم کرے گا تو آپ اس کو کیسے پکڑیں گے؟ کیونکہ وہ آپ کا سپورٹر ہے۔ اور انہوں نے مسلمانوں کو ایسا نعرہ دے دیا ہے کہ ہر آدمی اس کے پیچھے دیوانہ ہو کر بھاگ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان اسلام سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں اور جہاں جہاں یہ لعنت مسلط کی گئی ہے وہاں نہ سکون ہے، نہ امن واحترام ہے، نہ لوگوں کو معاش ملتی ہے اور نہ برکات ہیں۔ چوبیس گھنٹے ہر آدمی ایک عذاب میں مبتلا ہے۔ جس کے پاس کرسی ہے وہ مزے میں ہے اور جو غریب ہے وہ روز بروز غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کا زندگی گزارنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو وقت کے بادشاہ نے قضا کا بڑا عہدہ دینا چاہا، لیکن آپ نے انکار کر دیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کو دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ اگر تم کبھی قسم کھا بیٹھے اور پھر تمہیں بعد

میں سمجھ آیا کہ میں نے جو قسم کھائی ہے کہ یہ کام نہیں کروں گا اس کا کرنا بہتر ہے تو قسم پر نہ جمے رہنا، بلکہ قسم کا کفارہ ادا کر کے اس بھلائی والے کام کو ضرور سرانجام دے دینا۔

حدیث: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی آدمی قسم کھا بیٹھے اور پھر بعد میں دیکھے کہ اس کام کے کرنے میں تو بھلائی ہے تو وہ اس قسم کا کفارہ ادا کر کے اس بھلائی کے کام کو کرے۔

ایک روایت میں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ابن آدم کی کوئی ایسی قسم یا منت جو اس کے اپنے ہاتھ میں نہ ہو وہ قسم اور منت نہیں ہے۔ مثلاً: ایک آدمی کہے کہ میں منت مانتا ہوں کہ دس لاکھ طواف کروں گا، اسی طرح کوئی کہے کہ میں منت مانتا ہوں کہ میں دس کروڑ ریال خیرات کروں گا اور اس کے پلے میں دس ریال بھی نہیں تو یہ منت نہیں ہوگی۔

قطع رحمی اور گناہ کی قسم کھانا:

اسی طرح اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں فلاں کی چوری کروں گا، ایک تو یہ نافرمانی ہے اور دوسرا قسم بھی خدا کی کھا رہا ہے۔ اور اسی طرح قطع رحمی کی قسم کھائے، یہ بھی گناہ ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔ ایسی قسموں کے کھانے سے اللہ کے رسول نے روکا ہے۔

حدیث: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو گناہ پر قسم کھائے اس کی بھلائی یہ ہے کہ وہ قسم توڑ ڈالے اور گناہ سے واپس لوٹ آئے۔

ایک آدمی نے قسم کھائی: مجھے اللہ کی قسم ہے! اگر مجھے فلاں آدمی نے نقصان پہنچایا تو میں اس کی چوری کروں گا۔ یہ معصیت ہے۔ کیا اب یہ قسم ہوگی؟ کیا اس کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا؟ بعض ائمہ فرماتے ہیں: ایسی قسم نہیں ہوتی؛ کیونکہ قسم وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہو، معصیت کی قسم قسم نہیں ہوتی، اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اگر ایسی قسم کھا بیٹھا ہے تو اس کا کفارہ دے گا۔

لات اور عزّیٰ اور پیر کی قسم کھانا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی آدمی لات وعزّیٰ کی قسم کھا بیٹھے تو اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً کہے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے ان کی زمانہ جاہلیت میں

عادت تھی کہ وہ لات اور عزیٰ کی قسمیں کھاتے تھے اور وہ قسمیں ان کی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اس لیے کبھی کبھی بلا اختیار ان کی زبانوں پر وہ قسمیں آجاتی تھیں۔ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً کلمہ پڑھے۔ اور اگر کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کے سوا غیر اللہ کی جان بوجھ کر قسم کھائے تو وہ کافر ہو جاتا ہے، یعنی اگر کوئی آدمی یہ عقیدہ رکھے کہ اگر میں پیر کے مزار کی قسم کھاؤں گا یا پیر کے وجود کی قسم کھاؤں گا اور یہ عقیدہ رکھے کہ اگر میں غلط قسم کھاؤں گا تو مجھے نقصان پہنچے گا تو یہ کفر و شرک ہے۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی سمجھ لو کہ اگر کبھی زبان سے کفر و شرک کا کلمہ نکل گیا تو اس کا علاج بھی یہی ہے کہ فوراً کلمہ پڑھ لے۔

کتابوں میں آتا ہے کہ بی بی رابعہ بصریہ ؒ نے دیکھا کہ ان کے ساتھی مجلس میں بیٹھ کر شیطان کی مذمت کر رہے ہیں۔ بی بی صاحبہ نے ان کو فرمایا: تم لوگ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے کہا: شیطان کا ذکر آ گیا تھا تو ہم اس پر لعنت بھیج رہے تھے۔ بی بی صاحبہ نے فرمایا: تم نے جتنی دیر دشمن کا ذکر کیا ہے اتنی دیر دوست کو یاد کر لیتے۔ بی بی صاحبہ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ شیطان کو لعنت نہ کرو، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ شیطان تو ملعون ہے ہی، لیکن ایک دوست ہے اور ایک دشمن ہے۔ جتنی دیر آدمی دشمن کا ذکر کرے اتنی دیر دوست کا ذکر کیوں نہ کرے؟ لازمی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں زیادہ فضیلت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہم منفی پہلو پر زیادہ چلتے ہیں اور برائی ڈھونڈیں گے، لیکن اگر اس میں کوئی اچھائی ہے تو اس کا کبھی ذکر نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مثبت پہلو پر کام کرنے کی توفیق عطا دے۔

﴿لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ ۖ فَإِن فَآءُو فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۲۲۷]

''جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسمیں کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار مہینے تک مہلت ہے۔ پھر اگر وہ باہم مل جائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر طلاق کا ارادہ کر لیا ہے تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایلاء کے بارے میں ذکر فرمایا ہے۔ چونکہ یہ بھی ایک قسم ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قسم کی آیات کے بعد ایلاء کا ذکر کیا ہے کہ ایک آدمی قسم کھاتا ہے: میں اپنی بیوی سے صحبت نہیں کروں گا۔ تو اس قسم کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

ایلاء کی صورت:

زمانہ جاہلیت میں یہ ہوتا تھا کہ لوگ بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے تھے۔ اس طرح بیوی درمیان میں لٹک جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک حکم جاری فرمادیا کہ اگر کوئی آدمی یا تو یہ قسم کھائے کہ میں کبھی اپنی بیوی سے نہیں ملوں گا اور اس نے مدت متعین نہیں کی، یا وہ کہے کہ میں چار مہینے تک بیوی سے نہیں ملوں گا، یا یہ کہے کہ میں تین مہینے تک بیوی سے نہیں ملوں گا۔

ایک صورت میں مدت متعین نہیں کی، دوسری صورت میں چار مہینے یا زیادہ کی مدت متعین ہے اور تیسری صورت میں چار مہینے سے کم کی مدت متعین ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ اگر کسی نے قسم کھائی اور چار مہینے سے کم کی کھائی، مثلاً: کہا کہ میں تین مہینے تک اپنی بیوی سے نہیں ملوں گا۔ اور تین مہینے تک وہ اپنی بیوی سے نہیں ملا۔ تین ماہ گزرنے کے بعد اس نے ملنا شروع کردیا تو ٹھیک ہے۔ نہ اس پر قسم کا کفارہ ہے اور نہ اس پر کوئی اور گناہ ہے۔

ایک آدمی نے قسم کھائی کہ میں چار مہینے تک اپنی بیوی سے نہیں ملوں گا۔ اگر چار مہینے کے اندر اندر اس نے رجوع کرلیا تو قسم کا کفارہ ادا کرے اور اس کی بیوی پہلے کی طرح حلال ہے۔ اس نے چار ماہ کی قسم کھائی تھی اور ابھی چار مہینے نہیں گزرے تھے اور وہ پہلے بیوی سے مل گیا۔ قسم کا کفارہ ادا کرے گا اور کسی قسم کا اس پر جرمانہ نہیں آئے گا۔

ایلاء کے چار ماہ گزرنے کے بعد رجوع کے لیے صرف نکاح کافی ہے:

قسم کھائی کہ میں چار مہینے تک اپنی بیوی سے صحبت نہیں کروں گا۔ اب چار مہینے گزر گئے اور صحبت نہیں کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کی بیوی کو طلاق بائن ہوجائے گی۔ اب اس مرد پر عورت حرام ہوگئی۔ اب اگر یہ چاہتا ہے کہ یہ عورت پھر سے میرے نکاح میں آجائے تو اس سے دوبارہ نکاح کرے گا، حلالہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔

غیر معین مدت تک ایلاء کا حکم:

ایک آدمی نے قسم کھائی تھی کہ میں بیوی سے صحبت نہیں کروں گا اور مدت متعین نہیں کی ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ سے پہلے پہلے رجوع کرلیا تو کفارہ ادا کرے گا اور بیوی بیوی رہے گی۔ اگر چار ماہ گزر گئے اور رجوع نہیں کیا تو طلاق پڑ جائے گی۔ اس کے بعد رجوع کرنا چاہے گا تو نکاح کرنا پڑے گا اور کسی قسم کا کفارہ ادا نہیں کرنا

پڑے گا۔

اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں چار مہینے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت نہیں کروں گا۔ چار مہینے گزر گئے تو کیا اب اس کو طلاق دینی ہوگی یا خود بخود طلاق ہو جائے گی؟ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ فرماتے ہیں: طلاق دینی پڑے گی۔ اگر وہ مرد طلاق نہیں دیتا تو عورت قاضی کے پاس جائے، قاضی مرد کو بلا کر جبر کرے کہ تم اس کو طلاق دو تو اس طرح طلاق واقع ہوگی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چار مہینے کی قسم کھائی تھی۔ جب چار مہینے گزر گئے تو قسم خود بخود واقع ہو جائے گی اور اس کو دوبارہ طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے: ﴿فَإِنْ فَاءُوْ فِيْهِنَّ﴾ قراءتِ شاذہ ہے۔ قاعدہ ہے کہ اگر قراءت شاذہ قراءتِ متواترہ کی تفسیر ہو تو اس قراءت پر اعتماد کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کا معنی یہ ہے کہ اگر چار مہینے کے اندر اندر رجوع کر لیا تو ٹھیک، طلاق نہیں ہوگی، ورنہ چار مہینے گزرنے کے بعد خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی۔

واقعۂ ایلاء:

حدیث پاک میں ایک بہت بڑا مشہور واقعہ گزرا ہے۔ آقائے نامدار، خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ اپنی ازواجِ مطہرات سے ناراض ہو گئے، آپ نے قسم کھالی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج سے ملنا بند کر دیا۔ اور مدینہ میں افواہ اڑ گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ جب یہ بات اڑی تو سب سے پہلے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بڑا صدمہ گزرا!! کیونکہ ان کی بیٹیاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تھیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں سیدھا اپنی بیٹی کے گھر گیا اور کہا کہ میں تمہیں کہا کرتا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ نہ کیا کرو۔ تم بار بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خرچے مانگتی ہو تو اب نتیجہ نکل آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے مسجد نبوی میں آکر دیکھا کہ سب صحابہ پریشان ہیں، کوئی گھٹنوں میں سر دے کر رو رہا ہے، کوئی غم میں مبتلا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھ سے بھی صبر نہ ہوا، میں سیدھا آیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بالا خانہ میں موجود تھے۔ میں نے اطلاع دی، اجازت نہ ملی۔ مجھ سے صبر نہ ہو سکا، میں نے تھوڑی دیر بعد پھر اجازت مانگی، لیکن پھر بھی اجازت نہ ملی۔ تیسری دفعہ جب میں نے اجازت مانگی تو اجازت ملی۔ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر سب سے پہلے سوال کیا:

یارسول اللہ! کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تو طلاق نہیں دی ہے۔ میں نے تو قسم کھائی ہے کہ بیویوں سے نہیں ملنا ہے ایک ماہ کے لیے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خوش ہو کر اللہ تعالی کی تکبیر کا نعرہ بلند فرمایا۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو جب اطلاع ملی تو سب خوش ہو گئے اور الحمد للہ کہا کہ حضور اکرم ﷺ نے قسم کھائی ہے، طلاق نہیں دی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اس کے بعد مناسب سمجھا کہ کوئی ایسی بات کروں کہ حضور اکرم ﷺ خوش ہو جائیں تو میں نے عرض کیا: حضور! عورتوں کو تو آپ نے سر پر چڑھا دیا ہے۔ ہم مکہ والے تو ان کو سیدھا کر کے رکھتے تھے، کوئی چیز مانگتیں تو ان کو بید مار مار کر ان کی پسلیاں توڑ ڈالتے تھے۔ جب سے ہم مسلمان ہوئے ہیں یہ تو ہمارے سر پر بیٹھ گئی ہیں۔ اسلام نے ان کو اتنے حقوق دے دیئے ہیں کہ یہ تو ہماری بات بھی نہیں سنتی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ مسکرا دیئے۔ جو غصہ تھا وہ نکل گیا۔

رجوع کرنے کے دو طریقے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بیوی کو صرف اتنا کہہ دے کہ میں نے رجوع کر لیا، بیوی سے میاں بیوی والا عمل کیا یا لوگوں کے سامنے رجوع کا اقرار کر لیا وغیرہ تو رجوع ہو جائے گا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رجوع میں صحبت شرط ہے کہ عورت سے جماع کرے؛ کیونکہ بیوی سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، اس لیے اب وہ صحبت بھی کرے۔

اصل میں یہ علمی مباحث ہیں اور آج جو میری طرح میرے بھائی پانچ پڑھے ہوئے ہیں، جن کو اللہ تعالی کی رحمت سے قدوری کا ترجمہ بھی نہ آئے وہ ائمہ اربعہ پر اعتراض کرتے ہیں۔

اصل علمی بحث یہ ہے کہ کیا قولِ رسول افضل ہے یا فعلِ رسول افضل ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک فعلِ رسول افضل ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ساری شریعت قولِ رسول کا نام ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ ہر عمل حضور اکرم ﷺ خود کریں؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ صاحبِ نصاب نہیں تھے، کبھی زکوۃ نہیں دی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب قسم کھائی تو کیا زبان سے کھائی تھی؟ یا وہ بھی کوئی فعل تھا؟ صاف ظاہر ہے قول ہے۔ جب قول سے قسم ہو جاتی ہے تو اسی طرح قول سے رجوع بھی ہو جائے گا۔

طلاق ناپسندیدہ عمل ہے:

اللہ تعالی کو سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جب کوئی مرد اپنی عورت کو بلا وجہ طلاق دیتا ہے تو اللہ تعالی کا عرش ہل جاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ یہ کتنا ناپسندیدہ عمل ہے!! اسی لیے اسلام

نے یہ پابندی لگائی ہے کہ اگر تم نے ایلاء کرلیا ہے تو رجوع کرلو۔ اگر تم نے طلاق دے دی ہے تو مدت کے اندر رجوع کرلو، یا عورت کو عزت کے ساتھ فارغ کردو، تاکہ عورت جہاں چاہے دوسرا نکاح کرلے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ تجھ سے بہتر شوہر عطا فرمادے۔ اور تم بھی شادی کرلو گے تو ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے اور اچھی بیوی عطا کردیں۔ اسی طرح دونوں کے گھر آباد ہوجائیں گے۔

لیکن یہ ہماری جاہلیت ہے کہ طلاق بھی نہیں دیتے اور آباد بھی نہیں کرتے، حقوق بھی ادا نہیں کرتے اور طلاق بھی نہیں دیتے، بیوی کو خرچہ بھی نہیں دیں گے اور حقوق بھی ادا نہیں کریں گے، والدین مجبور ہوکر اس کو اپنے پاس بٹھائیں گے اور جب اس کو واپس گھر بھیجیں گے تو خاوند کی وہی نفرت اور وہی طعنے ہوں گے۔ ان سب چیزوں کو اسلام ناجائز سمجھتا ہے کہ اگر بیوی کو ساتھ رکھنا ہے تو عزت کے ساتھ رکھو۔ اگر تمہاری نہیں بن سکتی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر چھوڑنا ہے تو ان کو احسان کے ساتھ چھوڑ دو۔ اگر کوئی آپس میں جھگڑا ہوگیا تھا، اب صلح ہوگئی ہے تو سابقہ باتوں کو مت دہراؤ، ان کو زبان پر مت لے آؤ۔ بس ایک بات تھی اس کو بھول جاؤ؛ کیونکہ اگر تم زبان پر لاؤ گے تو وہ فتنے دوبارہ زندہ ہوں گے۔

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ﴾ اس سے ایک اور مسئلہ نکلا کہ آدمی اپنی بیویوں سے ایلاء کرسکتا ہے، باندیوں سے نہیں کرسکتا۔ اب باندیوں کا قصہ بھی ختم ہوگیا ہے۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۲۲۶] تم نے جو چار ماہ کی قسم کھالی یہ زیادتی ہے۔ تو اس چار مہینے میں جو مرد نے عورت کو تکلیف پہنچائی، لیکن اگر تم رجوع کرلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردیں گے؛ کیونکہ جیسے مرد کا حق ہے اسی طرح عورت کا بھی حق ہے۔ جس طرح مرد میں اللہ تعالیٰ نے جماع کی خواہش رکھی ہے اسی طرح عورت کے اندر بھی خواہش رکھی ہے۔ تم نے چار مہینے کی قسم کھا کر اس کو اس تقاضے کو پورا کرنے سے روک دیا۔ اب اگر اس کے بعد تم نے رجوع کرلیا تو اللہ تعالیٰ بخشنے والے اور مہربان ہیں۔ اس سے اشارہ کردیا کہ یہ بھی غلطی ہے، اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گشت کا واقعہ:

حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک دفعہ رات کو گشت کررہے تھے اور ایک مکان کے قریب سے گزرے تو ایک عورت خاوند کی جدائی میں عربی میں اشعار پڑھ رہی تھی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ میں آج اکیلی سوئی

ہوں اور میرا خاوند مجھ سے دور ہے۔ اگر مجھے اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہوتا تو میری چارپائی پر آج کوئی اور سویا ہوا ہوتا۔
جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار سنے تو تڑپ گئے۔ آپ نے فوراً اپنی بیٹی سے رجوع کیا اور ان سے پوچھا:...... دین کا سوال پوچھنے میں شرم نہیں ہونی چاہیے۔ اور چونکہ وہ زوجہ محمد ﷺ تھیں، جتنا ان کو علم ہوسکتا ہے وہ زوجہ عمر کو نہیں ہوسکتا تھا...... میری بیٹی! مجھے بتاؤ کہ ایک عورت بغیر خاوند کے کتنے دن گزار سکتی ہے؟ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے بڑا اچھا جواب دیا: کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟ فرمایا: اللہ کے قرآن میں تو کہیں نہیں لکھا ہوا کہ اتنے دن عورت علیحدہ رہ سکتی ہے۔ فرمایا: ایک خاوند مر جائے تو متوفی کی کتنی مدت ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چار ماہ اور دس دن کی عدت ہوتی ہے۔ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے اتنے دن عدت رکھی ہے تو اسی میں حکمت ہے کہ اس سے زیادہ عورت کو مرد سے علیحدہ نہیں رہنا چاہیے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ بات سمجھ آگئی اور آپ نے ایک حکم جاری فرمادیا کہ اب مجاہدین جب جہاد پر جائیں، ان کا سلسلہ اس طرح جوڑا جائے کہ ایک مجاہد گھر سے چار ماہ سے زیادہ غائب نہ رہے، تاکہ وہ اپنی بیویوں کے حقوق ادا کرسکیں اور بیویاں اپنے حقوق کا صحیح استفادہ کرسکیں۔

وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے مدت چار ماہ اور دس دن رکھی ہے اور یہاں بھی ایلاء کی آخری حد چار ماہ ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ لگائیں کہ کتنے لوگ ہیں جن کے گھر میں بیوی موجود ہے اور اپنی خواہشاتِ نفس اپنی بیوی سے بھی پورا کرتے ہیں، لیکن کتوں کی طرح دوسروں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے۔

کیا ایلاء کی مدت پوری ہونے کے بعد بھی کفارہ ہے؟

ایک آدمی نے چار مہینے کے بعد رجوع کیا تو کیا اس پر کفارہ ہے یا نہیں؟

یہاں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب چار مہینے پورے ہوگئے تو طلاق ہوگئی۔ چار مہینے کے اندر اس کو رجوع کرنے کا حق تھا، لیکن چار مہینے گزرنے کے بعد رجوع کرنے کا حق نہیں، اب مدت پوری ہوگئی۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور باقی ائمہ کا ایک قول ہے کہ چار مہینے گزرنے کے بعد بھی اگر جلدی جلدی رجوع کرلے تو رجوع ہوجاتا ہے اور اس پر کوئی کفارہ وغیرہ بھی نہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر چار مہینے کے بعد بھی وہ بات باقی ہے تو پھر قرآن میں چار مہینے کے ذکر کی

ضرورت ہی کیا ہے؟ جبکہ قرآن نے چار ماہ کی پابندی لگائی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ﴿فَإِنْ فَآؤُا فِيهِنَّ﴾ کہ اگر وہ رجوع کریں ان چار ماہ کے اندر اندر تو ٹھیک ہے۔ اگرچہ یہ قراءتِ شاذہ ہے، لیکن اصول ہے کہ اگر قراءتِ شاذہ قراءتِ متواترہ کی تفسیر ہو تو وہ قابل حجت ہوتی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قولِ قدیم ہے کہ اگر چار ماہ کے بعد بھی رجوع کیا تو اس پر کفارہ نہیں۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص قسم کھالے اور دیکھے کہ اس طرح کرنا نہ کرنے سے بہتر ہے تو قسم توڑ دے۔ اور اس نے بھی قسم کھائی تھی۔ اور بیوی سے ملنا نہ ملنے سے بہتر ہے۔ لہٰذا رجوع کرلے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں مطلق قسم کا ذکر ہے، چار ماہ کی قید نہیں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے پھر خود یہ قول چھوڑ دیا۔ اور ان کا قولِ جدید یہ ہے اور یہی جمہور کا قول ہے کہ وہ کفارہ دے گا؛ کیونکہ مطلقاً قسم پر کفارہ ہے، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چار ماہ گزرنے کے بعد طلاق ہوگئی، اب وہ رجوع نہیں کرسکتا اور اس پر کفارہ نہیں: کیونکہ اس نے اپنی قسم پوری کرلی۔

مدتِ ایلاء ختم ہونے پر خود بخود طلاق ہوجاتی ہے:

﴿وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ [البقرۃ: ۲۲۷]۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ لفظ دلالت کرتا ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد طلاق خود بخود واقع نہیں ہوجاتی؛ کیونکہ اگر خود بخود طلاق ہوجاتی تو ﴿وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ اس لیے چار ماہ گزرنے کے بعد عورت خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ چونکہ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف مائل ہیں تو لکھ دیا کہ چار ماہ گزرنے کے بعد خود بخود طلاق واقع نہیں ہوگی، بلکہ چار ماہ گزرنے کے بعد اس سے طلاق کا مطالبہ کیا جائے گا اور دلیل یہی آیت دی۔

اور آگے فرمایا: کچھ حضرات اس طرف بھی گئے ہیں کہ چار مہینے گزرنے سے طلاق ہوجائے گی۔ اور وہ حضرات یہ ہیں: حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور اس کے بعد تابعین میں ابن سیرین، مسروق، قاسم، سالم، حضرت ابوسلمہ، قتادہ، شریح، عطاء، ابراہیم نخعی اور حضرت سدی رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ چار ماہ گزرنے کے بعد طلاق خود بخود ہوجائے گی۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک آدمی نے چار مہینے کے لیے قسم کھائی۔ اب چار ماہ میں رجوع کرلیا تو ٹھیک ہے تو گویا

عزمِ طلاق اس کا نہیں ہے؛ کیونکہ اگر عزمِ طلاق ہوتا تو وہ رجوع نہ کرتا۔ اتنے بڑے صحابہ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم جنہوں نے خود حضور اکرم ﷺ سے قرآن پڑھا ہے، ان کا بھی یہی قول ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ سب پر رحمتیں کرے؛ کیونکہ فہم میں خطا ہو سکتی ہے، لیکن ان کی نیتوں میں خطا نہیں تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اجر دیا ہے۔

اگر مجتہد نے اجتہاد کیا اور وہ قرآن وسنت کے مطابق نکلا تو اس کو دوہرا ثواب ہوگا اور اگر اجتہاد غلط نکلا تب بھی اس کو اجتہاد کرنے کا ثواب ملے گا؛ کیونکہ اس نے دین تک پہنچنے کی جد و جہد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

مدت گزارنے پر کونسی طلاق واقع ہوگی؟

چار ماہ گزرنے کے بعد کونسی طلاق واقع ہوگی؟ رجعی ہوگی یا طلاقِ بائن ہوگی؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: طلاقِ بائن ہوگی۔ یعنی جب تک اس عورت سے دوبارہ نکاح نہ کرے اس وقت تک وہ عورت اس کی بیوی نہیں بن سکتی۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض حضرات فرماتے ہیں: یہ طلاقِ رجعی ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں: طلاق بائن ہوجائے گی۔ یہ قول حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عثمان غنی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور اسی قول کو حضرت عطا، حضرت مسروق، حضرت عکرمہ، حضرت حسن، حضرت محمد بن الحنفیہ اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ بھی فرماتے ہیں۔

اب دیکھیں کہ امام صاحب کا پلڑا کتنا بھاری ہے کہ ان کے ساتھ سارے خلفاء موجود ہیں اور سارے صحابہ موجود ہیں۔ اب اگر کوئی آدمی امانت دیانت کے ساتھ اور دل میں تعصب نہ ہو کوئی مسئلہ لے لے تو سب سے زیادہ وزن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس ہوگا۔

کیا ایلاء کے بعد طلاق کی عدت گزارنا ضروری ہے؟

چار ماہ گزرنے کے بعد چاہے خود بخود طلاق ہوگئی یا خاوند سے طلاق لی گئی بہر حال طلاق ہوگئی، اب عورت پر عدت ہے۔ لیکن ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ ہے کہ ان چار ماہ کے اندر اگر تین حیض گزر چکے ہیں تو اب مزید عدت گزارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں: اس عورت کو عدت گزارنی ہوگی؛ کیونکہ عدت طلاق کے بعد ہوتی ہے، طلاق سے پہلے نہیں ہوتی۔ ...... واللہ تعالیٰ اعلم......

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [البقرۃ:۲۲۸]

''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (دوسری جگہ نکاح کرنے سے) روکے رکھیں۔ اور ان کے لیے حلال نہیں کہ چھپائیں جو اللہ نے ان کے پیٹ میں پیدا کیا ہے اگر وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند کو اپنی بیویوں کے پھیر لینے کا حق ہے اس عرصہ (تین حیض) میں اگر وہ صلح کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اور دستور کے موافق عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ ان پر مردوں کا حق ہے۔ اور مردوں کا ان سے کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے۔ اور اللہ زبردست ہے، تدبیر کرنے والا ہے۔''

ان آیات میں احکامِ طلاق کا بیان ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھیں کہ طلاق کی اقسام پر بناء احادیث مبارکہ جو فقہاء کرام نے نقل فرمائی ہیں قرآن و سنت کی روشنی میں وہ یہ ہیں کہ طلاق یا تو رجعی ہوگی یا بائن ہوگی یا مغلظہ ہوگی۔ یہ تین قسم کی طلاقیں ہیں۔ یہ نہیں کہ فقہاء نے خود بنائی ہیں، بلکہ قرآن و حدیث کی ساری آیات ان کے سامنے ہوتی ہیں۔

طلاقِ رجعی: کا معنی یہ ہے کہ خاوند نے اپنی بیوی کو ایک رجعی طلاق دی۔ اب اگر ایک رجعی طلاق دینے کے بعد خاوند رجوع کرنا چاہے تو بغیر نکاح کے رجوع کر سکتا ہے۔

اور ایک طلاقِ بائن ہے، اگر خاوند اس کو دوبارہ اپنے پاس رکھنا چاہے تو تجدید نکاح کر کے رکھ سکتا ہے، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

طلاق مغلظہ: کا معنی ہے کہ خاوند نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ اب خاوند کو بعد میں ہوش آیا، یا حالات آئے، اب وہ چاہتا ہے کہ میں دوبارہ اپنی بیوی کو گھر میں لے آؤں تو اللہ تعالیٰ کے قرآن نے واضح مسئلہ بیان فرمادیا: ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۳۰]۔ اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہوگی جب تک کہ وہ عورت عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے اور وہ مرد جو اس سے شادی کرے باقاعدہ نکاح ہو، عورت اس کے عقد میں جائے اور وہ خاوند اس سے جماع کرے اور اس کے بعد

طلاق دے دے۔

حضور اکرم ﷺ کی حدیث مبارک ہے: ''لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلَ لَهٗ'' [ابوداود، رقم: ۲۰۷۶] کہ جو لوگ صرف یہ کاروبار بنائیں گے کہ کسی نے طلاق دے دی تو اگر کسی نے حلالہ کرانا ہے تو وہ تیار بیٹھے ہوں، ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ یہ انسان نہیں، بلکہ سانڈھ اور کرائے کے جانور ہیں۔ اس لیے اللہ کے نبی ﷺ نے ان پر لعنت کی ہے۔ اور اسی طرح اس پر بھی لعنت بھیجی ہے جو شخص ایسے لوگوں کے پاس آئے اور کہے کہ میں نے چونکہ تین طلاقیں دے دی ہیں، میں نے بیوی کو حلال کرانا ہے، میں اس کو پھر رکھنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کریں! آپ اس سے ایک رات کے لیے شادی کرلیں۔ اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ (یہ طریقہ شریعت میں ناپسندیدہ ہے، لیکن اگر اس طرح سے کسی نے معاملہ کرلیا تو اس کے لیے وہ عورت پھر سے حلال ہو جائے گی، جیسا کہ اس آیت کی رو سے ثابت ہوئی ہے۔ انور)

طلاق دینے کا سنت طریقہ:

طلاق دینے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ عورت حیض کے بعد طہر میں ہو اور اس طہر میں میاں بیوی نے آپس میں جماع نہ کیا ہو تو آدمی طلاق دے۔ یہ صحیح طریقہ ہے کہ عورت حیض میں بھی نہ ہو اور اس طہر میں خاوند نے جماع بھی نہ کیا ہو اور ایک طلاق دے۔ اب اگر...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... تین طلاقیں دینا چاہتا ہے تو علماء نے فرمایا: وہ اسی طرح انتظار کرے، دوسرے طہر میں اس کو دوسری طلاق دے، اسی طرح پھر انتظار کرے اور تیسرے طہر میں جا کر اس کو تیسری طلاق دے۔ چونکہ منشائے اسلام یہ ہے کہ جھگڑا نہ ہو اور صلح ہو جائے؛ کیونکہ میاں بیوی کا ایک ایسا رشتہ ہے کہ اس سے زیادہ قریبی رشتہ بے حجابانہ تعلق کسی سے بھی قائم نہیں ہوسکتا۔ ماں کا بڑا مقام ہے! بہن کا بڑا مقام ہے! بیٹی کا بڑا مقام ہے! لیکن وہ بے تکلفی اور بے حجابی جو میاں بیوی میں ہوسکتی ہے وہ کسی میں نہیں ہوسکتی۔ اب اسلام یہ چاہتا ہے کہ ایک عورت سے تم نے نکاح کیا ہے، اب اس عورت نے اپنا سب کچھ تمہارے سپرد کیا ہے، اب تم طلاق دو اور وہ کسی دوسرے گھر میں جائے، ایسی بات نہ کرو۔ اسلام اس سے روکتا ہے۔

پرانے لوگوں کی پرانی باتیں ہوتی ہیں، لیکن اس میں سبق ہوتے ہیں۔ ایک مثل ہے کہ کسی بزرگ کا مٹی کا لوٹا وضو کرنے کے لیے تھا۔ وہ ٹوٹ گیا تو وہ بزرگ بہت اداس بیٹھے تھے کہ میرا لوٹا ٹوٹ گیا۔ کوئی شاگرد آیا، اس نے

کہا: حضرت! مٹی کا لوٹا ٹوٹ گیا، کوئی سونے کا تو نہیں تھا۔ جو ٹوٹ گیا میں آپ کے لیے اور دو مٹی کے لوٹے لے آتا ہوں۔ بزرگ نے فرمایا: لوٹے کی کوئی بات نہیں۔ لوٹے مجھے اور بھی مل جائیں گے، مگر میں نے اس لوٹے کو اتنا عرصہ استعمال کیا تھا، اس نے ہمارا ننگ دیکھا ہوا تھا۔

ان باتوں میں ہدایتیں ہوتی ہیں، ورنہ مٹی کے لوٹے نے کیا دیکھنا ہے!؟ اور انہوں نے اس کو کیا دکھانا ہے؟ جن لوگوں کو مٹی کے لوٹے سے اتنا انس پیدا ہو جائے۔ یہ مقام کی باتیں ہیں، ہر کسی کو سمجھ نہیں آسکتیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی کو وہ مقام نصیب فرماتے ہیں تو ہر آدمی کے عقل میں آنے والی بات نہیں ہوتی۔

قرآن اور نبی ﷺ کا احترام:

میرے اپنے استاذ تھے، بہت بڑے اللہ والے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر رحمت فرمائے۔ جب وہ قرآن پڑھتے تو ہاتھ پر اچھی طرح کپڑا لپیٹ کر ورقہ پلٹتے تھے۔ ہم تو طالب علم تھے، کئی دفعہ ہم دیکھتے، ہمیں یہ عجیب سی بات لگتی تھی کہ دیکھو! اتنے بڑے شیخ ہیں، اتنی بڑی ان کی دین کی خدمات ہیں، پاک ہاتھ پر بھی کپڑا چڑھاتے ہیں۔ یہ بلا وجہ تکلف ہے۔ ایک دن میں نے عرض کیا: اتنا تکلف کیوں کرتے ہیں؟ فرمانے لگے: آپ ٹھیک کہتے ہیں، آپ اچھی بات کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی سمجھنے کی توفیق دے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! اللہ معاف کرے، میں اعتراض نہیں کر رہا، بلکہ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی۔ فرمایا: حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وَاللّٰہِ! مَا مَسَسْتُ ذَکَرِیْ بِیَمِیْنِیْ مُنْذ......بَایَعْتُ بِھَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ''[1] کہ جس دن سے میں نے اپنا دایاں ہاتھ حضور اکرم ﷺ کے ہاتھ میں بیعت کے لیے دیا تھا، اس کو میں نے زندگی بھر فرج پر نہیں لگایا۔ یہ مقامِ ادب ہے۔ حکم نہیں تھا کہ ہاتھ مت لگانا۔ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا مقامِ حیا تھا۔ جب ادب نصیب ہوگا تو پھر پتہ چلے گا کہ قرآن کیا ہے؟ حدیث کیا ہے؟ اور حضور اکرم ﷺ سے محبت کا کیا مقام ہے؟

آج تو...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... سب سے بڑا موحد وہ ہوتا ہے جو قرآن کو ایک ہاتھ میں لے کر پھینک دے کہ بڑا عقیدے کا مضبوط ہے، اس کو قرآن کی قدر نہیں ہے۔ مرضی آئے جوتے پر رکھ دے، مرضی آئے تو سرہانہ بنا کر سو جائے۔ یہ سوچنے اور مقام کی بات ہے۔ آخر کیا بات تھی جب قرآن اترتا تھا تو حضور اکرم ﷺ کی اونٹنی بیٹھ جاتی تھی اور ہمارا تو بندے کے سر پر تیس پارے قرآن رکھ دو نہیں بیٹھتا۔ حضور اکرم ﷺ سردی کی رات

[1] [مسند ابی یعلی موصلی، احیاء العلوم: ۵/ ۸۵]

میں پسینہ پسینہ ہوجاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ادب عطا فرمائے۔ بزرگوں نے ایک بات لکھی ہے اور وہ بڑی پکی بات ہے۔ انہوں نے فرمایا:

بے ادب محروم گشت از فضلِ رب

''جو آدمی بے ادب ہوجاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوجاتا ہے۔''

ان کو استاذ کا، کعبہ کا اور حرم کا ادب نہیں رہتا۔ خالی خولہ بندہ ہوتا ہے، اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صحیح معنیٰ میں ادب نصیب فرمائے۔ قرآن فرماتا ہے: ﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ [الحج: ۳۲] شعائر اللہ کی تعظیم وعظمت دل کا تقویٰ ہے۔ اب دل کا تقویٰ نصیب ہو تو ادب آئے۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان فرقت نہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک دوسرے کا پردہ اور لباس بنایا ہے وہ قائم رہے۔ اور اگر مجبوراً طلاق دینی پڑی، عورت حیض میں ہے تو اس کے پاک ہونے کا انتظار کرو۔ جب وہ پاک ہوجائے تو اس طہر (پاکی کے ایام) میں اس کے ساتھ مجامعت بھی نہ کرو۔ یہ پابندی اس لیے لگائی کہ طبیعت کے اندر خواہش ہو، طلاق نہ ہو، ورنہ ماہواری کے ایام میں بھی طلاق واقع ہوجائے گی اور تین طلاقیں اکٹھی بھی واقع ہوجائیں گی۔

تین چیزیں مذاق میں بھی واقع ہوجاتی ہیں:

لفظ طلاق سے بچا کرو؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت ہے۔ ان تین چیزوں کے ساتھ کبھی کھیلا نہ کرو۔ ''ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَ هَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ.'' [سنن الترمذی، رقم: ۱۱۸۴] نکاح، طلاق اور رجوع۔ یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ مذاق بھی کرو تو حقیقت ہے۔

مثلاً: ایک آدمی نے مذاق میں کہا کہ میں نے اپنی لڑکی آپ کے نکاح میں دے دی اور سامنے والے نے کہا: میں نے قبول کرلی تو نکاح ہوجائے گا، اگرچہ بعد میں وہ کہیں گے کہ ہم تو مذاق کررہے تھے، نہ میں لڑکی دے رہا تھا اور نہ وہ لڑکی لے رہا تھا۔ اسی طرح طلاق ہے کوئی آدمی کہے کہ میں نے تو غصہ میں دی تھی، مجھے جوش آگیا تھا، یا کہے کہ بیوی کو ڈرانا چاہتا تھا۔ اسی طرح کوئی کہے کہ میں نے تو طلاق لکھی ہے، مگر وہ لکھی ہوئی میری بیوی کو نہیں ملی۔ یہ

سب بہانے ہیں طلاق ہوگئی۔ گولی نکلی تو لگ گئی۔ اب یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ گولی تم نے وضو کر کے پکڑی تھی یا بغیر وضو کے پکڑی تھی۔

اس لیے ان تین چیزوں سے بچنا چاہیے۔ دنیا کے اندر کونسا گھر ہے جہاں جھگڑا نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے حضرات کے گھروں میں ازواج کے اختلاف ہوجاتے تھے۔ یہ فطری اور طبعی بات ہے کہ جہاں تعلق ہوتا ہے وہاں جھگڑے ہوتے ہیں۔ اور پھر قدرتی چیز ہے جتنی محبت اور پیار زیادہ ہو جھگڑے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر تم سنت پر چلو تو پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہ پڑے؛ کیونکہ یہ مسئلے اتنے خوف والے ہیں کہ بعض اوقات علماء اس میں احتیاطی طور پر سخت الفاظ استعمال فرماتے ہیں، تاکہ بندہ ان سے بچے۔

عدتِ طلاق:

اگر عورت کو طلاق دے دی تو اس کی عدت کتنی ہے؟ اللہ تعالیٰ کے قرآن نے فرمایا: ﴿ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ [البقرۃ:۲۲۸] اس کے لیے تین قروء عدت ہے۔ لفظ ''قُرُوْٓءٍ'' اضداد میں سے ہے۔ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: حیض کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور طہر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جب اس نے عورت کو طلاق دی تو عورت کی عدت تین حیض ہوگی۔ وہ ''قُرُوْٓءٍ'' سے حیض کا معنی لیتے ہیں۔ جب تین حیض گزر گئے تو عدت گزر گئی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تین طہر عدت ہے کہ عورت تین طہر یعنی پاکی کے دن گزارے، مثلاً: آٹھ دن حیض کے ہیں اور پھر آگے طہر کے دن ہیں۔ اس طرح جب تین طہر گزریں گے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک عدت پوری ہوجائے گی۔

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ﴾ کا لفظ تو عام ہے کہ طلاق والی عورتیں، لیکن یہ حکم اس کے لیے جو عورت بھی ہو اور آزاد بھی ہو، لونڈی نہ ہو۔ اگر لونڈی ہے تو اس کی عدت دو حیض ہے، تین حیض نہیں۔ یہ طلاق والی وہ عورت ہے جس کی عدت تین حیض یا تین طہر ہے، جو بالغہ ہے، حرہ ہے اور جس کی اپنی خاوند کے ساتھ صحبت ہوچکی یا خلوت صحیحہ ہوچکی۔ مثلاً: ایک آدمی کا نکاح ہوا، عورت خاوند کے گھر میں آگئی اور میاں بیوی نے صحبت بھی کر لی تو اب طلاق دی تو اس عورت کی عدت تین حیض ہے۔

خلوت صحیحہ بھی صحبت کے قائم مقام ہے کہ بیوی رات کو خاوند کے کمرے میں آگئی۔ میاں بیوی نے جماع تو نہیں

کیا، لیکن دروازہ بند ہے، کمرہ محفوظ ہے، ان کو کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے، کسی کے آنے کا کوئی خطرہ بھی نہیں ہے اور میاں بیوی اکٹھے لیٹے رہے تو خاوند سے خلوت صحیحہ ثابت ہوگئی۔ اب اگر اس عورت کو طلاق دی گئی تو اس عورت کو بھی عدت گزارنی پڑے گی اور وہ عدت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تین حیض ہوگی اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تین طہر ہوگی۔

ایک آدمی نے ایک عورت سے نکاح کیا، لیکن وہ عورت خاوند کے گھر میں نہیں آئی، میاں بیوی آپس میں نہ ملے، نہ جماع کیا ہے اور نہ خلوت صحیحہ ہوئی ہے، اس عورت کو غیر مدخول بہا کہا جاتا ہے۔...... اب خدا نہ کرے!...... کوئی ناچاقی ہوگئی اور خاوند نے طلاق دی تو اب عورت پر کوئی عدت نہیں؛ کیونکہ نہ عورت مدخول بہا ہے، نہ صحبت ہوئی اور نہ خلوت صحیحہ ہوئی۔ وہ عورت طلاق کے بعد عدت کے بغیر دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے، چاہے ایک طلاق ہوئی یا تین۔

یہ حرام حلال کے مسائل ہیں۔ ان کو ذہن میں رکھیں! اگر کبھی سابقہ پڑ جائے تو علماء سے باقاعدہ رجوع کریں۔ یہ ایسے مسائل نہیں ہوتے کہ آدمی صرف اردو کی کتابیں پڑھ کر سمجھ لے۔ اگر گاڑی کے لیے مکینک کے پاس جانا ضروری ہے۔ جیسے کوئی صرف کتاب پڑھ کر گاڑی کو درست نہیں کرسکتا اور کپڑے کے لیے درزی کے پاس جانا ضروری ہے تو دین کے لیے بھی عالم کے پاس جانا ضروری ہے۔ ورنہ تو کپڑا سلائی ہوتے ہوئے آپ نے بھی دیکھا ہے۔ جب خود سلائی کریں گے تو وہ نمونہ ہوگا۔ جب تم تین میٹر کا ایک کپڑا نہیں سی سکتے ہو تو اب اس کے بعد تم محمد مدنی ﷺ کے دین کو کاٹو پھانٹو تو تمہاری مرضی ہے۔ تو نتیجہ وہی نکلے گا جو دیکھ رہے ہو کہ آج دین کا کیا حال ہے؟ ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ﴿١٣﴾﴾ [السبا: ١٣] تھوڑے لوگ ہیں جن کے پاس دین ہے، ورنہ...... ماشاء اللہ...... ہر آدمی شتر بے مہار ہے۔ اس لیے ایسے مسائل میں مہربانی کیا کریں، علماء سے جا کر پوچھا کریں۔

مدخول بہا عورت کی عدت کے مسائل:

عورت بالغہ ہے، حرہ ہے، میاں بیوی کی صحبت ہوچکی ہے، یا خلوت صحیحہ ہوچکی ہے۔ اب طلاق دی تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی عدت پورے تین حیض ہوگی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تین طہر ہوگی۔

عورت کو طلاق ہوئی اور وہ حاملہ ہے تو اب اس کی عدت وضع حمل ہوگی؛ کیونکہ اس کو حیض نہیں آتا، چاہے طلاق کے ایک گھنٹہ بعد بچہ پیدا ہوا ہو یا نو ماہ بعد۔

اسی طرح ایک عورت کے ساتھ آپ کا نکاح تو ہے، لیکن وہ عورت اتنی چھوٹی ہے کہ اس کو ابھی حیض شروع نہیں ہوا، اس کو طلاق دے دی تو اس کی عدت چاند کے مطابق تین ماہ ہوگی۔

عورت بوڑھی ہوگئی، حیض نہیں آتا۔ اس وقت...... اللہ نہ کرے...... خاوند نے طلاق دے دی تو اس کی عدت بھی تین ماہ ہوگی۔ خاوند مر جائے تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہوگی۔ خاوند کے علاوہ بھائی ہے، یا کوئی اور رشتہ دار ہے، وہ مر جائے تو اس کا سوگ تین دن ہوگا۔

حیض کی مدت کیوں رکھی؟ یہ قرآن نے خود بتا دیا۔ فرمایا: طلاق والی عورتیں حیض کا انتظار کریں: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ﴾[البقرۃ:۲۲۸] کہ عورتوں کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ چھپائیں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ان کے ارحام میں اگر وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان لانے والی ہیں۔ یعنی جب عورت کو طلاق دی گئی اور اس کے رحم میں حمل ہے تو اس کو چاہیے کہ اس کو نہ چھپائے اور سیدھی بات کرے کہ میں حاملہ ہوں۔ اگر عورت حیض کی حالت میں ہے، لیکن چھپا رہی ہے، خاوند طلاق دے رہا ہے اور وہ اپنے حیض کو چھپا رہی ہے، تاکہ میری عدت جلدی ختم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تمہارے رحم میں حیض ہے، تب بھی بات واضح بتا دو اور اگر بچہ ہے تو بتا دو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ عدت اس لیے رکھی گئی ہے، تاکہ اگر حمل ہے تو واضح ہو جائے۔

اسی لیے مرنے کے بعد چار مہینے دس دن کی عدت رکھی گئی ہے کہ خاوند مر گیا تو ہو سکتا ہے کہ عورت حاملہ ہو تو چار ماہ دس دن کے بعد نفخ روح ہو جاتی ہے اور بچہ پیٹ میں حرکت کرتا ہے، معلوم ہو جاتا ہے۔ اب اگر حمل ہے اور تم نے نہیں بتایا یا دوسری جگہ شادی ہوگئی تو دوسرے خاوند کا پانی اس کو لگے گا۔ ایک کے بیج کو دوسرا سیراب کرے گا۔ اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

حیض کی عدت اس لیے رکھی گئی ہے، تاکہ پتہ لگ جائے کہ عورت کو حمل ہے یا نہیں۔ اس لیے عدت حیض بنے گی (اگر حمل ہوگا تو حیض نہیں آئے گا اور عورت وضعِ حمل تک عدت گزار کر اس خاوند سے فارغ ہو جائے گی اور اگر موت کی عدت گزار رہی ہے تب بھی وضع حمل سے اس کی عدت پوری ہو جائے گی)۔

﴿وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ﴾[البقرۃ:۲۲۸] خدا نہ کرے اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ عورت عدت میں ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کا خاوند اس کو لوٹانے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ یعنی

عدت کے اندر اگر خاوند رجوع کرنا چاہے تو یہ خاوند کا زیادہ حق ہے۔ عورت یا اس کے ورثہ یہ نہیں کہہ سکتے: چونکہ تم نے مجھے طلاق دے دی ہے، اب تم رجوع نہیں کر سکتے۔

ایک بات یاد رکھیں! یہ اس صورت میں ہے جب خاوند نے طلاقِ رجعی دی ہو۔ اور اگر طلاق بائن دی تو تجدیدِ نکاح کر کے خاوند اپنی بیوی کو لوٹا سکتا ہے۔ اور اگر خاوند نے تین طلاقیں دے دیں تو جب تک کہ وہ عورت کسی اور سے شادی کرے اور دوسرا خاوند یا تو قدرتاً مر جائے یا وہ اپنی ناچاقی کی بنا پر خود اپنی منشا سے طلاق دے دے تو وہ پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔

تین طلاقوں کا مسئلہ:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چونکہ لفظِ ''طلاق'' واضح اور صریح ہے، اس میں کوئی کنایہ نہیں ہے، لہٰذا ایک دفعہ لفظ ''طلاق'' کہا تو ایک طلاق ہوگی، دو دفعہ کہا تو دو دفعہ طلاق واقع ہوگی اور اگر تین دفعہ کہا تو تین دفعہ طلاق ہوگی۔ یہ سب ائمہ کے نزدیک اتفاقی مسئلہ ہے؛ کیونکہ جو مسئلہ منصوص ہو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اختلاف وہاں ہوتا ہے جو مسئلہ منصوص نہ ہو۔ یہ مسئلہ بھی منصوص ہے: ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ﴾ [البقرۃ: ۲۳۰] کہ اگر تین طلاقیں ہو گئیں تو عورت خاوند کے لیے حلال نہیں جب تک کہ دوسرے خاوند سے نکاح نہ کر لے اور وہ اس کو طلاق دے کر فارغ نہ کرے۔

اگر ایک طلاق دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے خاوند کو یہ حق دیا ہے کہ وہ عدت کے اندر اندر رجوع کر لے۔ رجوع کا معنی یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے یہ کہہ دے کہ میں نے بیوی کو طلاق دی تھی، میں اب رجوع کرتا ہوں۔ یا کسی ایک کے سامنے کہہ دے یا بیوی سے کہلائے یا بیوی سے میاں بیوی والا عمل کر لے تو وہ بیوی اس کی اسی طرح رہے گی۔

لیکن ایک بات یاد رکھیں! اسلام نے ایک مرد کو تین طلاقوں کا حق دیا ہے۔ اگر...... خدا نہ کرے...... ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دے دی، پھر رجوع کر لیا تو اس آدمی کا ایک حق ختم ہو گیا (یہ نہیں کہ وہ روز نئے تیر برساتا رہے)۔ اب اگر اس نے کچھ عرصہ کے بعد دوسری طلاق دے دی تو دو کا حق ختم ہو گیا۔ اب جب تیسری طلاق دے گا تو خود بخود تین طلاقیں ہو جائیں گی۔ اب وہ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وہ تو میں نے ایک دفعہ طلاق دی تھی اور صلح ہو گئی تھی۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارے پاس جو تین طلاقوں کے اختیارات تھے وہ تم استعمال کر چکے ہو۔ اب وہ

عورت تمہاری بیوی نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ دوسری جگہ نکاح نہ کر لے۔

بہر حال یہ مسئلے بڑے سخت ہیں۔ ہمارے بعض لوگوں میں ایسی بری بیماری ہے...... اللہ پاک ہر مسلمان کی حفاظت فرمائیں، ہر گھر کی حفاظت فرمائیں...... کہ چھوٹے چھوٹے مسئلے پر عورتوں کو طلاق دے دیتے ہیں۔ اگر حساب کریں تو دو تین سو طلاقیں ہو جائیں گی؛ کیونکہ نمک زیادہ پڑ گیا تو طلاق، مرچ زیادہ پڑ گئی تو طلاق، گھر میں گیا، کپڑا دھلا ہوا اچھا نہیں تھا، بس یہ تماشہ ہے جو لگا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی تھی اس کو اپنی زبان سے جوش میں آ کر حرام کر رہے ہو۔

تین طلاقوں کے بعد صلح کا حکم:

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ خاوند نے مثلاً: ایک دفعہ طلاق دی، برادری والوں نے آ کر کہا: اچھی بات نہیں ہے، تمہارے بچے ہیں۔ اور ان برادری والوں نے عورت کو سمجھایا اور مرد کو بھی سمجھایا، اب دونوں میں صلح ہوگئی۔ چھ ماہ یا سال گزرنے کے بعد پھر طلاق ہوگئی۔ اب پھر برادری والے آگئے اور انہوں نے پھر صلح کرا دی۔ اب سال کے بعد اس نے پھر طلاق دے دی، اب پھر برادری والے آگئے۔ مرد کہتا ہے کہ میں تین طلاقیں دے چکا ہوں۔ برادری والے کہتے ہیں: پہلے والی طلاقوں سے تم رجوع کر چکے ہو، مولویوں کی بات چھوڑو، کیوں اپنا گھر برباد کرتے ہو؟ اور عورت کو بہکاتے ہیں کہ دیکھو! تمہارے چار بچے ہیں۔ اگر تم خاوند کے گھر سے چلی جاؤ گی تو کب تک بھائی خرچہ برداشت کریں گے؟ بس اس بات کو کس نے سنا ہے؟ چپ کر کے گھر میں رہو۔

یاد رکھیں! یہ عورت کسی کے نزدیک بھی حلال نہیں، پوری زندگی...... نعوذ باللہ...... زنا کرتے رہیں گے۔ کتنی ایسی عورتیں ہیں جن کو تین طلاقیں ہو چکیں، لیکن برادری والوں نے صلح کرا کے ان کو گھر بٹھا دیا، لیکن شریعت کی نظر میں دونوں زنا کر رہے ہیں۔ آئندہ جو اولاد ہوگی وہ ولد الزنا ہوگی؛ کیونکہ شریعت کا نکاح باقی نہ رہا تو کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اللہ نہ کرے کبھی گھر میں ایسی بات ہو جائے تو اپنے علاقے کے ذمہ دار اہل سنت مسلک کے عالم کی خدمت میں جا کر مسئلہ پوچھیں، جن کے بارے میں یہ تسلی ہو کہ واقعی یہ عالم ہے، مفتی ہے۔ اس کو جا کر سیدھی بات بتائیں۔ اب جو اللہ اور اللہ کے رسول نے حکم دیا ہے مجھے سمجھا دیں، تا کہ اللہ پاک مجھے حرام سے بچائے اور حلال پر قائم رکھے۔

طلاق کے بعض الفاظ صریح ہوتے ہیں اور بعض کنائی الفاظ ہوتے ہیں۔ مثلاً: کسی نے کہا: میں نے تجھے طلاق

دے دی، یا کہا: تم مجھ پر حرام ہو۔ یہ صریح الفاظ ہیں۔ اور اگر یہ کہا کہ تم میرے گھر سے چلی جاؤ، تیرا میرا کوئی تعلق نہیں، یا کہا: تم مجھ سے آزاد ہو، یا کہا: آج کے بعد تیرا میرا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اب ایسے سینکڑوں الفاظ ہیں جو آدمی استعمال کرتا ہے۔ اب یہ عالم کا کام ہے کہ وہ اس آدمی سے ذمہ داری کے ساتھ پوچھے گا کہ بھائی! سیدھی بات بتاؤ کہ یہ لفظ کہتے ہوئے تمہاری نیت کیا تھی؟ کیا طلاق کی نیت تھی یا ویسے جھگڑا کر رہے تھے؟ بعض اوقات اس کا مقصد طلاق ہوتا ہے۔ اس لیے ان سارے مسائل کا حل یہ ہے کہ اگر کبھی...... خدا نہ کرے...... کسی کے گھر میں کوئی ایسی بات ہو جائے تو عالم دین سے رجوع کریں۔

رجوع کا حق کس کو ہے؟

﴿اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ یہ شرط اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہے۔ یعنی...... اللہ نہ کرے...... اگر ایک آدمی اصلاح نہیں چاہتا، اس کے بعد رجوع ہو جائے گا۔ مثلاً: بعض مرد اپنی عورتوں کو تنگ کرنے کے لیے طلاق دے دیتے ہیں۔ جب وہ عدت کے اندر ہوتی ہے یا ایک دو دن باقی ہوتے ہیں تو وہ رجوع کر لیتے ہیں، اب وہ پھر اس کی بیوی بن گئی۔ کچھ عرصے کے بعد پھر طلاق دے دی اور پھر رجوع کر لیا۔ مقصد صلح نہیں ہوتا، بلکہ عورت کو ذلیل کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح رجوع تو ہو جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا نہ کرو۔ اگر رجوع کرنا ہے اور اگر واقعی تم اصلاح چاہتے ہو اور واقعی تمہیں احساس ہو گیا ہے کہ میں نے طلاق دے کر غلطی کی ہے، میرے گھر کا پورا نظام برباد ہو جائے گا اور میں اب بیوی کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ پھر تمہیں حق ہے کہ رجوع کر لو۔

میاں بیوی جیسے بھی ہوں عمل نیک ہونے چاہئیں:

اگر ایک نوجوان ہے، خوبصورت ہے، مگر بیوی کالے رنگ کی مل گئی۔ یا ایک عورت ہے، وہ بے انتہائی خوبصورت ہے اور خاوند بدصورت ہے۔ جیسا کہ عرب کی حکایت ہے کہ اس نے بڑی خوبصورت لڑکی سے شادی کر لی تو ایک دن وہ بڑے اچھے موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے بیوی سے کہا: تم مجھے بتاؤ دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب کون ہے؟ اور بدنصیب کون ہے؟ تو بیوی نے کہا: آپ بادشاہ ہیں، میں عورت ہوں، آپ کا وسیع مطالعہ ہے۔ بادشاہ نے کہا: تم بتاؤ۔ تو اس نے کہا: مجھ سے اگر پوچھتے ہیں تو میرے نزدیک سب سے زیادہ خوش نصیب آپ ہیں اور بدنصیب میں ہوں۔ بادشاہ نے کہا: وہ کیسے؟ اس عورت نے کہا: آپ سب سے زیادہ خوش

نصیب ہیں؛ کیونکہ آپ کو میرے جیسی خوبصورت بیوی ملی ہے۔ اور سب سے بدنصیب میں ہوں کہ آپ جیسا شوہر ملا ہے۔ اگر آپ بادشاہ نہ ہوتے تو کوئی خیرات بھی نہ دیتا۔

قرآن نے ہمیں سبق دیا ہے: ﴿وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْــٴًـا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ﴾ [البقرۃ:۲۱۶] کہ میرے بندے! کبھی کسی چیز کو تم محبوب سمجھتے ہو اور میں جانتا ہوں کہ وہ تمہارے لیے بری ہے۔ اور کبھی کسی چیز کو تم برا سمجھتے ہو، لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ تیرے لیے بہتر ہے۔

مثلاً: آدمی سمجھتا ہے کہ میری بیوی خوبصورت نہیں، کالی ہے اور مجھے ساتھی طعنہ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہیں کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بطن سے کوئی ہیرا دے دے، جو عالم بن کر دنیا کا تاج بن جائے، محدث پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا ولی پیدا ہو جائے۔ تو خوش ہوتا ہے کہ میری بیوی بڑی خوبصورت ہے، اس سے تمہیں ایسی فتنہ اولاد مل جائے جو تیری عزت کو زمین میں گاڑ دے تو کیا کرو گے؟

ہمارے ایک دوست تھے ایک دن بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے بات چل نکلی تو وہ کہنے لگے: میرا تجربہ تو یہ ہے کہ آدمی بیوی کے بارے میں زیادہ تجسس نہ کرے کہ خوبصورت ڈھونڈو، بلکہ کوئی کالی شکل والی ہے تو اچھا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ کالی شکل والی کو کوئی نہیں دیکھے گا، اس طرح عزت محفوظ رہے گی، نہ کوئی اس پر نظر ڈالے گا۔ خوبصورت ہوگی تو ہزاروں آدمی دیواریں پھاندیں گے۔

جو بیوی عزت میں خیانت نہیں کرتی تو سمجھو کہ اس سے زیادہ قیمتی ہیرا تمہیں دنیا میں نہیں ملے گا۔ اس بیوی کو تم آگ لگاؤ گے جو خوبصورت ہو، لیکن جب تم گھر سے نکلو تو تمہارے بستر پر کوئی اور آتا رہے۔ جو لوگوں کے گھروں میں جا کر بیٹھتی ہو، کلبوں میں کھیلتی ہو اور غیروں کے ساتھ پھرتی ہو۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [البقرۃ:۲۲۸] عورتوں کے لیے بھی حقوق ہیں، جیسا کہ تیرے حقوق عورت پر ہیں۔ ''بِالْمَعْرُوْفِ'' کا معنی ہے کہ وہ حقوق تم خود خیر خواہی سے ادا کرو۔ یہ نہیں کہ وہ بھی عدالت میں جا کر اپنے حقوق تم سے منوائے اور تم بھی مقدمہ کر کے حق منواؤ۔

بیویوں پر شوہر کے حقوق:

عورت کے ذمہ حقوق یہ ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب خاوند کی نظر پڑے تو خاوند خوش ہو جائے۔ یعنی

عورت اپنے خاوند کے لیے اپنے گھر میں بن ٹھن کر صاف ستھرا لباس پہنے۔ غریب ہے، غریبانہ صاف ستھرا لباس پہنے۔ یادرکھیں! اگر نظافت نہیں ہے تو ایمان نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن اتارا کہ میرا مدنی! یہ مدینے والے کتنے پاک لوگ ہیں کہ استنجا ڈھیلے سے کرنے کے بعد بھی بدن کو پانی سے دھوتے ہیں۔ کیونکہ جس گھر میں صفائی نہیں ہوتی وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ لیکن ہمارے ہاں رواج ہے کہ عورت دوسروں کے لیے بنتی سنورتی ہیں، خاوند کے لیے نہیں بنتی۔ جب کبھی شادی پر جانا ہوتو وہ اس دن غسل بھی کرے گی، اچھے کپڑے بھی پہنے گی اور میک اپ بھی کرے گی؛ کیونکہ لوگوں نے دیکھنا ہے۔ آج کل تو...... ماشاء اللہ...... شریف بیویاں پردہ بھی خاوند سے کرتی ہیں کہ اس کو دیکھ کر فوزا دوپٹہ اوڑھ لیں گی اور جب وہ نکل جائے تو دوپٹہ ختم ہے۔ یہ عورت شریعت کی نظر میں ملعونہ ہے۔

حدیث شریف کا مفہوم ہے: جو عورتیں میک اپ کر کے، سنگھار کر کے اور فیشن ایبل کپڑے پہن کر بازاروں میں نکلیں، ان عورتوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ چاہے وہ تمہاری نظر میں کتنی عزت والی ہوں۔ لیکن بات قرآن و حدیث کی ہے اور ان کے لیے ہے جو قرآن وحدیث کو مانتے ہیں۔ اور جو نہیں مانتے ان سے تو کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ جو کچھ چاہیں کرتے پھریں۔ اس لیے دیکھیں! اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا: ﴿اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۰﴾ کہ یہ سارے مسئلے ان عورتوں کو سمجھاؤ جو اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان نہیں تو جو مرضی آئے کرو۔ ہاں اگر دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں تو پھر قرآن کے مطابق زندگی گزارنی پڑے گی۔ اگر ہم قرآن سے ہٹیں گے تو قرآن پاک کی لعنت کے مطابق جو سزا ہے وہ ہم پر بھی مرتب ہوگی۔ چاہے مولوی کی بیٹی ہو، پیر کی بیٹی ہو، چاہے کسی کی بیٹی ہو۔

دوسرا حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عورت پر خاوند کا یہ حق ہے کہ جب خاوند حکم دے وہ حاضر ہو کہ روٹی، پانی یا خدمت کے لیے بلایا، اس نے جماع کی خواہش کی تو فوزا تعمیل کرے اور انکار نہ کرے۔ ہاں اگر وہ بیمار ہے، حقوق کے قابل نہیں تو خاوند کو بتادے کہ میری حالت یہ ہے، ورنہ شریعت نے عورت کے لیے یہ حکم رکھا ہے کہ اگر وہ کسی حال میں بھی ہے اور خاوند نے حکم دیا ہے، یا خاوند نے اپنی خواہش کے لیے بلایا، لیکن بیوی نے انکار کر دیا تو صبح تک اللہ تعالیٰ کے فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں کہ تم نے اپنے خاوند کو انکار کر دیا۔ کھانا تو وہ ہوٹل میں بھی کھا سکتا ہے، کپڑے تو وہ لانڈری سے بھی دھلوا سکتا ہے۔ اصل بیوی تو تم اس لیے ہو کہ خاوند اپنی خواہش پوری کر سکے۔

تیسرا حق خاوند کا یہ ہے: ''إِذَا غَابَ عَنْهَا حَفِظَتْهُ'' جب خاوند گھر سے باہر چلا جائے عورت پر حق ہے کہ عورت اپنے خاوند کے مال کی حفاظت کرے، اس کے مال کی حفاظت کرے اور اس کی عزت کی حفاظت کرے۔ یہ نہیں کہ جب خاوند چلا جائے تو وہ خیانت کرے۔

بیوی کے حقوق:

مردوں پر یہ حق ہے کہ بیوی کے نان نفقہ، سکنیٰ، کھانا پینا اور لباس آرام کو مہیا کرے۔ اسی طرح عورت کے جو دوسرے شریعت کے مطابق جائز تقاضے ہیں وہ بھی پورے کریں۔ جیسے مرد چاہتا ہے کہ میری بیوی غیر مرد کو نہ دیکھے، کسی غیر مرد سے برائی نہ کرے، اسی طرح تمہاری بیوی بھی چاہتی ہے کہ تم بھی کسی دوسری عورت کی طرف نہ دیکھو، تم بھی کسی دوسری عورت سے برائی نہ کرو۔ تو جیسے تم اپنے حق کا مطالبہ کر رہے ہو ایسے تم بھی اس کے حقوق کی حفاظت کرو۔ یہ نہیں کہ جب تم نکلو تو خیانت کرتے رہو اور غیر عورتوں کے پاس جا کر زنا کرتے رہو۔

اگر دوسری شادی کرو گے تو اسلام نے تمہیں اجازت دی ہے۔ اس میں بھی تم عدل کرو گے۔ اگر ایک دن دوسری بیوی کے پاس رہے تو دوسرے دن پہلی بیوی کے پاس رہے۔ کپڑے میں عدل کرے، رہائش میں عدل کرے، وقت میں عدل کرے اور ہاں محبت میں عدل نہیں ہو سکتا۔ یہ دل کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ کسی عورت کی طرف دل زیادہ مائل ہوتا ہے اور کسی بیوی کی طرف دل کم مائل ہوتا ہے۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ فرماتے تھے: ''اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعْدِلُ فِي مَا أَمْلِكُ'' اے اللہ! میں اپنی بیویوں کے معاملہ میں عدل کرتا ہوں جو میرے بس میں ہے۔ اور جو بات میرے بس میں نہیں وہ میرے ہاتھ میں نہیں۔[1]

اس لیے اس میں شریعت کا مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اگر ایک آدمی کی دو بیویاں ہیں: ایک دن ایک بیوی کے پاس ہے اور دوسرے دن دوسری بیوی کے پاس ہے۔ اس پر یہ ضروری نہیں کہ ایک رات اِدھر جماع کیا ہے تو دوسری رات اُدھر بھی جماع کرے۔

﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٢٨﴾﴾ [البقرۃ: ۲۲۸] یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حقوق دیے ہیں، لیکن مردوں کو عورتوں سے اونچا درجہ دیا ہے۔ مرد ہر لحاظ سے عورت سے افضل ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿اَلرِّجَالُ

[1] [کنز العمال: ۱۶/ ۹۷۶، مجمع الزوائد ۴/ ۵۰۱]

﴿قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [النساء:۳۴] ہم نے مردوں کو عورتوں کا قوام بنایا ہے۔

اس لیے دیکھیں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی نہیں بنایا؛ کیونکہ مقامِ نبوت و رسالت کا جو تقاضہ ہے وہ عورت پورا نہیں کر سکتی۔ اس لیے اسلام نے عورت کو امامت کا حق نہیں دیا؛ کیونکہ یہ مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق کا مرد کے ساتھ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ مردوں کو ہم نے ایک درجہ تفوق دیا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہر چیز کے اندر حکمتیں ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو فیصلے فرمائے ہیں بحیثیت مسلمان کے ہمارا ایمان ہے: وہ حق ہے، عدل ہے اور صدق ہے۔ ان میں شبہ کرنے والا کافر ہو سکتا ہے، مسلمان نہیں ہو سکتا۔

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۲۸] اللہ تعالیٰ غالب ہیں، یعنی اگر ہم نے مرد کو افضل قرار دیا ہے تم سارے مخالفت کر دو تو میرا کوئی نقصان نہیں کر سکتے۔ میں تو سب پر غالب ہوں، تم اپنی عاقبت خراب کرو گے اور اپنے لیے بربادی خریدو گے۔ میں تو غالب ہوں، مجھے کوئی مغلوب نہیں کر سکتا۔ اور باقی ہم نے یہ نکاح اور طلاق والے مسائل اس لیے رکھے ہیں کہ ہم حکمت والے ہیں اور ہمارا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس میں تیری بھلائیاں ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے، تم سب اس کے محتاج ہو۔

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۲۹، ۲۳۰]

''طلاقِ رجعی دو بار تک ہے۔ پھر دستور کے موافق روک لینا ہے یا خوش عنوانی سے چھوڑ دینا ہے۔ اور تمہارے لیے حلال نہیں کہ لے لو کچھ بھی جو تم نے ان کو دیا تھا، مگر یہ کہ وہ دونوں ڈریں کہ اللہ کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پھر اگر تم ڈرو کہ وہ (میاں بیوی) اللہ کے ضابطوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت بدلہ (بدل خلع) دے کر چھوٹ جائے۔ یہ اللہ کے ضابطے ہیں، ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو اللہ کی حدود سے آگے بڑھے گا تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ (ان دو طلاقوں کے بعد) پھر اگر اس کو (تیسری) طلاق دے دی تو اب اس کے بعد اس کو وہ عورت حلال نہیں، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی خاوند سے نکاح کرے۔ پھر اگر وہ شخص (بھی) اس کو طلاق دے دے تب گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر مل جائیں، اگر خیال رکھیں اللہ کے ضابطے قائم رکھیں گے۔ اور یہ اللہ کے ضابطے ہیں، جن کو وہ جاننے والوں کے لیے بیان کرتا ہے۔''

طلاق کے مسائل:

ان آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے طلاق کے احکام کا ذکر فرمایا ہے کہ مرد کو طلاق دینے کا حق ہے کہ دو دفعہ طلاق دے؛ کیونکہ مرد کے پورے اختیار میں تین طلاقیں ہیں: ایک رجعی ہوگی، دو طلاقیں دے گا تو طلاقِ بائنہ ہو جائے گی، لیکن اس میں بھی عدت گزر جائے تو دوبارہ نکاح کر کے رجوع کر سکتا ہے، یعنی صرف نکاح کرے گا۔ ہاں اگر دو طلاقیں دے چکا ہے تو اب اس کے بعد ایک طلاق دینے کا حق باقی ہے کہ یا تو اس کو باقاعدہ رکھو اور اگر چھوڑنا ہے تو چھوڑ دو۔ اس کے بعد مرد کے حقوق ختم ہو جاتے ہیں اور اس کو رجوع کرنے کا حق باقی نہیں رہتا اور نہ ہی وہ رجوع کر سکتا ہے۔

ہاں اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ پہلا خاوند اب بھی اسی بیوی کو رکھنا چاہتا ہے تو اسلام نے اس کی پابندی لگائی ہے کہ وہ عورت اپنی منشا سے دوسری جگہ شادی کرے۔ اور وہ نکاح فرضی نہ ہو، بلکہ میاں بیوی باقاعدہ مجامعت کریں اور اس کے بعد دوسرا خاوند اپنی مرضی سے چھوڑنا چاہے یا دوسرا خاوند مر گیا تو عورت عدت گزارنے کے بعد پہلے شوہر کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے۔

یہ سارے مسائل بڑے ضروری اور اہم ہیں...... اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے!...... آج جس دور میں ہم گزر رہے

ہیں بڑا پرفتن دور ہے۔ اور گھر گھر میں اختلافات، فسادات، لڑائیاں اور جھگڑے ہیں تو ان چیزوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑے کھول کھول کر احکام واضح کیے ہیں، تاکہ ہر بندہ احتیاط کرے۔ اگر...... اللہ نہ کرے!...... گھر میں کوئی جھگڑا کرے تو بیوی کو مار سکتا ہے، گھر میں رہتے ہوئے بیوی کے ساتھ علیحدہ بھی رہ سکتا ہے اور اس کے ساتھ بے رخی بھی کر سکتا ہے، لیکن طلاق کا لفظ زبان پر نہ لائے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''أَبْغَضُ الْحَلَالِ عِنْدَ اللّٰهِ الطَّلَاقُ ''[1] (اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں مبغوض چیز ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے۔ یہ احکام ایسے جامع مانع و کامل مکمل ہیں کہ آج پوری دنیا انصاف کے ساتھ اسی بات کی طرف لوٹ رہی ہے کہ جو اسلام نے احکام رکھے ہیں ایسے جیسے جامع احکام نہیں مل سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام میں بندوں کے لیے رحمت ہی رحمت ہے۔ مثلاً: دیکھیں!

❁ ...... اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ سب سے پہلے ''اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ '' ہے۔

❁ ...... اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جب اپنی صفت کا اظہار فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝﴾ [طٰہٰ:٥] حالانکہ یہ ایسا مقام تھا کہ صفتِ قہاریت کا اظہار فرماتے اور صفتِ جباریت کا اظہار فرماتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے صفتِ رحمن کا بیان فرمایا۔

❁ ...... اسی طرح صحیح حدیث مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سو رحمت پیدا فرمائی ہے: اس سو میں سے صرف ایک حصہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اتارا ہے، باقی ننانوے حصے اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ ایک حصے سے ساری دنیا میں اتفاق، محبت، رشتے داریاں اور والدین ہیں۔ ابھی ننانوے گنا رحمت محفوظ ہے۔

❁ ...... پھر دیکھیں! اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیغمبر کیسا عطا فرما دیا ہے!! ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [الانبیاء:١٠٧]

❁ ...... اور حضور اکرم ﷺ کے صحابہ کی صفت بیان فرمائی: ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح:٢٩] وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر مہربانی فرمانے والے ہیں۔

❁ ...... اور اسی طرح صحیح حدیث مبارک میں آیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ''اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ

[1] [سنن ابی داود، رقم: ۲۱۷۸، باب: فِي كَرَاهِيَةِ الطَّلَاقِ]

مَنْ فِي السَّمَاءِ'' (تم زمین والوں پر رحم کرو اللہ تعالیٰ تم پر رحم کریں گے)۔ یعنی اسلام سراپا رحمت ہے۔

[جامع الترمذی: رقم: ۱۹۲۴، باب: ما جاء فی رحمۃ المسلمین]

......اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مومن کی صفت یہ ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرے اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے۔

تو جب اتنا سراپا رحمت دین ہے اور سراپا رحمت اسلام ہے تو اس نے عورتوں پر بھی رحمت کی ہے، انسانوں پر بھی رحمت کی ہے اور مردوں پر بھی رحمت کی ہے۔ اس نے جانوروں کے بھی حقوق بتا دیئے، اس نے راستے کے بھی حقوق بتا دیئے، اس نے ضعیفوں کے بھی حقوق بتائے اور یتیموں کے بھی حقوق بتائے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! خبردار!! عورتوں کے بارے میں خبردار رہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک عورت کو تیرے تابع فرما دیا ہے کہ عورت کسی ملک کی ہے اور مرد کسی ملک کا ہے۔ صرف ایجاب وقبول کے ایک کلمہ نے عورت کا مالک بنا دیا ہے۔ تو تم بھی اس پر رحم کرو اور اس کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھو۔

اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا: یاد رکھو! ''اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا؛ فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا'' [بخاری، رقم: ۵۱۸۶] کہ عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی ٹیڑھی پسلی سے پیدا فرمایا ہے۔ تو جیسے پسلی میں ٹیڑھا پن ہوتا ہے اسی طرح عورتوں میں بھی کچھ نہ کچھ تو کجی رہتی ہے۔ جتنی مرتبہ کیوں نہ مل جائے، کوئی نہ کوئی کمی ہوگی، اس کو حلم وحوصلے کے ساتھ برداشت کرو۔ اتنی سختی بھی نہ کرو کہ وہ ٹوٹ جائے اور اتنے ڈھیلے بھی نہ بن جاؤ کہ عورت آزاد ہو کر شتر بے مہار ہو جائے اور پھر تیرے قابو میں بھی نہ رہے۔

[کنز العمال: رقم: ۴۴۹۵۷، المسند الجامع لابی الفضل: ۴۱/۱۴۹۱]

بیویوں میں عدل نہ کرنے پر سزا:

اسلام نے مرد کو حق دیا ہے کہ وہ چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے، لیکن یہ حکم نہیں دیا کہ تم چار رکھو، یعنی رکھنے کی اجازت ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے اور پیسہ دیا ہے تو اس کو اجازت ہے کہ بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتے ہو، لیکن اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے پابندی لگائی ہے: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾ [النساء: ۳] کہ اگر تم ڈرتے ہو کہ میں عدل وانصاف نہیں کر سکوں گا تو ایک شادی کرو۔ اور ساتھ یہ پابندی بھی لگا دی کہ اگر تیری دو

بیویاں ہیں اور تو نے عدل نہ کیا تو قیامت والے دن اللہ تعالیٰ تجھے فالج زدہ اٹھائیں گے، تاکہ محشر میں لوگوں کو پتہ لگے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی بیوی سے عدل نہیں کیا۔

نکاح کے اندر رضامندی کا حق اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو عطا فرمادیا ہے کہ اگر مرد راضی نہ ہو تب بھی نکاح نہیں ہوگا اور عورت راضی نہ ہو تب بھی نکاح نہیں ہوگا۔ عورت کو حکم دیا کہ اپنے ولی کی اجازت کے ساتھ نکاح کرے، لیکن عورت سے اجازت لینا ولی کو بھی ضروری ہے (ولی اس کو کہتے ہیں جس کو بچی یا بڑی عورت کا نکاح دینے کا اختیار ہو، جیسے باپ، دادا، بیٹا، پوتا، بھائی، چچا اور بھتیجا وغیرہ)۔ ہاں اگر کوئی بچی نابالغ تھی، ولی نے نکاح کر دیا تو نکاح ہو جائے گا، لیکن اگر عورت بالغ ہے تو اس کے اولیاء کو اللہ نے حکم دیا کہ اس کی رضامندی حاصل کرو۔

نکاح کی غرض سے ہونے والی بیوی کو دیکھنا:

اسلام نے حکم دیا ہے کہ غیر محرم عورت پر نظر ڈالنا حرام ہے، لیکن اسلام کہتا ہے کہ اگر تم شادی کرنا چاہتے ہو تو کسی جگہ تم نے خطبہ کیا ہے تو تمہارا حق ہے کہ تم اپنی ہونے والی بیوی کو ایک نظر دیکھ سکتے ہو اور وہ عورت بھی اپنے ہونے والے شوہر کو ایک نظر دیکھ سکتی ہے، تاکہ بعد میں کسی قسم کا تنافر پیدا نہ ہو۔

اسلام نے حکم دیا کہ دونوں میں کفو بھی ہو، یعنی دونوں مسلمان ہوں، دونوں آزاد ہوں اور دونوں معاشرے کے اندر برابر کے ہوں۔

اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ نکاح کرو تو عورت کو مہر ادا کرو۔ اگر مہر ادا نہیں کرو گے تو وہ قیامت تک تیرے ذمہ باقی رہے گا۔ بعض ائمہ تو فرماتے ہیں کہ جب تک مہر ادا نہ کرے خاوند کو اس وقت تک بیوی سے ملنے کا حق بھی نہیں ہے۔

مرد کو چار عورتوں سے نکاح کرنے کا حق دیا ہے، لیکن عورت کو چار مردوں سے نکاح کرنے کا حق نہیں دیا۔ اس پر بعض بے دین لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں عورت کی عزت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر ایک عورت کے چار خاوند ہوں۔ کوئی کہے: میرے پاس آؤ، دوسرا کہے: میرے پاس آؤ تو عورت کیا کرے گی؟ اس کے علاوہ اگر حمل ٹھہر گیا تو پتہ نہیں کہ یہ نطفہ کس کا ہے؟ نطفہ ٹھہر گیا تو دوسرے کی فصل کو پانی اور لگا رہا ہے۔ اس کے بعد نسب میں خلل پڑ گیا۔ اور اگر ایک کی اولاد ہو تو باقی تین نے کیا گناہ کیا ہے؟

یہ بھی اللہ تعالیٰ نے عورت کی عزت رکھی ہے کہ اگر خاوند کی چار بیویاں ہیں تو یہ پہلی بیوی زیادہ محفوظ رہے گی کہ

تین دن خاوند دوسری بیویوں کے ساتھ رہے گا تو اس کو آرام مل رہا ہے۔

طلاق کا ہونا بھی حکمت ہے:

اسلام نے طلاق کا بھی ایک حق رکھا ہے؛ کیونکہ اگر خدانخواستہ طلاق نہ ہوتی تو آپ دیکھ لیں کہ یورپ کے بعض ملکوں میں اتنی مشکلات ہیں کہ خاوند طلاق نہیں دے سکتا اور آپس میں محبت بھی نہیں ہے۔ بیوی اپنے گھر ہے اور خاوند اپنے گھر ہے۔ اگر خاوند طلاق دے تو اس کے لیے اتنے مصائب اور مشکلات ہیں کہ وہ ان سے نکل نہیں سکتا۔ اگر کسی نے شادی کی اور...... خدانہ کرے...... آپس میں موافقت نہ ہو سکی اور اسلام میں طلاق نہ ہوتی تو کیا کرتے؟ ایک شریف آدمی نے نکاح کیا، بیوی کا بعد میں پتہ چلا کہ وہ بدچلن ہے۔ اگر طلاق کی اجازت نہ ہو تو خاوند کیا کرتا؟ اور اسی طرح اگر شادی ہوگئی، لڑکی بھی ٹھیک ہے اور لڑکا بھی ٹھیک ہے، لیکن دونوں میں نفرت ہے۔ اگر طلاق کی گنجائش نہ ہوتی تو کیا کرتے؟ اس لیے اسلام نے طلاق کی بھی گنجائش رکھ دی ہے کہ...... خدانہ کرے...... اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو طلاق دے سکتے ہو کہ طلاق دینے کے بعد تم اپنا کوئی دوسرا گھر ڈھونڈ و اور عورت کوئی دوسرا گھر ڈھونڈ لے۔ دونوں کے گھر اللہ تعالیٰ آباد فرما دیں۔

بیوی اور مطلقہ عورتوں سے نکاح سنتِ رسول ہے:

پھر دیکھیں کہ بیوی اور مطلقہ عورتوں سے نکاح کرنا سنت بن گیا۔ میرے آقا سرکار مدینہ نبی کریم ﷺ نے عین شباب میں سب سے پہلا نکاح خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پہلے دو شوہر فوت ہو چکے تھے اور بی بی صاحبہ کی عمر چالیس سال تھی۔

نکاح میں ایجاب وقبول:

نکاح کے اندر دونوں کا حق ہے۔ اگر بیوی راضی نہ ہو تو نکاح نہیں ہو سکتا اور اس پر کوئی جبر بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارے ہاں عجیب مسئلے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملکوں میں ایسی جہالت ہے کہ عورت بیٹھی رہتی ہے۔ اس کی پانچ سات سہیلیاں بھی ساتھ بیٹھی ہوتی ہیں۔ قاضی صاحب دو گواہوں کو لے کر آتا ہے کہ تمہیں فلاں بن فلاں کا نکاح منظور ہے؟ اگر وہ چپ بیٹھی ہو تو دوسری عورت اس کی گردن کو پکڑ کر ہلا دیتی ہے، یا دوسری عورتیں کہہ دیتی ہیں کہ ہاں قبول ہے۔ یہ غلط ہے۔ اسلام نے اس کا بھی حل بتایا ہے۔ اسلام نے کہا ہے: ایک کنواری لڑکی ہے، اس سے

جب پوچھا گیا اور وہ چپ بیٹھ گئی تو اسلام کہتا ہے: یہ چپ رہنا بھی رضا ہے؛ کیونکہ شریف عورت بعض دفعہ اپنی زبان سے نہیں کہتی۔ بہرحال آج کل تو شادی سے پہلے ہی سب کچھ ہو جاتا ہے۔ جتنے مراحل میاں بیوی نے بعد میں طے کرنے ہیں وہ پہلے ہو جاتے ہیں اور نکاح کے بارے میں بعد میں غور ہوتا ہے۔ بہرحال! اسلام ان چیزوں کا روادار نہیں۔ جبکہ پہلے تو اتنی شرم تھی کہ شادی کے بعد کئی مہینوں تک عورت خاوند کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتی تھی۔ اب تو نہ غیرت رہی اور نہ شرم رہی۔

اگر قاضی نے عورت سے جا کر پوچھا کہ فلاں بن فلاں کا نکاح قبول ہے؟ اور عورت ہنس پڑی تو یہ بھی رضا ہے۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر رو پڑی تو بعض اوقات خوشی سے بھی رونا ہوتا ہے، مگر جب وہ نکاح سے پہلے انکار کر دے تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

یہ سارے مسئلے فقہاء نے قرآن سے لیے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو خوشخبری دی گئی تو وہ خوشی سے ہنس پڑیں۔

طلاق صرف خاوند کے اختیار میں ہے:

نکاح میں عورت کی رضامندی شرط ہے، لیکن طلاق میں عورت کی رضامندی شرط نہیں ہے؛ کیونکہ طلاق خاوند کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس پر شکر کرو؛ کیونکہ اگر طلاق عورت کے ہاتھ میں ہوتی تو تم روز طلاق لے کر باہر آتے۔ یہ تو ابھی اس کے ہاتھ میں نہیں ہے اور تم جوتے اٹھا رہے ہو۔

اس آیت (نمبر ۲۳۰) میں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ دو دفعہ طلاق دینے کے بعد اگر رکھنا ہے تو بھلائی سے رکھو، یہ نہیں کہ تم اسے تنگ کرو۔ اگر چھوڑنا ہے تو اس کو شرعی طریقہ کے ساتھ چھوڑو، یہ نہیں کہ اس کو دھکے دو، الزام لگاؤ۔ بس جب طلاق دی ہے تو بات ختم ہوگئی۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر تم طلاق دینا چاہتے ہو اور عورت کو اس کا حق المہر نہ دیا ہو تو حق المہر دے کر طلاق دو۔ اور کپڑے اور کچھ چیزیں دے کر روانہ کرو؛ کیونکہ اتنا عرصہ تم نے اکٹھے زندگی گزاری ہے۔ آپ نے پہلے پڑھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی بیویوں کو فرما دیں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿٢٨﴾ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٢٩﴾﴾

[الاحزاب: ۲۸، ۲۹]

اے میرے مدنی! اپنی بیویوں سے کہہ دیں: اگر تمہیں دنیا کی زندگانی اور زینت عزیز ہے تو آؤ، میں تمہیں کچھ نفع کی چیز بھی دے دوں اور تمہیں بڑے احسن طریقے سے آزاد کر دوں۔ اور اگر تم اللہ کو، اللہ کے رسول کو اور آخرت کو پسند کرتی ہو تو دنیا میں تو تکلیفیں گزارنی ہوں گی، لیکن آخرت میں تمہارے لیے بہت بڑا ثواب ہے۔ پھر تمہیں برداشت کرنا ہوگا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی حکم دیا ہے: ﴿فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ (اگر بیوی کو اپنے پاس رکھنا ہے تو اس کو بھلائی کے ساتھ رکھو اور اگر چھوڑنا ہے تو احسان کے ساتھ چھوڑو)۔

خلع کے متعلق مسئلہ:

﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ:۲۲۹] اگر تم عورت کو طلاق دینا چاہتے ہو تو اس کو عزت کے ساتھ طلاق دے کر فارغ کر دو۔ اس سے یہ مطالبہ نہ کرو کہ تم مجھے اتنے پیسے دو تو میں تمہیں طلاق دوں گا۔ ہاں اگر بیوی کو یقین ہو چکا ہے یا تم دونوں کو یہ یقین ہو چکا ہے کہ ہمارا آپس میں گزر نہیں ہو سکتا اور خاوند طلاق نہیں دینا چاہتا اور عورت مطالبہ کرتی ہے کہ میں چونکہ تیرے حقوق ادا نہیں کر سکتی تو تیرے گھر میں رہنے کا فائدہ نہیں ہے۔ اور وہ خود مطالبہ کرتی ہے کہ مجھے طلاق دے دو۔ تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نے جو کچھ اس کو دیا تھا اس سے واپس لے لو: کیونکہ اب طلاق کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہے۔ (ہاں اگر خاوند خود طلاق دینا چاہے یا زیادتی خاوند کی طرف سے ہو تو عورت سے خلع میں کچھ نہ لے۔) اس کو شریعت کی اصطلاح کے اندر ''خلع'' کہتے ہیں۔

سب سے پہلا یہ مسئلہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا ہے کہ ان کی بیوی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر یہ درخواست کی کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنے خاوند کو دیکھا، چند دوستوں کے ساتھ آرہے تھے۔ چھوٹے قد کے ہیں، سیاہ رنگ کے ہیں، میرے دل میں نفرت آگئی، میں اس کے گھر میں نہیں رہ سکتی، میں اپنے خاوند کے حقوق ادا نہیں کر سکتی تو میرا بیوی بننے کا کیا فائدہ؟

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ ہم نے اسلام میں حدیں مقرر کر دی ہیں، اللہ کی حدود کو کبھی نہ توڑنا۔ مثلاً: ایک عورت کا ......اللہ نہ کرے...... کسی دوسرے مرد کے ساتھ تعلق بن گیا۔ دوسرے مرد نے کہا: تم خاوند کو تنگ کرو۔ جو کچھ لینا ہے لے لے، میں تجھے دے دوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: خبردار! تم میری حدیں توڑ رہی ہو! یہ الگ بات ہے

کہ میاں بیوی کی نہیں بنتی، دلوں کے اندر نفرت آ گئی۔

روایت میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ارواح کو پیدا کیا تھا تو جن ارواح میں اللہ تعالیٰ نے وہاں موانست پیدا کر دی، دنیا میں آ کر بھی ان میں موانست ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہاں بھی تنافر ہو گیا تو دنیا میں آ کر بھی تنافر ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر میاں بیوی کے درمیان نفرت پیدا ہو گئی اور بیوی نے طلاق کا مطالبہ کیا تو اس صورت میں کوئی گناہ نہیں۔

یاد رکھو! جو عورت پہلے خاوند کا گھر برباد کر کے آ رہی ہو وہ تیرا گھر بھی آباد نہیں کرے گی؛ کیونکہ بعض لوگ عشق کے چکر میں آ جاتے ہیں اور مجنون بن جاتے ہیں۔ ایک عورت نے اگر اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال نہیں کیا، اپنی اولاد کو چھوڑ دیا اور تیرے عشق میں مبتلا ہو گئی تو تم بھی انتظار کرو، تجھے چھوڑ کر تیسرے کے پاس جا سکتی ہے۔

تین طلاقوں کے بعد دوسرے مرد سے نکاح کیوں؟

﴿فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ [البقرۃ: ۲۳۰] اگر خاوند نے تیسری طلاق دے دی تو اب یہ عورت اس خاوند کے لیے حلال نہیں ہو گی جب تک کہ کسی دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح نہ کر لے۔ اور صرف فقط نکاح نہیں، بلکہ اس کے ساتھ جماع بھی کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ سزا اس لیے ہے کہ ہم نے تو تمہیں ایک طلاق کا حق دیا تھا تو تم نے اس سے کیوں تجاوز کیا؟ اور تیسری طلاق کیوں دے دی۔ اگر تم نے تین طلاقیں دے کر ہمیشہ کے لیے اس عورت کو اپنے سے علیحدہ کر دیا ہے تو اب یہ تمہارے نکاح میں نہیں لوٹ سکتی جب تک دوسرا نکاح نہ کر لے۔

اس بات کو کافروں اور جاہلوں نے بڑا اچھالا ہے کہ عجیب بات ہے کہ تین طلاقیں تو مرد نے دی ہیں، لیکن سزا عورت کو مل رہی ہے کہ وہ دوسری جگہ نکاح کرے اور دوسرے خاوند کے ساتھ لیٹے۔ یاد رکھیں! یہ اسلام پر الزام ہے۔ اسلام کی منشا یہ ہے کہ جس آدمی نے تین طلاقیں دے دی ہیں، تم اس کے گھر میں پھر کیوں جانا چاہتی ہو؟ اسلام کہتا ہے: خبردار! مت جاؤ؛ کیونکہ ''لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَيْنِ'' [بخاری، رقم: ۶۱۳۳] (ایمان والا ایک بل سے دو دفع نہیں ڈسا جاتا)۔ ''اَلْمُجَرَّبُ لَا يُجَرَّبُ'' (جب ایک دفعہ کسی پر تجربہ کر لیا تو اس پر دوبارہ تجربہ کی ضرورت نہیں)۔ اس کے باوجود اگر عورت اپنے خاوند کے پاس جانا چاہتی ہے تو وہ خود راضی ہو رہی ہے۔

اسلام تو نہیں کہتا کہ جاؤ۔ اسلام تو اس کو بچانا چاہتا ہے کہ تم اور جگہ شادی کر لو؛ کیونکہ ہو سکتا ہے اس دوسرے خاوند کے ساتھ دل لگ جائے۔ لہٰذا اسلام نے عورت کی حفاظت کی ہے۔

یاد رکھیں! اگر عورت دوسرے خاوند کے پاس جا رہی ہے، نکاح کر کے جا رہی ہے۔ اگر پہلا خاوند باحیاء ہے تو اس کو تکلیف ہوگی کہ دیکھو! اگر میں زیادتی نہ کرتا تو میری بیوی دوسرے کے بستر پر نہ لیٹتی۔

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ اگر دوسرا خاوند خود بخود طلاق دے دے یا مر جائے ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۳۰] اب پہلا شوہر اور بیوی دوبارہ رجوع کر سکتے ہیں، لیکن عدت گزارنے کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! اگر تم دونوں کو یقین ہے کہ دوبارہ شادی کر کے ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں گے اور اللہ کی حدود کو نہیں توڑیں گے تو پھر نکاح کرو۔ یہ نہ ہو کہ نکاح کے بعد لڑائی کرو کہ تم تو فلاں کی بیوی بنی تھی اور تم نے یہ یہ کیا تھا۔ جب میں نے تجھے چھوڑ دیا تو پتہ نہیں تم کہاں کہاں پھرتی رہی ہو؟ اگر یہ نفرت ہے تو دوبارہ نکاح نہ کرو۔ اور اگر تمہیں یقین ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حدود کو نہیں توڑ و گے تو اب اسلام اجازت دیتا ہے کہ رجوع کر سکتے ہو۔

یہ اللہ تعالیٰ نے حدود اور قوانین وضع کر دیئے ہیں۔ ان لوگوں کو فائدہ ہوگا جو جاننے والے ہیں اور جو نہیں جانتے، جن کو حلال وحرام کا پتہ نہیں ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

نکاح وطلاق مذاق اور بغیر نیت کے بھی ہو جاتے ہیں:

اس لیے یاد رکھیں کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں بڑا باریک فرق ہے۔ اس کی طرف عام طور پر لوگوں کی توجہ نہیں جاتی۔ نکاح، طلاق، عتاق اور رجعت یہ سب معاملات ظاہری ہیں۔ ایک آدمی نے نکاح کیا۔ اس میں ایجاب وقبول ہوا، لڑکے لڑکی نے قبول کیا، حق المہر طے ہو گیا، دونوں کے ولی موجود ہیں اور شہود موجود ہیں۔ اب اس کے بعد لڑکا کہے کہ نکاح کرنے کی میری نیت نہیں تھی، مجھے ماں باپ پکڑ کر لے آئے تھے۔ تو اب ظاہری الفاظ پر حکم ہوگا۔ ایک لڑکی نے نکاح کو قبول کیا اور کچھ دن گزرنے کے بعد کہے کہ مجھ پر جبر کیا گیا تھا تو اس وقت میں نے قبول کر لیا تھا، ورنہ میری نیت نہیں تھی تو اس صورت میں اسلام ظاہری الفاظ دیکھے گا۔ ایک آدمی مسجد سے نکل رہا ہے تو ظاہر میں اچھا فیصلہ کریں گے کہ یہ نماز کے لیے گیا ہوگا۔ ایک آدمی مے کدہ سے باہر آ رہا ہے، حالانکہ ضروری نہیں کہ اس نے وہاں شراب پی ہو، لیکن بظاہر اس کا آنا اسی لیے ہو سکتا ہے۔ تو ظاہری فیصلہ کریں گے، باطن کا معاملہ اللہ

تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ دل میں کیا بات تھی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۡ﴾ [البقرة:۲۳۱] تم میرے قوانین کو ٹھٹھہ اور مخول نہ بنا ڈالو۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَ هَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالْعِتَاقُ''[1] (تین چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت ہے۔ اور وہ تین چیزیں یہ ہیں: نکاح، طلاق اور عتاق)۔ اور ایک روایت میں ہے: نکاح، طلاق اور رجعت۔ اگر ان سے کسی نے مذاق کیا تو شریعت اس کو مذاق نہیں سمجھے گی، کل وہ لاکھ کہتا رہے کہ میں نے بیوی کو مذاق میں طلاق دی تھی، شریعت کے اندر ظاہری لفظ کو دیکھا جائے گا کہ اس نے ظاہر میں لفظ طلاق نکالا تھا، لہٰذا اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

آج یہ مشکل ہوگئی ہے کہ ہم لوگوں کو حرام کی تو شرم نہیں ہے، گلیوں میں بازاروں میں کھڑے ہیں، طواف میں جھانک رہے ہیں اور رکن یمانی پر اور کچھ نہیں تو بازو ماریں گے، اس میں حیا نہیں کرتے، لیکن اگر کوئی شریعت کا مسئلہ ہو تو کہتے ہیں: چھوڑو! یہ میاں بیوی کی بات ہے۔ مولوی صاحب سے جا کر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اب ان کو حیا آرہی ہے، جبکہ اسلام کہتا ہے: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ﴾ [الاحزاب:۵۳] حق کے اندر حیا نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تو عورتیں آکر مسئلہ پوچھتی تھیں: اے اللہ کے رسول! میں حیض میں ہوں تو غسل کیسے کروں؟...... جبکہ ہماری بہن یا ہماری بیٹی یہ مسئلہ نہیں پوچھے گی اور جانتی بھی نہیں کہ یہ مسئلہ کیسے ہے؟ اور دوسرا شرم بھی ہے۔ فلم دیکھنے سے شرم نہیں، وی سی آر پر بیٹھ کر خاوند کے ساتھ تم بلیو پرنٹ دیکھو تو تمہیں حیا نہیں آتی اور دین کا مسئلہ پوچھتے ہوئے تمہیں شرم آرہی ہے۔ یہ عجیب شرم ہے! جو آج تک مجھے سمجھ نہیں آئی...... بہر حال حضور اکرم ﷺ نے اس کو فرمایا: جب تمہارے ماہواری کے دن گزر جائیں تو پھر تم غسل کرو، بالوں میں پانی پہنچاؤ۔ ...... وہ عورت سیدھی سادھی تھی...... وہ پوچھنے لگی کہ اس کو کیسے رکھوں؟ تو بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا: اللہ کی بندی! یہ مزید تفصیل عورتوں کا کام ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ ان کے نام سے کفر کانپتا تھا اور آج بھی کانپتا ہے۔ جس کے بارے میں دشمن کو یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اگر ان کی جماعت میں ایک اور عمر پیدا ہو جاتا تو پوری دنیا پر اسلام ہوتا۔ ایسا آدمی آکر حضور اکرم ﷺ سے عرض کر رہا ہے: یا رسول اللہ! میری بیوی کے بدن پر نظر پڑ گئی۔ چاند

[1] [الجامع الصغیر: رقم: ۳۳۵۱، جامع الاحادیث: ۱۱/ ۳۲۲]

روشن تھا، بدن نظر آ رہا تھا، مجھ پر شہوت آ گئی اور میں قابو نہیں کر سکا (رمضان کا مہینہ تھا)۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرما دیا۔ اب آپ ایمان سے بتائیں کہ اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شرم کر جاتے تو ہم قیامت تک کتنی تکلیف میں مبتلا ہوتے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ﴾ [1] کہ رات کو رمضان میں اگر میاں بیوی جماع کریں تو حلال ہے۔

آج کل ہمارے ہاں یہ ہندوؤں کی رسم ہے کہ اگر کسی لڑکی کو طلاق ہو جائے تو کوئی اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ یہ مطلقہ ہے۔ ان کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ بے چاری مظلوم ہو، اس کے شوہر نے اس کو ناحق طلاق دی ہو، لیکن کوئی اس سے رشتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی تیار بھی ہو تو وہ ایسا ہوتا ہے کہ جس کو کوئی رشتہ نہیں دیتا۔

طلاقِ صریح اور طلاقِ کنائی:

طلاق کے بعض الفاظ صریح ہیں اور بعض الفاظ کنائی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ لفظ ''طلاق'' صریح ہے، اس کا دوسرا معنی نہیں ہوسکتا۔ ہمارے اپنے علاقے کا ایک واقعہ ہے کہ جب مرد سے طلاق لکھوائی گئی...... وہ بڑا چالاک آدمی تھا...... اس نے ''بقلمِ خود'' کی بجائے ''بقلمِ خوف'' لکھ دیا۔ یاد رکھیں! اللہ کے دین میں ایسی شرارتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح تم ایک مولوی کو تو دھوکہ دے سکتے ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کو دھوکہ نہیں دے سکتے، اس کے سامنے ہر بات لکھی ہوئی ہے۔

آج لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ ایک مولوی نے یہ فتویٰ دیا ہے اور دوسرے مولوی نے یہ فتویٰ دیا ہے، ہم کہاں جائیں؟ یہ مولوی تو آپس میں لڑتے ہیں۔ یاد رکھیں! یہ بھی دراصل شیطانی وسوسہ اور دھوکہ ہے کہ شیطان اسلام سے ہٹانے کے لیے اس قسم کا وسوسہ ڈال دیتا ہے، تاکہ ہم دین سے ہٹ جائیں۔ اختلاف کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ تم جو مسئلہ مجھے آ کر بتاؤ میں اس کے مطابق ہی جواب لکھوں گا۔ دوسرے مولوی صاحب کے پاس اس بندے نے کہا کہ میں ایک دفعہ طلاق کہہ دی ہے تو صاف ظاہر ہے وہ اس کے مطابق جواب لکھے گا۔ اور تیسرے مولوی سے کہا: میں نے تو کہا تھا کہ اگر تم اس طرح کرو گی تو میں تجھے طلاق دے دوں گا، طلاق میں نے نہیں دی تھی۔ اب بتائیں کہ ان صورتوں کے اندر مولوی کیا کریں؟ وہ تو اس کے مطابق فتویٰ دے گا جو تم اس سے پوچھنے

جاؤ گے۔ اور پھر کہتے ہیں کہ دیکھو! حنفی عالم نے یہ کہا اور حنبلی عالم نے یہ کہا۔ بھائی! جس مسلک پر ساری زندگی گزاری ہے اس مسلک کے عالم سے جا کر مسئلہ پوچھو۔ اگر تم نے دوسرے سے رجوع کیا ہے تو لازمی بات ہے کہ وہ اپنی فقہ کے مطابق فتویٰ دے گا۔

کنایہ الفاظ کی مثال یوں ہے جیسے کہہ دے: آج کے بعد تیری میری ختم ہوگئی، یا کہہ دیتا ہے کہ آج کے بعد تمہاری ساری تمہارے کندھے پر ہے، آج کے بعد تمہاری نکیل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ان الفاظ سے طلاق بائنہ ہوجاتی ہے، لیکن ایک موٹی بات یاد رکھیں! جب بھی کوئی مسئلہ ہو تو فوراً عالم سے رجوع کریں۔

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾ [البقرة: ۲۳۱، ۲۳۲]

”اور جب تم نے بیویوں کو طلاق دے دی اور وہ اپنی عدت (کی انتہاء) کو پہنچ گئیں تو ان کو دستور کے مطابق رکھ لو یا ان کو عمدہ طریقے سے چھوڑ دو۔ اور ان کو ستانے کے لیے نہ روکے رکھو، تاکہ ان پر زیادتی کرو۔ اور جس نے یہ کیا اس نے اپنا برا کیا۔ اور اللہ کے احکام کا مذاق مت اڑاؤ اور اللہ کا احسان یاد کرو جو تم پر ہے۔ اور وہ جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری کہ تم کو سمجھا دے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور جان لو کہ اللہ سب چیز جانتا ہے۔ اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی اور وہ اپنی عدت کو پورا کرچکیں تو اب ان کو نہ روکو کہ نکاح کرلیں اپنے انہی خاوندوں سے جب وہ راضی ہوجائیں آپس میں دستور کے موافق۔ اس سے اس کو نصیحت ملتی ہے جو تم میں سے اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ اسی میں تمہارے لیے زیادہ سنوار اور زیادہ ستھرائی ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

احکامِ طلاق اللہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے؛ کیونکہ اسی نکاح وطلاق پر حسنِ معاشرت کا دارومدار ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر کسی نے عورت کو طلاق دے دی، جب اس عورت کی عدت ختم ہونے کے قریب آگئی...... پہلے دور کے اندر یہ ہوتا تھا کہ عورت سے رجوع کر لیتے تھے، پھر طلاق دے دیتے تھے، پھر رجوع کر لیتے تھے۔ اسی طرح عورت پر ظلم کرتے رہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ احکام واضح کر دیئے۔ فرمایا: خبردار! ایسا مت کرو۔ اگر تم نے طلاق دے دی اور اب عدت ختم ہونے پر آگئی ہے...... اور تم رکھنا چاہتے ہو تو شرعی طریقے سے اور بھلائی کے طریقے سے رکھو اور آئندہ اپنے گھر میں صلح کے ساتھ زندگی بسر کرو، تیرا مقصد دل سے رکھنا ہو۔ اور اگر تم نہیں رکھنا چاہتے ہو تو اس کو بھلائی اور عزت کے ساتھ رخصت کر دو۔

چونکہ قاعدہ یہ ہے کہ عورت عدت کے ایام خاوند کے گھر میں گزارے گی اور عدت کے دنوں کے اندر اس کا نفقہ، مکان کا خرچہ پہلے کی طرح خاوند کے ذمہ ہوگا۔ اب جب عدت ختم ہونے پر آگئی۔ اب اگر رکھنا ہے تو بھلائی سے رکھے اور اگر چھوڑنا ہے تو عزت کے ساتھ اس کو رخصت کر دے۔ بلکہ حکم ہے کہ اس کو تھوڑا بہت دے کر رخصت کریں، تاکہ یہ نہ ہو کہ نکاح کے وقت تو خوشی ہو اور اب طلاق دینے کے وقت دشمن بن جاؤ۔ اگر تم روک کر ان پر ظلم کرو گے، بلکہ ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ تم اپنے اوپر ظلم کر رہے ہو؛ کیونکہ جو آدمی اللہ کے قانون کو توڑتا ہے وہ دراصل اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ...﴾ ان آیات میں دوسرا مسئلہ یہ بیان ہوا کہ اگر تم نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی ہے اور وہ اپنی عدت پوری کر چکی ہیں تو وہ عورت اگر کسی دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی ہے تو اس کو مت روکو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ طلاقِ رجعی ہے؛ کیونکہ رجوع کا حق اس وقت ہوتا ہے جب ایک طلاق دی جائے یا دو طلاقیں دی جائیں۔ تین طلاق کے بعد رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت کے رواج کی تردید:

زمانۂ جاہلیت کے اندر یہ رواج تھا کہ عدت پوری کرنے کے بعد پہلے والا خاوند اس سے کہتا کہ تم جب دوسری شادی کرو گی تو میں تجھے دیکھ لوں گا۔ اس کے بعد اگر عورت دوسری شادی کرنا چاہتی تو پہلا خاوند وہاں جا کر کہتا: خبردار! اس سے نکاح نہ کرنا، یہ میری مطلقہ ہے۔ حالانکہ طلاق دینے کے بعد اس کا اس عورت کے ساتھ کوئی تعلق

نہیں رہا۔ اسلام کہتا ہے: ﴿فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ﴾ خبردار! ان کو مت روکو۔ وہ جہاں نکاح کرنا چاہیں کرسکتی ہیں؛ کیونکہ اب یہ اس کے لیے ایسے ہوگئی جیسے اجنبی ہو۔ اب طلاق کے بعد تمہارا اس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔

عورت کے دوبارہ نکاح کرنے کے مسائل:

ایک آدمی نے عورت کو طلاق دی، اس کی عدت گزر گئی۔ اس کے بعد خاوند کو خیال آیا کہ میں اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کروں اور عورت بھی چاہتی ہے کہ میں اپنے پہلے خاوند کے گھر واپس چلی جاؤں، دوبارہ اس سے نکاح کرلوں، بجائے اس کے کہ کسی اور کے گھر جاؤں۔ لیکن جو مرد یا عورت کے وارث ہیں وہ کہتے ہیں: خبردار! اس نے تمہیں طلاق دی ہے، اس سے پھر نکاح مت کرو۔ اسلام نے کہا: اس طرح وارث نہ کریں۔ اگر وہ آپس میں راضی ہیں تو تم منع نہ کرو، لیکن اس میں شرط یہ ہے: ﴿إِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُم بِٱلۡمَعۡرُوفِ﴾ کہ جب عورت اور خاوند بالکل شرعی اور بھلائی کے طریقے سے دوبارہ نکاح کرنے پر راضی ہوں، یعنی خاوند کی نیت یہ نہ ہو کہ عورت کو اب دوبارہ نکاح میں لے کر ذلیل کرے گا۔

......دوسری بات یہ ہے کہ عورت دوسری جگہ شادی کرنا چاہتی ہے، لیکن وہ جگہ اس کے کفو میں نہیں ہے تو اب وارث روک سکتے ہیں۔

......اسی طرح اگر عورت اپنے مہرِ مثل سے بھی کم پر راضی ہو رہی ہے، یعنی اس کی باقی بہنوں کا مہرِ مثل دس ہزار تھا، وہ تین ہزار مہر پر نکاح کر رہی ہے تو اس کے اولیاء اس کو روک سکتے ہیں کہ تم کیوں ہماری اہانت کرا رہی ہو؟ برابر کے آدمی کے ساتھ رشتہ کرو۔

......اسی طرح ایک عورت عدت کے اندر ہے اور وہ عدت کے اندر کسی اور جگہ شادی کرنا چاہتی ہے تو اس کے اولیاء اس کو روک سکتے ہیں کہ ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔

اس لیے قرآن پاک نے ایک لفظ بڑھایا: ﴿إِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُم بِٱلۡمَعۡرُوفِ﴾ شرط یہ ہے کہ شریعت کے مطابق ہو تو اولیاء نہ روکیں۔ اگر اس کے باوجود وہ نکاح نہیں کریں گے تو گنہگار ہوں گے اور جو فتنے اور فساد پیدا ہوں گے اس کے ذمہ دار اس کے اولیاء اور وارث بھی ہوں گے۔ مثلاً: ایک لڑکی بالغ اور جوان ہوگئی۔ اگر ماں باپ رشتہ ملنے کے باوجود شادی نہ کرتے، اس کے بعد اگر وہ گناہ میں مبتلا ہوئی تو اولیاء پر بھی برابر کا گناہ ہوگا؛ کیونکہ اس کو

شادی سے روکنے والے وہ ہیں، ورنہ ان کا فرض تھا کہ جب لڑکی بالغ ہو جائے تو اس کے لیے مناسب رشتہ ڈھونڈیں اور اپنی طرف سے پوری کوشش کریں۔

آیات کا شانِ نزول:

حدیث پاک میں دو واقعات پیش آئے ہیں:

1 ......ایک حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ انہوں نے اپنی بہن کی شادی کی۔ اتفاق سے میاں بیوی میں نا چاقی ہو گئی اور اس کے خاوند نے طلاق دے دی۔ اور عدت کے اندر اس کے خاوند نے رجوع نہ کیا۔ عدت گزرنے کے بعد خاوند کو خیال آیا کہ میں نے غلطی ہے، میں دوبارہ اپنی سابقہ بیوی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اور بیوی بھی راضی ہو گئی۔ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس کے شوہر نے آکر کہا: آپ مہربانی کریں اور اپنی بہن کا نکاح دوبارہ مجھ سے کر دیں۔ تو حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ غصہ میں آگئے اور کہا: عجیب آدمی ہو!! پہلے میں نے تمہیں اپنی بہن کا رشتہ دیا ہے، تم نے طلاق دے کر ہماری عزت لوٹا دی۔ اب تم پھر دوبارہ نکاح مانگنے کے لیے میرے دروازے پر آگئے ہو؟ خبردار! میں تمہیں رشتہ نہیں دوں گا۔

2 ......دوسرا یہ واقعہ پیش آیا حضرت جعفر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنی چچا زاد بہن کا نکاح ایک آدمی سے کیا۔ اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ وہاں بھی طلاق ہو گئی اور عدت بھی گزر گئی۔ اب دونوں نے پھر نکاح کرنے کا ارادہ کیا، لیکن حضرت جعفر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نہیں مانے اور کہا: تم نے پہلے بھی طلاق دی ہے۔ اب پھر دوبارہ تمہارا نکاح کراؤں، تاکہ تم دوبارہ طلاق دے سکو؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ کہ اگر وہ عورتیں دوبارہ اپنے اسی شوہر کے ساتھ نکاح کرنے پر راضی ہیں تو تم ان کو منع نہ کرو۔ اس سے آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان اور عظمت کا اندازہ لگائیں کہ جب یہ آیات اتریں تو حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ خود چل کر اپنی بہن کے شوہر کے پاس گئے اور کہا کہ میں اپنی بہن کا رشتہ تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں؛ کیونکہ اب اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا ہے۔ جب قرآن نے فیصلہ کر دیا ہے تو ہم روکنے والے کون ہیں؟ حضرت جعفر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی خود چل کر گئے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر ایمان تھا، ان کے اندر

اتباع تھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی اور حضور پاک ﷺ کے فرمان کی۔

احادیث میں ایک اور مشہور واقعہ ہے کہ ایک صحابی نے ایک گھر میں حضور اکرم ﷺ کی معرفت اپنے نکاح کے لیے پیغام بھیجا اور وہ صحابی شکل وصورت کے اعتبار سے بھی کوئی زیادہ خوبصورت نہیں تھے۔ایک غربت تھی اور دوسرا حسن و جمال بھی نہیں تھا۔ بہرحال حضور اکرم ﷺ کا پیغام لڑکی کے گھر والوں کو دیا کہ کیا تم اپنی لڑکی کا رشتہ اس کو دینے کے لیے تیار ہو؟ اس صحابی نے اجازت چاہی کہ مجھے اتنی اجازت دیں کہ میں اپنی بہن سے پوچھ لوں۔ تو جب یہ بات گھر میں اس لڑکی نے بھی سن لی تو کہا: جب حضور ﷺ نے اس رشتہ کو قبول کیا ہے تو اب پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں یہ رشتہ قبول ہے۔

بچیوں کی شادی اور والدین کا لمحہ فکریہ:

قرآن پاک کی اس آیت ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی لڑکی عاقلہ بالغہ ہے تو اس کی رضامندی ضروری ہے۔ جہاں قرآن والدین کو ولی بناتا ہے وہاں یہ بھی پابندی لگاتا ہے کہ والدین اپنی اولاد کی رضامندی حاصل کریں۔ یہ نہیں کہ وہ انکار کرتی رہیں اور یہ کہیں میں باپ ہوں۔ جیسا کہ ہمارے ہاں جاہلیت ہے کہ اس لڑکی کو فرمانبردار سمجھا جاتا ہے جو ماں باپ کے کہنے کے مطابق عمل کرے، چاہے اس پر ظلم بھی ہو رہا ہو۔لہٰذا پندرہ پندرہ سال کی لڑکیاں ہوتی ہیں اور ستر ستر سال کے دولہے ہوتے ہیں۔ ظالم ماں باپ پیسوں کے لیے اپنی عزتوں کو بیچتے ہیں، اپنی بیٹیوں کی قیمت لگاتے ہیں، ورنہ تم ساٹھ ستر سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی اگر یہ تمنا رکھتے ہو کہ مجھے نوجوان لڑکی ملے تو نوجوان لڑکی کے کیا جذبات ہوتے ہوں گے کہ مجھے بوڑھا ملے؟ جب لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ باپ کے ساتھ جارہی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جو لڑکی اس کے ساتھ ہے یقیناً اس کی بیٹی ہوگی اور جب پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے: یہ میری تیسری بیوی ہے۔ وجہ دولت ہے۔اس کے مقابلے پر اگر کوئی نوجوان خوبصورت ہے، لیکن اس کے پاس دولت نہیں تو اس کو کوئی رشتہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

اور خاص طور پر جتنے ہمارے غریب ملک ہیں، جہاں غربت ہے، وہاں دولت والے ملکوں کے لوگ محض اس لیے آتے ہیں کہ وہاں جا کر ان کے والدین کو لاکھ دو لاکھ روپے دے کر پندرہ سولہ سال کی لڑکی سے شادی کر لی اور

ایک ماہ بعد طلاق دے کر آ گئے۔ انہوں نے...... نعوذ باللہ...... اسلام کو اپنی خواہشات پوری کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم نے زنا نہیں کیا، نکاح کیا ہے۔ ان کو کہا جائے کہ جب تم نکاح کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے کہ تمہارے دل میں ایک مہینہ کی نیت تھی یا دو مہینے کی نیت تھی۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تم کس کو دھوکہ دے رہے ہو؟ لوگوں کو دھوکہ دے سکتے ہو، والدین کو دھوکہ دے سکتے ہو، لیکن ﴿عَلِيمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝﴾ [فاطر:۳۸] جس کی ذات ہے، جن کو ہمارے سینے کے ہر راز کا علم ہے، اس کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اگر وہاں لڑکی بے چاری کہتی بھی ہے کہ میں اس جگہ رشتہ نہیں کر سکتی، آدمی کی عمر ساٹھ ستر سال ہے تو والدین اس کو کہتے ہیں: کیا اس لیے ہمارے گھر میں پیدا ہوئی تھی کہ آج ہماری ناک برادری میں کٹوا دے؟ بس ہم نے جو کہہ دیا وہی ہوگا۔ یاد رکھیں! یہ ظلم ہے۔

بچیوں کی پرورش میں والدین کا ظلم:

یاد رکھیں! لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔ دوسرا لڑکی کے کفو کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر لڑکی پڑھی لکھی ہے اور تم جاہل سے شادی کر رہے ہو تو یہ بھی ظلم ہے۔ اگر لڑکی با جمال ہے اور تم اس کی شادی ایسے آدمی سے کر رہے ہو جس کی شکل سے لوگوں کو نفرت آئے، یہ ظلم ہے۔ اگر لڑکی کسی با عزت گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور تم اس سے نچلے لوگوں میں اس کا رشتہ کر رہے ہو، یہ ظلم ہے۔ اس کے لیے برابر کفو تلاش کیا جائے۔

اور یاد رکھیں! جہاں ایسے رشتے ہوتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اس لیے قرآن پاک نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی بیٹی تھیں اور حضرت زید رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر رشتہ قبول کر لیا، لیکن جب شادی ہوگئی، دونوں میں گزارہ نہ ہو سکا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ جب بھی کوئی بات کرتے تو بی بی زینب رضی اللہ عنہا فوراً فرماتیں کہ یہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا، ورنہ میں تجھے شوہر کیسے قبول کر سکتی ہوں؟ میں قریشی ہوں، بنو ہاشم خاندان سے ہوں اور تم ایک غلام زادے ہو۔ تمہارا میرا کیا جوڑ ہو سکتا ہے؟ آخر انجام یہ ہوا کہ طلاق ہوگئی۔

یاد رکھیں! اسلام جہاں یہ کہتا ہے کہ لڑکی اپنے والدین یا ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے، وہاں اسلام اولیاء کو بھی مجبور کرتا ہے کہ تم لڑکی کے حالات کو دیکھو۔ تعلیم یافتہ ہے تو تعلیم یافتہ شوہر تلاش کرو، برابر کا رشتہ تلاش

کرو۔ یہ نہ ہو کہ شوہر کی عمر ساٹھ سال ہو اور بیوی کی عمر پندرہ سال ہو۔ اس قسم کے جو رشتے ہوں اور اس کے بعد جو فساد پیدا ہوں گے اس کا کون ذمہ دار ہوگا؟

بی بی بریرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیح احادیث میں موجود ہے کہ بی بی بریرہ رضی اللہ عنہا خوش شکل تھیں، جبکہ ان کے شوہر کی شکل بیوی کے برابر نہیں تھی۔ دونوں میں ناچاقی ہوگئی۔ خاوند کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ہر وقت بیوی کے پیچھے پھرتے رہتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس بی بی کو بلا کر فرمایا کہ تمہارا خاوند تم سے محبت کرتا ہے، تمہارے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ تم مہربانی کرو اور اس کے ساتھ گزارہ کرو۔ بی بی بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اگر حکم ہے تو میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تیار ہوں اور اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی، میری زندگی اس کے ساتھ نہیں گزر سکتی۔

﴿ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ﴾ اللہ کا دین اسلام قیامت تک کے لیے ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ اپنے احکامات فوج کے ذریعے تمہارے دماغوں میں اتارے۔ اور یاد رکھیں کہ دنیا کا کوئی قانون اور نظام کبھی طاقت سے نہیں چل سکتا۔ تم اس سے لوگوں کی گردن کو جھکا لو گے، لیکن دل نہیں جھکا سکتے۔

ہارون الرشید کی بیوی بی بی زبیدہ نیک خاتون تھیں۔ ایک دن اس نے اپنے محل کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھا کہ پورے بغداد کے لوگ بھاگے بھاگے جا رہے ہیں۔ وہ گھبرا گئی کہ شہر میں کیا ہو گیا ہے!؟ جلدی سے نیچے اتر کر خاوند کے کمرے میں گئیں، اس کو جگا کر کہا: عجیب بات ہے! تم یہاں سو رہے ہو اور سارا شہر باہر بھاگا جا رہا ہے؟ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟ ہارون الرشید نے کہا: کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام ابو یوسف تشریف لا رہے ہیں۔ یہ سارے لوگ ان کے استقبال کے لیے جا رہے ہیں، لہٰذا کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ بی بی زبیدہ نے کہا: پھر بادشاہ تو وہی ہے! کیونکہ تمہارے لیے تو لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جاتا ہے اور یہ تو دل اور محبت سے جا رہے ہیں، لہٰذا اصل حکومت تو اس کی ہے جس کی دل پر حکومت ہے۔

دلوں پر راج تب چلتا ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ کے قوانین پر صحیح طرح عمل پیرا ہو۔ اس لیے اسلام نے جہاں جہاں حدود بیان کی ہیں تو وہاں آگے پابندی لگائی ہے: ﴿مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ﴾ کہ ان احکام پر عمل وہ کرے گا جس کا اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان ہو۔ جب دلوں میں آخرت کا خوف بیٹھ جائے، قبر کا خوف بیٹھ جائے تو پھر کسی پولیس والے کی ضرورت نہیں۔

جب یہ تمہارا ایمان ہو جائے تو: ﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ﴾ میں نے جو قانون اور احکام بنائے ہیں اگر تو غور کرے تو وہ تجھے پاک کرنے کے لیے ہیں اور وہ تیری خیر و بھلائی کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو غنی ہیں، تم سب محتاج ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نکاح رکھا ہے۔ اگر یہ نکاح نہ ہوتا تو جو لوگ معاشرے والے اپنے آپ کو ترقی یافتہ ممالک کہتے ہیں، میں بلا مبالغہ اللہ کے حرم میں بیٹھ کر کہتا ہوں آپ وہاں کے رسائل اور ان کی چھپی ہوئی کتابیں دیکھیں کہ وہاں کتنی اولادیں ہیں جن کو اپنے والدین کا پتہ نہیں ہے! کیونکہ جب نکاح کا فلسفہ ختم ہو جائے، مرد و عورت کو اتنی آزادی دی جائے، جب تعلیم مخلوط کر دی جائے، ہر جگہ لڑکی اور لڑکے کو اکٹھا کر دیا جائے، جب ان کے ڈرامے اکٹھے کر دیئے جائیں اور ماں باپ کے سامنے ان کی لڑکیاں ڈانس کر کے اپنے ملک کی ثقافت پیش کر رہی ہوں اور ماں باپ خوشی محسوس کر رہے ہوں، اس کے بعد جو انجام ہوگا وہ واضح اور ظاہر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی آیات کو مذاق بنانے کا کیا مطلب؟

﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے قرآن کی اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا: "كَانَ الرَّجُلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يُطَلِّقُ امْرَأَتَهٗ وَ يَقُوْلُ: كُنْتُ لَاعِبًا" حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں کبھی کوئی آدمی یہ کہتا: "زَوَّجْتُكَ ابْنَتِيْ." "میں نے اپنی بیٹی کا تجھ سے نکاح کر دیا۔ دوسرا کہتا: اچھا!۔ تو وہ کہتا: میں مذاق کر رہا تھا۔ اسی طرح کہتا: میں نے اپنی باندی کو آزاد کر دیا اور باندی کہتی: اچھا! میں آزاد ہوں۔ تو وہ کہتا: نہیں! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرمایا کہ خبردار! اللہ تعالیٰ کے احکام کو تم مذاق نہ بنایا کرو۔[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت ہے: نکاح، طلاق اور عتاق۔ ان تین چیزوں میں کبھی مذاق نہ کریں۔

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری نعمتیں یاد کرو کہ میں نے تمہارے پاس اپنا پیغمبر بھیجا، میں نے تمہارے پاس اپنے نبی پاک کے ذریعے قرآن بھیجا۔ اب ان نعمتوں کا یہ مطلب نہیں کہ تم میری ان نعمتوں کا مذاق کرو۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [البقرة: ۲۳۱] جو کام کرو اس میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو چھوڑو

[1] [المطالب العالیة: رقم: ۲۰۱۷۰۶/۱۰۶]

اللہ سے ڈرو، یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے تیری کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ جب ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم میں ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے مطابق بدلہ دیں گے۔

عورت کے نکاح کے اولیاء:

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة:۲۳۲]

مفسر ابن کثیر ﷫ فرماتے ہیں: اس آیت سے اشارہ ملتا ہے کہ عورت کے اولیاء کو حق ہے، ان کی اجازت کے بغیر عورت نکاح نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت اپنا نکاح خود نہ کرے، جب تک کہ اس کے اولیاء، ولی الامر راضی نہ ہوں۔ اگر ان میں سے کوئی نہیں ہے تو وقت کا بادشاہ یا اس کا نائب قاضی وغیرہ اس کا ولی ہوتا ہے۔

حتیٰ کہ بعض ائمہ فرماتے ہیں: اگر عورت اولیاء کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گی تو نکاح نہیں ہوگا، بلکہ وہ زنا تصور ہوگا۔ گو بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ نکاح تو ہو جائے گا، لیکن اس کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا؛ کیونکہ اس نے حضور اکرم ﷺ کے فرمان کی مخالفت کی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: یہ تو زانیہ عورت کا کام ہے کہ وہ اپنے بدن کا سودا خود کرتی پھرتی ہے، شریف عورت کا نکاح اس کے ماں باپ ہی کرتے ہیں۔ اور نکاح کے اندر ان لوگوں کو گواہ بنایا جائے جو نماز روزے کے پابند ہوں؛ کیونکہ اسلام کا حکم ہے کہ گواہ عادل ہوں۔ اور جو آدمی نماز نہیں پڑھتا تو اس کی گواہی کہاں معتبر مانی جائے گی؟ حالانکہ نماز اسلام اور کفر کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ نکاح کے اندر کسی عالم کو بلایا جائے، وہ خطبہ پڑھے۔ مفسر ﷫ فرماتے ہیں: اگرچہ اس مسئلے کے اندر بڑا اختلاف ہے کہ ولی کے بغیر نکاح ہوتا ہے یا نہیں ہوتا؟ اس کی تفصیل کتب احکام کے اندر ملاحظہ فرمائیں۔

ولی الامر سے مراد آدمی ہے، عورت نکاح کی ولی نہیں بن سکتی۔ یہ سارا انتظام اس لیے ہو رہا ہے کہ معاشرہ ٹھیک رہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے رشتہ دار بھی ہوں گے اور ماں باپ بھی راضی ہوں گے تو معنی ہوگا کہ آپ واقعی نکاح کر رہے۔ اور اگر ماں باپ کو پتہ نہیں ہے کہ عورت نے کچھ کر لیا تو گویا اس کے اندر کوئی نہ کوئی حرکت ضرور ہے۔

اختلاف اس میں ہے کہ اگر کوئی لڑکی عاقلہ بالغہ ہوگئی، اس نے اپنی رضامندی سے بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کرلیا تو کیا نکاح ہوجائے گا؟ بعض ائمہ فرماتے ہیں: نکاح نہیں ہوگا۔ اور بعض ائمہ فرماتے ہیں: نکاح تو ہوجائے گا، لیکن یہ گناہگار ہے کہ اس نے حدیث رسول پاک ﷺ کی مخالفت کی ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے پاس کافی پیسے تھے۔ وہ دوسرے ملک سے شراب خرید کر لے آئے، تاکہ بیچ سکیں۔ جب مدینہ منورہ کے اندر پہنچے تو پتہ چلا کہ شراب تو حرام ہوگئی ہے۔ وہ سیدھے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: میں تو برباد ہوگیا۔ میرا جتنا پیسہ تھا میں نے اس کی شراب خرید لی ہے اور پھر اس کے اندر یتیم بچے کا بھی پیسہ ہے تو آپ مہربانی کریں! مجھے اجازت دیں کہ میں اس شراب کو کافروں کے ملک میں جا کر بیچ دوں؛ کیونکہ ان کے لیے تو حرام نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ثَمَنُ الْخَمْرِ حَرَامٌ'' [مسند احمد، رقم: ۲۲۲۰] میرے صحابی! جب حرام بیچو گے تو جو پیسے ملیں گے وہ بھی حرام ہوں گے۔ اور فرمایا: ان مٹکوں کو توڑ دو۔ اس صحابی نے ان شراب کے مٹکوں کو توڑ دیا۔

اس لیے وہ امن والا معاشرہ تھا۔ ہاں! ان لاکھوں میں سے کسی ایک سے غلطی بھی ہوگئی۔ آج کسی کو کہا جائے: نماز پڑھو، تو کہتے ہیں: ہاں پڑھ لیں گے۔ حالانکہ زندگی کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے نہیں بتایا کہ کب مرنا ہے؟ ورنہ تو ہم ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکتے۔ اگر ہر آدمی کو پتہ چل جائے کہ ساٹھ کی عمر میں مرجانا ہے تو جو دن گزرتے وہ بھی اس کی موت کے گزر جاتے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک پردہ دے دیا اور آدمی سمجھتا ہے کہ میں زندہ ہوں۔ میں یہ کروں گا اور میں وہ کروں گا۔ جب موت آئی تو لوگوں نے اٹھایا اور قبر میں ڈال دیا۔ ساری اکڑفوں ختم ہوگئی اور دولت بھی گئی۔

ایک عجیب واقعہ!

حضرت ابوحازم رحمہ اللہ تابعی تھے۔ اس زمانہ میں عبدالملک بادشاہ تھا۔ جب وہ بادشاہ مدینہ منورہ آیا تو اس نے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا یہاں ایسا آدمی بھی ہے جس نے صحابہ کی زیارت کی ہو؟ لوگوں نے کہا: ہاں! حضرت ابوحازم ہیں۔ تو بادشاہ نے کہا: ان کو بلاؤ۔ حضرت ابوحازم رحمہ اللہ بادشاہ کی مجلس میں تشریف لے آئے تو سب سے پہلے بادشاہ نے یہ اعتراض کیا کہ آپ نے بڑی زیادتی کی کہ میں مدینہ منورہ میں آیا ہوں اور آپ مجھے

ملنے کے لیے بھی نہیں آئے۔ یہ آپ نے میرے ساتھ زیادتی کیوں کی ہے؟ انہوں نے کہا: یہ زیادتی تو تب ہو جب میری آپ کی ملاقات پہلے ہو اور پھر میں ملنے نہ آتا۔ بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے۔ اب بادشاہ نے کہا: مجھے کوئی نصیحت فرمائیں کہ اللہ پاک ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ حضرت ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہ چاہتے کہ جن چیزوں سے میں نے منع کیا ہے تم ان مقامات میں نظر نہ آؤ اور جن چیزوں کا حکم ہے وہاں میں تمہیں پاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے مسجد کا حکم دیا ہے تو مسجد میں نظر آؤ۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ شراب خانہ میں نہ جاؤ تو وہاں نہ جاؤ۔ یہ ساری باتیں ہوتی رہیں اور حضرت ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ نصیحتیں فرماتے رہے۔ بادشاہ نے آخر میں کہا: آپ مجھے کوئی کام بتائیں، مجھے خوشی ہوگی کہ میں نے اتنے بڑے بزرگ کا کام کیا ہے۔ حضرت ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہاں کام تو ہے۔ بادشاہ نے پوچھا: کیا کام ہے؟ فرمایا: مجھے جنت میں داخل کردو اور جہنم سے بچادو۔ بادشاہ نے کہا: یہ تو میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ حضرت ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پھر میرا کوئی کام بھی نہیں ہے؛ کیونکہ سب سے بڑی کامیابی جنت میں جانا اور جہنم سے بچنا ہے۔ جب تم یہ نہیں دے سکتے ہو تو پھر تمہارے پلے میں کیا ہے؟ اس کے بعد بادشاہ نے انہیں پیسوں کا ہدیہ دیا اور کہا کہ میں ہدیہ پیش کرتا ہوں، اس کو قبول فرما لیں۔ آپ نے فرمایا: اگر یہ میری نصیحت کی قیمت ہے تو پھر اس سے زیادہ بہتر ہے کہ میں کوئی خنزیر لے لوں اور اگر تمہارا یہ مقصد نہیں تھا، بلکہ خالص تم مجھے ہدیہ دے رہے ہو تو جتنے عالم تمہارے ملک میں ہیں اگر اتنا ہدیہ تم نے سب کو بھیجا ہے تو مجھے دے دو، ورنہ صرف مجھے دینے کا کیا مطلب ہے؟

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾[البقرة: ۲۳۳]

''اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل۔ یہ حکم اس کے لیے ہے جو (کم از کم) دودھ کی مدت پوری کرنا چاہے۔ اور ان ماؤں کا کھانا اور کپڑا لڑکے کے باپ پر ہے دستور کے مطابق۔ کسی کو حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے مطابق۔ نہ ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور وارث کے ذمہ بھی ایسا ہی ہے۔ پھر اگر ماں باپ آپس کی رضا اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں اور اگر تم اپنی اولاد کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ حوالہ کر دیا ان کو جو تم نے ان کو دینا طے کیا ہے دستور کے مطابق۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔''

ماقبل آیات سے ربط:

اس آیت میں احکامِ رضاعت کے بارے میں ارشاد ہے۔ اس سے پہلے طلاق کے احکام کا ذکر ہے اور احکامِ رضاعت کے بعد پھر احکامِ طلاق کا ذکر ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ پوری دنیا پر نظر ڈالیں تو انسانوں کی کامیابی اسی گھر کے ماحول پر ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے گھریلو ماحول اپنی رحمت سے اچھا نصیب کر دیا، نیک بیوی مل گئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار اولاد عطا فرمادی، گھر میں تفاہم وموافقت ہے، صلاح ومشورہ ہے تو وہ گھر جنت کا ایک نمونہ ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسا گھرانہ ہے جس میں کوئی خبیثہ عورت آگئی، جس کی وجہ سے خاوند اور بیوی کے درمیان نااتفاقی اور ناچاقی پیدا ہوگئی تو وہ گھر دنیا میں گویا جہنم کا ایک نمونہ بن جاتا ہے۔ یہ عذاب زیادہ ہے کہ آدمی ہر وقت ذہنی طور پر پریشان ہے اور ہر وقت مسائل کے اندر الجھا ہوا ہے۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔

اس لیے قرآن مقدس میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کے مسائل واضح کر کے بیان فرمائے؛ کیونکہ ان مسائل میں آدمی اکثر مبتلا ہوتا ہے اور اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے عورتوں کو خاص طور پر نصیحت فرمائی: ''يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ! تَصَدَّقْنَ، وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ؛ فَإِنَّكُنَّ أَكْثَرُ أَهْلِ جَهَنَّمَ''[1] (اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ کیا کرو؛ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ جہنم میں زیادہ جانے والی عورتیں ہیں)۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ عورتیں ناقصات العقل بھی ہیں اور ناقصات الدین بھی ہیں۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب دنیاوی معاملات عورتوں کے سپرد ہو جائیں تو اس وقت زندگی موت سے بہتر ہے۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے اپنی امت پر

[1] [جامع الترمذی: رقم: ۶۳۵، باب: ما جاء في زكاة الحلي]

سب سے زیادہ خطرہ یہ ہے کہ عورتوں کا فتنہ سب سے بڑا فتنہ ہے۔ میری امت اس میں مبتلا ہو جائے گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حکم فرمایا: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [البقرة:۲۲۸] (جیسے تمہارے عورتوں پر حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کا بھی تم پر حق ہے)۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا'' (خبردار! عورتوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا کرو اور نرمی کا معاملہ کیا کرو)۔ اسی طریقہ سے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ''[1] (تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے)؛ کیونکہ آدمی باہر دوستوں سے اچھا ہوتا ہی ہے اور جس سے آپ اچھے نہیں رہیں گے وہ آپ سے ویسے ہی ملنا چھوڑ دے گا۔ لیکن انسان کی اصل اچھائی اپنے گھر کے اندر ہوتی ہے کہ اس کا اپنے گھر والوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے؟

مدتِ رضاعت کتنی ہے؟

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ...الخ﴾ [البقرة:۲۳۳]

اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولاد دی تو وہ کتنی مدت تک اپنی ماں کا دودھ پیے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر فرمایا: ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ دو سال دودھ پلائے۔ ان مسائل میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ وہ جو احناف کے ہاں مسئلہ ہے کہ مدت دو سال نہیں، اڑھائی سال ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک بچے نے ایک عورت کا دودھ دو سال نہیں، بلکہ اس سے ایک مہینہ بعد، یا تین مہینہ بعد، یا چار مہینہ بعد، یا پانچ مہینہ بعد، یا چھ مہینہ بعد یعنی اڑھائی سال کی عمر تک اگر کسی بچے نے کسی دودھ والی عورت کا دودھ پیا ہے تو رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟ تو احناف کہتے ہیں: اڑھائی سال تک رضاعت کا حکم جاری ہو سکتا ہے؛ کیونکہ قرآن میں دوسری جگہ آتا ہے: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ [الاحقاف:۱۵] (مدتِ حمل اور دودھ چھڑانے کی عمر تیس ماہ ہے، یعنی اڑھائی سال ہے)۔ جب ﴿ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ کا لفظ آ گیا تو امام صاحب فرماتے ہیں: چونکہ اس آیت میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں: ایک حمل اور دوسرا دودھ چھڑانا۔ تو ایک تفسیر میں ہر ایک کی مدت اڑھائی سال ہو سکتی ہے، حمل کی بھی اور دودھ چھڑانے کی بھی۔ اس لیے اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ اڑھائی سال کی عمر کے اندر پیا تو اس سے بھی احتیاطاً حرمتِ

---

[1] [جامع الترمذی، رقم:۳۸۹۵، باب فِي فَضْلِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ]

رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

بہر حال بچہ اپنی ماں کا دودھ دو سال پیئے اس کے بعد اس کو ماں کا دودھ چھڑا دینا چاہیے اور اگر ماں بیمار تھی یا ماں کا دودھ بچے کے لیے کسی وجہ سے مضر تھا تو اب یہ بچہ جس عورت کا بھی دودھ پیئے گا تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں بن جائے گی۔ اور جس عورت کا دودھ پیئے گا لازماً وہ بھی بچے والی ہوگی؛ کیونکہ بغیر بچہ کے دودھ نہیں ہوتا، وہ بچہ اگر لڑکی تھی تو اس کی بہن بن جائے گی اور اگر لڑکا تھا تو بھائی بن جائے گا، اس کو ''رضاعی بھائی'' کہتے ہیں۔ یہ دودھ کا رشتہ ہے۔ یہ اسی طرح رشتہ ہے جیسے حقیقی رشتہ ہے، یعنی جیسے حقیقی بہن سے نکاح حرام ہے اسی طرح جس بہن کے ساتھ دودھ پیا ہے اس کے ساتھ بھی نکاح حرام ہے۔ ہاں یہ فرق ہے کہ دودھ مثلاً: تم نے پیا ہے، تمہارے دوسرے بہن بھائی نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا تو ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ اس عورت کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح اس عورت کی اور اولاد ہے جس کے ساتھ تم نے دودھ نہیں پیا ان سے بھی تمہارا نکاح حرام ہے۔

آپ ﷺ کا رضاعی ماں کے ساتھ برتاؤ:

حدیث: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بڑھیا حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئی، اس کا عام بوسیدہ لباس تھا۔ حضور اکرم ﷺ اس کے لیے کھڑے ہوگئے اور اپنی چادر بچھا کر اس کو بٹھایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ہم حیران ہوگئے کہ وہ جو بات بھی حضور پاک ﷺ سے کہتی تھی کہ ایسا کر دیں، حضور پاک ﷺ حکم فرماتے کہ اس طرح کر دو۔ ہم حیران ہوگئے کہ یہ کونسی بڑھیا عوت آگئی ہے جس کے لیے حضور پاک ﷺ اتنی مہربانی فرما رہے ہیں!؟ بہر حال جب وہ چلی گئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے بارے میں حضور اکرم ﷺ سے پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ میری ماں ہے، جنہوں نے مجھے دودھ پلایا تھا۔

بی بی شیمہ حضرت حلیمہ کی بیٹی تھیں۔ وہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کھیلتی تھیں۔ خدا کی شان دیکھیں کہ ایک جنگ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بستی پر حملہ کیا جس میں وہ رہتی تھیں۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے محاصرہ کیا تو وہ لڑکی جوش میں آگئی کہ کون میرے گھر پر حملہ کرنے والا ہے؟ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو سارا دن اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر پھرتی تھی؟ حضور اکرم ﷺ کو اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو کچھ نہ کہو، اس کی بستی والوں کو بھی کچھ نہ کہو۔ واقعی وہ میری بہن ہے۔ اس کی محبت درست ہے۔

مسئلہ: ﴿لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ﴾ اس سے ایک اور مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ مدتِ رضاعت تو دو سال ہے، لیکن اگر ماں باپ پہلے دودھ چھڑانا چاہیں تو وہ بھی جائز ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کامل رضاعت دو سال بنے گی۔

اڑھائی سال کے بعد بچہ کے دودھ پینے سے رضاعت ثابت نہ ہوگی:

رضاعت کی حد ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اڑھائی سال کی عمر تک دودھ پی لے تو رضاعت ثابت ہوگی۔ اگر بچہ چار سال کا، پانچ سال کا ہوگیا اور کسی عورت کے سینے سے منہ لگا کر اس نے دودھ پی لیا تو اب رضاعت کے لیے مسئلے ثابت نہیں ہوں گے؛ کیونکہ حرمتِ رضاعت کے لیے شرط ہے کہ وہ مدت حولین میں ہو یا اڑھائی سال میں ہو، اس کے علاوہ نہ ہو۔

﴿وَعَلَی الۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ رِزۡقُهُنَّ وَكِسۡوَتُهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ﴾ پہلے تھا ''وَالۡوَالِدٰتُ'' اس سے مراد ماں تھی۔ اور باپ کو فرمایا: ﴿وَعَلَی الۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ رِزۡقُهُنَّ وَكِسۡوَتُهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ﴾۔ تو قرآن پاک نے یہ جو اسلوب بدلا ہے کہ وہ جس کا بیٹا ہے اس کے ذمہ روٹی اور خرچہ ہے اور ماں کی ذمہ داری دودھ پلانا تھا۔ یہاں بجائے ''وَالِد'' کے ''الۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ'' فرمایا، اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ تمہارے بچے کو اس کی ماں دودھ پلا رہی ہے، اس کا جو تم خرچہ لباس دے رہے ہو اس کو تم بوجھ نہ سمجھو؛ کیونکہ اس اولاد کی نسبت بھی تو تمہارے طرف کی جائے گی؛ کیونکہ بیٹا جب بھی منسوب کیا جائے گا تو باپ کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ اس لیے تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس کا خرچ ادا کرو۔ اور تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس کے اخراجات باقاعدہ ذمہ داری سے ادا کرو۔

بیٹے کا نسب باپ سے ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کی نسبت ہمیشہ باپ کی طرف کی جائے گی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ﴾ [الاحزاب:٥] (ان کو ان کے باپ کے نام سے پکارو)، ماں کی طرف نسبت نہیں ہوگی۔ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ماں کی طرف کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا، اس لیے وہاں نسب ماں کی طرف ہو سکتا تھا، ورنہ جتنے مولود ہیں ان کی نسبت والد کی طرف ہوگی۔

قیامت میں آدمی کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا یا ماں کے؟

بعض لوگوں نے ایک مسئلہ بنایا ہوا ہے کہ دنیا میں تو اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے، لیکن قیامت والے

دن لوگوں کو ماں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ یہ غلط بات ہے۔ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کو ہمارے لوگ خود بناتے ہیں۔ ایک بات چلتے چلتے پوری دنیا میں پھیل گئی، وہ مسئلہ بن گیا۔ اور اس طرح وہ دلیل دیتے ہیں: کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف نسبت ہوگی۔ اور اسی طرح کچھ لوگ کہتے ہیں جن کا باپ حقیقتاً معلوم نہیں ہے ان پر بھی پردہ پڑ جائے گا، جب ماں کی طرف پکارے جائیں۔

ہمیشہ یاد رکھیں! یہ بات غلط ہے۔ یہ نصِ قطعی کا مسئلہ ہے۔ جس میں اختلاف پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نصِ قطعی ہے: ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [الاحزاب:۵] ان کو ان کے والد کے نام کے ساتھ پکارا جائے۔

بعض لوگ کسی کو بیٹا بنا لیتے ہیں۔ اگر اس کا والد معلوم ہے تو لازمی طور پر اس کی حقیقی باپ کی طرف نسبت کرو۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت زید کو متبنّیٰ بنایا تھا تو حکم ہوا کہ ان کو ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے پکارا جائے، اس کی نسبت بیٹا بنانے والے یا بنانے والی کی طرف نہ کی جائے۔

بعض لوگوں نے ہسپتالوں سے بچے اٹھا لیے اور والدین معلوم نہیں، یا کبھی ایسے حالات بھی ہوتے ہیں کہ جنگ ہوئی کسی عورت کا بچہ رہ گیا، معلوم نہیں کس کا ہے، اب اگر اس بچے کو کسی نے پالا تو آدمی بظاہر یہی کہے گا کہ میرا بیٹا ہے، لیکن اگر نسبت معلوم ہو جائے تو ہر بچے کی نسبت باپ کی طرف ہوگی، ماں کی طرف نہیں ہوگی۔

نسبت کس کی طرف؟

اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ انسان اور حیوان میں یہی بنیادی فرق ہے کہ اگر انسان کا باپ مرجائے تو بیٹا یتیم ہوگا، یعنی والد کی موت سے یتیم کہلائے گا۔ اور جانوروں میں ماں مرجائے تو یتیم کہلائے گا؛ کیونکہ جانور کے باپ کا تو پتہ نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے کام تقسیم فرما دیے ہیں: ماں کی ذمہ داری تھی دودھ پلانا، تربیت کرنا، گھر میں بچے کی تربیت کرنا اور باقی نفقہ اور کسوہ باپ کی ذمہ داری ہے، لہٰذا اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوگی۔

مسئلہ: بعض لوگ اپنی نسبتوں کو چھپانے کے لیے اپنے آپ کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اپنی قوم بدل دیتے ہیں، حالانکہ کوئی چھوٹی بڑی قوم نہیں ہوتی۔ اصل میں بڑا وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہو۔

دیکھیں! ابوجہل کتنا بڑا قریشی سردار! لیکن اس پر لعنت پڑ رہی ہے، جبکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو ایک غلام تھے، ان کو یہ رتبہ دیا جا رہا ہے۔ تو ابوجہل کو اس کی قوم نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، اس کو اس کے نسب نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، فرعون کو بادشاہت نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، فرعون پر لعنت آ گئی، اس طرح ہامان ونمرود کو کوئی فائدہ نہیں ہوا، لیکن دنیا کے اعتبار سے بعض قومیں بڑی سمجھی جاتی ہیں اور بعض قومیں چھوٹی سمجھی جاتی ہیں۔ تو بعض لوگ اپنی نسبت بدل دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر بھی میرے آقا ﷺ نے لعنت فرمائی: ''مَنِ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ غَيْرُ أَبِيهِ فَالْجَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ'' (جو شخص اپنے باپ کے علاوہ کی طرف نسبت کرے گا اور وہ جانتا بھی ہو کہ یہ اس کا باپ نہیں ہے (گویا وہ اپنا باپ بدل رہا ہے) تو ایسے شخص پر جنت حرام ہے)۔ [مسند بزار: ۲/۱۴۵]

ماں کے دودھ کا اثر:

آج چودہ سو سال گزر چکے ہیں اور ہم پندرہویں صدی کے اندر داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن نے جو فیصلہ کیا تھا: ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ آج ساری دنیا کے ڈاکٹر جو پہلے کہتے تھے کہ ماں بچے کو دودھ نہ پلائے، فلاں دودھ لکھ دو۔ اب وہ سارے وہیں آ گئے کہ ماں کا دودھ سب سے زیادہ مفید ہے۔ اب جس ڈاکٹر کے پاس جائیں وہ پہلی نصیحت یہی کرے گا کہ بچے کو ماں کا دودھ پلائیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلے فرمائے ہیں وہ عین صدق ہیں، حق ہیں، جن میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا اور وہ قیامت تک غلط نہیں ہو سکتے۔ بندوں کے فیصلے غلط ہو سکتے ہیں؛ کیونکہ بندہ ناقص ہے، اس کے فیصلے بھی ناقص ہیں، بندے کی عقل بھی ناقص ہے، سوچ بھی ناقص ہے اور ان کی تھیوریاں بھی غلط ہو جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت یہ ہے کہ جو بچے ماں کا دودھ پیتے ہیں ایک تو وہ صحت مند ہوں گے، دوسرا یہ ہے کہ ان کا ماں کے ساتھ زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بخلاف اس بچے کے کہ پیدا ہونے کے بعد نوکرانی کے سپرد کر دیا جائے، وہ اس کو ڈبے کا دودھ پلا رہی ہے اور پھر اس کے بعد وہ انگریزی سکولوں میں پڑھ رہا ہے۔ پھر وہی حال ہوتا ہے جو اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

اولاد سے کیا بو آئے ماں باپ کے اطوار کی؟
دودھ ہے ڈبے کا اور تعلیم ہے سرکار کی

کہ جب دودھ بھی انگریزی ہو اور تعلیم بھی انگریزی ہو تو اس بچے کے اندر ماں باپ کی عادات کیسے آئیں گی؟ آپ ان سے کیا توقع کریں گے کہ وہ اسلام کی خدمت کریں گے؟ یہ عجیب سی بات ہے! یہ تو ایسے ہیں جیسے آپ کریلے کی بیل سے کہیں کہ مجھے آم دے دو۔ وہاں تو آم پیدا نہیں ہوسکتا، وہاں تو کریلا ہی ملے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک اصل اور بنیاد رکھی ہے۔

بچے کو دودھ پلانے کا خرچہ کس کے ذمہ ہے؟

﴿رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔﴾ خرچ کرنے کا مسئلہ سمجھیں! اگر میاں بیوی کے درمیان صلح ہے تو بیوی کا خرچہ ویسے بھی خاوند کے ذمہ ہے۔ اور اگر بچہ پیدا ہوا تھا اور خاوند نے طلاق دے دی، عدت کا خرچہ تو خاوند کے ذمہ ہے، اب بچے کا خرچہ والد دے گا؛ کیونکہ عدت تین حیض تھی۔ اس مدت کے اندر خرچہ کا ذمہ دار خاوند ہے۔ اسی طرح ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے، طلاق کے بعد وضع حمل ہوا، بچہ پیدا ہوگیا تو عدت ختم ہوگئی، اور عدت کے بعد وہ عورت کے خرچہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔ لیکن بچہ کی جب تک مدتِ رضاعت پوری نہیں ہوگی اس وقت تک بچہ کے خرچہ کا ذمہ دار والد ہوگا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: ﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔﴾ کہ تمہارا بیٹا ہے، اس لیے اس کے خرچہ کا ذمہ دار تم ہو۔

﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ﴾ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر آدمی امیر ہے تو خرچہ امیروں والا دے گا، متوسط طبقہ کا ہے تو خرچ متوسط طبقہ والا ہوگا اور غریب ہے تو خرچہ غریبوں والا دے گا؛ کیونکہ ہر کسی کے اخراجات میں فرق ہے۔

اگر عورت امیر ہے اور خاوند غریب ہے یا خاوند امیر ہے اور عورت غریب ہے تو دونوں صورتوں میں مرد کی حیثیت کو سامنے رکھ کر خرچ کا فیصلہ کیا جائے گا۔

طلاق دینے کے بعد بچے کی ماں نہ چھینو:

﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾ اللہ تعالیٰ نے کتنا عادلانہ نظام بنایا ہے کہ جب رضاعت کا مسئلہ ہو تو بچے کی ماں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عورت کو طلاق دے دی تو دودھ پلانے کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے۔ باپ کہے کہ میں اپنا بیٹا چھین لوں گا اور ماں تڑپ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! ان کی ماؤں کو مت نقصان پہنچاؤ۔ ٹھیک ہے کہ تم نے اس عورت کو طلاق دے دی، لیکن وہ بھی تو اس بیٹے کی ماں ہے۔ تم اس عورت پر ظلم نہ کرو، اس

کے بچے کو اس کے پاس رہنے دو، تاکہ ماں اس کی تربیت کرے، اس کو دودھ پلائے۔ جب بچہ بڑا ہو جائے گا تو سیدھی سی بات ہے کہ وہ باپ کو ہی ملے گا، لیکن یہ ظلم کرے کہ بچہ میں اس شرط پر دوں گا کہ تم یہاں دو سال تک پڑی رہو، یا کہے: تم اپنے ماں باپ کے گھر بچہ نہیں رکھ سکتی ہو۔ اسلام کہتا ہے: خبردار! ﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾ جب تم نے طلاق دے دی ہے، عدت گزر گئی ہے، اب وہ عورت تمہارے لیے اجنبیہ بن گئی، اب وہ بیٹے کی کمزوری کی وجہ سے تمہارے دروازے پر پڑی رہے اور وہ ذلیل ہوتی رہے، یہ ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کسی ماں پر اس کے بیٹے کی وجہ سے ظلم نہ کرو۔

اسی طرح باپ پر بھی ظلم نہ کرو، مثلاً: عورت کو پتہ ہے کہ میرے خاوند کی اتنی آمدن ہے کہ مشکل سے گزارا چل رہا ہے تو یہ دودھ پلانے والی کہاں سے رکھے گا؟ تو وہ کہے کہ تم اپنے بچے کو لے جاؤ، میں اس کو دودھ نہیں پلاتی۔ حالانکہ بچہ کی تربیت جتنا ماں کر سکتی ہے اتنا باپ نہیں کر سکتا۔ آپ دیکھیں کہ باپ مضبوط نوجوان بھی ہے، اس کو تین سال کا بیٹا طواف میں دو گے تو تین چکروں کے بعد ماں کو دے دے گا کہ اس کو پکڑو اور ماں بے چاری کتنی کمزور ہو وہ بچے کو نہیں چھوڑے گی اور اس کو لے کر پھرتی رہے گی۔

اس لیے اسلام نے کہا ہے کہ والدین کا درجہ بڑا بلند ہے، لیکن والدین میں بڑا درجہ ماں کا ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ سے صحابی نے پوچھا: یا رسول اللہ! والدین میں سے کس کا حق مجھ پر زیادہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''أُمُّكَ''۔ اس صحابی نے عرض کیا: اس کے بعد؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''أُمُّكَ''۔ اس صحابی نے پھر عرض کیا، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''أُمُّكَ''۔ اس صحابی نے پھر عرض کیا: اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ثُمَّ أَبَاكَ''۔

چوتھے نمبر پر تیرے باپ کا حق آتا ہے۔ سب سے زیادہ تجھ پر حق ماں کا ہے؛ کیونکہ ماں نے تکلیفیں بھی برداشت کی ہیں: ایک حمل کی تکلیف کہ تمہیں نو ماہ تک اپنے پیٹ میں سنبھالے رکھا اور تیرا بوجھ برداشت کیا۔ اگر آپ نے تجربہ کرنا ہو تو ایک اینٹ کو سر پر رکھ کر کچھ فاصلہ طے کر کے دیکھ لیں، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ عورت کو کتنی مشقت ہوتی ہے؟ اور اسی حالت کے اندر عورت باورچی خانہ میں بھی جائے گی، آگ بھی جلائے گی، گھر کی صفائی بھی کرے گی، شوہر کے کپڑے بھی استری کرے گی اور اس کی تمام خدمات بھی کرے گی۔ اس لیے فرمایا: ﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾ کہ ایک عورت کو طلاق دے دی، اب اس سے بچہ نہ چھینو۔

والد کے بعد وارث پر بچہ کا خرچہ ہے:

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ﴾ ایک آدمی کا بچہ ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا، عدت بھی گزر گئی، لیکن بچہ موجود ہے تو اب بچے کا خرچہ کون دے گا؟ جبکہ باپ مر گیا تو اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا کہ جیسے والد کے ذمہ اس بچے کا خرچہ تھا، والد کے وارث پر بھی اس کا خرچہ ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وارث سے مراد ذی رحم محرم ہے، یعنی جو اس کے قریبی رشتہ دار ہیں، مثلاً: بھائی، بہن ہیں۔ جیسے شریعت میں میراث ملے گی اسی حساب سے ان رشتہ داروں سے خرچہ لیا جائے گا۔ مثلاً: لڑکے کے دو روپے اور لڑکی کو ایک روپیہ ملا ہے تو لڑکے سے دو حصے خرچ لیں گے اور لڑکی سے ایک حصہ خرچہ لیں گے۔ اور وہ خرچہ اس وقت تک دیتے رہیں گے جب تک بچہ دودھ پیتا رہے گا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وارث سے مراد خود یہ بچہ ہے۔ ان کی بھی یہ بات ٹھیک ہے، لیکن اگر جائیداد ہی نہ ہو، بچہ غریب ہو تو پھر خرچہ کون دے گا؟ (پھر خرچہ حکومت دے گی۔)

﴿فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ﴾ جہاں میاں بیوی میں جھگڑا نہ ہو وہاں یہ صورتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ یہ صورتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں...... اللہ نہ کرے...... عورت کو طلاق ہوگئی، عدت گزر گئی۔ عورت کہتی ہے کہ ہم مشورہ کرلیں کہ سال دودھ پلانے کے بعد وہ دوسری چیزوں پر گزارہ کرلے؛ کیونکہ تمہارا بیٹا ہے، مجھے طلاق ہوگئی ہے، میں دوسری جگہ شادی کر رہی ہوں اور دوسرا گھر والا تمہاری اولاد کو برداشت نہیں کرتا۔ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو دونوں مشورہ کرلیں اور مدت حولین سے پہلے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، وہ ایسا کر سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ دونوں اس پر راضی ہوں اور یہ بھی ضروری ہے کہ بچے کو بھی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ اللہ تعالیٰ جب ماں کو نقصان نہیں دینا چاہتا، باپ کو نقصان نہیں دینا چاہتے تو اس بچے کو بھی نقصان نہ پہنچے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰي يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۳۴،۲۳۵]

''اور تم میں سے جو لوگ فوت ہوں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ عورتیں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن انتظار میں رکھیں۔ پھر جب وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے حق میں دستور کے مطابق کریں۔ اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔ اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان عورتوں کا پیغامِ نکاح اشارہ میں کہو، یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے، لیکن ان سے چھپ کر (نکاح) وعدہ نہ کرو، مگر یہی کہ رواجِ شریعت کے مطابق کوئی بات کہہ دو۔ اور نکاح کا ارادہ نہ کرو، حتیٰ کہ عدت اپنی انتہاء کو پہنچ جائے۔ اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، پس اس سے ڈرتے رہو۔ اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے۔''

ان آیات میں عدتِ وفات کا ذکر ہے، جبکہ سابقہ آیات میں عدتِ حیات کا بیان تھا۔

متوفیٰ عنہا زوجہا کی عدت:

ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ عورت چار مہینے اور دس دن عدت گزارے۔ اگر خاوند کے علاوہ اور کوئی رشتہ ہے، مثلاً: کسی کا باپ فوت ہو گیا، ماں فوت ہو گئی، بہن فوت ہو گئی یا بیٹا فوت ہو گیا...... کیونکہ موت و حیات تو لازم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نظام تو چلے گا...... تو خاوند کے علاوہ باقی کے لیے صرف تین دن عدت ہے۔ تین دن کے بعد شریعت کے اندر اجازت نہیں ہے کہ آدمی بلا وجہ اپنے آپ کو سوگ کی حالت میں رکھے۔ جب تین دن گزر گئے تو سوگ ختم ہو گیا۔ لیکن اگر عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو صرف عورت پر چار مہینے اور دس دن عدت ہو گی کہ وہ اس عرصہ میں کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔

ایک عورت کا خاوند چاندرات فوت ہوا تو اب عورت چار مہینے اور دس دن عدت گزارے گی، مہینہ چاہے تیس کا آ گیا یا انتیس کا آ گیا، وہ چار مہینے اور دس دن مزید۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا خاوند چاندرات فوت ہوا۔ لیکن اگر وہ چاندرات نہیں تھی، کسی اور تاریخ میں فوت ہوا تو ہر مہینہ تیس کا شمار کیا جائے گا۔ زمانہ جاہلیت میں یہ رواج ہوتا تھا کہ اگر عورت کا خاوند فوت ہو جاتا تو اس عورت کو دور کمرے میں پھینک دیتے تھے اور وہ سیاہ لباس پہن لیتی تھی اور اسی حالت میں وہ عورت پورا ایک سال گزارتی تھی۔ نہ اس کے پاس کوئی آتا تھا اور نہ کوئی جاتا تھا۔ کوئی چھوٹا بچہ جا کر اس کو کھانا دے آتا اور وہ عورت اسی طرح پڑی رہتی تھی۔ جب ایک سال کی مدت گزر جاتی تھی تو ان کے پاک ہونے کا طریقہ یہ تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں عورتیں بدن پر ڈالتی تھیں اور بکری جانور وغیرہ کو کھلاتے تھے اور اس کے بعد عورت غسل کرتی اور سمجھا جاتا تھا کہ اب وہ عدت سے نکل گئی ہے۔

ابتدائے اسلام میں ایک سال کا بھی حکم آیا کہ عدتِ وفات ایک سال ہے، لیکن یہ نہیں کہ عورت کو علیحدہ کوٹھڑی میں ڈال دیا جائے۔ وہ بھی انسان ہے، تمہارے ساتھ رہے گی، لیکن اسلام نے رعایت فرما دی تو یہ آیت پہلے والے حکم کے لیے ناسخ ہوگئی، حالانکہ وہ آیت باعتبار قراءت کے متاخر ہے اور چار مہینے دس دن والی آیت باعتبار قراءت کے متقدم ہے، لیکن اس آیت کے لیے ناسخ ہے؛ کیونکہ ترتیب نزول علیحدہ ہے اور ترتیب قراءت علیحدہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات دماغ میں رکھ لیں کہ یہ دونوں ترتیبیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرے پاک نبی کو فرما دیں کہ فلاں آیت کو فلاں سورت میں رکھیں اور فلاں سورت فلاں سورت کے بعد ہوگی۔ یہ ساری ترتیب اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، کسی کی ذاتی منشا سے نہیں ہے۔

بعض روافض اور فرق باطلہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھو! اہل سنت والجماعت کا قرآن ہی الٹ ہو گیا ہے۔ پہلی سورت تو تھی ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ①﴾ [العلق:۱] اور یہ پڑھتے ہیں: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ①﴾ [الفاتحہ:۱]۔ انہوں نے ...... نعوذ باللہ...... قرآن کو خود الٹ دیا ہے، قرآن کو بدل دیا ہے۔ حالانکہ یہ جہالت ہے۔ نزول علیحدہ چیز ہے، ترتیب قراءت علیحدہ چیز ہے۔ اور دونوں کا حکم دینے والا رب العالمین ہے۔ اسی طرح اسی ترتیب سے میرے مدنی پاک ﷺ نے اپنی زندگی میں قرآن پڑھا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی ترتیب سے پڑھا اور آج چودہ سو سال کے بعد وہ اسی ترتیب سے محفوظ ہے۔ دونوں چیزیں حکم خداوندی سے ہیں۔ اس میں نہ کسی بندے کا دخل ہے اور نہ کسی کی رائے کا دخل ہے۔

عدت کے مسائل:

عدت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ عورت چار مہینے دس دن اپنے خاوند کے گھر سے باہر نہیں جائے گی اور خاص طور پر تو رات کو کسی حالت میں بھی نہیں نکلے گی۔ اگر کوئی مجبوری ہے کہ بیماری ہوگئی، کوئی عذر آ گیا تو دن میں مجبوراً خاوند کے گھر سے باہر جاسکتی ہے، لیکن رات میں وہ کسی شکل میں باہر نہیں رہ سکتی۔ چار مہینے دس دن اس نے اپنے خاوند کے گھر میں گزارنے ہیں۔ وہ ان دنوں میں میک اپ بھی نہیں کرے گی، کوئی شوخ کپڑے بھی نہیں پہنے گی، سرمہ بھی نہیں لگائے گی، کاجل بھی نہیں لگائے گی اور وہ دوائی جو آنکھوں کی زینت کا باعث بنے وہ بھی استعمال نہیں کرے گی۔

جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ ایک عورت نے آ کر حضور اکرم ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! میری بیٹی بیوہ ہوگئی ہے اور اس کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ مجھے اجازت ہے کہ آنکھوں میں دوائی لوں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا جاہلیت کا زمانہ بھول گیا کہ ایک سال تک عورت پڑی رہتی تھی، کوئی اس کی شکل بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے مہربانی کردی ہے تو دوا کے بہانے سے تم زینت بنانا چاہتی ہو؟ حضور اکرم ﷺ نے اس کو اجازت نہ دی۔

ہاں اگر کوئی عورت بیمار ہوگئی، اس کی آنکھیں خراب ہوگئیں، کوئی ایسی دوائی ڈالی جو حسن کا ذریعہ نہیں بنتی تو اس کو آنکھ میں ڈالنا جائز ہے، لیکن عورت عدت کے اندر کوئی ایسا عمل نہیں کرے گی جو اس کے سنگھار اور فیشن کا ذریعہ بنے۔

عدت میں رکھنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ فرمادیتے ہیں کہ جب کسی عورت کے رحم میں نطفہ ٹھہر جائے تو وہ نطفہ سب سے پہلے استقرار پکڑتا ہے، اس کے بعد وہ علقہ بنتا ہے، پھر وہ مضغہ بنتا ہے اور پھر نفخ روح ہوتی ہے۔ چار مہینے کے بعد نفخِ روح ہوجاتی ہے تو لازمی بات ہے کہ روح والی چیز حرکت کرے گی۔ اس عدت سے واضح ہوجاتا ہے کہ حمل ہے یا نہیں ہے؟ اب حمل میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ اگر عورت خاوند کے مرنے کے فوراً بعد دوسری شادی کرلیتی ہے تو ممکن تھا کہ پہلے شوہر کا نطفہ ٹھہر چکا ہو اور وہ حاملہ ہو۔ اور ان کی عدت وضع حمل ہوتی ہے۔

اگر عورت حاملہ تھی اور خاوند فوت ہوگیا اور مثلاً: ایک ماہ کے بعد وضع حمل ہوگیا تو اس عورت کی عدت ختم ہوگئی اور اگر عورت کو ایک مہینہ کا حمل تھا، خاوند فوت ہوگیا تو اس کو وضع حمل تک چاہے جتنے مہینے لگیں عدت گزارے گی؛ کیونکہ نطفہ شوہر کا پیٹ میں موجود ہے۔ جب تک عورت کے رحم کی صفائی نطفہ اوّل سے نہ ہوجائے وہ کسی دوسری

جگہ شادی نہیں کر سکتی۔ اس لیے اسلام نے عدت کا حکم عطا فرمایا ہے۔

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ عدت گزرنے کے بعد عورت غسل کرے، تیل لگائے، سرمہ ڈالے اور اچھے کپڑے پہنے، تاکہ اس کو اور رشتہ کے لیے پیغام آئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ دوسری جگہ شادی کرنا چاہتی ہے تو اس کو کرنے دو، لیکن بھلائی اور بہتری کے طریقے سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر وہ عورت کوئی اسلام کے خلاف حرکت کرے تو تم پر بھی گناہ ہوگا اور اگر وہ دوسرے نکاح کے لیے بنتی سنورتی ہے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، لیکن اگر عدت کے دوران کوئی ایسا کام کرے تو اس پر گناہ ہوگا۔

تقویٰ اختیار کرو:

فقہاء کرام نے اس سے ایک یہ بھی مسئلہ نکالا ہے کہ مثلاً: تم چار ساتھی ہو۔ ایک مکان کرائے پر مشترک لیا ہوا ہے۔ اب تین آدمی کہتے ہیں: جب ہم کام سے واپس آئیں گے تو فلم لائیں گے۔ چوتھا کہے کہ دوست ہیں، اب ان سے کیا مغز ماری کرنی ہے؟ اور وہ کہے: میں نہیں دیکھتا۔ دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا اور دوسرے ساتھیوں کو منع نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ برابر کا مجرم ہے کہ یہ ان کے اس گناہ پر راضی ہے اور چپ ہے۔ باقی یہ سوچنا کہ ہم چار ساتھی ہیں، مجھے اس طرح کرایہ کم پڑتا ہے، کھانے کے پیسے کم ادا کرنے پڑتے ہیں، ان باتوں میں نہ جائیں۔ رزق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق: ۲، ۳] جو مجھ سے ڈرتا ہے اور میرے دین کے لیے تکلیفیں بھی برداشت کرتا ہے ہم اس کو ایسی جگہ سے رزق دیں گے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوگا۔ ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ [الطلاق: ۳] اور جو اللہ تعالیٰ پر توکل رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی ان کے لیے کافی ہوتا ہے۔

عدت کے دوران نکاح کرنا جائز نہیں ہے:

ایک عورت بیوہ ہوگئی، ابھی وہ عدت کے اندر ہے۔ شریعت میں عدت کے اندر دوسرا نکاح نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اسلام نے یہ بھی منع فرما دیا کہ جب وہ عدت میں ہے تو عدت کے اندر تم اس کو کوئی نکاح کا کھل کر پیغام بھی نہ دے اور کوئی وعدہ بھی نہ کرو؛ کیونکہ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی عورت بیوہ ہوگئی۔ تمہارے دل میں یہ خیال ہے کہ عدت کے بعد اس سے شادی کرلوں تو کنایۃً اس سے رشتہ کی تم بات کر سکتے ہو کہ تم

کہہ دو کہ مجھے بھی اچھی اور نیک بیوی کی تلاش ہے۔ دعا کرو! اللہ تعالیٰ میرے لیے بھی آسانی پیدا کر دے۔ اس سے عورت سمجھ جائے گی، لیکن کھل کر بات کہنا منع ہے۔ اس عدت کے اندر یہ بھی سبق ہے کہ اگر کوئی عورت پہلے شوہر کے احسانات کے باوجود چار مہینے دس دن صبر نہیں کر سکی تو تم بھی جان لو کہ یہ عورت تمہارے ساتھ بھی کوئی وفا نہیں کرے گی۔

تعریض دوطرفہ بات کو کہتے ہیں، بالکل واضح نہ ہو کہ میں تم سے شادی کروں گا، بلکہ کہو کہ میرا شادی کا ارادہ ہے۔ اللہ کرے کوئی مناسب رشتہ مل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم نے دل میں چھپایا ہوا کہ فلاں شریف اور پڑھی لکھی عورت ہے، نوجوان ہے اور اس کی عدت کے بعد اس سے خطبہ کروں گا تو یہ دل میں رکھنا منع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں جانتا ہوں کہ جو بات تم دل میں چھپائے ہوئے ہو وہ تم اس سے ضرور کرو گے، لیکن خبردار! اس سے کوئی چوری چھپے وعدہ بھی نہ کرو اور اس سے کھل کر کوئی نکاح کی بات نہ کرو جب تک کہ اس کی عدت گزر نہ جائے۔

اس سے ہمیں یہ بھی سبق ملا کہ اگر عورت بیوہ ہو جائے تو یہ ہندوؤں کی رسم تھی کہ وہ اس کی دوسری شادی نہیں کرتے تھے۔ اور ہندوؤں میں آج تک بھی یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ اگر عورت کا خاوند مر جائے تو عورت باقی ساری زندگی بغیر خاوند کے گزارتی ہے، بلکہ بعض ہندو قبائل میں یہ بھی بری عادت ہے کہ عورت کو ''ستی'' ہونا کہتے ہیں کہ اگر عورت کا خاوند مر جائے تو وہ عورت کو بھی ساتھ ایک چتا میں رکھ کر دونوں جلا دیتے ہیں کہ جب اس کا خاوند مر گیا ہے تو اب عورت کو زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟ اس لیے وہ اس رسم کو ''ستی'' یعنی جل جلانا کہتے ہیں۔ اس لیے کسی نے کہا:

؎ دوستی میں دو ستی ہوتے ہیں دل
تب جا کر بنتی ہے دوستی

دوستی کا معنیٰ صرف یہ نہیں ہوتا کہ زبانی کلامی کھانے پینے کا دوست ہو، بلکہ دوست تو دوستوں کے لیے قربانیاں دیتے ہیں، تب کہیں دوست کہلانے کا حق بنتا ہے۔

بیوہ عورت کی جلدی شادی کر دو:

آج مسلمانوں کے اندر بھی یہ بیماری عام ہے کہ بیوہ عورت سے پہلے تو کوئی شادی نہیں کرتا۔ ان کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ پہلے شوہر کو کھا گئی ہے، اب اگر ہم شادی کریں گے تو ہمارا کیا حشر کرے گی؟ اگر اسی طرح عورتوں کے ذمہ

...کوئی کسی کو زندہ نہ رہے۔ یاد رکھیں اس کی کے ہاتھ میں موت و حیات نہیں اللہ ...
مار سکتی ہے اور نہ مرد کسی کو مار سکتا ہے۔ موت و حیات کی گھڑی متعین ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک عورت نے بیس
سال کی عمر میں شادی کی اور دو سال کے بعد خاوند فوت ہو گیا یا ایک مہینہ کے بعد خاوند فوت ہو گیا تو اب بیس سال کی
نوجوان عورت بغیر شوہر کے بیٹھی رہے تو لازمی بات ہے کہ پھر گناہ پیدا ہوں گے، معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو گا۔ اور
اگر شادی ہو جائے تو...... الحمد للہ...... وہ اپنے گھر میں آباد ہو گی۔

یہی وہ حکمت تھی کہ میرے آقا سرکار مدینہ ﷺ نے جو سب سے پہلے شادی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کی تھی وہ بیوہ
تھیں اور حضور اکرم ﷺ کا عین شباب تھا۔ ورنہ مکہ کی کوئی سی لڑکی اور کوئی گھرانہ ایسا نہیں تھا جو میرے پاک
نبی ﷺ کو رشتہ نہ دیتا ہو، لیکن اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے عمل کو قیامت
تک کے لیے زندہ رکھنا تھا، اس لیے حضور اکرم ﷺ کا پہلا نکاح ہی بیوہ سے ہوا، بلکہ حضور اکرم ﷺ کے اکثر
نکاح بیوہ عورتوں سے ہوئے ہیں، کنواری عورت صرف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ اس کے اندر حکمتیں تھیں۔
اگر ہم آج بھی اسلام کے احکام پر عمل کریں تو یہ معاشرہ فساد سے بچ سکتا ہے۔

﴿وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا﴾ تم بیوہ سے چوری چھپے باتیں نہ کرو، چوری چھپے وعدے نہ کرو: کیونکہ جب تم ایسی
باتیں کرو گے تو لازمی بات ہے کہ آدمی اس میں واقع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى﴾
[الاسراء: ۳۲] کہ زنا کے قریب مت جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ زنا نہ کرو: کیونکہ جب آدمی قریب جائے گا تو واقع ہونے کا
زیادہ اندیشہ ہے اور جب آدمی قریب ہی نہیں جائے گا تو لازمی بات ہے کہ اس سے بچ جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ
نے اس کی مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک چراگاہ سے مالک نے روکا ہوا ہے۔ اگر تم اپنی بکریاں اور جانور چراگاہ کے
قریب چراؤ گے تو کسی وقت جانور چراگاہ کے اندر پڑ جائے گا، لیکن اگر تم اس چراگاہ سے دور رہو گے تو خطرہ نہیں
ہوگا کہ تمہارا جانور اس چراگاہ میں چلا جائے۔ اس لیے اسلام نے جوان عورت کے ساتھ علیحدہ بیٹھنے سے منع فرمایا:
کیونکہ جب غیر عورت اور مرد اکٹھے بیٹھے ہوں تو تیسرا شیطان داخل ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر تم غیر محرم عورتوں سے
باتیں کر رہے ہو، غیر محرم عورتوں کے ساتھ سفر کر رہے ہو اور باہر کسی ملک میں تفریح کے لیے جا رہے ہو تو جب قرب
کے مواقع پیدا ہوں گے تو فتنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے اسلام نے حکم دے دیا کہ غیر محرم عورت کے ساتھ
...

محرم کے ساتھ بے تکلفی نہ کرو اور کسی کے ساتھ ایسی بات نہ کرو کہ دلوں کے اندر کھوٹ پیدا ہو جائے۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ﴾ عدت کے دوران کوئی عقد نکاح نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ یعنی چار مہینے اور دس دن جب تک نہ گزریں اس وقت تک اس عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔

گناہ ہو جائے تو توبہ کرلو:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ: ۲۳۵] یعنی تم لوگوں کو تو دھوکہ دے سکتے ہو، لیکن اپنے خالق اور مالک کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اس کو تو تمہارے دلوں کے اندر جو بات ہے اس کا پتہ ہے، اس لیے اس سے ڈرو۔ اور اگر کوئی غلطی ہو جائے تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والے بھی اور مہربانی والے بھی ہیں۔ وہ اپنے بندوں کو ان کے گناہوں پر فوراً سزا نہیں دیتے، بلکہ مہلت دیتے ہیں، تاکہ بندہ توبہ کر لے۔ یہ بھی شیطان کا لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے ہٹانے کا ایک طریقہ ہے کہ اگر...... خدا نہ کرے...... کسی بندے سے زنا ہو گیا، یا کسی بندے نے شراب پی لی، اب شیطان دماغ کے اندر یہ بات بٹھاتا ہے کہ تم اس وقت تک ایک شریف انسان تھے اور نیک آدمی تھے جب تک تم نے یہ گناہ نہیں کیا تھا۔ اب تم نے یہ گناہ کر لیا ہے، اب ایک گناہ کرو تو برابر ہے اور لاکھ کرو تو برابر ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری رحمت کے دروازے بند نہیں ہو گئے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایک دفعہ گناہ کر لیا تو ہمیشہ گناہ کرتے رہو۔ ایک دفعہ تم کنویں میں گر گئے تو اب ہمیشہ اسی میں اپنے آپ کو گراتے رہو۔ ایک دفعہ تم آگ میں جا پڑے ہو تو اب ہمیشہ اپنے آپ کو آگ میں ڈالتے رہو، بلکہ تم یہ یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمانے والے ہیں، اللہ تعالیٰ حلیم بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ رحیم بھی ہیں۔

اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم کا اندازہ کر لیں کہ ملازم سے ایک غلطی بھی ہو جائے تو مالک اس سے کہتا ہے: خبردار! اگر تم نے پھر غلطی کی تو میں تمہیں نوکری سے نکال دوں گا، تمہاری تنخواہ کاٹ لوں گا۔ لیکن اس کریم کا حال دیکھیں کہ ستر سال بھی زندگی گناہ میں گزر جائے، رو کر اس کے دروازے پر پڑ جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں معاف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ پھر بھی اگر کوئی آدمی خود بخود اپنے آپ کو جہنم میں ڈالے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

یاد رکھیں! توبہ کا دروازہ اس وقت بند ہوگا جب سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا، یا بندے کی جب

موت کا وقت آتا ہے اور غرغرہ کا وقت آجاتا ہے اس وقت اگر کوئی توبہ کرے تو اس کی توبہ فائدہ نہیں پہنچاتی۔ خاص طور پر نوجوان بھائی یاد رکھیں کہ اصل توبہ جوانی کی ہے، ورنہ بڑھاپے میں جانے کے بعد ہر آدمی کچھ نہ کچھ توبہ کرہی لیتا ہے؛ کیونکہ تین سو ساٹھ جوڑ ہے کھانے کے بعد بلی حج پر جاتی ہے۔ جب آدمی کے چلنے کی قوتیں ختم ہوگئیں تو اس وقت کیا منہ کالا کرے گا؟ پھر تو لازمی بات ہے کہ مسجد کا رخ کرے گا؛ کیونکہ گھر والے تو بیٹھنے نہیں دیتے۔

متوفیٰ عنہا زوجُھا کا حکم مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں کو ہے۔ اس پر سب سے بڑی دلیل یہ آیت مبارکہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی، بلکہ آیت مطلق ہے۔ اور یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ سب عورتوں کے خاوند فوت ہو جانے پر عدت چار مہینے دس دن گزارنی ہوگی، لیکن علماء کرام نے اس میں ذرا تفصیل فرمائی ہے کہ اگر خاوند چاند رات میں فوت ہوگیا تو اب چار مہینے دس دن گزارے گی، چاہے مہینہ انتیس کا ہو یا تیس کا ہو، اور اگر خاوند چاند رات کو فوت نہیں ہوا تو ہر مہینہ تیس دن کا شمار کر کے ٹھیک ایک سو تیس دن پورے کرے گی۔

حدیث: مسند احمد کی روایت ہے اور امام ترمذی نے اس کی تصحیح فرمائی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی نے شادی کی اور وہ مرگیا، اس نے دخول بھی نہیں کیا اور نہ اس نے مہر مقرر کیا تھا۔ کئی دفعہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے جاتے رہے کہ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: اس مسئلے میں اب میں اجتہاد سے بات کہتا ہوں "فَإِنْ كَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ" اگر میرا فتویٰ درست ہے تو یوں سمجھو کہ یہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت فرمادی اور اگر میں اس غلطی کروں تو یہ میری غلطی ہے۔ چونکہ برائی کی نسبت شیطان کی طرف ہوتی ہے اور شیطان نے مجھے غلطی میں ڈالا ہے۔ اللہ تعالیٰ غلطی سے پاک ہیں، اللہ کے نبی معصوم ہیں، لہٰذا جو خطا ہوگئی وہ میری ہوگی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: اس مسئلے کے اندر میرا اجتہاد یہ ہے کہ اس عورت کا حق مہر مثلی دیا جائے اور اس میں نہ کمی کی جائے اور نہ زیادتی کی جائے۔ اور عورت پر لازم ہے کہ وہ چار مہینے دس دن عدت گزارے اور عورت کے لیے میراث بھی ہوگی۔ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ میں نے خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فیصلہ بردہ بنت واشق کے بارے میں کیا تھا۔ اس کا بھی نکاح ہوگیا تھا، اس کا خاوند فوت ہوگیا اور وہ غیر مدخولہ تھیں تو اس کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ فرمایا تھا جو آپ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بے انتہاء خوش ہوئے۔ اسلام لانے کے بعد ان کو اتنی کبھی خوشی نہ ہوئی تھی جتنی اس فیصلہ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہونے پر خوشی ہوئی تھی۔ ...... الحمد

للہ...... اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وہ فیصلہ کرایا جو اللہ کے نبی کا فیصلہ ہے۔

حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہے:

مفسر فرماتے ہیں: یہ آیت عام ہے۔ اس سے صرف وہ عورت نکلے گی جو حاملہ ہو۔ اس کا خاوند مر گیا تو اس کی عدت کا مسئلہ علیحدہ ہے۔ قرآن میں ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ط﴾ [الطلاق: ۴] حمل والی عورتوں کی مدت وضعِ حمل ہے۔ مفسر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی شان! ہوسکتا ہے کہ ایک گھنٹہ کے بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو جائے تو اس کی عدت ختم ہو جائے گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا تو اس کی عدت چار ماہ دس دن تھی۔ اب اگر وہ عورت حاملہ ہے تو وہ فرماتے تھے کہ اس کی عدت اَبْعَدُ الْاَجَلَیْن بنے گی، یعنی اگر وضع حمل دو ماہ کے بعد ہو گیا تو عدت چار ماہ دس دن گزارے گی؛ کیونکہ وہ ابعد الاجلین ہے۔ اور اگر حاملہ ہے اور وضع حمل میں چھ مہینے باقی ہیں تو پھر وضع حمل کا انتظار کرے گی۔ مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بات بہت اعلیٰ ہے اور بڑی دل کو لگنے والی ہے اور دونوں قرآن کی آیت کو جمع کرنے والی بھی ہے۔

لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ حدیث مبارک میں اس کے خلاف موجود ہے۔ صحیحین کے اندر ہے کہ صبیعہ اسلمیہ تھی۔ اس کے خاوند سعد بن خولہ فوت ہو گئے۔ یہ عورت حاملہ تھی۔ تھوڑی مدت گزری تھی کہ اس کو وضع حمل ہو گیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ چند راتیں گزریں، اس کو وضع حمل ہو گیا۔ جب وہ نفاس سے پاک ہو گئی، اس عورت نے غسل کیا، اچھے کپڑے پہنے، تیار ہو گئی، تاکہ مجھے کوئی نکاح کے لیے خطبہ کرے۔ اس کے ایک عزیز تھے، انہوں نے دیکھ کر فرمایا: میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ تم بڑی بن سنوری بیٹھی ہو، تم کیا نکاح کرنا چاہتی ہو؟ خدا کی قسم! تم نکاح نہیں کرسکتی جب تک کہ چار مہینے اور دس دن نہ گزریں، ابھی تمہاری عدت پوری نہیں ہوئی ہے۔ بی بی فرماتی ہیں: جب انہوں نے مجھے یہ کہا تو میں نے اپنے کپڑے اکٹھے کیے، یعنی برقعہ پہنا، لباس پہنا۔ جب شام کا وقت ہوا تو میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور عرض کیا کہ میرا وضع حمل ہو گیا، لیکن ابو السنابل فرماتے ہیں کہ تم چار مہینے اور دس دن عدت گزارو۔ میرے بارے میں کیا حکم ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب وضعِ حمل ہو گیا تو تم حلال ہو گئیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اب تم چاہو تو شادی بھی کرسکتی ہو؛ کیونکہ تمہاری عدت پوری ہو چکی ہے۔

دین ایمان اتنا اہم ہے کہ اس کے اندر کوئی شرم نہیں۔ اب دیکھیں! عورت کا خاوند فوت ہو گیا، وضع حمل ہو گیا تو عورت نے تیاری کی، تا کہ مجھے پیغام آئے، تا کہ میں نکاح کروں۔ دوسرے آدمی کو جب پتہ چلا تو اس نے بھی شریعت کا حکم سنایا کہ ابھی چار مہینے دس دن نہیں گزرے، لہٰذا تم کیسے نکاح کے لیے تیار ہو رہی ہو؟ تو اب بی بی نے فوراً حضور اکرم ﷺ کے پاس آ کر مسئلہ پوچھا۔ وہ لوگ دین پر اتنے پکے تھے، اس میں کوئی شرم نہیں تھی۔ اب اللہ تعالیٰ معاف کرے کہ گناہ ہوتے رہیں، زنا ہوتے رہیں، لیکن برادری کا رسم و رواج رہ جائے۔ بیوہ عورتیں نکاح نہیں کریں گی، ان کی زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّآ أَنْ يَّعْفُوْنَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوْٓا أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۳۶، ۲۳۷]

’’تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب تک کہ ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو یا ان کے لیے کچھ حق مہر مقرر نہ کیا ہو۔ اور ان کو خرچ دو وسعت والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق۔ جو خرچ دستور کے موافق ہے، نیکی کرنے والوں پر لازم ہے۔ اور اگر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی اور ان کے لیے حق مہر مقرر کر چکے تھے تو جو ٹھہرایا تھا اس کا آدھا مہر لازم ہوگا، مگر یہ کہ عورتیں معاف کر دیں یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے معاف کر دے۔ اور تم مرد درگزر کرو تو (یہ) پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔ اور آپس میں احسان کرنا نہ بھولو۔ بے شک جو کچھ تم کرتے ہو اللہ دیکھتا ہے۔‘‘

ربطِ آیات:

عدتِ طلاق بھی پڑھ چکے ہیں اور عدت وفات بھی پڑھ چکے ہیں۔ اب ان آیات میں بقیہ مسائل کا ذکر ہے۔

علماء فرماتے ہیں: عام طور پر چند صورتیں ہوتی ہیں:

1 ایک آدمی کا نکاح ہوا اور اس کے ساتھ حق المہر بھی معین ہوگیا۔ عورت کی رخصتی ہوکر میاں کے گھر میں بھی آگئی، میاں بیوی بحیثیت میاں بیوی بھی رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد طلاق ہوگئی۔

2 نکاح ہوگیا، حق المہر بھی معین ہے، لیکن عورت کی رخصتی نہیں ہوئی، دخول نہیں ہوا اور طلاق ہوگئی۔

3 نکاح ہوگیا، حق المہر معین نہیں ہوا اور اس کے بعد طلاق ہوگئی۔

ان آیات مبارکہ میں پہلے اس صورت کا ذکر ہے کہ نکاح ہوا، میاں بیوی ابھی نہیں ملے، حق المہر بھی معین نہیں تھا اور طلاق ہوگئی تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان کو کچھ نہ کچھ تم نفع پہنچاؤ۔ اب نفع پہنچانے کی صورت یہ ہوئی: ﴿عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ﴾ اگر امیر آدمی ہے تو اپنی حیثیت سے کچھ دے دے، جوڑا کپڑے وغیرہ۔ اور اگر غریب ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق دے دے، مثلاً: ایک جوڑا دے دیا۔ فرمایا: یہ جو کچھ دینا ہے تم بھلائی کے ساتھ دے دو، بغیر کسی دعوے کے دو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ جو ہم نے کہا ہے ان لوگوں پر واجب ہے جو احسان کرنے والے بھلائی کرنے والے ہیں۔

اس سے مسئلہ نکلا کہ اگر ایک آدمی کا نکاح ہوا، لیکن ابھی عورت خاوند کے گھر میں نہیں اور میاں بیوی کا آپس میں ملاپ بھی نہیں ہوا اور طلاق ہوگئی تو اس کی کوئی عدت نہیں ہے، لیکن اس کا مہر معین تھا تو اب آدھا حق المہر ادا کرے گا۔

دوسری صورت: ﴿اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ﴾ ہاں ایک صورت یہ ہے کہ تم نے حق المہر مقرر کیا تھا اور نکاح بھی ہوگیا، لیکن میاں بیوی نہیں ملے اور طلاق ہوگئی۔ اب عورت کہتی ہے کہ میں آدھا حق المہر بھی نہیں لیتی ہوں تو اس کی اپنی خوشی ہے۔ یا وہ معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کی کنجی ہے (مرد)؛ کیونکہ قبول بھی اس نے کرنا ہے اور طلاق بھی اسی نے دینی ہے۔ مرد کے معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ذمہ اصل میں آدھا حق المہر تھا، لیکن وہ کہے کہ میں پورا حق المہر دوں گا۔

﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ﴾ آپس میں بھلائی کے کام کو مت بھولو۔ یعنی اگر عورت معاف کرے بھلے کی بات ہے۔ اور اگر مرد پورا حق مہر دے تو یہ مرد کی بھلائی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دونوں چاہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کریں، ان میں جو بھلائی میں سبقت کرے گا اس کو زیادہ ثواب ہوگا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٧﴾﴾ [البقرۃ: ۲۳۷] یعنی ہر عمل اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے۔ اگر تو نے پورا حق المہر ادا کردیا اور تیری نیت بھلائی ہے، اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، وہ تجھے اس کا بدلہ دیں گے۔ اور عورت کا حق بنتا تھا کہ تجھ

سے آدھا حق المہر لے، لیکن اس نے معاف کر دیا تو یہ اس کی طرف سے بھلائی کی بات ہے۔

تیسری صورت: یہ ہے کہ عورت کے ساتھ نکاح ہوا حق المہر متعین نہیں ہے اور وہ عورت اپنے خاوند کے گھر میں بھی آ گئی، میاں بیوی بھی مل گئے، اس کے بعد خاوند نے طلاق دے دی۔ اب خاوند مکمل حق المہر دے گا، جیسا کہ اس خاندان کی دیگر لڑکیوں کا مہر ہوگا، یعنی وہ مہر مثل ادا کرے گا۔

چوتھی صورت: نکاح ہو گیا، مہر بھی معین ہے، میاں بیوی ملے نہیں ہیں، لیکن ایک ایسے خالی کمرے میں آ کر بیٹھ گئے، کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا اور پردے بھی گرا دیئے، یعنی ان کو ملنے سے روکنے والا نہیں ہے، لیکن بیٹھے ہیں، ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے اور ایک دوسرے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ خاوند نے طلاق دے دی۔ اس صورت میں خاوند کو پورا حق مہر دے گا۔

یہ چار صورتیں ہیں: دو کا ذکر یہاں ہے، تیسری کا ذکر سورۃ النسا میں ہے اور چوتھی صورت کا ذکر احادیث صحیحہ میں ہے، جو...... ان شاء اللہ...... آگے آ رہی ہے۔

''غیر مدخول بہا جس کا حق مہر مقرر نہ ہو'' کا حکم:

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نکاح کے بعد اگرچہ دخول نہ ہوا ہو خاوند کو طلاق دینے کا حق ہے، بلکہ اگر اس نے حق المہر بھی ادا نہیں کیا، حق المہر بھی مقرر نہیں کیا پھر بھی طلاق کا اس کو حق ہے، وہ اس طلاق دے سکتا ہے۔

عورت کو کچھ دینے کی وجہ یہ ہے کہ عورت کے دل میں تمنا تھی کہ یہ میرا خاوند ہے، مجھے حق المہر دے گا، میں اس کے گھر میں آباد رہوں گی، ہمارا گھر آباد ہوگا، لیکن قدرت کی بات ہے، آبادی نہ ملی، آخر اس کا دل ٹوٹ گیا اور بے چاری مطلقہ بھی بن گئی۔ مطلقہ بننے کے بعد رشتے ملنے مشکل ہو جاتے ہیں؛ کیونکہ جہاں بھی طلاق ہو...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... لوگوں کے دماغ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ ضرور لڑکی کا قصور ہوگا، حالانکہ طلاق مرد دے رہا ہے، لیکن مرد کے ذمہ کوئی قصور لگانے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کا دل ٹوٹ گیا، اس کو مطلقہ بننا پڑا، اس کو حق المہر بھی نہ ملا اور لوگوں میں باقاعدہ شہرت بھی ہو گئی کہ فلاں سے نکاح ہو گیا، اس لیے کم از کم اس کو کچھ دو، تاکہ اس کی دل جوئی ہو جائے۔ باقی کتنا دیا جائے؟ اگر امیر ہو تو اپنی طاقت کے مطابق دے اور اگر غریب ہے تو اپنی طاقت کے مطابق دے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَتِّعُوهُنَّ﴾ کہ کچھ نہ کچھ تو اس کو نفع پہنچاؤ۔ اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک خادم اس کو دے دو، یعنی عبد خرید کر کے اس کو دے دو۔ آگے اس کی مرضی ہے عبد کا مکاتب بنا کر قیمت حاصل کرے یا عبد کو آزاد کر کے شادی کرے۔ اور فرمایا: درمیانہ درجہ یہ ہے کہ چاندی کے کچھ سکے اور کچھ پیسے وغیرہ دے دو۔ اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ لباس دے دو۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: درمیانہ درجہ یہ ہے کہ اس کو بڑی اوڑھنے والی چادر، سر پر رکھنے کا دوپٹہ، ایک ملحفہ اور ایک بڑی چادر دے دو۔ کیونکہ پہلے زمانہ میں اکثر رواج چادروں کا تھا، اس دور میں شلوار وغیرہ کا استعمال بہت کم تھا۔ اس لیے ساری زندگی میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چادر استعمال فرمائی۔ شلوار کا خریدنا تو حدیث پاک میں موجود ہے، لیکن پہننے میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شلوار پہنی ہے۔ اور بعض میں ملتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شلوار خریدی تو ہے، لیکن پہننے کا موقع نہیں ملا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شلوار کو پسند فرمایا کہ شلوار بڑا اچھا لباس ہے۔ اس میں آدمی کا بدن محفوظ رہتا ہے۔

حضرت قاضی شریح رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کم از کم اس کو پانچ سو درہم دے دو۔ حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چاہے تو خادم دے دو، چاہے تو خرچہ دے دو اور چاہے تو لباس دے دو۔ حضرت حسن بن علی رحمہ اللہ نے اسی طرح نکاح فرمایا کہ حق المہر بھی مقرر نہیں تھی اور طلاق بھی ہوگئی تو آپ نے دس ہزار درہم دیئے۔

ایک آدمی کا ایک عورت سے نکاح ہوا۔ اس نے اس کو طلاق دے دی، لیکن ابھی وہ ملے بھی نہیں تھے اور حق المہر بھی مقرر نہیں تھا۔ قرآن پاک نے تو بطریق العموم فرما دیا کہ ان کو کچھ نہ کچھ نفع پہنچاؤ۔ امیر آدمی ہے تو اپنی طاقت کے مطابق اور غریب آدمی ہے تو اپنی طاقت کے مطابق نفع پہنچائے۔ کچھ اقوال امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر ان دونوں میں جھگڑا ہو گیا کہ عورت کہتی ہے: مجھے مہر دو۔ تو کم از کم نصف مہر مثل دے، یعنی اس کی جو باقی بہنیں ہیں مثلاً: ان کو ایک ہزار ملا ہے تو اس کو پانچ سو روپے اور اگر جھگڑا نہ ہو تو جتنی اس کو توفیق ہے دے دے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول جدید یہ ہے کہ خاوند پر جبر نہیں کیا جائے گا کہ اتنا دو۔ کم از کم اتنا دے جس پر متعہ کا اطلاق ہو جائے کہ یہ نفع ہے؛ کیونکہ قرآن پاک نے مطلقاً حکم دیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے یہ پسند ہے کہ کم از کم اتنا دے کہ جس میں نماز صحیح ہو جائے، یعنی تین کپڑے دے۔ اور قولِ قدیم یہ ہے کہ میں تو مقرر نہیں کر سکتا کہ خاوند اتنا دے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق فرمایا ہے، لیکن مناسب ہے کہ تیس درہم دے۔

بہر حال اگر ایک عورت کا نکاح ہو گیا حق المہر متعین نہیں تھا، ملاقات سے پہلے طلاق ہو گئی تو کچھ نہ کچھ دے دو۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن نے اس کی مقدار معین نہیں فرمائی۔ اس لیے اس کی مقدار کے اندر اختلاف ہے۔

مسئلہ:

﴿وَمَتِّعُوهُنَّ﴾ یہ حکم مطلقہ غیر مدخولہ کے لیے ہے، یا مطلقہ مدخولہ کے لیے ہے۔ بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ لفظ عام ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر آتا ہے: ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَي الْمُتَّقِيْنَ﴾ [البقرۃ:۲۴۱]۔ مطلقہ عورتوں کو خیر خواہی کے ساتھ کچھ نہ کچھ نفع پہنچائیں اور یہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں پر واجب ہے۔ اسی طرح جب اللہ پاک نے حضور اکرم ﷺ کو حکم دیا تو آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کو اللہ کے حکم کے مطابق یہ فرمایا تھا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ [الاحزاب:۲۸] اے میری بیویو! اگر تم دنیا کی زینت اور دنیا کا آرام چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ نہ کچھ دے دوں اور میں تمہیں خوش اسلوبی کے ساتھ فارغ کر دوں۔ حالانکہ وہ سب بیویاں تھیں، رخصتی ہو چکی تھی، لیکن وہاں بھی حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ﴿تَعَالَيْنَ﴾ اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے اور یہی قول حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا ہے، ابو العالیہ حضرت حسن بصری اور امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔

مفسر فرماتے ہیں: دوسرا قول یہ ہے کہ اگر عورت کو میاں کے چھونے سے پہلے طلاق ہوئی ہے، اس کو کچھ نہ کچھ دینا چاہیے۔ لیکن جو عورتیں مدخولہ ہو گئیں اور ان کو حق المہر بھی مل گیا، وہ خاوند سے فائدہ اٹھا چکی اور خاوند اس سے فائدہ اٹھا چکا تو ان کے لیے واجب نہیں۔ پہلی صورت کے اندر تو حسن خلق ہے کہ مدخولہ ہے یا غیر مدخولہ ہے، مفروض لھا ہے یا غیر مفروض لھا ہے، طلاق کے بعد بھی اس کو کپڑے یا کوئی ہدیہ دے کر عزت کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔ واجب صرف ان پر ہے جن عورتوں کو نکاح کے بعد طلاق ہو گئی، ابھی میاں بیوی نے ایک دوسرے کو چھوا نہیں تھا؛ کیونکہ قرآن مجید میں دوسری آیت وضاحت کے ساتھ موجود ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ [الاحزاب:۴۹] کہ جب تم نے مومنہ عورتوں کے ساتھ نکاح کیا اور اس کے بعد تم نے ان کو طلاق دے دی چھونے سے پہلے تو اب ان پر کوئی عدت نہیں۔ اب تم ان کو کچھ نہ کچھ دے کر آرام سے رخصت کر دو۔

حدیث مبارک میں آتا ہے جس کو سہل بن سعد اور ابواسید نے روایت کی ہے کہ ایک عورت کا نام امیمہ بنت شرحبیل تھا، اس کا حضور اکرم ﷺ کے ساتھ نکاح ہوا اور جب حضور اکرم ﷺ تشریف لے گئے اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے کوئی ایسی بات کی جو حضور اکرم ﷺ کو ناگوار گزری۔ آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک روک لیا۔ اور باہر جانے کے بعد حکم دیا کہ اس کو دو کپڑے دے کر عزت کے ساتھ رخصت کر دیا جائے، یعنی آپ ﷺ نے اس کو طلاق دے دی۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تیسرا قول یہ ہے کہ یہ دینا اس کے لیے ہے جو مطلقہ ہے اور جس کے ساتھ دخول بھی نہیں ہوا اور حق المہر بھی مقرر نہیں ہوا۔ اب اگر دخول ہو چکا ہے تو اس پر حق المہر دینا واجب ہے۔ اور اگر اس کے لیے مہر مقرر تھا اور اس نے طلاق دے دی، لیکن ابھی دخول نہیں کیا تو نصف مہر دینا ہوگا۔ جیسا کہ آپ نے پڑھا: ﴿فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ﴾ اور جس کے ساتھ دخول نہیں ہوا اور مہر بھی مقرر نہیں ہوا اس کو کچھ نہ کچھ دے دو۔

گھریلو معاملات اور میل ملاپ میں احتیاط:

نکاح اور طلاق یہ عائلی معاملات ہیں۔ ان کے اندر بے پناہ فتنے ہیں، قتل تک مصیبتیں آ جاتی ہیں۔ اسلام ان کو خوش اسلوبی کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اسلام نے حکم دیا ہے کہ کسی آدمی سے دوستی رکھو تو حد میں رکھو۔ یہ نہ کرو کہ کسی سے دوستی رکھی تو آدمی اس کو گھر میں لا رہا ہے، اس دوست کو اپنی بیوی کے ساتھ ملا رہا ہے، گھر میں اکٹھا کھانا کھا رہے ہیں، پورا گھر ہی اس کے سپرد ہے اور اپنا ہر عیب اس کو بتا رہا ہے۔ کل کو اگر دشمنی ہو جائے تو وہ پوری دنیا میں تمہیں ننگا کرتا پھرے گا۔ اسلام کا یہ حکم ہے کہ اگر تمہارا کسی سے جھگڑا ہو گیا تو اس کو حد میں رکھو اور اتنا نہ بڑھاؤ کہ ایک دوسرے کی ماں بہن کی گالیاں دو، لڑائیاں لڑو اور ایک دوسرے کے خلاف جھوٹے مقدمے اور قصے شروع کر دو۔ اگر کل صلح ہو جائے تو آنکھیں نیچی ہوں گی۔ اس لیے اسلام نے ہمیں ہر چیز کا ایک ادب سکھایا ہے۔

کئی گھر اس لیے برباد ہوئے کہ ایک آدمی کے خاندان کی عورتوں سے ناجائز تعلقات ہو گئے۔ جب ان کو سمجھایا گیا تو عورت نے کہا: ان لوگوں کو میرا خاوند گھر میں لے آیا تھا یا میں سڑک سے پکڑ کر لائی ہوں؟ اس لیے اگر تمہاری دوستی ہے تو اس کو ایک حد میں رکھو۔ اب اگر تم اس کو گھر میں لا رہے ہو، اگر تم آگ اور کپاس کو قریب رکھ دو اور پھر کہو کہ آگ نہ لگے تو ممکن نہیں ہے۔ اگر تم نے گیس کا بھرا ہوا سلنڈر رکھا ہوا ہے اور وہاں آگ بھی جل رہی ہے تو وہ

سلنڈر کسی وقت تو پھٹ جائے گا۔ عورت اگر کسی غیر محرم کے ساتھ ملے گی تو ان کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے تو کسی وقت شیطان نے بھڑکا دینا ہے اور فتنہ واقع ہو جائے گا؛ کیونکہ دوست کو تم خود گھر لے آئے اور اس کی بیوی سے بے تکلف کر دیا۔ تمہارا دوست ہے، اس کو پتہ ہے کہ تم ساڑھے سات بجے ڈیوٹی پر جاؤ گے اور اڑھائی بجے واپس آؤ گے، تمہارا گھر بھی خالی ہے۔ اب وہ تمہارے گھر میں اکیلا سویا ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ گلی والے دیکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ آنے جانے والا ہے تو محلے والے بھی اس کو کیسے روک سکتے ہیں؟

اس لیے اسلام یہ کہتا ہے کہ تمہارا جس جگہ نکاح ہوا ہے اگر...... خدا نہ کرے...... طلاق ہو رہی ہے تو پہلے گویا تمہارا ایک معاہدہ ہوا تھا اب وہ ٹوٹ رہا ہے تو اس کو خوش اسلوبی اور محبت سے توڑو، اس کو دشمنی سے نہ بدلو۔

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾﴾ [البقرۃ:۲۳۹]

''نمازوں کی حفاظت کرو اور (خاص کر) درمیان والی نماز (عصر) کی اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے ہوا کرو۔ پس اگر تمہیں کسی کا ڈر ہو تو (نماز) پیادہ پڑھ لو یا سوار ہو کر، پھر جس وقت امن پاؤ تو اللہ کو یاد کرو جیسا تم کو سکھایا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

گزشتہ آیات سے ربط:

ربط کی پہلی صورت: ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نماز کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے۔ گزشتہ آیات میں معاشرتی مسائل کا ذکر تھا، جن کا ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت سابقہ پڑتا ہے۔ درمیان میں اب نماز کا حکم آ گیا۔ علماء کرام نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ گھریلوں معاملات میں آدمی احتیاط کرے، کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی ہے، اسی طریقے سے نکاح اور طلاق کے معاملات ہیں تو جب طلاق ہوتی ہے تو دو خاندانوں کے درمیان جدائی ہوتی ہے، اس میں افراط و تفریط ہو جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا، تاکہ آدمی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ اس کی کو پورا کرے۔

ربط کی دوسری صورت: بعض علماء نے یوں بھی ربط بیان فرمایا ہے کہ معاشرتی نظام میں جو غلطیاں ہو گئیں،

غلطیوں کا کفارہ یہ ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [ھود: ۱۱۴] کہ اگر انسان سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو فوری طور پر نیکی کرے، عبادت کرے، نماز پڑھے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے؛ کیونکہ نیکیاں اس گناہ کو معاف کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

ربط کی تیسری صورت: بعض علماء نے تیسری وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ نکاح اور طلاق کے جتنے مسائل تھے وہ حقوق العباد تھے، وہ انسان کا انسان پر حق تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے نماز کا ذکر فرمایا۔ اس میں حقوق اللہ کا بیان ہے کہ صرف حقوق العباد کی پابندی نہیں، بلکہ حقوق اللہ کا بھی خیال رکھو۔

ربط کی چوتھی صورت: بعض علماء نے اس کی ایک اور توجیہ بھی بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝﴾ [البقرة: ۲۳۸] پہلے نکاح، طلاق اور عدت کے احکام تھے ،جس کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں انسان کو نماز کا پابند کیا ہے۔ جو آدمی اپنے اللہ کے دربار میں آ جائے گا اس کے دل میں خشیت پیدا ہوگی۔ تو اللہ تعالیٰ تنبیہ فرما رہے ہیں کہ گھریلو معاملات میں ایسے نہ الجھ جاؤ کہ نمازیں بھی بھلا دو؛ کیونکہ عام طور پر ایسے ہوتا ہے کہ جب طلاق ہوگئی تو آدمی پاگل ہو کر پھر رہا ہے، دماغ خراب ہے، نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ حج ہے، نہ زکوٰۃ ہے اور نہ قرآن ہے۔ بس فراق کے اندر ایسا الجھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد کو چھوڑ بیٹھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فوراً نماز کا حکم دیا۔

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝﴾ [البقرة: ۲۳۸] ''حٰفِظُوْا'' مفاعلہ کا صیغہ ہے۔ علماء نے فرمایا: اس میں ایک اشارہ ہے کہ جتنی تم نماز کی حفاظت کرو گے اتنی نماز تمہاری حفاظت کرے گی؛ کیونکہ مفاعلہ دو جانب سے ہوتا ہے، ایک جانب سے کبھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کے بارے میں ایسا لفظ استعمال فرمایا جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جتنی تم نماز کی حفاظت کرو گے اتنی نماز تمہاری حفاظت کرے گی۔

حفاظت صلوٰۃ کا معنیٰ:

محافظتِ صلوٰۃ کا معنیٰ جیسا کہ آپ نے کئی مقامات پر پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ... أَقِمِ الصَّلٰوةَ... الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ... يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ ہر جگہ لفظ ''أَقِمِ'' آتا ہے اور یہاں ''حٰفِظُوْا'' کا لفظ ہے۔ اب نماز تمہاری کوئی پابند تو نہیں ہے کہ تم پہرہ دو گے۔ حفاظت کا معنیٰ یہ ہے کہ اس کے

اوقات کی حفاظت کرو، اس کے شروط وارکان کی حفاظت کرو، اس کے شرائط، واجبات، سنن اور مستحبات کی حفاظت کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ سر پر ایک چیز ہے جو اتارنی ہے، بلکہ پوری پابندی اور حفاظت کے ساتھ جو اس کے حدود وشرائط ہیں اور جو ارکان ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک وقت پر ادا کرنے کا نام "اقامتِ صلوۃ" ہے۔ اگر آپ نے جلدی جلدی وضو کیا اور کوئی جگہ خشک رہ گئی تو وضو نہ ہوا۔ جب وضو نہ ہو تو نماز بھی نہ ہوئی۔ اسی طرح ہمارے بعض بھائی ایسا کام کر رہے ہوتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں پر کسی چیز کی تہہ جم جاتی ہے، مثلاً: آٹا لگ کر خشک ہوگیا، یا رنگ لگ گیا جس کی تہہ بن جاتی ہے، اسی طرح پلاسٹک نما چیز لگ گئی، وضو کرتے وقت ان کا خیال نہ کیا۔ جب وضو کے کسی عضو تک پانی نہ پہنچا تو وضو نہ ہوا۔ جب وضو نہ ہوا تو نماز نہ ہوئی۔ یہ بات "محافظتِ صلوات" کے خلاف ہے۔ بعض لوگوں نے انڈر ویئر پہنا ہوا ہوتا ہے۔ پیشاب کر کے کبھی ٹشو سے استنجا کر لیتے ہیں، احتیاط نہ کی اور بعد میں قطرے گر گئے۔ وہی انڈر ویئر پہن کر نماز پڑھتے ہیں، جبکہ پلید کپڑا اندر موجود ہوتا ہے، جس سے نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح بعض لوگ نماز کے وقت دوڑ کر آتے ہیں، رش ہوتا ہے، باہر سڑک پر کھڑے ہوگئے اور یہ خیال نہ کیا کہ جگہ پاک ہے یا پلید ہے؟ یا کسی گھر میں مہمان ہوئے، قالین بچھے ہوئے ہیں، نماز کے وقت اللہ اکبر کہہ کر وہیں قالین پر کھڑا ہوگیا۔ خدا جانے وہاں کسی بچے نے پیشاب کیا ہو اور اس قالین نے اس کو اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔ یہ چیزیں حفاظتِ صلوۃ کے خلاف ہیں۔ جو آدمی محافظتِ صلوۃ کرے گا وہ باقاعدہ سے وقت پر وضو کرے گا، خلال کرے گا، دیکھے گا کہ میری کوئی ایسی جگہ تو نہیں جہاں پانی نہ پہنچا ہو، اپنے لباس پر غور کرے گا اور جہاں نماز پڑھ رہا ہے اس جگہ کی پاکی کے بارے میں غور کرے گا۔

قانتین کی تفسیر:

ہمارے بعض لوگ یہ غفلت کرتے ہیں کہ مثلاً: رات کو بارہ ایک بج گیا، بیٹھے رہے، نماز نہیں پڑھی۔ اس کے بعد صبح اٹھ کر نماز پڑھتے ہیں، یہ نماز نہیں ہوئی۔ یہ "اِقَامَةُ الصَّلٰوة" کے خلاف ہے۔ اسی طرح محافظتِ صلوۃ کے بارے میں علماء نے فرمایا کہ ابتداء کے اندر نماز کے دوران کلام کرنا بھی جائز تھا، یعنی نماز پڑھتے ہوئے کسی نے پوچھا: کتنے فرض ہوگئے؟ تو اس کو جواب دے دیتے تھے۔ اسی طرح سلام کا جواب دینا بھی جائز تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ اپنے اللہ کے آگے خشوع وخضوع کے ساتھ کھڑے

ہو۔ تو نماز کے اندر بولنا بھی بند، ادھر ادھر دیکھنا بھی بند ہو گیا۔ بلا وجہ گردنیں پھیرنا یہ سب چیزیں قنوت کے خلاف ہیں۔ اور جب حدیث مبارک نے تشریح فرما دی: ''أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ''[1] (تم خدا کی ایسی عبادت کرو جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو)۔ اب جس بندے کو یہ مقام حاصل ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ سے نظر ہٹا کر کسی دوسری چیز کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تمہیں یہ مقام نہ ملے تو تم اس مقام پر پہنچو کہ تیرا رب تجھے دیکھ رہا ہے۔ جس بندے کو یہ یقین ہو جائے کہ میرا آفیسر مجھے دیکھ رہا ہے، وہ نہیں ہلتا۔ تو جس بندے کو یہ یقین ہو جائے کہ میرا خدا مجھے دیکھ رہا ہے تو اس بندے کو کیا پڑی ہے کہ وہ ادھر ادھر دیکھے؟ بعض بڑے پکے نمازی ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو پتہ نہیں کس مرتبہ کا سمجھتے ہیں! نماز میں کھیل رہے ہوتے ہیں اور نماز بھی ہو رہی ہے۔ یہ کوئی نماز تو نہیں، کوئی کھیل ہو گیا۔

نماز کو اطمینان سے ادا کرو:

اگر تم نے نماز پڑھی، لیکن رکوع کے اندر پشت سیدھی نہیں ہوئی، کھڑا ہو گیا، یہ نماز مکمل نہیں ہوتی۔ اسی طرح سر سجدے میں ڈالا اور فوراً اٹھا لیا، یا ٹانگیں پیچھے اٹھائی ہوئی ہیں، اسی طرح سر سجدے میں ڈالا اور تسبیح ایسے پڑھی کہ پتہ نہیں کہ تم نے کیا پڑھا ہے؟ ٹکریں مار رہے ہو تو یہ منافق کی نماز ہوتی ہے، مومن کی نماز نہیں ہوتی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ قرآن میں فرمایا: ﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝﴾ [البقرۃ: ۴۵] یہ نماز ان لوگوں کے لیے بھاری ہے جو منافق ہوتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں ان کا تو سکون و قرار نماز میں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ'' (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے)۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: بلال! اٹھو! نماز کا وقت ہو گیا ہے، اذان کہو اور ہمیں آرام پہنچاؤ۔ اذان ہو گی، ہم نماز پڑھیں گے اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کو معراجِ مومن بنایا ہے۔ نماز سے ہمیں روحانی سکون اور طمانیت محسوس ہو گی۔

نماز نہ پڑھنے والوں کے بارے میں حکم:

علماء نے فرمایا: اگر کوئی منکرِ نماز ہے، ایسا آدمی بالاتفاق کافر ہے، اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ اور اگر ایک

---

[1] [صحیح البخاری: ۱/ ۲۷، صحیح مسلم: ۱/ ۲۹]

آدمی منکر تو نہیں ہے، بلکہ مانتا ہے کہ نماز عبادت ہے، فرض ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، لیکن نماز چھوڑ دیتا ہے، یا تو کسی عذر کی وجہ سے چھوٹ گئی کہ نیند آ گئی اٹھ نہیں سکا، یا کوئی حادثہ ہو گیا۔ اور دوسرا یہ ہے کہ عمداً نماز چھوڑ دی کہ ڈرامہ دیکھ رہے ہیں، گپیں لگا رہے ہیں۔ اذان ہو گئی، نماز کا وقت ختم ہو گیا، اس کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور الشیخ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز جان بوجھ کر چھوڑنے والا آدمی بھی کافر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کا نکاح ختم ہو جاتا ہے؛ کیونکہ یہ کافر ہے۔ اور فرماتے ہیں اگر ایسا آدمی مر جائے تو اس کا جنازہ بھی نہ پڑھو اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی نہ کرو؛ کیونکہ یہ مرتد ہے، مسلمان نہیں ہے۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے پانچ پانچ سال سے نماز نہیں پڑھی اور جانتے نہیں کہ نماز کیا ہے؟ بعض لوگ ایسے ہیں جو خود تو نمازی ہیں، لیکن بی بی بے نمازی ہے، تب بھی نکاح نہ رہا۔ تو آئندہ جو اولاد ہوگی وہ کیا ہوگی؟ صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ علماء کے نزدیک ولد الزنا ہوگی۔

باقی آئمہ فرماتے ہیں: ایسا آدمی فاسق فاجر ہے۔ اس نے ایسا کام کیا ہے جو کفر کے قریب لے گیا ہے اور اس نماز کے چھوڑنے سے کبھی یہ کفر میں پڑ جائے گا، لیکن کافر نہیں ہوتا۔ بہر حال جب ایک بڑے امام یہ فرما رہے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حدیث مبارک کے ظاہری الفاظ بھی یہی ہیں "مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ"[1] (جو شخص نماز کو جان بوجھ کر چھوڑے اس نے کفر کیا)۔

اس لیے حکم ہے: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ﴾ (نمازوں کی پابندی کرو)۔ اسی طرح آیا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ [النساء: ١٠٣] کہ نماز کو اس کے اوقات میں ادا کرو۔ یہ ٹھیک ہے کہ اوقات میں دو وقت ہیں: ایک اوّل وقت ہے اور ایک آخری وقت ہے۔ اس کے اندر نماز پڑھ لے تو وہ شکر کرے کہ اس نے نماز ادا کر لی ہے۔ یہ بھی "محافظة على الصلوة" میں داخل ہے کہ اگر تیرے گھر کے قریب کوئی مسجد ہے اور اس مسجد کی اذان تمہیں سنائی دیتی ہے تو پھر تمہاری نماز گھر میں درست نہیں ہوتی، تمہیں مسجد میں جا کر ہی نماز پڑھنی ہوگی۔ ہاں اگر عذر ہے تو پھر آپ گھر میں مجبوراً نماز پڑھ سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے بھی شرط ہے کہ اگر کوئی آدمی نہ ملے تو آدمی اپنے بیوی بچوں کو جماعت کروا لے، خود امام بن کر نماز پڑھے، تاکہ جماعت کا ثواب نصیب ہو جائے۔

[1] [الترغیب والترھیب: ١/ ٢١٥، الطبرانی اوسط: ٣/ ٢٤٣]

(۱) جماعت میں سستی کرنے والے کی مثال:

میرے آقا ﷺ نے پیاری مثال دی ہے: "مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ" [۱] کہ تم بکریوں کا ریوڑ چرانے کے لیے جاتے ہو تو جب وہ ریوڑ اکٹھے جا رہا ہو اور چرانے والا بھی ساتھ ساتھ پھر رہا ہو تو ریوڑ محفوظ رہتا ہے، لیکن جو بکری پیچھے رہ جائے، اس کو ہمیشہ شکاری جانور اٹھایا کرتے ہیں کہ وہ ریوڑ سے کٹ گئی۔ جو مسلمان جماعت سے پیچھے رہ جاتا ہے وہ بھی کٹتے کٹتے آخر جہنم کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔

اصول یہ ہے کہ شیطان آہستہ آہستہ اور تدریجاً تدریجاً گمراہ کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں نے بندے کو کیسے پٹڑی سے اتارنا ہے؟ اگر آپ ہمیشہ صفِ اوّل میں نماز پڑھتے تھے تو وہ دل میں خیال دے گا کہ روز لڑائی ہوتی ہے، چلو دوسری صف میں کھڑے ہو جاؤ، اس طرح لڑائی سے بچ جاؤ گے۔ اس طرح اگلی صف چھوٹ گئی۔ پھر وہ آپ کو چوتھی اور پانچویں صف میں لے جائے گا۔ اس طرح کرتے کرتے گھر میں نماز شروع کرا دے گا۔ اس لیے علماء نے فرمایا: اگر کسی آدمی کی عادت ہے کہ وہ روزانہ دو نفل پڑھتا ہے۔ اب اگر اس نے کسی دن یہ سوچا کہ آج میں تھکا ہوا ہوں تو نفل کو چھوڑ دیتا ہوں، علماء نے لکھا ہے کہ جب آدمی نوافل چھوڑتا ہے تو سزا یہ ملتی ہے کہ وہ سنت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جب سنتیں پڑھنا چھوڑتا ہے تو سزا یہ ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو فرضوں سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نمازوں کی محافظت کرو پوری دیانت داری کے ساتھ۔ اور اپنے گھروں میں اور اپنے اہل و عیال میں نماز ان کے خون میں داخل کریں کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو نماز شروع اور دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھے تو اس کو مار بھی سکتے ہیں۔

حدیث: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا: "أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟" اعمال میں سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: "اَلصَّلَاةُ فِي وَقْتِهَا" کہ سب سے افضل عمل نماز کو اس کے اوقات میں ادا کرنا ہے۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ نے اوقات مقرر فرمائے ہیں ان کے اندر نماز کو پورے شروط اور پورے ارکان کے ساتھ ادا کرے۔ میں نے عرض کیا: اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اَلْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ" یعنی اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا...... اس حدیث میں حضور پاک ﷺ نے نماز کو جہاد سے بھی مقدم فرما دیا؛ کیونکہ آدمی مسلمان ہوگا تو جہاد کرے گا اور اگر آدمی مسلمان نہ ہو تو

---

[۱] مشکوٰۃ المصابیح: ۱/۳۸، رقم: ۱۷۳، حاکم: ۱/۱۶۰ تا ۱۶۲

وہ جہاد کیسے کرے گا؟...... پھر میں نے عرض کیا: اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ فرمایا: والدین کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ حدیث بیان فرمائی۔ اور آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں اور بھی سوال کرتا رہتا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مجھے جواب عطا فرماتے رہتے۔ [صحیح البخاری: رقم: ۵۲۷، باب: فضل الصلاۃ لوقتہا]

حضرت ام فروہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعمال کی فضیلت بیان فرما رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے محبوب عمل یہ ہے کہ نماز کو جلدی سے اوّل وقت میں ادا کرے۔

صلوٰۃِ وسطیٰ کا مصداق:

"الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" سے کون سی نماز مراد ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: اس سے صبح کی نماز ہے۔ اس قول کو امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی موطا میں ذکر کیا ہے اور اس کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف کی ہے۔ ابورجا عطاردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیچھے فجر کی نماز پڑھی تو آپ نے فجر کی نماز میں ہاتھ بھی اٹھائے، دعا بھی کی اور دعائے قنوت بھی پڑھی۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ یہی فجر کی نماز صلوٰۃِ وسطیٰ ہے۔ اسی میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ہم پورے خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوں۔

حضرت ربیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی تو میں نے ان سے پوچھا: صلوٰۃِ وسطیٰ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: یہ فجر کی نماز ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد صلوٰۃِ فجر ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۝﴾ "قٰنِتِيْنَ" کے اندر حکم ہے کہ تم قنوت بھی پڑھا کرو اور قنوت صبح کی نماز کے اندر پڑھی جاتی ہے۔ آگے آرہا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور جمہور کی رائے یہ ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے اور "قٰنِتِيْنَ" سے مراد قنوت پڑھنا نہیں، بلکہ مطلقاً خشوع وخضوع کا حکم ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل کہ صلوٰۃِ وسطیٰ سے فجر کی نماز مراد ہے، یہ ہے کہ ایک ایسی نماز ہے جس میں قصر نہیں، باقی نمازوں کی چار یا تین رکعات ہیں تو ان کی آدھی دو رکعت ہوئی، لہٰذا صلوٰۃِ وسطیٰ کا معنی درمیانی نماز ہوا اور وہ فجر کی نماز ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ فجر کی نماز دو نمازوں کے درمیان میں آ گئی۔ ظہر عصر سرّی نمازیں ہیں، ان میں آدمی زور سے قرآن نہیں پڑھتا۔ مغرب وعشا جہری نمازیں ہیں، ان میں آدمی قرآن زور سے پڑھتا ہے، لہٰذا دو جہری نمازیں ہو گئیں، دو سرّی ہو گئیں اور درمیان میں صبح کی نماز آ گئی۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد ظہر کی نماز ہے (لیکن یہ کمزور قول ہے)۔ ہم زید بن حارث کی خدمت میں بیٹھے تھے، انہوں نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آدمی بھیجا کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: اس سے مراد ظہر کی نماز ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو عین گرمی کے وقت میں پڑھتے تھے اور یہ نماز صحابہ پر بڑی مشقت والی ہوتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾۔

قریش کی ایک جماعت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر گزری۔ اور وہ اس وقت اکٹھے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک غلام بھیجا کہ پوچھ کر آؤ صلوٰۃ وسطیٰ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے پہلے تو فرمایا کہ صلوٰۃ عصر مراد ہے۔ پھر دو آدمیوں نے سوال کیا تو آپ نے فرمایا: صلوٰۃ ظہر مراد ہے؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز بڑی سخت گرمی میں پڑھتے تھے، حتیٰ کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک صف یا دو صفیں ہوتی تھیں۔ اکثر لوگوں کے آرام کا وقت ہوتا تھا یا کاروبار میں مشغولیت کا وقت ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں اتاریں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار! اگر لوگ نماز میں اور جماعت میں حاضر نہ ہوئے تو میں حکم دے کر ان کے گھروں کو جلا دوں گا۔ [مسند احمد: ۵/۲۰۶]

اس کو زبرقان نے روایت کی ہے۔ یہ ابن عمرو بن امیہ الضمری اس کا نام ہے۔ اس نے کسی صحابی کو نہیں دیکھا۔

اکثر علماء، اکثر تابعین اور جمہور کے نزدیک صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اور صحیح قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے صاحبین سے منقول ہے کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔ ابن حبیب مالکی رحمہ اللہ نے بھی اس قول کو اختیار کیا کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد صلوٰۃ عصر ہے۔

حدیث: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى صَلٰوةِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَبُيُوْتَهُمْ نَارًا'' کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تفسیر بیان فرما دی کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد صلوٰۃ عصر ہے کہ مکہ کے مشرکوں نے ہمیں خندق کھودنے میں اتنا الجھا دیا کہ ہماری نماز عصر بھی قضا ہو گئی، اللہ تعالیٰ مشرکوں

[مسند احمد: ۱/۸۱]

کے دلوں اور گھروں کو آگ سے بھر دے، اللہ تعالیٰ ان پر عذاب کرے، ہم سے صلوۃ وسطیٰ قضا ہوگئی۔ تو حضور اکرم ﷺ نے مغرب کی نماز کے بعد اس نمازِ عصر کی قضا کی تھی۔

اور ایک قول یہ ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد مغرب کی نماز ہے؛ کیونکہ نمازیں یا تو چار رکعات والی ہیں یا دو رکعات والی ہیں تو ان کے درمیان جو تین رکعات والی نماز ہے وہ صرف مغرب ہے۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد عشا کی نماز ہے۔ اور علی بن احمد الواحدی نے عشا کی نماز مراد لی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: صلوٰۃِ وسطیٰ مبہم ہے، ان پانچ میں کوئی ایک ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر کو چھپا دیا؛ کیونکہ جو بھی قیمتی چیزیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو چھپا دیا ہے، تا کہ بندہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد پانچوں نمازیں ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: صلوٰۃِ وسطیٰ سے جماعت کی نماز ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد جمعہ کی نماز ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا: عید الفطر کی نماز مراد ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: عید الاضحیٰ کی نماز مراد ہے۔

مفسر فرماتے ہیں: بعض علماء نے چپ کر لی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ جب ہر نماز کے بارے میں اتنے دلائل ہیں تو انہوں نے کہا: ہم خاموش ہیں، جو بھی ہے بس ٹھیک ہے۔ مفسر فرماتے ہیں: کیونکہ صحابہ کے زمانے سے لے کر آج تک اختلاف چلا آ رہا ہے۔ اس لیے بس پابندی کریں، لیکن اکثر اقوال عصر کے بارے میں ہیں۔

نماز کسی حالت میں معاف نہیں:

نماز اتنی اہم عبادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم میدانِ جنگ میں بھی ہو اور تمہیں دشمن کا خوف بھی آ جائے، تب بھی نماز معاف نہیں ہوتی۔ نماز بیماری میں معاف نہیں ہوتی، نماز سفر میں معاف نہیں ہوتی، حتیٰ کہ آدمی کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر پڑھے، اگر وضو نہ کر سکے تو تیمم کر کے نماز پڑھے، اگر ہوائی جہاز میں ہے، ٹرین میں ہے، جس میں بھی ہے، اپنی نمازوں کے اوقات کا پورا پورا خیال رکھے اور نماز کو صحیح معنوں میں ادا کرنے کی کوشش کرے۔

قرآن پاک نے دوسرے مقامات پر صلوۃ الخوف کی پوری تفصیل بیان فرمائی ہے کہ اگر دشمنوں کے مقابلے پر ہے اور صفیں بن چکی ہیں، اس حالت میں بھی امام نماز پڑھائے گا۔ اگر اس کے پیچھے دس صفیں بن گئیں تو جب امام رکوع میں جائے گا تو اس کے ساتھ والی صف رکوع میں چلی جائے، باقی کھڑے رہیں، تا کہ دشمن حملہ نہ کر سکے۔ اور امام اور اس کے ساتھ والی صف دونوں سجدے کر لیں، امام کھڑا ہو جائے اور باقی صفیں رکوع و سجود پر کھڑی ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ نماز کسی حالت میں معاف نہیں ہے۔ اگر جنگ اتنی شدید ہو گئی ہے کہ سواری سے اترنے کا بھی موقع نہیں ملتا، تب بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ سواری پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لو۔ اگر ممکن ہو سکے تو قبلہ کی طرف رخ کرو، لیکن اگر جانور ہیں، دوڑ رہے ہیں، قبلہ کی طرف منہ نہیں رہا تو جتنا امکان ہو سکتا ہے قبلہ کی طرف رخ کریں۔ اگر رکوع و سجود ادا نہیں کر سکتے تب بھی حکم ہے کہ اشارے کے ساتھ نماز ادا کرلو، لیکن نماز ہر حالت میں ادا کی جائے گی: کیونکہ نماز نے بندے کو اپنے اللہ تعالیٰ سے جوڑا ہے۔ اور جب نماز قطع ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے تعلق قطع ہو جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اَلصَّلَاۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ'' نماز دین کا عمود ہے (جس نے نماز کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے نماز کو ختم کر دیا اس نے دین کو ختم کر دیا)۔ [شعب الایمان: ۳/۳۹، رقم: ۲۸۰۷]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں کو خط لکھا کرتے تھے کہ جس آدمی کو نوکری یا عہدہ دو اس کی نماز کا خیال رکھو: کیونکہ جو نماز کی حفاظت کرے گا وہ بندوں کے حقوق کا بھی خیال کرے گا اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کی نماز کا خیال نہیں کرتا ہے تو وہ بندوں کے حقوق کا کیا خیال کرے گا؟

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب دو لشکر آپس میں ٹکرا جائیں، جنگ کی حالت کے اندر، یعنی دونوں لڑائی کر رہے ہیں، اگر دو رکعات پڑھنے کا بھی موقع نہیں ہے تو ایک رکعت پڑھ لے، چاہے اشارے کے ساتھ ہی پڑھ لے، نماز ادا ہو جائے گی۔ انہوں نے ایک حدیث پاک سے استدلال فرمایا۔ حضور اکرم ﷺ سے فرمایا:

''فَرَضَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ الصَّلَاةَ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّكُمْ ﷺ فِي الْحَضَرِ أَرْبَعًا وَفِي السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ وَفِي الْخَوْفِ رَكْعَةً'' [مسلم: رقم: ۶۸۷، سنن ابی داؤد: ۱۲۴۷]

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں پر نماز فرض کی ہے۔ اگر وہ گھروں کے اندر ہیں تو چار رکعتیں پڑھیں، سفر کے اندر ہیں تو قصر کریں، دو رکعت پڑھیں اور حالتِ خوف کے اندر ہیں تو ایک رکعت بھی جائز ہے، لہٰذا ان کے نزدیک

اگر ایک رکعت بھی پڑھی جاسکے تو نماز ادا ہو جائے گی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے باقاعدہ باب لکھا ہے کہ اگر آدمی دشمن کے مقابلے پر ہے اور ان کے قلعے کے سامنے ہے اور دشمن اوپر سے تیر برسا رہا ہے اور یہ قلعہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہے تو یہ کیسے نماز ادا کرے؟

اسی طرح امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اب لڑائی زور پر ہے اور فتح قریب آگئی ہے اور نماز نہیں پڑھ سکتے تو کیا کریں؟ فرمایا: ہر بندہ اشارے کے ساتھ اپنی نماز ادا کرلے۔

مفسر فرماتے ہیں: اگر ایسی حالت ہوگئی ہے کہ اشارہ بھی نہیں کر سکتے تو نماز کو مؤخر کر دے۔ جب وقت ملے تو آرام کے ساتھ نماز پڑھ لے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب ہم تستر کا قلع فتح کر رہے تھے، صبح کا وقت تھا اور ہم قلعہ فتح کرنے کے قریب تھے۔ اب ہمیں وقت نہیں مل رہا تھا کہ نماز پڑھ لیں تو ہم نے نماز کو مؤخر کر دیا، حتیٰ کہ سورج نکل آیا۔ اس کے بعد ہم نے قضا نماز پڑھی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی ہمارے ساتھ تھے، یعنی اگر یہ غلط بات ہوتی تو وہ خاموش نہ رہتے۔

ہوائی جہاز میں نماز کا حکم:

بعض علماء فرماتے ہیں: اگر کوئی آدمی ہوائی جہاز کے اندر ہے تو نماز قضا کرلے اور نیچے اترنے کے بعد نماز پڑھے۔ بعض محتاط علماء فرماتے ہیں کہ ہوائی جہاز میں بھی نماز پڑھ لے اور اترنے کے بعد احتیاطاً پھر بھی قضا کرلے۔ لیکن اب متاخرین علماء سب کا فتویٰ یہی ہے کہ ہوائی جہاز میں نماز جائز ہے، آدمی آرام کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے۔

ہم نے تو سفر میں یہ تجربہ کیا ہے کہ اگر آدمی کی نیت ٹھیک ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی نماز پڑھنا چاہے تو لوگ اس کی بڑی اعانت کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ اور جمہور علماء رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ایسی خوف کی حالت ہو تو نماز مؤخر نہ کریں، بلکہ خوف والی نماز ادا کریں۔ جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے کہ دو صفیں بنالیں: اگلی صف نماز پڑھے اور پیچھے والے کھڑے رہیں۔ یا اشارے کے ساتھ بھی نماز ادا کرلیں یا سواری پر بھی نماز ادا کرلیں۔ باقی رہا خندق کے موقع پر نماز کا قضا ہونا تو اس

کا جواب یہ ہے کہ اس موقع پر ابھی صلاۃِ خوف والی آیات نہیں اتری تھیں۔ جب وہ بعد میں اتری ہیں تو بعد میں عمل بھی کیا جائے گا۔

امام مکحول، امام اوزاعی اور امام بخاری رحمہم اللہ فرماتے ہیں: کوئی حرج نہیں، قضا کر سکتے ہیں۔ ایسے حالات کبھی کبھی پیش آتے ہیں۔ اور قرآن کے اندر جو ہے اس پر عمل کرنا بھی ٹھیک ہے۔ اس کی تفصیل آگے سورۃ النساء میں آرہی ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۴۰-۲۴۲]

’’اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، یہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر دیں ایک برس تک خرچ دینے کی گھر سے نکالے بغیر۔ ہاں اگر خود نکل جائیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں، جو کچھ وہ اپنے حق میں کریں بھلی بات۔ اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ اور طلاق یافتہ عورتوں کو خرچ دینا ہے، اپنے دستور کے مطابق (یہ) پرہیزگاروں پر لازم ہے۔ اللہ تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھ لو۔‘‘

عورت کب؟ کہاں؟ اور کتنی عدت گزارے؟

اس میں دو قول ہیں: اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور اکثر ائمہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ پہلے عورت کی میراث بھی مقرر نہیں تھی، اس کے لیے عدت ایک سال کے لیے تھی اور خاوند کے ذمے وصیت لازمی تھی کہ جب وہ موت کے قریب آتا یا اس سے پہلے وصیت کر دیتا کہ اگر میں مر جاؤں تو میری بیوی ایک سال تک میرے گھر میں رہے گی۔ اس کا خرچہ اور رہائش سب میری میراث سے ادا کیا جائے گا۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ﴾ [البقرۃ: ۲۳۴] تو وہ آیت اس حکم کے لیے ناسخ ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے چار مہینے اور دس دن عدت معین فرما دی۔ اور اگر حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہوگئی، چاہے وضع حمل جلدی ہو جائے یا دیر سے ہو۔ اور خرچہ

میراث سے دیا جائے گا۔

اسی طرح دوسرے رشتہ داروں کے لیے بھی وصیت کا حکم تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے میراث کو مقرر کر دیا کہ لڑکی کا ایک حصہ اور لڑکے کے دو حصے ہوں گے، بیوی کو چوتھا یا آٹھواں حصہ ملے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیوی کا حصہ بھی مقرر کر دیا تو اب وصیت کا حکم بھی ختم ہو گیا۔ اور ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ؕ﴾ سے سال والا حکم بھی ختم ہو گیا۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ قرآن میں اتنا ہے کہ عدت تو چار مہینے دس دن رہے گی، لیکن استحبابی طور پر یہ ہے کہ اگر خاوند چاہے تو ایک سال تک کے لیے وصیت بھی کر دے کہ ایک سال تک میری بیوی کو خرچہ میری میراث میں سے دیا جائے۔ اب عورت کی مرضی ہے کہ چار مہینے دس دن گزرنے کے بعد پورے سال تک فائدہ اٹھا لے اور اگر وہ چاہے تو فائدہ نہ اٹھائے۔ اس کی طرف حضرت مجاہد اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ گئے ہیں۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الفاظِ قرآن بھی ان کے مصاحب ہیں۔

عورت عدت اپنے خاوند کے گھر میں گزارے۔ ہاں اگر ایسے حالات ہو جائیں کہ خاوند مر گیا اور اس کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی، عورت بیوہ ہو گئی۔ اب اس کے رشتہ دار اس کو نہیں رہنے دیتے تو عورت مجبور ہے، وہ اپنے والدین کے گھر میں آ جائے یا جہاں اس کو اعتماد کی جگہ ملے وہاں عدت گزارے؛ کیونکہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی حل نہیں ہے۔ عورت اگر عدت کے اندر باہر نکلنا چاہے تو اس کو اجازت نہیں دی جائے گی۔

شریعت کے مسائل کی پابندی:

﴿فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ اس سے اسلام نے ہمیں ایک مسئلہ سکھا دیا کہ تمہیں روکنے کا حق تب ہے جب شرعاً بھی حق ہو اور اگر شرعاً حق نہ ہو تو تمہیں روکنے کا حق نہیں بنتا۔

مثلاً: اسلام نے حکم دیا ہے کہ جب لڑکا دس سال کا ہو جائے اس کا بستر علیحدہ کر دو۔ اسی طرح بچہ دس سال کا ہو جائے اور خاص اوقات میں دوپہر کا وقت ہے، میاں بیوی لیٹے ہوئے ہیں، چاہے بیٹا ہو اس کو بغیر اجازت کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسلام نے جہاں جہاں پابندی لگائی ہے ان احکام کو پورا کرنا ہوگا۔ اگر کوئی ان کو توڑے گا تو ہمیں اس کو روکنا ہوگا۔ یہی بنیادی وجہ ہے، جس کی وجہ سے آج کل ہمارے حالات خراب ہو گئے ہیں۔

مثلاً: ایک فلیٹ میں رہتے ہیں، دو کمرے والے فلم دیکھ رہے ہیں یا کوئی برائی کر رہے ہیں اور ایک کمرے میں جو آدمی رہتا ہے وہ نمازی اور صالح ہے، کوئی برائی نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ میں ان کو منع کروں، یہ جانیں اور ان کا کام جانے، میں کیا کروں؟ بلکہ وہاں ہماری ذمہ داری ہے کہ برائی سے منع کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں طاقت دی ہے تو طاقت سے روکیں، اگر اتنی طاقت نہیں دی تو زبان سے روکیں اور اگر زبان سے بھی روکنے کی طاقت نہیں ہے تو کم از کم دل میں برا سمجھو۔ اگر تم اکٹھے رہ رہے ہو تو یہ برا سمجھنا نہیں ہے، بلکہ برا سمجھنا یہ ہے کہ ان سے علیحدہ ہو جاؤ؛ کیونکہ آدمی جس کو برا سمجھتا ہے اس کو سلام بھی نہیں کرتا۔

یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے جو حدود مقرر فرمائی ہیں ان کے اندر رہنا ضروری ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پوری امتِ مصطفیٰ ﷺ کے ذمہ ہے۔ صرف کسی مولوی کا، کسی پیر کا اور کسی بزرگ کا اس پر ٹھیکہ نہیں ہے، بلکہ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [آل عمران: ۱۱۰]۔ اور اللہ کے نبی نے فرمایا: ''بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً'' اگر تمہیں قرآن کی ایک آیت بھی آتی ہے، ایک حدیث بھی آتی ہے، ایک نماز کا مسئلہ بھی آتا ہے، ایک وضو کا مسئلہ بھی آتا ہے اور ایک طواف کا مسئلہ بھی آتا ہے تو وہ بات اپنے دوسرے بھائی کو پہنچاؤ۔[1] اسی طرح اللہ کے نبی نے حکم دیا ہے کہ اگر تم نے کوئی منکر (گناہ کا کام) دیکھا ہے ''مَنْ رَأَى مِنْكُمْ فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ'' تو اس کو روکنا چاہیے۔ [صحیح مسلم: رقم: ۴۹، جامع الترمذی: رقم: ۲۱۷۲]

عدت لازم کیوں؟

عورت پر عدت گزارنے کی پابندی اس لیے لگائی گئی کہ شاید عورت کے پیٹ میں بچہ ہو۔ چار مہینے دس دن میں بات واضح ہو جائے گی۔ اگر بچہ ہوگا تو لازمی بات ہے کہ وہ نفخِ روح کے بعد حرکت کرے گا، حیض بند ہو جائے گا، پیٹ بڑھنا شروع ہو جائے گا اور جب بات ثابت ہو جائے کہ بچہ ہے تو عدت وضعِ حمل ہوگی۔ عدت گزارنے کے بعد وہ عورت اگر دوسری جگہ شادی کرنا چاہے تو شادی کر سکتی ہے۔

عدت پر اعتراض اور اس کا جواب:

آج دشمنِ اسلام اعتراض کرتا ہے کہ عدت کا مقصد استبراءِ رحم ہوتا ہے کہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس کا رحم خالی ہے یا

[1] [صحیح البخاری، رقم: ۳۴۶۱، باب: ما ذکر عن بني إسرائيل]

بچہ ہے؟ اب ہمارے پاس آلات موجود ہیں کہ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ حمل ہے یا نہیں، بلکہ پیشاب کا قطرہ ڈالنے سے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں ہے، تو پھر چار مہینے اور دس دن قید لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ سمجھیں! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے فرمایا ہے: مشین سے حمل کا تو پتہ لگ جائے گا، لیکن کتنی بڑی بد خلقی ہوگی کہ خاوند کی قبر ابھی خشک نہیں ہوئی اور عورت دوسرے شوہر کے لیے تیار ہوگئی۔ یاد رکھیں! ایسی عورت تیرا گھر بھی آباد نہیں ہونے دے گی۔ اس مرنے والے شوہر کا خاندان اور رشتہ دار ہیں، ان کے طعنوں سے بچ جائے گی اگر عدت گزارے گی، ورنہ وہ طعنہ دیں گے کہ یہ تو ہمارے بھائی اور ہمارے بیٹے کے مرنے کے انتظار میں تھی۔ لیکن جب عدت گزر جائے گی، اتنی مدت میں زخم بھر جائیں گے اور ماں باپ بھی تسلی کر لیں گے تو ماں باپ خود کہیں گے کہ بیٹا! تم جوان عورت ہو، تم دوسری جگہ شادی کر لو۔ ہمارے مقدر سے پہلا خاوند تو چلا گیا۔ اگر دوسری جگہ شادی کرنا چاہتی ہو تو کر لو؛ کیونکہ تمہاری اتنی جوانی پڑی ہے، اس کو کیسے گزارو گی؟ اس طرح وہ خود مشورہ دینے والے بن جاتے ہیں اور معاشرے کے اندر خیر رہتی ہے۔ اسلام نے جامع و مانع اور کامل و مکمل اصول مرتب فرما دیئے ہیں کہ قیامت تک نہ ان کے اندر کوئی تغیر و تبدل ہے اور نہ کوئی کمی ہے۔

خاوند کے گھر میں عدت گزارنا لازمی ہے:

حدیث: سعد بن اسحاق بن کعب رحمہ اللہ نے اپنی چچی سے روایت کی ہے کہ فریعہ جو مالک بن سنان رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر پوچھا: یا رسول اللہ! اگر مجھے شریعت اجازت دے تو میں بنو خدرہ قبیلے سے تعلق رکھتی ہوں، مجھے اجازت ہو تو میں ماں باپ کے گھر واپس چلی جاؤں؟ کیونکہ میرا خاوند فوت ہو گیا ہے، اس نے کوئی مسکن بھی نہیں چھوڑا ہے، کوئی خرچہ بھی نہیں چھوڑا ہے تو اب میں واپس ماں باپ کے گھر چلی جاؤں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی اور فرمایا: ٹھیک ہے۔ بی بی کہتی ہیں: میں وہاں سے پھری اور ابھی میں اسی حجرے کے اندر ہی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بلایا، کسی کو حکم دیا کہ مجھے آواز دی جائے۔ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے کیا کہا تھا؟ میں نے دوبارہ بیان کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی گھر میں بیٹھی رہو، جب تک تمہاری عدت چار مہینے دس دن پوری نہ ہو جائے۔ بی بی فرماتی ہیں: میں نے چار مہینے دس دن وہیں عدت گزاری۔

جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت آیا تو انہوں نے میرے پاس با قاعدہ آدمی بھیج کر مسئلہ پوچھا کہ تمہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکم دیا تھا؟ تو میں نے یہ واقعہ ذکر کیا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ خاوند غریب ہے، جیسا ہے، خاوند کے مرنے کے بعد عورت اپنی عدت خاوند کے گھر کے اندر گزارے گی، اس عدت کے اندر اس کو خاوند کے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے میری یہ بات سننے کے بعد اسی فیصلے کو قائم رکھا اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔

یاد رکھیں! اگر خاوند مر گیا، اس نے جائیداد چھوڑی، مکان بھی چھوڑا۔ عورت کو آٹھواں حصہ بھی ملنا ہے، اولاد بھی موجود ہے، اولاد اپنی ماں کو رکھنا چاہتی ہے اور ماں بھی اپنی اولاد کے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو شریعت یہ نہیں کہتی کہ اس کو ضرور نکال دو، چاہے وہ ساری زندگی بیٹھی رہی، اس کی مرضی ہے۔ ہاں اگر عورت خاوند کے مرنے کے بعد اس گھر میں عدت گزارنے کے بعد نہیں رہنا چاہتی، وہ چاہتی ہے کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر جاؤں تو وہ عدت گزار کر جا سکتی ہے۔ اسی طرح شریعت کا حکم ہے کہ اگر عورت جوان ہے، نکاح کے قابل ہے اور وہ بیوہ ہوگئی ہے تو اس کی شادی کر دینی چاہیے، لیکن اگر اس کے بچے ہیں، وہ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی اور اپنے دامن کو حیا اور شرافت کے ساتھ محفوظ رکھتی ہے تو کوئی گناہ نہیں، اس کو اجر ملے گا۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے شادی کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہیں دی۔ ایک دن جب وہ آئے تو ان کے کپڑے پر کچھ اثر تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ کیا داغ ہیں؟ اس صحابی نے عرض کیا: یہ میں نے رنگ نہیں ڈالا، میں نے شادی کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے بتایا بھی نہیں اور شادی بھی کر لی۔ اچھا! تم نے بیوہ عورت سے شادی کی ہے یا کنواری عورت سے شادی کی ہے؟ اس نے عرض کیا: میں نے بیوہ عورت سے شادی کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے کنواری عورت سے شادی کیوں نہیں کی؟ اس نے کہا: حضور! میرے اپنے گھر میں چھ بہنیں ہیں۔ اگر میں کنواری عورت شادی کر کے لے آتا تو وہ بھی میری بہنوں کی عمر کی ہوتی، اس لیے میں نے بڑی عمر کی عورت سے شادی کی ہے، تاکہ وہ میری بہنوں کی ماں بن کر ان کی نگرانی کر سکے، ان کو سنبھال سکے اور حفاظت کر سکے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے خوش ہوئے اور فرمایا: تم نے بہت اچھا کیا کہ تم نے اپنی بہنوں کا خیال کیا۔ [صحیح البخاری: رقم: ۵۰۷۷ ، ۲۳ ، صحیح مسلم: رقم: ۵۱۰۵]

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۠ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۴۳تا۲۴۵]

"اسی طرح آپ (ﷺ) نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے تھے اور وہ ہزاروں تھے۔ پھر اللہ نے ان کے لیے فرمایا: مر جاؤ۔ پھر ان کو زندہ کیا۔ بے شک اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ اور جان لو کہ اللہ خوب سنتا، خوب جانتا ہے۔ ایسا کون شخص ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے کہ (اللہ) اس کے لیے اس کو کئی حصے دگنا کر دے۔ اور اللہ تنگی کرتا ہے اور فراخی بھی۔ اور تم اسی کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔"

فی زمانہ جہاد سے ڈرنے اور جہاد نہ کرنے کی وجہ:

ان آیات میں ایک تو انفاق فی سبیل اللہ کا ارشاد ہے اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ کا مسئلہ ہے اور اسی ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ بعض لوگ موت سے بھاگے تو ان کا کیا انجام ہوا؟

تو اس مسئلے کو آپ ذہن میں رکھیں کہ آج جو مسلمانوں نے جہاد چھوڑ دیا ہے، انفاق فی سبیل اللہ کو چھوڑ دیا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ حب الدنیا وکراہیۃ الموت ہے۔ دنیا کی محبت ہمارے دلوں میں گھر کر گئی اور موت کو ہم ایک بلا سمجھنے لگ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ان دونوں چیزوں سے محروم ہو گئے۔

آج پوری دنیا میں مسلمان ذلت میں پڑا ہوا ہے، اس کی وجہ ہمارے گناہ ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے ہمیں باخبر کیا کہ جس معاشرے میں زنا بڑھ جائے گا، جس معاشرے میں ظلم بڑھ جائے گا اور فحاشی وعریانی پھیل جائے گی اللہ تعالیٰ ایسا عذاب مسلط کر دیتے ہیں کہ انسان ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ سب سے بڑی برائی کفر ہے اور سب سے بڑی نیکی ایمان ہے۔ مسلمان چاہے خدانخواستہ کتنا ہی معاصی میں مبتلا ہو جائے، لیکن مسلمان تو ہے۔ کافر کتنے اچھے کام کیوں نہ کر لے، غریبوں مظلوموں کی مدد کرے، بیواؤں یتیموں کی

مدد کرے، لیکن اصل برائی کفر اس میں موجود ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ایک وقت میری امت پر ایسا آئے گا کہ میری امت عذابوں میں مبتلا ہوگی۔ اور ان پر دشمن ایسے چڑھ دوڑیں گے جیسے بھوکا کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہوگی؟ کیا اس وقت مسلمان تھوڑے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمان تو بہت زیادہ ہوں گے، لیکن سیلاب آتا ہے اور اس کے اوپر جھاگ ہوتی ہے، اسی طرح مسلمان کمزور ہوں گے۔ اور یہ قاعدہ ہے: ''لَنْ يَصْلُحَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ كَمَا صَلَحَ بِهِ الْأَوَّلُ'' [اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن: ۸/۱۵۵] کہ اس امت کا آخر صلاح نہیں پا سکتا، مگر اس طریقے سے جس پر ہمارے سلف نے صلاح حاصل کی تھی۔ اور وہ یہ تھا کہ ان کے اندر حب دنیا نہیں تھی اور کراہیت الموت نہیں تھی۔

صدقہ وخیرات کے کچھ واقعات:

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اس دور میں تیس ہزار درہم کا عطیہ آیا۔ بی بی صاحبہ نے جونہی صدقہ خیرات شروع کی وہ سارے درہم چلا دیئے۔ اور اس دن بی بی صاحبہ کا نفلی روزہ تھا، شام کو جب افطار پر بیٹھیں تو سوکھے روٹی کے ٹکڑے کھجور کے چند دانے تھے۔ آپ کی کنیز نے عرض کیا: اگر دو درہم ہمیں دے دیتیں تو آج ہم کچھ پکا لیتیں۔ سیدہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم یاد دلا دیتی تو میں دے دیتی۔ اندازہ فرمائیں کہ تیس ہزار درہم (چاندی کے سکے) صدقہ خیرات ہو رہا ہے، اپنے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں اور اس کی یاد بھی نہیں آئی کہ میرے اپنے گھر میں بھی کھانا ہے یا نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے راستے میں سب کچھ دے دیا۔

حضور اکرم ﷺ ایک نماز کے لیے تشریف لے آئے، تکبیر ہوگئی، لیکن آپ ﷺ دوبارہ تشریف لے گئے، واپس آکر نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو صحابہ نے عرض کیا: آپ نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا کہ تکبیر ہونے کے بعد گھر چلے جائیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اصل بات یہ ہے کہ جب میں مصلے پر آ گیا تو مجھے یاد آ گیا کہ میرے گھر میں سونے کا ٹکڑا پڑا ہوا ہے تو میں نے کہا نبی کی شان نہیں ہے کہ وہ نماز پڑھائے اور گھر میں سونا رکھا ہو۔ تو میں جا کر اس کو خیرات کرنے کا حکم دے کر آیا۔ حضور اکرم ﷺ نے سلام پھیرا اور جبرئیل علیہ السلام نے آکر عرض کیا: آپ کے رب نے سلام بھیجا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر چاہو تو پہاڑ سونے کے بنا کر آپ کے ساتھ بھیج دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں اپنے اللہ سے اتنا چاہتا ہوں کہ ایک وقت کا کھانا مل جائے، شکر کر

لوں اور ایک وقت نہ ملے تو صبر کر کے مانگ لوں۔ بس اتنا چاہیے اور کچھ نہیں چاہیے۔

اور جس دن تک حضور اکرم ﷺ کی اس سنت پر طرز عمل جاری رہا مسلمان کامیاب رہے۔

بزرگوں نے دنیا کی مثال سمجھائی ہے، جیسے کشتی کے لیے پانی ہوتا ہے۔ اگر پانی کشتی کے نیچے ہوتا ہے تو کشتی کو چلانے کا باعث بنتا ہے۔ اگر وہی پانی کشتی کے اندر داخل کر دو تو کشتی کو غرق کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا کی مثال ہے۔ اگر یہ دولت دین کے تابع ہو جائے تو کامیابی ہے، لیکن جب دولت دل میں داخل ہو کر حب دنیا بن گئی اور موت کی کراہیت کا سبب بن گئی تو ہلاکت کا دور آ گیا۔

صحابہ کرام ؓ کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی۔ اس زمانہ میں ان کو اتنا مال ملا جس کا ہم تصور نہیں کر سکتے، لیکن ان کے دل میں حب دنیا نہیں تھی، ان کو اللہ اور اللہ کے احکام سے محبت تھی اور موت سے کراہیت نہیں تھی، ان کو یقین تھا کہ موت کا وقت معین ہے، نہ آگے ہو سکتی ہے اور نہ پیچھے ہو سکتی ہے۔ اور موت سے ڈر نہیں لگتا تھا۔

(واقعہ) ابوجعفر المنصور بادشاہ تھا۔ اس کی خدمت میں ایک اللہ کے بزرگ آئے تو بادشاہ نے ان سے کہا: مجھے ایک بات سمجھائیں کہ مجھے موت سے بڑا ڈر لگتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ جب میں کسی کا جنازہ دیکھتا ہوں اور قبر کو دیکھتا ہوں تو میں کانپ جاتا ہوں اور میری نیندیں اڑ جاتی ہیں، حالانکہ موت تو ضرور آنی ہے، پھر مجھے اتنا ڈر کیوں لگتا ہے؟ ان بزرگوں نے فرمایا: بڑی سیدھی سی بات ہے۔ آپ مجھے بتائیں کہ آدمی گھر کو چھوڑ کر ویران گھر میں جائے گا تو اس کو ڈر لگے گا یا ڈر نہیں لگے گا؟ اسی طرح ایک آدمی ویرانے کو چھوڑ کر آباد گھر میں جائے تو اس کو راحت وخوشی ہوگی کہ میں جنگل سے شہر میں آ گیا، لیکن اگر اس کو شہر سے جنگل میں ڈال دو تو صاف ظاہر ہے ڈرے گا۔ آپ کو بھی اس لیے ڈر لگتا ہے کہ آپ نے اس دنیا کے گھر کو آباد کر لیا اور آخرت والے گھر کو برباد کر دیا ہے۔ جب وہ اگلا گھر برباد لگتا ہے تو آپ کو ڈر لگتا ہے۔ مومن کو آخرت والے گھر سے ڈر اس لیے نہیں لگتا؛ کیونکہ اس کے لیے یہ دنیا ویرانہ ہے اور آخرت راحت ونعمت ہے۔

دنیا اور کراہیت الموت کو جب تک آپ ختم نہیں کریں گے اس وقت تک آپ ترقی نہیں کر سکتے۔ جب دنیا سے محبت ہوگی تو گھر سے باہر (جہاد کے لیے) نہیں نکلو گے۔ اگر دوسرا بھی کوئی دین کے لیے نکلتا ہے تو اس پر بھی مذاق اڑاؤ گے کہ دیکھو! یہ بستر بند آئے پھرتے ہیں۔ اور گھر کے اندر بیٹھ کر ان پر باتیں بناتے ہیں۔ اللہ کے بندے! اگر کوئی بندہ اپنا گھر وطن چھوڑ کر سنت انبیاء کے طریقے کو قائم رکھ کر تبلیغ کے لیے نکلا ہے، اس کو اچھا نہیں سمجھتے ہو تو نہ

سمجھو، لیکن ان کی برائی تو نہ کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک دن ان کے ساتھیوں نے عرض کیا کہ کبھی کبھی جنگ میں آپ ایسا اقدام فرماتے ہیں جو عقل کے خلاف ہوتا ہے کہ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے اندر گھس جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: جس سے موت ڈرتی ہو اس کو کیا پریشانی ہے؟ ساتھیوں نے پوچھا: وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: کیا موت وقت سے پہلے آسکتی ہے؟ ساتھیوں نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: جب وہ مجھ سے ڈر رہی ہے تو مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ [البقرة: ۲۴۳] یہاں رؤیت سے بصری رؤیت مراد نہیں ہے! کیونکہ یہ واقعہ حضور اکرم ﷺ کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے کا ہے۔ رؤیت دو قسم کی ہوتی ہے: ایک آنکھوں سے دیکھنا اور دوسری رؤیت قلبیہ بمعنی علم ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ①﴾ [الفیل: ۱] کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ہاتھیوں والے بادشاہ کا کیا انجام کیا؟ حالانکہ حضور اکرم ﷺ اسی سال پیدا ہوئے تھے جس سال ہاتھیوں والا بادشاہ آیا۔ آپ ﷺ نے وہ واقعہ نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے معنی یہ ہے کہ اے میرے مدنی! کیا آپ نہیں جانتے ہاتھیوں والے بادشاہ کے ساتھ کیا واقعہ گزرا؟ جو قصہ زیادہ مشہور ہو جائے تو وہ ایسے ہے گویا ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بہر حال یہاں اس آیت کے اندر رؤیت علمیہ مراد ہے۔ اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ جس واقعہ کی خبر دینے والے رب العالمین ہوں اس کی حقانیت میں یہاں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

''اُلُوْف'' جمع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ جمع کثرت ہے اور یہ دلالت کرتی ہے کہ دس سے زیادہ ہوں، یعنی وہ دس ہزار سے بھی زیادہ تھے۔

دس ہزار کا لشکر موت سے ڈر کر بھاگا، سب مر گئے:

ایک بستی کے اندر ایک وبا آگئی۔ جس سے آدمی مرنے لگ گئے تو ان ہزاروں آدمیوں نے سوچا کہ ہم یہاں سے نکل جائیں، نہیں تو سارے مر جائیں گے۔ فلاں پہاڑ کے درمیان خوبصورت وادی ہے، وہاں چشمے ہیں، ہم سب لوگ وہیں چلے جاتے ہیں، وہاں چشمے کے صاف پانی ہوں گے اور یہ بیماری تو اس بستی میں آئی ہے، وہاں نہیں آئی، اس لیے ہم وہاں جائیں گے، اگر یہاں رہ گئے تو مر جائیں گے۔ تو موت کی ڈر کی وجہ سے ہزاروں اس بستی کو

چھوڑ کر نکل پڑے۔ جب وہ اس وادی میں جا کر جمع ہو گئے تو مطمئن ہو گئے اور کہنے لگے: ہم نے بڑا اچھا کیا! اگر ہم بستی میں ہوتے تو مر جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مر جاؤ۔ مفسرین کے اس میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود حکم دے دیا کہ مر جاؤ۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو حکم دیا کہ ایک وادی کے ایک سرے پر کھڑے ہو جاؤ اور دوسرا دوسرے پر کھڑا ہو جائے اور ایک ایسی آواز لگاؤ کہ ان کے دل پھٹ جائیں۔ ان فرشتوں نے آواز لگائی تو یہ سارے لوگ دہشت سے مر گئے، لیکن فرشتے بھی تو اللہ تعالیٰ کے حکم تابع ہیں، اس لیے فرمایا: ''مُوْتُوْا'' اب دس ہزار آدمی کہاں دفن کریں؟ جو لوگ باہر والے باقی بچے تھے، انہیں پتہ لگا کہ جو بھاگ کر گئے تھے وہ مر گئے۔ انہوں نے جب وہاں جا کر دیکھا کہ ساری لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ ان کے دفن کا انتظام کریں، اس طرح کرو کہ جہاں پڑے ہیں پڑے رہیں، ان کے باہر دیوار دے کر یہیں ان کو بند کر دو۔ کون دس ہزر قبریں کھودے؟ تو انہوں نے باہر دیوار دے کر بند کر دیا اور وہی جگہ ان کی قبر بن گئی۔

حضرت حزقیل علیہ السلام اللہ کے ایک نبی تھے، وہ اتفاق سے وہاں سے گزرے تو حیران ہو گئے کہ اتنی بڑی قبر ہے۔ انہوں نے جب معلومات فرمائی تو ان کو پتہ چلا کہ یہ فلاں بستی کے لوگ تھے۔ یہ موت کے ڈر سے بھاگے تھے۔ جب یہاں آئے تو موت آ گئی۔

اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ دنیا میں اللہ کے منکر، انبیاء کے منکر پیدا ہوئے، صحابہ کرام کے منکر پیدا ہوئے، اہل بیت کے منکر پیدا ہوئے، اولیاء کے منکر پیدا ہوئے اور قرآن وحدیث کے منکر پیدا ہوئے، لیکن موت کا کوئی منکر پیدا نہیں ہوا؛ کیونکہ ڈنڈے کا انکار کون کرے؟ فرق اتنا ہے کہ کافر کہتا ہے کہ ہارٹ فیل ہو گیا۔ اگر وقت پر ہسپتال لے آتا تو شاید بچ جاتا۔ جبکہ مسلمان کہتا ہے: وقت مقرر ہے، چاہے لے آتے یا نہ لے آتے، مرنا تو تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ [النساء: ۷۸] تم بڑے اونچے اونچے مضبوط مکان بنا کر اندر بیٹھ جاؤ، لیکن موت کے وقت میرے فرشتے کو نہیں روک سکتے۔

طاعون زدہ بستی میں جانے کا حکم:

اگر کسی بستی میں طاعون (وبا) پھیل جائے تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تم بستی میں ہو تو باہر نہ نکلو اور اگر باہر ہو تو اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اسی کے اندر حکمتیں ہیں؛ کیونکہ اگر بستی سے باہر جاؤ گے تو لوگوں کے لیے

عذاب کا باعث بنو گے اور اگر سب نکل جاؤ گے تو غریبوں کے کفن دفن کا انتظام کون کرے گا؟ اور اگر اس نیت سے نکلو گے کہ اگر میں بستی میں رہوں گا تو مر جاؤں گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری مرضی ہو تو طاعون کی وبا میں رہو اور موت نہ آئے۔ کتنے لوگ ہیں جو جنگوں کے اندر ٹینکوں کے نیچے سو گئے، لیکن نہیں مرے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو گھر میں کرسی پر اچھے خاصے بیٹھے ہوئے ہیں وہیں ختم ہو گئے۔ اس لیے فرمایا: تم موت سے نہیں بھاگ سکتے۔ تم میرا شکر کرو، یعنی میرے احکام کی پابندی کرو۔

کیا تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے سے اس لیے ڈر رہے ہو کہ موت آ جائے گی؟ فرمایا: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ: ۲۴۴] جان لو کہ اللہ تعالیٰ سننے والے بھی ہیں اور جاننے والے بھی ہیں۔ ان کو پتہ ہے کہ تمہارے اندر کتنا اخلاص ہے؟ آگے فرمایا: تم جہاد سے اس لیے بھاگتے ہو کہ تمہیں دولت سے محبت ہو گئی۔ فرمایا: آؤ! میں تمہیں راستہ بتاؤں: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے جس کا مال بھی ختم نہ ہو اور وہ کبھی رو کیں بھی نہیں۔ تم تو بینکوں کے اندر دیتے ہو، کہیں پانچ فیصد اور کہیں سات فیصد پر دیتے ہو اور کبھی وہ بینک دیوالیہ ہو کر تیرا اصل بھی برباد کر دیتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تو وہ ربّ کریم ہوں جو ایک کا دس گنا دے دوں، سات سو گنا دے دوں، لاکھ گنا دے دوں یا اس سے بھی بڑھا دوں، میری مرضی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ﴾ میں چاہوں تو رزق تنگ کر دوں اور میں چاہوں تو تیرا رزق کھول دوں۔ تم سب نے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اس لیے تم میرے احکام کی پابندی کرو۔

وبا اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: طاعون یا جو وبائیں ہیں یہ ایسی بیماریاں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی قوموں کو عذاب دیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عذاب دینا چاہتے ہیں تو اس قوم پر بیماریاں مسلط کر دیتے ہیں۔ وبا کی بیماری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ جیسا کہ طاعون یہ ایسی بیماری ہے جس سے ایک گلٹی پیدا ہوتی ہے، جس کے فوراً بعد بندے مر جاتے ہیں اور اس پر کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا۔

وبا والی بستی میں داخل ہونے کا حکم:

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب شام کی طرف جانے لگے تو وہاں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ ہزاروں آدمی ایک دن میں مر

جاتے تھے۔ راستے میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو آپ نے مجلس مشاورت طلب کی کہ کیا مشورہ ہے؟ ہم وہاں داخل ہوں یا نہ داخل ہوں؟ ساتھیوں نے کہا: ہمیں جانا چاہیے۔ جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے وہی ہوگا۔ اور کچھ صحابہ نے مشورہ دیا کہ نہیں جانا چاہیے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سب کی رائے سننے کے بعد بڑے غور وفکر کے بعد فیصلہ فرمایا۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اس بستی میں داخل نہ ہوں۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کاش! یہ بات کوئی دوسرا کہتا اور تم یہ بات نہ کہتے۔ اتنے علم والے ہوکر یہ بات کہہ رہے ہو!؟ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ کر اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سنی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کسی علاقے میں وبا ہے، تم باہر ہو تو وہاں داخل نہ ہو اور اگر تم اس بستی کے اندر ہو تو باہر نہ نکلو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے:......الحمد للہ!......اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے اسی فیصلے کی توفیق دی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ [صحیح البخاری: رقم: ۵۷۲۹، صحیح مسلم: ۲۲۱۹]

حدیث:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کسی آدمی کو کوڑھ کی بیماری لگی ہوئی ہے، اس سے تم ایسے بھاگو جیسے انسان شیر سے بھاگتا ہے۔ اور دوسری جگہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی چیز تجاوز نہیں کرسکتی جب تک کہ میرا اللہ فیصلہ نہ فرمائے۔ ایک اعرابی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ بعض بیماریاں تو ایسی ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کو لگ جاتی ہیں، جیسے ہمارے اونٹوں کے اندر خارش کی بیماری ہوتی ہے۔ اگر ایک اونٹ کو یہ بیماری لگ جائے تو اس طرح سارے اونٹوں کو لگ جاتی ہے۔ تو یہ بیماری تو ایک دوسرے سے لگ رہی ہے؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ أَجْرَبَ الْأَوَّلَ؟'' مجھے یہ بتاؤ کہ جس پہلے اونٹ کو بیماری لگی اس کو کس نے بیمار کیا؟ اس نے کہا: اس کو تو اللہ تعالیٰ نے بیمار کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندے کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ بیماری اور شفا میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ایک اسباب ہیں جیسے ٹی بی کی بیماری ہے یا جذام کی بیماری ہے یا......اللہ تعالیٰ معاف کرے......ایڈز ہے جو انسانوں کے غلط جنسی ملاپ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ ایسی بلا ہے جس کا آج تک علاج نہیں ہوسکا اور ایسی

[ابن ماجہ: رقم: ۳۵۳۹، کنز العمال: رقم: ۲۸۶۳۹]

بیماری ہے جو دوسرے کے کپڑے پہننے سے بھی لگ سکتی ہے اور زیادہ تر خون کے انتقال سے لگتی ہے۔ خدا کی شان یہ ہے کہ پہلے دور میں ان باتوں کا خیال بھی نہیں کیا جاتا تھا، یعنی اگر کسی آدمی کو خون دینے کی ضرورت ہوتی تو صرف یہ تحقیق کی جاتی تھی کہ ان کا آپس میں گروپ ملتا ہے یا گروپ نہیں ملتا؟ یہ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ اس خون میں کیا کیا بلائیں آرہی ہیں؟ یاد رکھیں! شریعت کا حکم یہ ہے کہ جتنی بیماریاں متعدی ہیں ان سے بچنے کی کوشش کرو اور یہ عقیدہ رکھو کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ بچائے تو میں بچ نہیں سکتا، لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے کہ میں اپنی طرف سے بچنے کی کوشش کروں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسا کہ اگر راستے میں کانٹے پڑے ہیں تو جتنا راستہ صاف ہے آپ اپنا قدم صاف جگہ پر رکھیں، کانٹوں پر نہیں رکھیں گے؛ کیونکہ یہ عقل کا تقاضا ہے۔ آپ ہمیشہ اس راستے پر چلیں گے جو صاف ہوگا، لیکن اگر مقدر میں ہے تو کہیں نہ کہیں کانٹا لگ ہی جائے گا۔

﴿يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ کی تفسیر:

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ﴾ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرضہ دے؟ قرض کا معنی ہوتا ہے اگر سو ریال دے رہا ہوں تو واپس سو ریال لوں گا۔

اب اس کے بعد تین فرقے بن گئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو یہودی کہنے لگے ''إِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ أَغْنِيَاءُ'' مسلمانوں کا خدا غریب ہوگیا۔ دوسرا یہ بن گیا اور انہوں نے بخل کیا، اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہ کیا۔ اور تیسرا مومنوں کا گروہ ہے۔ حضرت ابوالاحراح رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی نے جب یہ آیت سنی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کرنے لگے: اللہ میاں قرض مانگتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: آپ گواہ ہوجائیں! میری جائیداد دو باغ ہیں جو سب سے اعلیٰ ہیں، میں یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک رکھ لو اور ایک دے دو۔ اس نے کہا: حضور! جو میرا سب سے اچھا باغ ہے جس میں چھ سو کھجوریں ہیں اور وہ بہترین باغ ہے وہ اپنے رب کو قرض دیتا ہوں۔ جب واپس آئے تو بیوی بچے اسی باغ میں تھے۔ باہر کے دروازے پر کھڑے ہوکر کہا: میری بیوی اپنے بچوں کو لے کر باہر نکل آؤ۔ ہم نے یہ باغ قرض دے دیا ہے، اب ہمارا اس میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مانگا ہم نے دے دیا۔

[المعجم الکبیر: ۲۲/۳۰۱]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم وہاں قرض کیوں نہیں دیتے جہاں ڈوبنے کا خطرہ نہیں اور وہاں قرض صرف قرض نہیں، بلکہ کئی گنا کر کے ہم دیں گے۔

اعتراض و جواب:

بعض بینکر جو جاہل ہوتے ہیں اس آیت کو لے کر کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ قرض لے کر واپس زیادہ کر رہے ہیں۔ اگر زیادہ دینا جائز نہ ہوتا تو خدا کیوں زیادہ دیتا؟ تو یہ ان کی جہالت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قرض کی ضرورت نہیں ہے اور اس آیت کا تو معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو۔

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض پر آدمی انعام دے اور مقرر نہ کرے، مثلاً: ایک آدمی نے تمہیں ایک ہزار ریال قرض دیا تو تم نے وعدے کے مطابق ہزار ریال بھی دے دیا اور ساتھ کوئی ہدیہ بھی دے دیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم میں وہ لوگ اچھے ہیں جو اپنے قرض کو بہتر طریقہ سے ادا کریں۔ تو غیر معین چیز انعام میں دینا جائز ہے۔ اور ایک ہے کہ فیصد مقرر کر دیا جائے یا قرض دیتے وقت شرط لگائی جائے کہ میں اتنا لوں گا تو جو قرض نفع کو کھینچے اس کا نام ''سود'' ہے۔

جہاد کی دو اقسام:

شروع آیت میں جہاد فی سبیل اللہ کا حکم ہے اور دوسرے حصے میں انفاق فی سبیل اللہ کا حکم ہے۔ تو یاد رکھیں! جہاد بھی دو قسم کا ہوتا ہے: ایک جہاد بالنفس کہ آدمی خود جا کر جہاد کرے اور ایک جہاد بالمال ہے کہ اگر آدمی خود نہیں لڑ سکتا یا خود وہاں نہیں پہنچ سکتا تو وہ اپنے مال کے ساتھ جہاد کرتا رہے۔ کیونکہ کسی مجاہد کو تیار کرنے میں برابر کا ثواب ہے۔ آج کل یہ سب سے بڑا المیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائیں کہ محض زبانی دعوؤں کے بجائے عملی اقدامات بھی فرمائیں۔ آج جو سب سے بڑا مسئلہ پیدا ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے موقعوں سے دشمن بڑا فائدہ اٹھاتا ہے کہ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے، ان کے والدین فوت ہو گئے تو کافران چھوٹے بچوں کو لے جاتے ہیں اور اپنے مشنری سکول میں داخل کر دیتے ہیں۔ بظاہر تو وہ بڑی ہمدردی کر رہے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب بچہ بڑا ہوگا تو وہ عیسائی ہو جائے گا، اگر یہودی نے اس کو لیا ہے تو یہودی ہو جائے گا۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ما

مِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ أَوْ يُنَصِّرَانِهٖ أَوْ يُمَجِّسَانِهٖ''[1] (اللہ تعالیٰ ہر بچے کو دین فطرت پر پیدا فرماتے ہیں (یعنی اس کے دل کی پلیٹ صاف ہوتی ہے) اگر اس کے ماں باپ یہودی ہیں تو اولاد کو یہودی بنا ڈالیں گے، اگر نصرانی ہیں تو اولاد کو نصرانی بنا ڈالیں گے اور اگر مجوسی ہیں تو مجوسی بنا ڈالیں گے)۔ اور ان معاملات میں یہودیت اور نصرانیت زیادہ متحرک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مذہب میں کوئی دل کشی نہیں رہی، اب کوئی آدمی عقل وفکر سے یا ان کی کتابیں پڑھ کر یہودی یا عیسائی بنے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو اب وہ یہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان کی غربت کا فائدہ اٹھاتے ہیں کہ ان کو نوکری کا لالچ دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ایسے مظلوم کی فیملی کو پناہ دے دے، ان کو تحفظ دے دے اور ان کے بچوں کو اپنی اولاد بنالے تو یہ بہت بڑا جہاد ہے۔

پورے دین کا اگر خلاصہ نکالا جائے تو دو لفظوں میں نکل سکتا ہے: ''اَلْعَظَمَةُ لِلْخَالِقِ وَالشَّفَقَةُ عَلَى الْمَخْلُوْقِ'' (خالق کی دل میں عظمت آجائے اور مخلوق کی دل میں شفقت آجائے) اسی کا نام اسلام ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت جب دل میں آجائے گی تو نماز روزہ سب آجائے گا، اللہ تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت ہوگی اور نواہی سے بچ جائے گا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت آئے گی تو اب وہ زکوٰۃ وصدقات بھی دے گا، خیرات بھی کرے گا، ہمسائے کے حقوق کا خیال بھی کرے گا اور بیوہ ویتیم پر رحم کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا معنیٰ:

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا کیا معنیٰ ہے؟ یہاں مفسرین کرام نے دو قول نقل فرمائے ہیں: بعض حضرات فرماتے ہیں: اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کون ہے جو اللہ کے بندوں کو قرض دے؟ اور بعض علماء نے فرمایا: حدیثِ الٰہی ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تم نے میری عیادت نہ کی، میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہ دیا اور میں ننگا تھا تو نے مجھے کپڑا نہ پہنایا۔ بندہ حیران ہو کر کہے گا: آپ کیسے مریض ہو سکتے ہیں؟ آپ تو ہر صفتِ نقصان سے منزہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرا فلاں بندہ بیمار تھا، اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، میرا فلاں بندہ بھوکا تھا تو اگر اس کو کھلاتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا اور میرا فلاں بندہ ننگا تھا تو نے اس کو لباس نہ پہنایا یعنی جب تو میرے بندے کو صرف میری رضا کے لیے کھلا رہا ہے تو مجھے دے رہا ہے؛ کیونکہ

[1] [صحیح مسلم: رقم: ۶۷۵۹؛ مسند احمد: رقم: ۷۶۹۸،۷۱۸۱]

جب بھی کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی عظمت کو سامنے رکھ کر اقدام کرتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے۔

غریب آدمی کو کوئی قرض نہیں دے گا اور اگر کوئی بڑی پارٹی ہے اور اس کے معاملات کاروبار ٹھیک ٹھاک ہیں، وہ جس بڑی فرم کو کہیں گے ان کو فوراً قرضہ مل جائے گا؛ کیونکہ ان کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ محفوظ مقام ہے، میرا پیسہ ڈوب نہیں سکتا ہے۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بدبختو! سوچو! جب تمھیں بندوں میں پارٹی مضبوط ملے تو قرضہ دے دیتے ہو تو اپنے خدا کو نہیں دیتے ہو؟ جہاں نہ خزانے ختم ہونے کا مسئلہ ہے اور نہ پیسے ڈوبنے کا مسئلہ ہے۔اسی لیے اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو تیار کیا کہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے؟ جب تم کسی مظلوم ومحتاج کو قرض حسنہ دیتے ہو (جس کے اوپر کوئی منافع چارج نہ کیا جائے) تو اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اس کو کئی گنا ثواب عطا فرمائیں گے۔

مفسر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ حکم کئی جگہ پر عطا فرمایا ہے۔حدیث نزول میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''مَنْ يُقْرِضُ غَيْرَ عَدِيْمٍ وَلَا ظَلُوْمٍ'' کون ہے جو ایسی ذات کو قرضہ دے جہاں قرضہ ڈوبے گا بھی نہیں اور پھر قرضے کا قرضہ نہیں ملے گا، بلکہ ہم اس کو کئی گنا بڑھا دیں گے۔[صحیح مسلم: رقم: ۷۵۸]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَا نَقَصَ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ'' اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا، اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں برکتیں عطا فرماتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عطا فرماتے ہیں۔[مجمع الزوائد: رقم: ۴۵۷۹، البزار: ۱/ ۱۸۷]

بعض علماء نے فرمایا: جو آدمی اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے وہ بھی قرض حسنہ میں آتا ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا میں خرچ کر رہا ہے۔بعض علماء نے فرمایا: جو آدمی ''سبحان اللہ'' اور ''الحمد للہ'' کہہ رہا ہے یہ بھی قرض حسنہ ہے۔ یاد رکھیں! اگر اللہ تعالیٰ پیسے کا کہہ دیں تو پیسے دو، غریب کو کھانا کھلا دو۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر مسلمان بھائی ملے تو مسکرا کر ملنے پر بھی اللہ تعالیٰ صدقہ کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

فرمایا: ولیمہ وہ سب سے برا طعام ہے جس میں امیروں کو کھلایا جاتا ہے اور غریبوں کو بھگایا جاتا ہے۔حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جو مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کو جتنی رقم قرض دے رہا ہے اس سے دوگنی رقم کا اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرماتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قرض آدمی اس وقت مانگتا ہے جب ہر طرف سے وہ مجبور ہو جاتا ہے

اور کوئی حل نہیں ہوتا۔ قرضے کے لیے آدمی اپنے آپ کو سائل بنا کر کسی کے سامنے لے آئے، یہ آسان کام نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آج کل لوگوں نے اس کو ذریعہ معاش بنا لیا ہے، لیکن چند ایسے گھٹیا قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن کو نہ اللہ تعالیٰ کا ڈر ہوتا ہے اور نہ بندوں کے حقوق کا خیال ہوتا ہے، ورنہ قرض بیماری اور موت ہے۔ اب کوئی قرض مانگنے کے لیے آ گیا تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ انتہائی محتاجی کی حالت میں ہے۔ جب بندہ ایسے آدمی کی مدد کرتا ہے اور بغیر کسی لالچ اور سود کے دیتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو دو گنا صدقے کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

حدیث: اللہ تعالیٰ چاہیں تو معمولی سی نیکی پر اتنی بڑی نعمت مل جاتی ہے جہاں لاکھ گنا کا تصور بھی نہیں ہوتا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سابقہ امتوں کے اندر ایک عورت تھی، جس کی ساری زندگی فسق و فجور میں گزر گئی۔ اس کو سفر کے دوران پیاس لگی۔ جب پیاس کی شدت نے اسے تنگ کیا، اس نے پانی تلاش کیا تو اس کو راستے میں ایک کچا کنواں مل گیا۔ اس نے دیکھا وہاں کوئی ڈول وغیرہ نہیں ہے، بہرحال اس نے اپنے ڈوپٹے کے ساتھ جوتا باندھ کر پانی میں ڈالا اور جب پانی باہر نکالا تو دیکھا ایک کتا کنویں کے کنارے پیاس کی شدت کی وجہ سے تڑپ رہا ہے۔ اس عورت نے بجائے اپنے منہ میں پانی ڈالنے کے اس کتے کے منہ میں ڈالا۔ جب کتے کو پانی ملا تو اس کو بھی ہوش آ گیا۔ عورت نے پھر دوبارہ پانی نکال کر خود پیا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس کو خبر دی گئی کہ ہم نے تیرے سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ تو نے میرے ایک جانور پر رحم کیا میں نے تم پر رحم کیا۔

اب دیکھیں! ایک پانی کے گھونٹ کے بدلے میں جنت مل گئی، ورنہ یہاں کون جنت کی قیمت لگا سکتا ہے؟

جنت میں درخت لگانے کا مطلب:

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمانو جنت کی زمین چٹیل میدان ہے۔ اگر تم اپنے باغ لگانا چاہتے ہو تو لگا لو۔ اب صحابہ نے عرض کیا: ہم جنت میں باغ کیسے لگائیں؟ ابھی تو جنت میں داخل ہی نہیں ہوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم تسبیحات "سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ" پڑھا کرو۔ جب بندہ "سبحان اللہ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں: میرے بندے کے لیے جنت میں ایک درخت لگا دو۔ اب تم جتنی تسبیحات پڑھتے جاؤ گے اپنا باغ بڑھاتے جاؤ گے۔ [ریاض الصالحین: ۲/۲۶۷]

خیرات کرنے میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ تم ہزاروں لاکھوں خیرات کرو، بلکہ ہر آدمی کے اللہ تعالیٰ نے حالات

پیدا فرمائے ہیں۔ ایک آدمی ایک لاکھ بھی خیرات کر دے کوئی فرق نہیں پڑتا، ایک آدمی دو ارب بھی خیرات کر دے تو اس کے لیے بہت بڑی چیز ہے اور ایک آدمی ایک سو بھی خرچ کرے تو بڑی چیز ہے۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ تھوڑے پیسے ہیں۔ جو تم درد دل سے دو گے وہ ایک پیسہ بھی تمہیں جنت میں لے جائے گا۔

بازار میں داخل ہونے کا عمل اور بیش بہا ثواب:

حدیث: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ دَخَلَ سُوقًا مِنْ أَسْوَاقِ '' مثال: جو شخص بازاروں میں سے کسی بازار میں جائے، بازار کے اندر جاتے ہوئے یہ کلمہ پڑھے ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ'' تو اللہ پاک اس کو دس لاکھ نیکیاں عطا فرماتے ہیں اور دس لاکھ گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ [جامع الترمذی: رقم: ۳۴۲۹]

یاد رکھیں! اگر ایک آدمی کے گناہ نہیں ہیں تو ان کے درجات بلند ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک وظیفہ بنا لو کہ جب بھی بازار میں داخل ہوا کریں تو یہ کلمہ ضرور پڑھا کریں۔

اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے بری جگہ بازار ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''أَحَبُّ الْبِلَادِ إِلَى اللّٰهِ الْمَسَاجِدُ وَأَبْغَضُ الْبِلَادِ إِلَى اللّٰهِ هُوَ أَسْوَاقٌ '' زمین میں سب سے بہتر ٹکڑا اللہ تعالیٰ کی مسجدیں ہیں؛ کیونکہ جب آدمی مسجد میں آئے گا، چاہے وہ کتنا گیا گزرا ہو، نماز پڑھے گا، قرآن پڑھے گا۔ اور فرمایا: سب سے بری جگہ بازار ہیں؛ کیونکہ لین دین میں جھوٹ بولنا، قسم کھانا اور عورتوں مردوں کا اختلاط ہوتا ہے تو جب وہاں کوئی آدمی جا کر اپنے اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کو اتنا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

حدیث: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ﴾ [البقرۃ: ۲۶۱] کہ جب کوئی بندہ نیکی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سات گنا بڑھا کر ثواب دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے دعا مانگی: اے اللہ! میری امت کو اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ آیت نازل فرمائی: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ [البقرۃ: ۲۴۵] تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! میری امت کو اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرما تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیت

[مصنف ابن ابی شیبہ: ۷/ ۳۴۱، حاکم: ۳/ ۴۹]

نازل فرمائی: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر:۱۰] اے میرے نبی! تیری امت ﷺ میں صبر کرنے والوں کو جو ثواب دیں گے اس کا کوئی حد وحساب نہیں ہوگا۔ [صحیح ابن حبان:۲۹۲۹]

اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے: جن لوگوں پر ابتلاء آیا ہے کہ کسی کو بیماری دی اور کسی کی آنکھیں لے لیں ﷺ کسی پر مال کا ابتلاء آ گیا، لیکن اس نے صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر قضا پر راضی ہوا۔ جب قیامت والے دن ان لوگوں کو ثواب ملتا دیکھیں گے تو لوگ یہ تمنا کریں گے کہ دنیا میں ان کے وجود کو مقراض (قینچی) سے ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا تو بہتر ہوتا، تا کہ آج ہمیں اس کا بھی ثواب ملتا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں جس کی آنکھیں لے لوں وہ میری رضا پر راضی رہے اس کے بدلہ میں جنت واجب کر دیتا ہوں۔ [الجامع الصغیر:۳/۲۴۲]

حضرت کعب بن احبار رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ ان کے پاس ایک آدمی نے آ کر کہا: میں نے ایک بندے کو کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝﴾ پڑھ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک کروڑ کمرے موتیوں اور یاقوت سے جنت میں بنا دیتے ہیں تو کیا میں اس کی بات مان لوں؟ آپ نے فرمایا: مان لو۔ تم کیوں تعجب کر رہے ہو؟ میں کہتا ہوں: دو کروڑ اور تین کروڑ بھی اللہ تعالیٰ دے سکتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں ﴿أَضْعَافًا كَثِيرَةً﴾ کہ میں ڈھیر سارا دوں گا تو اس کا حساب کون لے سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ جس کا رزق تنگ کرتے ہیں اس میں بھی حکمت ہے اور جس کا بڑھا دیتے ہیں اس میں بھی حکمت ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے حال کو جانتے ہیں۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۴۶]

''کیا آپ نے موسیٰ کے بعد بنی اسرئیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا جب انہوں نے اپنے نبی پاک سے کہا ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ فرمایا کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دے دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو؟ کہنے لگے: ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں ہمارے گھروں سے اور ہماری اولاد سے نکال دیا گیا ہے۔ پھر جب ان کو جہاد کا حکم ہوا تو سب پھر گئے، مگر ان میں سے تھوڑے سے اور اللہ کو گناہگار معلوم ہیں۔''

تفصیل واقعہ:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ایک خاص واقعہ کا ذکر فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کی قوم اپنے وقت کے نبی کے پاس آئی...... اس پیغمبر کے نام میں مختلف اقوال ہیں۔ اور نام معلوم ہو جانے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں اور نام نہ معلوم ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں، مقصد ایک واقعہ سنانا ہے۔ اب اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ آنے والے لوگ کون تھے؟ ان کے کیا نام تھے؟ اور ان کے نبی کا کیا نام تھا؟ ان کا حسب نسب کیا تھا؟ اس پر اللہ تعالیٰ کا قرآن متوجہ نہیں فرماتا۔ بس ایک واقعہ بیان کرنا مقصد ہے۔ البتہ محققین مفسرین نے کتب سابقہ سے یہ بات نقل فرمائی ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کافی پہلے کا ہے...... اصل میں یہ ہوا تھا کہ بنی اسرائیل اپنی بداعمالیوں میں پڑ گئے اور حد سے نکل گئے تو ان پر اللہ تعالیٰ نے ایک عذاب مسلط کیا کہ جالوت نام کے بادشاہ کو ان بنی اسرائیل پر مسلط کر دیا، جس نے ان پر پوری قوت کے ساتھ حملہ کیا اور اس نے مردوں کو قتل کر ڈالا، عورتوں کو کنیزیں بنا لیا، بچوں کو قیدی بنا لیا، ان کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا اور ان کو تباہ و برباد کر کے سب کچھ لوٹ کر واپس چلا گیا۔ اب اس قوم کو ہوش آیا اور اپنے نبی کے پاس آ کر کہنے لگے: آپ مہربانی کریں! اللہ تعالیٰ سے دعا کریں: اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کوئی اسباب پیدا کرے، ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کوئی قائد پیدا کرے، جس کی قیادت میں ہم جہاد کریں اور ہم اپنی اس ذلت کا بدلہ لیں۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے انہیں آیات کے اندر بیان فرمایا ہے۔

''اَلَمْ تَرَ'' اس سے مراد ایسا واقعہ اور ایسی بات ہے جو علم کے اندر ہو۔

''اَلْمَلَاِ'' سے مراد قوم کے سردار ہیں۔ اسی طرح قرآن نے کئی مقامات پر لفظ ''مَلَا'' کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد سردار ہیں۔ سرداروں کو ''مَلَا'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ سردار جب آتے ہیں تو مجالس کو بھر دیتے ہیں، لوگوں

کے دلوں کو ہیبت اور رعب سے بھر دیتے ہیں۔ یہ "فلاں" بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل تھے۔

اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب جہاد کیا جائے تو کسی کی قیادت میں کیا جائے۔ اب چاہے وہ خلیفۃ المسلمین کہلائے یا وہ بادشاہ کہلائے، چاہے وہ امیر المؤمنین کہلائے، بہرحال جہاد کے لیے ضروری ہے کہ قائد کی قیادت میں ہو، تب جہاد ہوگا، ورنہ فساد ہوگا۔

جب قوم کے سرداروں نے اللہ کے نبی سے آکر کہا کہ آپ ہمارے لیے کوئی سردار مقرر کریں تو انہوں نے فرمایا: میری قوم کے سردارو! تم بات ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن مجھے خوف آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم پر جہاد فرض کر دیا تو تم بھاگ جاؤ گے اور انکار کر دو گے۔ قوم نے کہا: ﴿وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا﴾ کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم انکار کر دیں، جبکہ ہمارے ساتھ تو اتنا برا سلوک ہو چکا ہے کہ ہمیں گھروں سے نکالا گیا ہے اور ہمیں اپنی اولادوں سے علیحدہ کر دیا گیا ہے؟ جالوت نے ہمارے اوپر ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے، یعنی جہاد تو ویسے اچھی چیز ہے اور جبکہ یہاں تو ایک داعیہ بھی موجود ہے کہ ہم اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ اب اگر آپ ہمیں بادشاہ اور قائد دیں گے تو ہم کیسے جہاد نہیں کریں گے؟

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۴۶] جب ان پر جہاد فرض ہو گیا تو قوم مکر گئی اور تھوڑے سے لوگ قائم رہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں ان لوگوں کو جو اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ﴾ [البقرۃ: ۲۴۷] یہ تفصیل ہے کہ اللہ کے پیغمبر نے کہا: تم جو کہتے تھے کہ ہم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دو، میں نے دعا کی ہے، اللہ تعالیٰ نے جہاد کا بھی حکم دے دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنایا ہے، تم اس کی قیادت میں جہاد کرو۔ قوم کہنے لگی: کمال ہے! ہم طالوت کو کیسے بادشاہ مان لیں؟ یہ تو غریب آدمی ہے، کپڑوں کو رنگنے والا بندہ ہے، ہم اس کو کیسے بادشاہ مان لیں؟ یعنی بجائے اللہ کے نبی کے فرمان کی اطاعت کے وہ اعتراض کرنے لگ گئے۔

اللہ تعالیٰ کے قرآن میں یہ ہمارے لیے اشارات ہیں کہ جب بھی مسلمان قوم نے جھگڑا کیا ہے تو اس لیے کیا ہے کہ فلاں ہمارا لیڈر بن سکتا ہے اور فلاں ہمارا لیڈر نہیں بن سکتا۔ جس وقت تک یہ جھگڑا نہیں تھا اس وقت تک کامیابی

ہی کامیابی تھی۔

بہر حال اللہ کے نبی نے قوم سے فرمایا: حضرت طالوت کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا وہ مؤید من اللہ ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب آدمی خود کسی عہدے کا مطالبہ نہ کرے، لیکن پھر اسے وہ عہدہ مل جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے ہیں۔ اور جب آدمی اپنی عقل سے عہدہ حاصل کرے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس کو اپنی عقل پر چلنے دو۔

اللہ کے نبی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کو تم پر دو خوبیاں دی ہیں: ایک تو اس کو علم میں فضیلت دی ہے اور دوسرا جسم میں بھی فضیلت دی ہے۔ یعنی علمی اعتبار سے بھی افضل ہے اور جسم کے اعتبار سے بھی افضل ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ اس زمانے میں بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ طاقت والے تھے، خوبصورت تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں علم بھی عطا فرمایا تھا۔ اس پر مفسرین نے لکھا ہے کہ جب جہاد کا قائد بنایا جائے اس میں یہ دو صفتیں ضروری ہیں، کیونکہ اگر جسمانی اعتبار سے درست نہیں ہوگا اور مریض ہوگا تو ایسا بندہ کسی دوسرے کے لیے کیا کام کرے گا؟ اور اس کی اپنی رعایا پر کنٹرول نہیں ہوگا۔ اور اگر علم نہیں ہوگا تو فیصلے کیسے کرے گا؟

آج بدقسمتی یہ ہے کہ ہم دونوں چیزیں نہیں دیکھتے ہیں۔ ایک کمپاؤڈر کلرک ڈاکٹر کے لیے ڈگری ضروری ہے، لیکن جو اسمبلی میں بیٹھے ہوئے ہیں ان کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۭ﴾ قوم نے اعتراض کیا تھا کہ حضرت جالوت غریب ہیں تو اللہ کے نبی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں اپنا ملک عطا کر دیں، ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۴۷] اللہ تعالیٰ وسیع فضل فرمانے والے ہیں اور ہر بات کو جاننے والے ہیں کہ اس کو کیوں منتخب کیا ہے؟

مفسر فرماتے ہیں: حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ وہ نبی حضرت یوشع بن نون علیہ السلام تھے۔ حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ نبی حضرت شمعون علیہ السلام تھے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں: ان کا نام شمویل تھا۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بعد ایک مدت تک سیدھے راستے پر رہے، یعنی دین موسیٰ پر جمے رہے، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، بعض لوگوں نے بت پرستی شروع کر دی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی ان کے اندر اپنے پیغمبر بھیجے، جو ان کو امر

بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہے اور وہ کوشش کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ان کو شریعت دی ہے اس پر قائم رہیں، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا بنی اسرائیل ہٹتے گئے اور دین کے اندر نئے نئے طریقے پیدا کرتے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ پاک کا ان پر غضب آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر دشمنوں کو مسلط کر دیا۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو قتل کیا اور ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل کو قیدی بنا لیا اور بنی اسرائیل کے بڑے بڑے شہروں پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہ دشمن ان میں سے جس سے لڑتا اس پر غالب آ جاتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب بنی اسرائیل تورات پر عمل کرتے تھے اور ان کے پاس ایک تابوت تھا، لیکن جب وہ خلاف پر تم گئے تو بعض بادشاہوں نے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو قتل بھی کیا اور قید بھی کیا اور تابوت بھی ان سے لے گئے۔ اس کے بعد ان سے کتاب تورات بھی چلی گئی۔ اب ان کے اندر بہت تھوڑے لوگ رہ گئے، جن کو تورات یاد تھی۔

یاد رکھیں! اس کے اندر شیعہ والے تابوت کا بنی اسرائیل والے تابوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جو بعض لوگ تعزیہ نکالتے ہیں یہ تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے روضہ کی شکل بناتے ہیں، جبکہ بنی اسرائیل کے پاس جو تابوت تھا وہ ایک صندوق تھا۔ آگے آپ پڑھیں گے کہ اس صندوق کے اندر سابقہ انبیاء کی کچھ چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

پہلے زمانے کے اندر جتنی کتابیں اتری ہیں وہ کتابیں الف سے لے کر یا تک صرف نبی کو یاد ہوتی تھیں، امت کو یاد نہیں ہوتی تھیں۔ یہ شان صرف امت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن نازل فرمایا وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں بھی محفوظ اور امت کے سینوں میں بھی محفوظ ہے۔ اسی طرح جو پہلی کتابیں تھیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کتابیں تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کو باقی رکھنے کا وعدہ نہیں فرمایا؛ اس لیے کہ ایک نبی کے بعد دوسرے نبی نے آنا ہوتا تھا، قوم کے اندر جتنی غلطیاں ہوتی تھیں وہ ان کی اصلاح کر دیتا تھا، لیکن آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین بنایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہے اور آپ کے بعد نئی شریعت نہیں آئے گی تو اللہ تعالیٰ نے یہ اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو ہم قیامت تک محفوظ رکھیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو اتریں گے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے تابع ہوں گے، وہ نئی نبوت لے کر نہیں آئیں گے، وہ تو پہلے سے نبی بن چکے ہیں۔

حضرت شمویل علیہ السلام کی پیدائش:

خاندان لاوی سے ایک عورت اپنے خاوند سے حاملہ تھی قتل ہو گئی۔ ایک عورت باقی تھی، وہ حاملہ تھی، اس کا خاوند

قتل ہو گیا۔ انہوں نے عورت کو حفاظت کے ساتھ کمرے میں بند رکھا، شاید اس سے کوئی لڑکا پیدا ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو نبوت عطا فرما دیں۔ وہ عورت دعائیں کرتی رہی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا پیدا ہوا، اس کا نام شمویل رکھا گیا...... شمویل کے معنی ہیں "سَمِعَ اللّٰهُ دُعَائِي" یعنی اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی۔ اور اسی طرح شمعون کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعائیں سن لیں...... بہر حال لڑکا پیدا ہوا اور جوان ہوا تو اللہ پاک نے اس کو بڑی اچھی جوانی عطا فرمائی۔ جب وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی بھیجی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: اب تم میری توحید بیان کرو اور لوگوں کو میری توحید کی دعوت دو۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دی۔ بنی اسرئیل نے ان سے مطالبہ کیا کہ تم مہربانی کر کے کسی کو ہمارا بادشاہ بناؤ، تاکہ اس کی قیادت میں ہم دشمنوں سے جا کر لڑیں۔ اب اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے فرمایا: اے لوگو! اگر میں دعا کروں اور بادشاہ بھی مقرر کر دوں تو تمہارا کیا اعتبار ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے تو تم نافرمانی کرو؟ وہ کہنے لگے: ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہم کیسے قتال نہیں کریں گے؟ جبکہ ہمیں قتل کیا گیا، ہمیں گھروں سے نکالا گیا، ہمیں بچوں سے جدا کیا گیا، ہمارے شہر چھن گئے اور ہماری اولادوں کو قید کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب ہم نے ان کو قتال کا حکم دیا تو سب کے سب جہاد سے پھر گئے، مگر تھوڑے لوگ قائم رہے اور باقی لوگوں نے اللہ کے نبی سے جو وعدہ کیا تھا ان کو پورا نہ کیا اور اپنے وعدے سے پھر گئے۔

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۲۴۷]

"اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ کہنے لگے: اس کو ہم پر حکمرانی کا حق کیسے ہو سکتا ہے؟ بلکہ ہم اس کی بہ نسبت حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور اس کو تو مالی وسعت بھی نہیں ملی۔ فرمایا: اللہ نے اس کو پسند کیا ہے تم پر اور اس کو زیادہ وسعت دی ہے علم اور جسم میں۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی سلطنت دیتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا ہے، سب جانتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے حضرت طالوت کو ان کا بادشاہ اور قائد مقرر کر دیا؛ کیونکہ وہ ان کے لشکر اور ان کی جماعت میں سے تھے، ان کے نبی کو ماننے والے تھے اور خود بھی اللہ تعالیٰ کے ولی تھے اور بڑے صالحین میں سے تھے۔ قوم نے کہا: کمال ہے! ہم طالوت کو کیسے بادشاہ مان لیں؟ یہ تو بادشاہ کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا۔ ہمارے ہاں بادشاہت لاوی کی اولاد سے چلی آ رہی ہے، یہ ان کی اولاد میں سے نہیں ہے اور یہ کسی بڑے خاندان کا فرد بھی نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے پاس دولت بھی نہیں ہے تو یہ ملک کو کیسے چلا سکتا ہے؟ لہٰذا ہم اس کو بادشاہ نہیں مان سکتے۔ اس سے تو ہم زیادہ حق دار ہیں۔ آپ ہمیں بادشاہ بنا دیں۔ اس طرح قوم نے بجائے اطاعت و فرمانبرداری کرنے کے اعتراض کیا، حالانکہ اسی آیت کے اندر قاعدہ مذکور ہے کہ بادشاہت ہو یا قیادت ہو، اس کے اندر دو اہم ترین صفات کا پایا جانا ضروری ہے: پہلی صفت یہ ہے کہ اس کے اندر علم ہو؛ کیونکہ اگر اس کی قوتِ علمیہ مضبوط نہیں ہوگی تو وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکے گا۔ اور دوسری صفت یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر بھی مضبوط ہو۔ ہزاروں سال پہلے جو فیصلہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا آج دنیا اسی نتیجہ پر آ گئی ہے کہ اگر کام کے لیے ویزہ لگوایا جائے تو وہ کہتے ہیں: پہلے میڈیکل کراؤ کہ کیا یہ آدمی اس کے لیے فٹ ہے؟ یہ تو بہت بڑی صفت ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ چن لیں۔ اللہ تعالیٰ کی چنائی میں کوئی نقص نہیں ہو سکتا، انسانوں کی چنائی میں نقص ہو سکتا ہے؛ کیونکہ چننے والا خود ناقص ہے، اس لیے کوئی نہ کوئی غلطی رہ سکتی ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کسی کو چن لیا ہو اس پر اعتراض کرنا سراسر جہالت و حماقت ہے۔

(دوسرا مسئلہ) اسلام کے اندر قومیت، نسل نسب و حسب کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اسلام نے فیصلہ فرما دیا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾ [الحجرات: ۱۳] ہم نے تم سب کو ایک نر اور مادہ سے پیدا کیا ہے، پھر ہم نے تمہاری شاخیں بنا دیں اور قبائل بنا دیے، تاکہ ایک دوسرے کو پہچاننا آسان ہو جائے۔

اس لیے اسلام کے فلسفے کو سمجھیں! دیکھیں! ابوجہل کتنا بڑا مکہ کا سردار ہے! لیکن جہنم کا حق دار ہے اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ غلام ہیں، لیکن جنت کے سردار ہیں۔ اس لیے اقبال نے کہا تھا:

؎ بلال از حبش ، صہیب از روم ، ابوجہل از مکہ

خدا کی شان دیکھو! بلال حبش سے آیا، صہیب روم سے آیا، لیکن ابوجہل مکہ میں پیدا ہوا اور جہنم میں گیا۔

ہاں کچھ قوموں کو اللہ تعالیٰ نے شرف دیا ہے تو ان کو اس پر اترانا نہیں چاہیے اور دوسروں کو حقیر نہ سمجھیں۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں نبی بھیجے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خاندانِ قریش میں محمد رسول اللہ ﷺ کو پیدا فرمایا تو قریش کی شان بھی بڑھ گئی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عرب کے اندر اپنا سب سے افضل نبی پیدا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک لغتِ عرب میں اتار دیا، اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ بھی عرب میں رکھا، اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کی زبان بھی عربی رکھی اور اللہ تعالیٰ نے عالمِ برزخ میں بھی عربی زبان رکھی۔ اس وجہ سے عرب کو فضیلت مل گئی۔ یہ کسی کو فضیلت مل جانا علیحدہ بات ہے اور کسی کو عمل کی بنا پر فضیلتیں ملیں۔ اور اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کو دوسرے مہینوں پر فضیلت عطا فرمادی تو یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ اگر چاہتے ہیں تو زبان کو فضیلت دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو مکان میں بھی فضیلت عطا فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو انسانوں میں بھی فضیلت عطا فرماتے ہیں، لیکن یہ سب میرے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی بندے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اعتراض کرے کہ اللہ تعالیٰ نے حج کے دن ذی الحجہ کیوں رکھے؟ اور محرم میں کیوں نہیں رکھے ہیں؟ کیونکہ ذی الحجہ کو پیدا کرنے والے بھی اللہ ہیں اور محرم کو پیدا کرنے والے بھی اللہ ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے کسی کو شرف عطا فرمایا ہے تو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کی تنقیص کرے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے، جس کو چاہے اونچا کردے اور جس کو چاہے کم تر کردے۔

﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ﴾ [آل عمران:۲۶]

بنی اسرائیل کا حضرت طالوت علیہ السلام کی بادشاہت پر اعتراض کرنا سرکشی کی دلیل تھی۔ ان کے لیے تو اولیٰ یہ تھا کہ وہ اپنے پیغمبر کی اطاعت کرتے اور اچھی بات کہتے۔ وقت کے پیغمبر نے ان کے اعتراض کا جواب دیا: اعتراض نہ کرو، اس کو تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے چن لیا ہے اور میں نے اس کو بادشاہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے نہیں بنایا، بلکہ جب تم نے مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ طالوت کو بادشاہ بناؤ۔ تو جب اللہ تعالیٰ کسی کو چن لے تو میں کیا کرسکتا ہوں؟

﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس کو علم کا مرکز بنایا اور جسم کی قوت بھی عطا فرمائی، جنگوں کی مہارت اور برداشت کرنے میں تم سے زیادہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کو چن لیا ہے تو پھر تم کیوں اعتراض کرتے ہو؟

مفسر فرماتے ہیں: ان آیات مبارکہ میں ہمیں یہ مسئلہ سمجھ آیا کہ بادشاہ وہ بنے جو علم کے اندر کامل ہو اور شکل کے

اعتبار سے خوبصورت ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کو قوتِ بدن بھی عطا فرمائی ہو؛ کیونکہ اگر اس کے پاس علم نہیں ہوگا تو وہ فیصلے نہیں کر سکے گا اور اگر اس کی شکل وصورت میں بردباری اور رعب نہیں ہوگا تو لوگوں پر اس کا اثر نہیں ہوگا، اس لیے ان دو صفتوں کا اس کے اندر ہونا ضروری ہے۔

کتابوں کے اندر ہے کہ حضرت طالوت علیہ السلام بے انتہا خوبصورت تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو قوت وطاقت بھی سب سے زیادہ عطا فرمائی تھی اور علم کے اندر بھی زیادہ تھے اور جنگ کے اندر مہارت رکھتے تھے۔

﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اللہ کے نبی نے آخر میں فیصلہ فرمایا کہ جب ملک اللہ کا ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ملک عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ایسی شان والا حاکم ہے کہ وہ جو چاہے کرے، اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۴۷] یعنی اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ فضل کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ علم کامل اور علم محیط کے مالک ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کون بادشاہت کے قابل ہے اور کون بادشاہت کے قابل نہیں ہے؟

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾
[البقرۃ:۲۴۸]

''اور ان سے ان کے نبی نے کہا: اس کے بادشاہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا، جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسلی ہوگی اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہوں گی، جن کو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی اولاد چھوڑ گئی تھیں، اس کو فرشتے اٹھا لائیں گے۔ اس میں تمہارے لیے پوری نشانی ہے اگر تم یقین رکھتے ہو۔''

جب اللہ کے نبی نے قوم کو سمجھایا کہ تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور قوم لاجواب ہوگئی تو کہنے لگی: چلو! ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں، لیکن کوئی نشانی تو ہو کہ یہ ہمارا بادشاہ بنے گا تو ہم جنگ جیت جائیں گے۔ محض آپ کا کہنا کافی نہیں۔ حالانکہ اللہ کے نبی کی بات تھی اور ان کا کہنا ہی کافی ہوتا ہے، لیکن جب دلوں میں کھوٹ ہو تو ایسی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔

اللہ کے نبی نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ٹھیک ہے، ہم ان کو نشانی بھی دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے زمانے میں ایک لکڑی کا صندوق تھا، اس کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کچھ کپڑے بھی تھے اور ان کا عصا بھی تھا اور الواحِ تورات یعنی جن تختیوں پر تورات لکھی ہوئی تھی وہ بھی تھیں اور کچھ تختیاں ایسی تھیں جو ٹوٹ گئیں تھیں، ان کو آپ نے اسی صندوق میں محفوظ کر دیا تھا۔ لازمی بات ہے کہ جن چیزوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کے نبی کے ساتھ ہوتا ہے، ان کی شان ہوتی ہے۔ اس لیے ان چیزوں کی بنی اسرائیل کے اندر بڑی حفاظت ہوتی تھی، لیکن جالوت بادشاہ نے ان پر حملہ کیا تو جہاں انہوں نے یہودیت کو برباد اور قید کیا، اس کے ساتھ ساتھ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام والا صندوق بھی ساتھ لے گئے۔ تو اللہ کے نبی نے ان سے فرمایا کہ اللہ کے فرشتے وہ صندوق اٹھا کر لے آئیں گے اور تمہارے سامنے رکھ دیں گے۔ اس سے سمجھ لینا کہ جب اللہ تعالیٰ ہمیں اتنی عظیم چھینی ہوئی نعمت واپس دینے پر قادر ہیں تو ہمیں فتح بھی دے سکتے ہیں۔ اس طرح تمہاری تسلی ہو جائے گی اور پکی تسلی ہو جائے گی؛ کیونکہ اس بادشاہ سے وہ تابوت لے کر آنا کوئی معمولی سی بات نہیں۔

﴿سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ حضرت عطا رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جیسے تم کوئی نشانی دیکھو اور تمہارے دل کو قرار ہو جائے اس کو ''سَكِينَة'' کہتے ہیں۔

اور بعض علماء نے فرمایا: ''سَكِينَة'' سے مراد ہے کہ سونے کا ایک تھال تھا، جس کے اندر اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے دلوں کو ملائکہ کے ذریعے غسل دلوایا تھا، وہ تھال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مل گیا، آپ نے اس کے اندر تورات کے الواح رکھ دیئے تھے۔

حضرت سفیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسی چیز تھی جو چہرے والی تھی، جیسا کہ انسان کا چہرہ ہوتا ہے، اس کے اندر بھی روح کی آمیزش تھی، جیسا کہ روح کی وجہ سے حرکت پیدا ہوتی ہے۔

حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ ایک نکلنے والی ہوا تھی، اس کے دو سرے بنے ہوئے تھے، اس کے دو پر تھے اور اس کی دم بھی تھی۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سَكِينَة'' ایسے تھا جیسے بلی کا ایک سر ہوتا ہے اور وہ تابوت کے اندر تھا۔ جب وہ بلی کی آواز نکالتی تو لوگوں کو یقین ہو جاتا تھا کہ اب ہماری کامیابی قریب آگئی ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس صندوق کے اندر ایک ایسی روح پوشیدہ رکھی تھی کہ جب یہ کسی بات

میں جھگڑتے تھے تو وہ روح بول کر ان کے درمیان میں فیصلہ کر دیتی تھی۔

بہر حال یہ سارے اقوال ہیں، مفسر رحمہ اللہ نے ان کو "قیل" کے ساتھ نقل فرمایا۔ جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اقوال مرجوح ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں "سَكِيْنَة" فرمادیا اور "سَكِيْنَة" کا معنیٰ طمانیت ہے، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ غار کے اندر تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾ [التوبۃ: ۴۰] اللہ تعالیٰ نے ان پر "سَكِيْنَة" نازل کی، یعنی اطمینان نازل کر دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے صحابہ پر اپنا "سَكِيْنَة" اتار دیا۔

مراد یہ تھی کہ اس صندوق اور الواحِ تورات کو دیکھ کر دلوں کو تسکین ہوتی تھی۔ باقی یہ کہنا کہ بلی کا سر تھا، یا ہوا تھی، یا کوئی روح تھی، یہ سب ایسی باتیں ہیں جو لوگوں نے روایاتِ اسرائیلیہ سے لی ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے آج صندوق بنا کر اس کے اندر سر رکھے ہوئے ہیں۔

اس بارے میں ایک قاعدہ یاد رکھ لیں: "إِبْهَمُوْا كَمَا أَبْهَمَهُ اللّٰهُ" اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو کھول کر بیان نہ کریں تو تم بھی بحث میں نہ پڑو۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اصحابِ کہف تھے۔ تو ہمارا ایمان ہے۔ باقی ان کے نام کیا تھے؟ والدین کے نام کیا تھا؟ اس میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہے اور کچھ تختیوں کے ٹکڑے تھے۔ اور یہی قول حضرت قتادہ، حضرت سدی، حضرت عکرمہ اور حضرت ضحاک رحمہم اللہ کا ہے۔ اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ اس میں من وسلویٰ بھی تھا، جو اللہ تعالیٰ بطورِ غذا کے اتارتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے عصا اور کپڑے بھی تھے اور الواح کے کچھ ٹکڑے بھی تھے، جن پر تورات لکھی ہوئی تھی۔

اور بعض نے کہا: اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جوتیوں کا ایک جوڑا بھی تھا۔

﴿تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۚ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیجے وہ آسمان وزمین کے درمیان میں اس تابوت کو اٹھا کر لائے اور طالوت کے سامنے اس تابوت کو رکھ دیا۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ تابوت آ رہا ہے۔ اب لوگ نبی کی نبوت پر ایمان لے آئے اور طالوت کی بادشاہت کو مان لیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس صندوق کو فرشتے ایک گاڑی پر

لائے جس کو آگے بیل کھینچ رہے تھے۔

حکایت: بعض لوگوں نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ مشرکین جب یہ تابوت لے آئے اور اس کو مندر میں نیچے رکھ کر اس کے اوپر بڑے بت کو رکھ دیا۔ جب صبح کے وقت مندر گئے تو دیکھا وہ بت نیچے ہے اور صندوق اوپر رکھا ہوا تھا۔ مشرکوں نے کہا: یہ تو ہمارے خدا کی توہین ہوگئی، انہوں نے صندوق کو پھر نیچے کر دیا اور اپنے بت کو اوپر رکھ دیا۔ دوسرے دن جب آئے تو دیکھا کہ بت پھر نیچے ہے اور صندوق اس کے اوپر ہے۔ انہوں نے کہا: یہ تو کمال ہوگیا اور پھر انہوں نے مشورہ کیا کہ صندوق کو زمین میں میخیں گاڑھ کر رکھو اور اس کے اوپر اپنا بت رکھو۔ صبح کو آ کر دیکھتے ہیں کہ بت کے بازو ٹوٹے پڑے ہیں اور صندوق اوپر ہے۔ انہوں نے کہا: یہ صندوق ہمارے خدا کو بھی مار گیا، لہٰذا اس کو نکالو اور نکال کر اس کو ایک بستی میں رکھ آؤ۔ جب وہاں رکھا تو بستی میں بیماری پھیل گئی، لوگ مرنے لگ گئے۔ بنی اسرائیل کی وہاں ایک لڑکی تھی، اس نے کہا: یہ صندوق سب کو کھا جائے گا، لہٰذا اس صندوق کو بنی اسرائیل کو واپس کرو۔ انہوں نے بیل گاڑی پر اس صندوق کو رکھ کر بنی اسرائیل کی بستی کی طرف دھکیل دیا۔

لیکن یہ بات ساری غلط ہے۔ جب قرآن نے کہہ دیا: ﴿تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ [البقرة:۲۴۸] کہ اس کو فرشتے لے آئے تو بات ختم ہوگئی۔

﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

[البقرة:۲۴۹]

''پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو فرمایا: اللہ ایک نہر سے تمہارا امتحان لیں گے۔ پھر جو اس سے پئے گا وہ میرا نہیں اور جو اس کو نہیں چکھے گا تو وہ میرا ہے، مگر جو کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے گا۔ تو سب نے اس سے پیا، مگر قلیل نے۔ پھر جب وہ اس سے پار ہوا اور وہ مومن جو اس کے ہمراہ تھے کہنے لگے: ہمیں آج جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ وہ لوگ جن کو یقین تھا کہ اللہ کے ہاں پیش ہونا ہے، کہنے لگے: بہت جگہ تھوڑی جماعت بڑی جماعت پر خدا کے حکم سے غالب ہوئی ہے۔ اور اللہ جم کر لڑنے والوں کے ساتھ ہیں۔''

جالوت ایک مشرک بادشاہ تھا۔ اس نے بیت المقدس میں آ کر بنی اسرائیل کے خلاف جنگ لڑی، اس کو فتح کیا اور بنی اسرائیل کے بہت سے انسانوں کو قتل کیا اور بہت سوں کو قیدی بنا لیا۔ اور بنی اسرائیل کے پاس ایک صندوق تھا، جس کا نام قرآنِ مقدس نے ''تابوت'' لیا ہے، اس صندوق کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے کچھ تبرکات بھی تھے، اس ظالم بادشاہ نے جب حملہ کیا تو وہ صندوق بھی لے گیا۔ بنی اسرائیل کا زمانہ چونکہ طویل ترین عرصہ پر محیط ہے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے بڑے انعامات و اکرام فرمائے، ان کو اپنے زمانے میں فضیلت دی۔ اور سب سے بڑی فضیلت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی نبوت رکھی، حتیٰ کہ عام روایات کے مطابق یہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں چار ہزار نبی بھیجے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر اپنی نعمت یاد دلائی کہ میں نے تمہارے اندر چار ہزار نبی بنائے اور صرف نبوت نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ملوکیت شہنشاہیت کا دور بھی عطا کیا اور ایسی بادشاہت عطا کی جو نہ پہلے کسی کو ملی تھی اور نہ بعد میں کسی کو ملے گی، لیکن ہر نعمت کے بعد بجائے ایمان لانے کے، بجائے شکر کرنے کے انہوں نے ناشکری کی اور کفر کیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پھر ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ اور کئی دفعہ ایسے واقعات ان پر پیش آئے کہ شاید اس سے ان کی اصلاح ہو جائے کہ کبھی اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا اور کبھی اللہ تعالیٰ نے ان پر جالوت کو بھیجا، جس نے لاکھوں اسرائیلیوں کا قتل کر ڈالا اور ان کے ہیکل سلیمانی کو اجاڑ ڈالا اور ان کی ہزاروں کی تعداد میں لڑکیوں کو کنیز بنا لیا، بچوں کو غلام بنا لیا اور یہ در بدر ذلیل و خوار ہو گئے۔ جب ان پر اللہ تعالیٰ کا قہر ٹوٹتا تو یہ رونے لگ جاتے تھے اور معافیاں مانگتے اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے درخواستیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو موقع بخشتے

تھے۔ یہ ایک بہت بڑی تاریخ ہے، جو کئی ہزار سال کے زمانے پر مشتمل ہے۔

یہ واقعہ جو ہم پڑھ رہے ہیں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً گیارہ سو سال پہلے کا یہ واقعہ ہے۔

بہرحال جب تابوت واپس آ گیا اور حضرت طالوت نے بھی لڑنے کی تیاری کر لی اور جب لشکر لے کر نکلے تو قوم سے کہا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے ایک اور امتحان ہے (جیسا کہ انہوں نے حضرت طالوت کا امتحان لیا تھا) وہ یہ ہے کہ راستے میں ایک نہر آ رہی ہے، اس کو پار کر کے ہم نے جالوت کے لشکر سے لڑنا ہے، لیکن خبردار! کوئی آدمی اس نہر کا پانی نہ پیے۔ اگر کوئی بہت زیادہ مجبور ہو جائے، پیاس زیادہ تنگ کر دے تو چلو میں پانی لے کر پی لیا تو معاف ہے، اس سے زیادہ معاف نہیں ہے۔ قوم کہنے لگی: آپ فکر نہ کریں۔ اب ہم آپ کے بالکل تابع ہیں۔ جب وہاں پہنچ گئے تو سب کے سب پانی پر ٹوٹ پڑے...... اس کے اندر ہم لوگوں کے لیے بھی سبق ہے کہ آج جو گناہوں کی نہر بہہ رہی ہے، اس میں ہمارے لیے امتحان ہے کہ کون ہے جو اس سے بچتا ہے؟ اور کون ہے جو اسے چکھتا ہے؟...... جب قوم نے زیادہ پانی پی لیا اور نہر سے باہر نکلے تو کہنے لگے: ہم تو آگے جانے کے قابل نہیں رہے، (کیونکہ وہ تو امتحان میں فیل ہو گئے تھے) ہمارے اندر طاقت نہیں کہ ہم جالوت کے لشکر کا مقابلہ کر سکیں۔

اب اس واقعہ کے اندر دیکھیں کہ یہاں تین حصے بن گئے: ایک وہ جنہوں نے نہر کے پانی کو چکھا بھی نہیں، دوسرے وہ جنہوں نے پیٹ بھر کر پانی پی لیا اور تیسرے وہ جنہوں نے تھوڑا سا پانی پیا تھا۔ اب جنہوں نے زیادہ پی لیا تھا وہ کہنے لگے: ہم تو نہیں لڑ سکتے۔ ﴿قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ﴾ جو ایمان والے تھے اور جن کو پکا یقین تھا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے روبرو جانا ہے، انہوں نے کہا: لوگو! ڈرو نہیں۔ کبھی تھوڑی جماعتوں کو اللہ تعالیٰ اپنے امر سے بڑی جماعتوں پر غالب کر دیتے ہیں۔ اگر ہم تھوڑے ہیں تو کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ کی مدد تو ہمارے ساتھ ہے۔ لیکن جن لوگوں نے پانی پیا تھا انہوں نے کہا: ہم تو نہیں لڑتے۔ تو اب حضرت طالوت کے ساتھ چند آدمیوں کا لشکر رہ گیا اور باقی سب بھاگ گئے۔ آگے جالوت لشکر لے کر آ گیا۔ اب جو پکے ایمان والے تھے، جب دشمن کے لشکر آمنے سامنے ہوئے تو انہوں نے کہا: ﴿رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ؁﴾ [البقرۃ: ۲۵۰] اے پروردگار! ہمیں اپنی رحمت سے صبر کرنے والا بنا دے کہ ہم جم جائیں۔ اور اے اللہ! ہمیں دشمنوں کے مقابلے پر استقلال نصیب کر، ثابت قدمی نصیب کر اور قوم

کافرین کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم میری طرف متوجہ ہوئے ہو تو اب میرا نام لے کر ابتدا کرو۔ جب لڑے تو حضرت طالوت کی فوج کو اللہ تعالیٰ نے فتح دے دی اور جالوت حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں سے قتل ہوا۔

حضرت طالوت جب لشکر لے کر نکلے تو اس وقت لشکر کی تعداد اسی ہزار تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہ نہر فلسطین اور اردن کے درمیان میں تھی، اس کو انہوں عبور کرنا تھا۔

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت بھی نقل فرمائی ہے کہ شروع میں حضرت طالوت کا لشکر اسی ہزار تھا، لیکن ۷۶ ہزار نے پانی پی لیا، باقی صرف چار ہزار کا لشکر رہ گیا تھا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ بدر کے دن ہماری تعداد تین سو اور کچھ تھی۔ ہمارا عدد بھی اتنا تھا جتنا حضرت طالوت کے ساتھ باقی رہ گئے تھا۔ اور اس نہر کو صرف انہوں نے عبور کیا جو خالص مومن تھے اور جو کمزور ایمان والے تھے وہ رہ گئے۔

جن لوگوں نے پانی پیا وہ نہر پار کر کے کہنے لگے: ہم جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے؛ کیونکہ ان کی تعداد زیادہ تھی اور ان کے پاس قوت بھی زیادہ تھی، لیکن اس وقت جو صحیح معنی میں عالم اور اللہ کے وعدے پر یقین رکھنے والے تھے، جو یہ بات جانتے تھے کہ مدد صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ نہ تو مدد لشکر کی تعداد پر موقوف ہے اور نہ ہتھیاروں پر موقوف ہے، بلکہ بعض اوقات کتنی چھوٹی سی جماعتیں ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بڑی جماعتوں پر غلبہ عطا فرما دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی معیت صبر کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایسی مخلوقات پیدا فرمائیں جن کے عدد کا کوئی علم نہیں ہے، لیکن ان تمام مخلوقات میں سے صرف دو مخلوق کو شریعت کا مکلف بنایا ہے۔ شریعت کی پابندی انسانوں اور جنوں پر ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو اس بات پر قادر تھے کہ ایک مخلوق جنت کے لیے پیدا فرما دیتے اور ایک جہنم کے لیے پیدا فرما دیتے۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھے کہ زمین پر جو بندہ بھی پیدا ہوا وہ اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا فرمایا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ چاہتے تو بندوں کو مجبور کر سکتے تھے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے کہ اس نے دنیا بنائی اور اس میں انس وجن اور مخلوق کو پیدا کیا اور ان کو اختیار دیا کہ یہ صراط مستقیم ہے اور یہ غلط راستہ ہے۔ اور

اس کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام بھیجے اور اپنی کتابیں اتاریں۔ اس کے بعد پھر اگر کوئی قوم کفر و شرک پر اڑ گئی، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو برباد نہیں کیا، لیکن جب کفر و شرک کے ساتھ انہوں نے فساد برپا کر دیا، اللہ کے نبیوں کے مقابلے پر ڈٹ گئے، پیغمبروں کو قتل کیا اور مظلوموں پر ظلم کیا تو ان پر اللہ تعالیٰ کا قہر آ گیا۔ پھر اس عذاب میں باقی بندوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ تھا کہ تم بھی سمجھ لو۔ اگر تم بھی اس طرح کرو گے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے امتحان رکھے ہیں، جیسے سنار سونے کو کٹھالی میں گزارتا ہے، ایسے اللہ بندوں کو امتحان میں سے گزارتے ہیں کہ کتنے اس میں کھرے نکلتے ہیں اور کتنے کھوٹے نکلتے ہیں؟ ورنہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ اور نقصان نہیں۔

آج یہی وجہ ہے کہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طلباء دورہ حدیث مکمل کر کے باہر جاتے ہیں اور ایسے بھی سینکڑوں مدارس ہیں جنہوں نے بس اپنے آپ کو وفاق میں رجسٹر نہیں کرایا، وہاں بھی طلباء ہیں، اسی طرح آپ پورے عالمِ اسلام پر نظر ڈالیں، لیکن جس انداز میں دین کا کام ہونا چاہیے تھا وہ کام نہیں ہو رہا؛ کیونکہ پہلے زمانے میں طالبِ علم فراغت کے بعد بزرگوں کی صحبت میں رہتا تھا۔ جب وہ ٹھیک ہو جاتا تو بزرگ دین کا کام کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ اب وہ بات نہیں رہی، اب علم صرف زبان تک یا حلق تک ہے۔ آخر کوئی وجہ تو تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت دینے کا فیصلہ پہلے فرما لیا، لیکن نبوت چالیس سال کے بعد دی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کی فوج کی آزمائش کی تھی، اسی طرح آج امت محمدیہ ﷺ کی آزمائش ہے کہ سب نہریں بہہ رہی ہیں: دولت کی نہریں بہہ رہی ہیں اور عیاشی کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ جو ان سے بچ کر نکل گیا وہ اپنا ایمان بچا گیا اور جو ان میں ڈوب گیا وہ ڈوب گیا۔

﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾

[البقرۃ: ۲۵۰ تا ۲۵۲]

''اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے ہوئے تو کہنے لگے: اے ہمارے رب! ہمارے دلوں میں صبر ڈال دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں کافر قوم پر غالب کر دے۔ پھر مومنین نے جالوت والوں کو اللہ کے حکم سے شکست دی اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا اور داؤد کو اللہ نے سلطنت اور تدبیر عطا فرمائی اور جو چاہا ان کو علم سکھایا۔ اور اگر اللہ ایک کو دوسرے سے دفع نہ کرتے ہوتے تو زمین میں فساد ہوتا اور لیکن اللہ جہان والوں پر بہت مہربان ہے۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ (ﷺ) پر صحیح صحیح پڑھ کر سناتے ہیں اور آپ (ﷺ) بلاشبہ (ہمارے) رسولوں میں سے ہیں۔''

باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ حق والے تھوڑے رہے ہیں:

آپ تاریخ کا مطالعہ کریں، اللہ تعالیٰ کے قرآن کو پورے تدبر اور غور وفکر سے پڑھیں اور اسی طرح قصص الانبیاء پر غور کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہمیشہ حق والوں کا عدد تھوڑا رہا ہے۔ اہلِ حق باعتبار عدد کے بھی اکثر تھوڑے رہے اور باعتبار اسباب کے بھی تھوڑے رہے۔

اب دیکھیں کہ جب طالوت اور جالوت کا مقابلہ ہوتا ہے تو حضرت طالوت کی وہ حیثیت نہیں۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کا فرعون سے مقابلہ ہوتا ہے تو دیکھ لیں کہ دو بھائی میدان میں کھڑے ہیں اور کوئی ساتھی نہیں ہے۔ اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دیکھیں کہ نمرود کے مقابلے پر اکیلے ہیں، حتیٰ کہ والدین اور رشتہ داروں نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ اسی طرح سابقہ واقعات دیکھتے چلے جائیں! حضرت نوح علیہ السلام کے دشمن لاکھوں کی تعداد میں تھے اور حضرت نوح علیہ السلام کو ماننے والے بس اتنے تھے جو ایک کشتی میں آ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کی نصرت فرماتے ہیں تو وہ کسی اسباب کے محتاج نہیں ہوتے۔ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

حضور اکرم ﷺ کے حالات پر نظر دوڑائیں کہ جب آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی تو ایک آپ تھے اور ایک سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ غزوۂ اول بدر پر نظر دوڑائیں تو حضور اکرم ﷺ کا تین سو تیرہ کا ایک قلیل لشکر ہے، جن کے پاس نہ گھوڑے ہیں، نہ تلواریں، نہ ہتھیار ہیں اور نہ تجربہ کار لڑاکا سپاہی ہیں۔ ان کے مقابلے پر ایک ہزار آدمیوں کا لشکر ہے اور وہ جنگجو لشکر ہے۔ اسی طرح قیصر و روم نے مقابلہ کرنا چاہا تو اس وقت اسلامی لشکر کے عدد پر بھی نظر ڈالیں

اور دشمن کے عدد پر بھی نظر ڈالیں۔ وجہ یہ ہے کہ خداوند قدوس ہمیں سبق دیتے ہیں کہ دنیا میں اسباب ہیں ان کا خالق خدا ہے، لیکن مومن کا ایمان ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر رہنا چاہیے۔ اسباب کی حد تک جتنا آپ سے ہوسکتا ہے کرو۔ دوسری اخلاص نیت ہے کہ تمہاری نیت خالص اللہ تعالیٰ کی رضا، اعلاء کلمۃ اللہ ہو، اور اس میں کوئی لالچ نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ ملک حاصل کرنا ہے، یا ہمیں بڑی دولت مل جائے گی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا مقصد ہو۔

اس واقعہ کے اندر ہمیں یہ سبق ملا کہ جب میدانِ جنگ میں آؤ تو اپنی طاقت پر نہ اتراؤ، بلکہ فوراً اپنی توجہ اپنے رب کی طرف کرو۔ اس لیے دیکھیں کہ جب دشمن کے مقابلے پر آئے تو انہوں نے فوراً دعا مانگی: ﴿رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ دعا تب مزہ کرتی ہے جب میدانِ جہاد ہو، سامنے دشمن ہو، آدمی میدانِ جہاد میں مجاہد بن کر کھڑا ہے، کشتیاں جلا کر کھڑا ہے اور پیچھے جانے کی امید نہیں ہے۔ اس وقت جب دعا نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے مدد کے لیے اترنے شروع ہو جاتے ہیں۔

﴿رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا﴾ اے اللہ! ہم پر صبر انڈیل دے۔ یہ نہیں مانگا کہ صبر عطا فرما! کیونکہ ہم تھوڑے سے ہیں اور سامنے تعداد و قوت کے اعتبار سے بڑا دشمن ہے۔ ﴿وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ اور ہمارے پاؤں جما دے، تاکہ ہم پیچھے نہ ہٹیں اور میدان کے اندر جمے رہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا جالوت کو مارنے کے لیے تین پتھر اٹھانے کی روایت:

﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾ حضرت طالوت کے لشکر میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نبی ہیں اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اللہ کے نبی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو ابھی نبوت نہیں ملی تھی، جس وقت یہ لڑائی ہوئی تھی۔ سابقہ کتابوں کی روایات میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے کپڑے میں تین پتھر رکھے ہوئے تھے اور ان کے پاس غلیل تھی، جس کے ساتھ پتھر مارا جاتا ہے۔ بعض ساتھی تعجب کرتے تھے کہ اتنے جنگجو قبیلے کے ساتھ ہماری لڑائی ہے اور دیکھو! داؤد پتھر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جا رہے تھے۔ ایک پتھر کے قریب سے گزرے تو اس پتھر نے آواز دی کہ مجھے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لو، میں تمہارے کام آؤں گا۔ ان چیزوں کا ذکر نہ اللہ کے قرآن میں ہے اور نہ کسی صحیح حدیث مبارک میں ہے۔

یہ اسرائیلی روایات ہیں، ان کی حقیقت کا اللہ تعالیٰ کو پتہ ہے؛ کیونکہ قاعدہ ہے کہ سابقہ کتابوں کی روایات پر آدمی آنکھیں بند کر کے ایمان نہیں لا سکتا؛ کیونکہ جب یہود و نصاریٰ نے اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات و انجیل کو بدل ڈالا تو باقی کتابوں کی کیا حیثیت ہے؟ اور نہ ہم ان کی تکذیب کریں گے، بلکہ ہم یہ دیکھیں گے کہ اگر وہ روایات کتاب و سنت کے مطابق ہیں تو لے لیں گے اور اگر کتاب و سنت کے مخالف ہیں تو ہم ان کو چھوڑ دیں گے اور اگر وہ نہ موافق ہیں نہ مخالف تو ہم ان کے متعلق خاموش رہیں گے۔

بہر حال روایات کے اندر ہے کہ جب جالوت لشکر لے کر مقابلے پر آیا تو وہ اتنا مسلح تھا کہ زرہ کے اندر چھپا ہوا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے غلیل کے اندر پتھر رکھ کر مارا تو وہ کھوپڑی کو چیرتا ہوا پار نکل گیا۔ جب فوج کا بادشاہ گر کر مر گیا تو فوج میں افراتفری پھیل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے نصرت فرمائی اور دشمن کو شکست ہوگئی، حضرت طالوت کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد حضرت طالوت نے اپنی بیٹی کی شادی حضرت داؤد علیہ السلام سے کی اور ان کو اپنے اقتدار میں بھی شریک کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت اور بادشاہت حضرت داؤد علیہ السلام کے گھر کی طرف پھیر دی۔

چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام نے پتھر سے دشمن کو مارا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام تسبیح کہتے تھے تو پہاڑ بھی ساتھ تسبیح کہتے تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے لوہے کو بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں نرم فرما دیا۔ ان کے ہاتھ میں لوہا ایسے ہو جاتا تھا جیسے موم نرم ہوتی ہے، نہ کسی بھٹی میں ڈالنے کی ضرورت اور نہ پگھلانے کی ضرورت تھی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقائے نامدار حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک صالح بندے کی وجہ سے ایک سو گھروں سے بلا رفع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کے اندر میری حکمتیں ہیں کہ میں اپنے بندے بھیج کر دشمنوں کو شکست دے دیتا، ورنہ دنیا کے اندر عبادت خانہ بھی نہ رہتا اور سب تباہ و برباد ہو جاتے۔

(حدیث) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''وَإِنَّ اللّٰهَ لَيُصْلِحُ بِصَلَاحِ الرَّجُلِ الْمُسْلِمِ وَلَدَهُ وَ وَلَدَ وَلَدِهِ وَأَهْلَ دُوَيْرَتِهِ وَ دُوَيْرَاتٍ حَوْلَهُ، وَلَا يَزَالُوْنَ فِيْ حِفْظِ اللّٰهِ

عَزَّوَجَلَّ مَا دَامَ فِيهِمْ ''اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے صالح ایمان والے بندے کی وجہ سے اس کی اولاد، اس کی اولاد کی اولاد، اس کے ساتھ حویلی والوں اور اس کے ساتھ جو اور گھر ہوتے ہیں اس کی حفاظت کرتے ہیں جب تک وہ بندہ ان میں رہتا ہے۔ [تفسیر در منثور: ۱/ ۳۲۰]

(حدیث) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تمہارے اندر سات قسم کے آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرماتے ہیں، جن کی وجہ سے تمہیں بارشیں دیتے ہیں اور جن کی وجہ سے تمہیں رزق دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ قیامت آجائے گی۔

(حدیث) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہیں ضعیفوں کی وجہ سے رزق دیتے ہیں۔ وہ جب دعائیں مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ تمہیں رزق نصیب فرمادیتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ بعض اوقات جانور کیڑے حشرات الارض کی وجہ سے رحمت فرمادیتے ہیں۔

(حدیث) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْأَبْدَالُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُوْنَ'' میری امت کے اندر (ہر وقت) تیس ابدال (رہتے ہیں)۔ یعنی ہر دور کے اندر اللہ تعالیٰ پیدا فرمائیں گے۔ ان کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ تمہیں رزق دیتے ہیں، ان کی دعاؤں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تم پر اپنی بارشیں برساتے ہیں اور ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرماتے ہیں۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے تھے: جب میں نے یہ حدیث پاک سنی تو میں نے امید کی کہ حضرت حسن رحمہ اللہ بھی ان میں سے ہوں گے۔[1]

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۵۱] اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمت فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بعض سے بعض کو شکست دیتے ہیں، اسی فتح وشکست میں اس کی حکمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے جمیع افعال واقوال کے اندر حکمتیں ہیں، کبھی اللہ تعالیٰ مدد کر کے کفر کو شکست دے دیتے ہیں، ورنہ کفر تو ساری دنیا مٹا ڈالے۔

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۵۲] اس میں اثبات رسالت اور شانِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمائی ہے کہ میرے مدنی! یہ جو آیات آپ پڑھ پڑھ کر ان کو سنا رہے ہیں، طالوت جالوت کا قصہ بتارہے ہیں، آپ اس زمانہ میں موجود نہیں تھے۔ یہ دلیل ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اللہ پاک آپ پر وحی بھیجتے ہیں تو آپ یہ سابقہ زمانوں کے خبریں دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو واقعات آپ کو پڑھائے

[1] [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸۷]

ہیں، اس کے عین مطابق سابقہ کتابوں کے اندر موجود ہیں، بنی اسرائیل کے علماء اس کو پڑھتے ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ آپ اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔

﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝﴾ [البقرة:۲۵۲] "اِنَّ" تاکید کے لیے ہے اور "ك" بھی تاکید کے لیے ہے۔ یہ سب تاکیدات ہیں۔ اور لام بھی تاکید کے لیے ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے نبی کی رسالت کا اثبات ہو کہ آپ اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔ تب ہی تو ہم نے وحی کے ذریعے یہ ساری خبریں دی ہیں۔

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝﴾ [البقرة:۲۵۴،۲۵۳]

"یہ رسول ہیں۔ ہم نے ان میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ کوئی تو وہ ہے کہ اللہ نے اس سے کلام کیا اور بعض کے درجات کو بلند کیا اور عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے کھلی نشانیاں دیں اور ان کو روح القدس سے تائید بخشی۔ اور اگر اللہ چاہتا تو جو لوگ ان پیغمبروں کے بعد ہوئے ہیں باہم نہ لڑتے، اس کے بعد کہ ان کے پاس صاف دلائل پہنچ چکے تھے، لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا۔ پھر بعض تو ان میں سے ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن اللہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ اے ایمان والو! خرچ کرو کچھ ہمارا دیا ہوا اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہے، نہ آشنائی اور نہ سفارش۔ اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں۔"

افضلیتِ حضرت محمد ﷺ:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اثباتِ رسالت اور اس کے بعد آپ ﷺ کی فضیلت اور عظمت کا ذکر فرمایا ہے۔

یہودیوں نے حضور اکرم ﷺ کو کیوں نہیں مانا؟ حالانکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب تھی اور وہ پڑھے لکھے

لوگ تھے۔ تورات کے اندر حضور اکرم ﷺ کی بہت سی صفات اور بہت ساری نشانیاں اتنی واضح موجود تھیں کہ ذرا بھی آدمی غور کرتا تو فوراً سمجھ جاتا، لیکن اس کے باوجود وہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے۔ ایک تو ان کے دلوں کے اندر حسد تھا کہ محمد عربی ﷺ کی شان افضلیت نہ ماننی پڑے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شانِ محمد عربی ﷺ اور رد علی المنکرین والمحرفین عن رسالۃ النبی کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ﴾ اللہ تعالیٰ نے جو رسول بھیجے ہیں ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ ان رسولوں میں سے ایک رسول ایسے ہیں جن کو ہم نے شرف کلام بخشا ہے کہ بغیر واسطہ، بغیر ملائکہ کے اور بغیر جبرئیل کے اللہ پاک نے خود کلام فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف کلام بخشا۔ اور ہم نے ایک دوسرے پر ان کے درجات کو بلند کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم جو میرے مدنی سے جلتے ہو، فضیلت دینا میرے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت بخشی ہے۔

مشہور روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے ہیں، ان میں تین سو تیرہ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے اور پھر تین سو تیرہ میں پانچ وہ رسول ہیں جن کی صفت اولوالعزم من الرسل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الاحقاف:۳۵]۔ وہ پانچ ان تین سو تیرہ پر افضل ہیں۔ پھر سب سے افضل، سب سے اکمل، سب سے اجمل، سب کے سردار اور سب کے امام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، بلکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: آدم میرا ابا ہے۔ باعتبار ظاہری قاعدے کے باپ افضل ہوتا ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری شان اتنی بلند کر دی ہے کہ قیامت والے دن میرے پرچم شفاعت کے نیچے حضرت آدم علیہ السلام کھڑے ہوں گے۔ ابراہیم علیہ السلام میرے ابا ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے میری عظمت ایسی بنائی ہے کہ قیامت والے دن ابراہیم علیہ السلام میرے پرچم کے نیچے کھڑے ہوں گے۔

اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلے بھی میں ہوں اور سب سے آخر بھی میں ہوں۔ اسی طرح اپنی امت کو فرمایا کہ سب سے اوّل بھی میری امت اور سب سے آخر میں بھی میری امت ہے۔

یاد رکھیں! ہمارے بعض بھائیوں کو غلط فہمی ہے یا محبت کے دریا میں غوطہ لگا تو بہہ گئے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اوّل بھی میں ہوں اور آخر بھی میں ہوں تو ان کے قدموں میں لغزش آ گئی اور وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اوّل و آخر تو اللہ تعالیٰ کی صفت تھی، وہی صفت نبی میں آ گئی ہے۔ اس لیے وہ حضور اکرم ﷺ کو مقام عبدیت سے مقام

ربوبیت پر لے گئے، حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے اس کی وضاحت فرمادی کہ میری امت اوّل بھی ہے اور آخر بھی ہے۔ اب اگر اوّلیت سے مراد خدا کی اوّلیت ہے تو پھر ساری امت اوّل ہوگئی، حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ ہم اوّل اس اعتبار سے ہیں کہ جب تمام امتیں کھڑی ہوں گی تو سب سے پہلے میری امت کو داخلہ ملے گا اور آخر ہوگئے باعتبار بعثت کے کہ جب ساری امتیں گزر گئیں، ساری امتوں کے دور گزر گئے اور انسانیت اپنے معراج کو پہنچ گئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنا نبی بھی۔ ایسا بھیجا جو ہر لحاظ سے کامل تھا، ورنہ پہلے تو نبی کے بعد نبی آتے گئے۔ اب تو ہر چیز کی انتہاء ہوگئی۔ انسانیت بھی اپنے معراج کو پہنچ گئی، علم بھی اپنے معراج کو پہنچ گیا، جتنے علوم تھے عمرانیات اور اقتصادیات سب اپنی معراج کو پہنچ گئے۔ جب ہر چیز کی انتہاء ہوجائے تو وہ ختم ہوجاتی ہے۔ اب چونکہ دنیا کی انتہاء کا زمانہ آرہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے سب سے افضل نبی سید الاوّلین والآخرین کو بھیجا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں اوّل اس طرح ہوں کہ سب سے پہلے جنت کا دروازہ میں کھٹکھٹاؤں گا، میں سب سے پہلے شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلے میں اپنی قبر مبارک سے کھڑا ہوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ارشاد فرمایا: ظالمو! تم جو حسد کی بنا پر میرے مدنی پر ایمان نہیں لا رہے ہو اور میرے مدنی کی فضیلت سے جل رہے ہو، مت جلو! یہ تو میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے رسولوں کو فضیلت دی ہے، میں نے زمانہ کو فضیلت دی ہے، میں نے مکان کو فضیلت دی ہے اور میں نے انبیاء اور رسولوں کو فضیلت دی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے چھ چیزیں ایسی عطا فرمائی ہیں جو کسی نبی کو نہیں ملی ہیں۔ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا: یارسول اللہ! وہ کیا چیزیں ہیں؟ فرمایا:

۞......"أُوتِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ" اللہ تعالیٰ نے مجھے جوامع الکلم عطا فرمائے کہ ایک ایسا کلمہ جس کے اندر معانی کے دریا بہہ رہے ہوں۔

۞......اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی عظمت دی ہے کہ اگر میں ایک مہینہ کی مسافت پر دور ہوتا ہوں تو اللہ تعالیٰ میرا رعب دشمنوں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔

۞......اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بھی فضیلت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے مالِ غنیمت کو حلال کردیا ہے، (جبکہ پہلے زمانے میں مالِ غنیمت حلال نہیں تھا، بلکہ اوپر سے آگ آکر اس کو کھا جاتی تھی)۔

⊛......پہلی امتوں کی نماز بغیر مسجد کے ادا نہیں ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے پوری زمین کو میری امت کے لیے مسجد بنا دیا کہ جہاں (پاک جگہ) کھڑے ہوں نماز پڑھ لیں نماز ادا ہو جاتی ہے۔

[صحیح البخاری: رقم: ۱/۱۲۸، صحیح مسلم: ۱/۳۷۰]

حضور اکرم ﷺ کی سچائی کا بیان:

جتنے نبی اور رسول آئے ان کی دعوت بڑی واضح تھی۔ مسجد حرام میں ابو جہل اور اس کے سارے ساتھی ایک دفعہ اکٹھے ہوئے اور کہنے لگے کہ محمد عربی (ﷺ) کا معاملہ ہم پر بالکل خلط ملط ہو گیا ہے، سمجھ نہیں آرہی کہ ان کے کلام کو شاعری کہیں یا آپ جادوگر ہیں کہ جو بندہ آپ کی بات سنتا ہے وہ ساتھ ہو جاتا ہے اور پھر ایسی ایسی خبریں دیتے ہیں جن کا کسی کو پتہ نہیں۔ سمجھ نہیں آرہی: کاہن ہیں یا کیا ہیں؟ تو روایات میں موجود ہے عتبہ نے کہا: تم مکہ کے سردار ہو، پڑھے لکھے ہو، لیکن تمہیں پتہ ہے کہ میں کتنا شعر کو سمجھنے والا ہوں، جادو کو سمجھنے والا ہوں۔ اگر تم مجھے اپنا نمائندہ بناؤ تو میں محمد (ﷺ) سے بات کر کے فیصلہ کرتا ہوں، مسئلہ کھل جائے گا، میں آپ کو ان کی شان بتاؤں گا۔ سرداروں نے اجازت دے دی۔

حضور اکرم ﷺ بھی مسجد الحرام میں بیٹھے تھے، وہ وہاں آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: میں نے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں، کیا اجازت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل اجازت ہے۔ اس نے کہا: میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ آپ بہتر ہیں یا آپ کے دادا ہاشم جو گزرے ہیں وہ بہتر ہیں؟ آپ بہتر ہیں یا عبدالمطلب بہتر ہیں؟ آپ بہتر ہیں یا آپ کے ابا عبداللہ بہتر ہیں؟ کیا وہ لوگ سب غلط تھے؟ تو آپ کیوں ہمارے خداؤں کو گالیاں دیتے ہیں؟ کیا وہ سب بے وقوف تھے جو ان کی عبادت کرتے رہے؟ تو کیا تمہارا باپ دادا پاگل تھا، عقل سے فارغ تھا؟ آپ کیوں ہمارے اندر تفریق ڈال رہے ہیں؟ جبکہ ہم ٹھیک ٹھاک آپس میں رہ کر زندگی گزار رہے تھے۔ آپ نے ہم کو جدا کر دیا ہے۔ اگر بیٹا آپ کے ساتھ ہے تو باپ ہمارے ساتھ ہے۔ تفریق ہو گئی ہے۔ یہ سارے......نعوذ باللہ ......اختلاف آپ نے کیوں ڈالے ہیں؟ وہ یہ ساری باتیں کرتا رہا اور حضور اکرم ﷺ یہ ساری باتیں سنتے رہے۔ جب اس نے بات ختم کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اپنی بات ختم کر لی ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اب میں جو کہتا ہوں وہ تم سنو۔ حضور اکرم ﷺ نے سورۃ حم سجدہ کی تلاوت کی اور پڑھتے آئے۔ جب اس آیت پر پہنچے: ﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ﴾ [فصلت: ۱۳] اے

میرے مدنی! اگر یہ کفارِ قریش تیری باتوں سے پھر بھی انکار کریں تو ان کو اس عذاب سے ڈرائیں جیسا کہ قومِ عاد اور قومِ ثمود پر آیا تھا تم پر بھی وہی عذاب آئے گا۔ تو عتبہ کانپنے لگ گیا، ڈر کر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ حضور اکرم ﷺ کے منہ مبارک پر رکھا اور کہنے لگا: خدا کے لیے مہربانی کریں! ہم آپ کے رشتہ دار تو ہیں، خدا کے لیے ہمیں عذاب سے بچائیں، اس کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ حضور اکرم ﷺ سے سیدھا گھر چلا گیا۔

سردار سارے حرم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کا پتہ کرایا تو پتہ چلا کہ وہ تو گھر چلا گیا ہے۔ سردار کہنے لگے: معلوم ہوتا ہے کہ وہ صابی ہو گیا ہے، ہم یہاں اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابو جہل کہنے لگا: ٹھہرو! میں جاتا ہوں، میں اس کے مزاج کو جانتا ہوں۔ ابو جہل سیدھا عتبہ کے گھر آیا اور دروازے پر آ کر کہنے لگا: معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی صابی بن گئے ہو، تم نے بھی باپ دادا کے دین کو چھوڑ دیا ہے؟ تم نے تو کمال کر دیا ہے! تم تو خود اپنے مذہب سے چلے گئے ہو۔ عتبہ نے کہا: ایسی باتیں نہ کرو۔ میں نے کوئی اپنا مذہب نہیں چھوڑا اور اگر تم مجھے طعنہ دیتے ہو تو میں قسم کھاتا ہوں: ''وَاللهِ! لا أُكَلِّمُ مُحَمَّدًا'' مجھے اللہ کی قسم ہے کہ آج کے بعد میں محمد عربی (ﷺ) سے کبھی بات نہیں کروں گا، لیکن میں تمہیں ایک بات کہتا ہوں کہ میں بھی اسلام نہیں لاتا، لیکن ایک بات یاد رکھو کہ وہ شاعر نہیں ہے، جادوگر بھی نہیں ہے اور کاہن بھی نہیں ہے۔ وہ جو کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے، وہ اللہ کا نبی ہے۔ میں نے اگر منت نہ کی ہوتی تو تم جانتے ہو کہ جو حضور اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا وہ سچ ہوتا ہے تو تم پر بھی عذاب آ جاتا۔[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب ہم نے رسول اور نبی بھیجے، کتابیں اتاریں اور اتنے واضح دلائل دیئے کہ کسی اندھے کو بھی شک نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود قوموں نے دلائل و معجزات آنے کے بعد بھی جھگڑا کیا، نبیوں سے بھی لڑ پڑے۔ جب میری اتنی رحمت کے بعد بھی باز نہ آئے، پھر ہم نے بھی حکم دے دیا کہ ان سے جہاد کرو۔

اس کے اندر یہ بات بھی سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم نے رسولوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''لَا تُفَضِّلُوْنِيْ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ''۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ''[2] مجھے نبیوں پر نہ بڑھاؤ۔ وہ بھی اللہ کے نبی ہیں اور میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔

---

[1] [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸۷]
[2] [صحیح البخاری: ۸/ ۱۹۴]

اور فرمایا: ''لَا تُطْرُوْنِی کَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ وَلٰکِنْ قُوْلُوْا: عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ'' میری شان کو ایسے نہ بڑھاؤ جیسے نصرانیوں نے اپنے نبیوں کی شان بڑھائی کہ حدود سے نکل گئے۔

[صحیح البخاری، رقم: ۳۲۶۱، شمائل ترمذی، رقم: ۳۲۲]

یادرکھیں! بڑھانے کا معنی یہ ہے کہ ایک نبی کی شان ایسے بیان کرو جس سے دوسرے نبی کی توہین معلوم ہو تو یہ ناجائز ہے۔

ایک فضیلت جزی ہوتی ہے اور ایک فضیلت کلی ہوتی ہے۔ یعنی اگر مجموعی فضیلتیں سامنے رکھی جائیں تو سب نبیوں کے سردار محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور اگر جزوی فضیلتیں دیکھی جائیں تو بعض نبیوں میں جزوی فضیلت دوسرے سے زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

نبی اور رسول کے معنی میں فرق:

یادرکھیں! ہر رسول نبی ہوتا ہے، لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ رسول اور نبی میں فرق یہ ہے: رسول وہ ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ نے شریعت عطا فرمائی ہو یا مستقل کتاب عطا فرمائی ہو۔ اور نبی کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کو مستقل کوئی کتاب ملے، بلکہ وہ سابقہ کتابوں اور شریعتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تورات دی اور حضرت ہارون علیہ السلام تورات ہی کے مطابق تبلیغ اور دعوت دیتے تھے۔ اس لیے حضرت ہارون علیہ السلام نبی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام رسول ہیں۔ اسی طرح یہ بھی دیکھ لیں کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش نبی بھیجے ہیں، ان میں رسول صرف تین سو تیرہ ہیں۔ رسالت کا مرتبہ نبیوں سے بڑھ کر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی اور رسولوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی، اگرچہ نبوت ورسالت میں بھی سب شریک ہوتے ہیں۔

یادرکھیں کہ نبوت یا رسالت کسبی چیز نہیں ہے۔ ولایت، کسی بندے کا ولی بن جانا کسبی چیز ہے، جو محنت سے حاصل ہو جاتی ہے، یعنی اگر کوئی بندہ صحیح معنوں میں اکلِ حلال، صدقِ مقال، یعنی کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا حلال سے کرلے، زبان پر کبھی جھوٹ نہ آنے دے، اللہ تعالیٰ کے فرائض، واجبات اور سنت ونوافل کی پابندی کرے، محرمات سے بچ جائے، مامورات کی تعمیل کرے تو محنت کرتے کرتے اللہ تعالیٰ اس کو مقامِ ولایت عطا فرما دیتے ہیں۔ اور کوئی بندہ بھی مقامِ ولایت پر پہنچ سکتا ہے؛ کیونکہ یہ محنت سے حاصل ہونے والی چیز ہے۔ لیکن نبوت و

رسالت کسبی چیز نہیں ہے، بلکہ وہبی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم کامل کے مطابق جس کو چاہتے ہیں نبوت و رسالت کے لیے چن لیتے ہیں۔ کوئی آدمی محنت کرنے سے نبی نہیں بن سکتا۔

مرزا قادیانی کو نبی ماننے والے لوگوں کو یہی دھوکہ دیتے ہیں کہ قرآن میں آیا ہے: ﴿وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء:٦٩] کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کی وہ اطاعت کرنے والے لوگ قیامت میں انبیاء کے ساتھ، صدیقین کے ساتھ، شہداء کے ساتھ اور صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ کیا ہی بہترین پسندیدہ رفاقت ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ انبیاء و صدیقین کی رفاقت نصیب کردے۔ اس آیت سے قادیانی لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرنے سے آدمی صدیق بن سکتا ہے، شہید بن سکتا ہے، صالحین میں شمار ہو سکتا ہے تو نبی کیوں نہیں بن سکتا؟

حالانکہ وہاں یہ نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرے وہ نبی بن جائے، بلکہ وہاں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ قیامت والے دن ان کے ساتھ ہوگا۔ یہ نہیں فرمایا کہ وہ بھی نبی بن جائے گا۔ نبی کے ساتھ ہونا علیحدہ بات ہے اور نبی ہونا علیحدہ بات ہے۔ لاکھوں صحابہ میرے مدنی کے ساتھ ساتھ تھے تو کیا سب نبی بن گئے؟

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾ [البقرۃ:۲۵۵]

''اللہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، زندہ ہے، سب کا سنبھالنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ کون ایسا ہے جو اس کے پاس سفارش کرے؟ مگر اس کی اجازت سے۔ وہ جانتا ہے مخلوق کے روبرو اور ان کے غائب حالات کو اور وہ سب احاطہ نہیں کر سکتے اس کے علم میں سے کچھ، مگر جس قدر وہ چاہے۔ اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے۔ اور وہ ان کے تھامنے سے نہیں تھکتا اور وہ عالیشان ہے، سب سے بڑا ہے۔''

آیت الکرسی کی تاثیر:

(واقعہ) امام بخاری ﷫ نے حضرت ابو ہریرہ ﷜ کی حدیث بیان فرمائی کہ حضرت ابو ہریرہ ﷜ نے اس جن کو پکڑ لیا۔ اس نے کہا: مجھے چھوڑ دو، میں تجھے ایسی آیت بتاتا ہوں جس سے تجھے بڑا فائدہ ہوگا۔ میں نے کہا: وہ کیا کلمات ہیں؟ اس نے کہا: جب تم رات کو لیٹنے کا ارادہ کرو تو لیٹتے ہوئے تم آیت الکرسی پڑھ لیا کرو تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کرنے والا تمہاری حفاظت کرے گا اور شیطان تمہارے قریب نہیں آئے گا، جب تک کہ تم صبح اٹھو گے۔ تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی تو میں حضور پاک ﷺ کی خدمت میں آیا اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم نے اپنے قیدی کے ساتھ کیا کیا؟ میں نے کہا: یا رسول اللہ! اس نے کہا تھا: میں آپ کو ایسے کلمات سکھاتا ہوں جس سے اللہ تعالیٰ فائدہ دیں گے۔ اس وجہ سے میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: پھر اس نے تمہیں کیا سکھایا؟ اس نے کہا تھا: آیت الکرسی پڑھ لیا کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ تمہاری حفاظت کرے گا اور ساری رات تمہیں شیطان بھی نہیں چھیڑے گا۔ راوی بیان فرماتے ہیں کہ صحابہ تو خیر ڈھونڈنے میں زیادہ حریص تھے، اس لیے حضرت ابو ھریرہ ﷜ نے اس کو چھوڑ دیا کہ ایک بات بتائی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اے ابو ہریرہ! اس نے تمہارے ساتھ تو بات سچی کی ہے، لیکن وہ جھوٹا ہے۔ کیا تمہیں پتہ بھی ہے کہ تم تین راتیں کسے پکڑتے رہے ہو؟ حضرت ابو ہریرہ ﷜ نے عرض کیا: مجھے تو پتہ نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ شیطان تھا۔ [مستفاد من صحیح البخاری: رقم: ۲۳۱۱، ۳۲۷۵]

اس آیت الکرسی کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ جو سب سے بڑا اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے وہ بھی مانتا ہے کہ آیت الکرسی کی یہ شان ہے اس لیے ایک محاورہ ہے: ''كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ كُلِّ حَكِيْمٍ فَإِذَا وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا'' کلمۂ حکمت مومن کی گمشدہ شے ہے۔ اگر دیوار پر بھی کوئی اچھی نصیحت لکھی ہوئی ہو تو اس سے بھی سبق حاصل کرو۔ دشمن سے بھی کبھی خیر کی بات مل جاتی ہے۔

اس سے ہمیں دوسرا یہ سبق ملا کہ آج کل ہمارا یہ ذہن بن گیا ہے کہ اگر ہمارا دشمن اور مخالف کوئی سچی بات بھی کرے تو ہم سو بہانے کرتے ہیں۔ ہم کہیں گے: مقصد یہ تھا وہ ویسے خوشامد کر رہا تھا، وہ آپ کو دھوکہ دینا چاہتا تھا،

---

[۱] [جمع الجوامع: رقم: ۱۵۹۷۲]

جبکہ اسلام ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ اگر مخالف بھی کوئی سچی بات کرے تو کہو کہ سچی بات ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس اس کمرے کی چابی تھی جس میں صدقہ کا مال تھا۔ ایک دن آپ چابی لگا کر اندر گئے تو دیکھا کہ کھجور مٹھی بھر کم معلوم ہو رہی ہے، دوسرے دن دیکھا کہ کھجور کم معلوم ہو رہی ہے، پھر تیسرے دن اس طرح دیکھا اور حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم چور کو پکڑنا چاہتے ہو؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: جی ہاں! ۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم دروازہ کھولو تو کہو: ''سُبْحَانَكَ مَنْ سَخَّرَكَ مُحَمَّدٌ ﷺ'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے ایسے پڑھا تو وہ چور پکڑا گیا۔ میں نے اس کو پکڑ کر پوچھا: یہ تم روزانہ چوری کر رہے ہو؟ اس نے کہا: میں چوری کرتا ہوں، لیکن میرے چھوٹے بچے ہیں، غریب ہوں، جن ہوں۔ تو میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ فرماتے ہیں: جب اس کو دو تین دن چھوڑتے رہے تو اس کو کہا کہ تم ہر دفعہ وعدہ کرتے ہو کہ میں نہیں آؤں گا، لیکن تم پھر آجاتے ہو؟ اب میں تم کو نہیں چھوڑتا، آج میں تمہیں پکڑ کر حضور اکرم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا۔ اس نے کہا: مہربانی کرو! مجھے وہاں نہ لے جاؤ۔ اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں تمہیں ایسا کلام بتا دیتا ہوں کہ اگر تم اس کو پڑھ لیا کرو تو جن چاہے بڑا ہو یا چھوٹا ہو، مرد ہو یا عورت ہو، تمہارے قریب بھی نہیں آئے گا۔ میں نے کہا: بتاؤ۔ اس نے آیت الکرسی کے بارے میں بتایا کہ یہ پڑھ لیا کرو۔ میں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس نے بات تو ٹھیک کی ہے؛ کیونکہ آیت الکرسی پڑھنے سے شیطان قریب نہیں آتا ہے۔ [سنن النسائی: رقم: ۱۰۷۹۴]

دوسرا قصہ:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انسانوں میں سے ایک آدمی ایسی جگہ پر گیا کہ اس کو جن مل گیا۔ ان میں آپس میں بات چیت ہوئی تو جن نے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ کشتی کرو اور مجھے کشتی میں گرا دو تو میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں گا کہ جن تمہارے قریب بھی نہیں آئیں گے۔ اس انسان نے کہا: ٹھیک ہے، میں لڑتا ہوں۔ جب لڑے تو اس نے جن کو گرا دیا تو اس کے بعد اس نے جن سے کہا کہ تم تو بڑے کمزور جسم کے ہو۔ تمہارے ہاتھ بھی ایسے ہیں جیسے کتے کے ہاتھ ہوتے ہیں، کیا تم سارے ایسے ہوتے ہو؟ اس نے کہا: سارے تو ایسے نہیں ہوتے، طاقتور بھی ہیں، لیکن میں سب میں کمزور ہوں۔ بات یہ ہے کہ اگر آیت الکرسی پڑھ لو تو کوئی شیطان کوئی جن تمہارے قریب

نہیں آئے گا اور بھاگتے ہوئے اس کے پادنکل رہے ہوں گے۔ اس نے پھر بھی کشتی لڑی اور پھر بھی اس کو گرادیا تو اس نے یہ آیت الکرسی بتادی۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وہ جو جن سے لڑا تھا وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تو نہیں تھے؟ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اور کون ہوسکتا ہے؟ [غریب الحدیث لابی عبید: ۳/۳۱۶]

اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! اللہ تعالیٰ نے تم کو ایسی شان دی ہے کہ جس گلی میں تم گزرتے ہو شیطان وہ راستہ چھوڑ کر دوسری گلی میں بھاگ جاتا ہے۔

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آیت الکرسی جس گھر میں پڑھی جائے اگر اس میں پہلے سے کوئی جن ہے تو وہ بھی بھاگ جاتا ہے۔

[المستدرک للحاکم: ۲/۲۵۹]

(حدیث) ایک روایت میں ہے کہ ہر چیز کی ایک بلندی ہوتی ہے اور قرآن کی بلندی سورۃ البقرۃ میں ہے۔ اس میں ایک آیت ہے جو تمام آیات کی سردار ہے۔ [ابن کثیر بحوالہ ترمذی]

واقعات:

ہم جس مدرسے میں پڑھتے تھے وہاں بھی جنات پڑھتے تھے۔ ایک طالب علم بڑا عابد اور زاہد تھا۔ اس کو طالبوں نے کہا: جب رات تہجد کے لیے اٹھو تو مہربانی کر کے ہمیں اٹھا دینا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ جب وہ رات کو مسجد میں تہجد پڑھنے کے لیے گیا تو اس کو یاد آیا کہ میں نے ساتھیوں کو اٹھانا تھا۔ اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور ایک ایک طالب علم کو اٹھایا۔ اب جس کی آنکھ کھلے وہ ہاتھ کو دیکھے، وہ خود بخود بے ہوش ہو جائے۔ صبح جب اساتذہ کو طلباء نے شکایت کی کہ آج ایسے واقعہ ہوا ہے۔ اس کو تلاش کیا گیا وہ نہ ملا اور وہ نکل گیا۔ ہمارے استاذ نے کہا: وہ جن تھا۔ اس کو ہم نے کہا تھا کہ تم شرارت نہ کرو اور پڑھتے رہو، لیکن تم اپنے آپ کو کسی پر ظاہر نہ کرنا، لیکن اس نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ اس ڈر کے مارے وہ مدرسہ چھوڑ کر چلا گیا ہے، اب تمہیں کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ مسلمان تھا، علم پڑھنے والا تھا، اس سے غلطی ہوگئی۔

خط ابودجانہ کا اثر:

مجھے یاد ہے ہم چھوٹے سے تھے۔ اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک جلسہ میں گئے۔ وہاں ایک مولوی

صاحب نے آ کر کہا کہ حضرت! ہم آج کل ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ہم نے بڑی کوششوں سے ایک ایک پیسہ جوڑ کر مدرسہ مسجد بنائی،...... ماشاء اللہ...... سوڈیڑھ سو طالب علم ہیں، لیکن جنات نے قبضہ کر رکھا ہے اور انہوں نے تنگ کر دیا ہے۔ طلباء روٹی رکھتے ہیں وہ کھا جاتے ہیں۔ رات کو طلباء سوتے ہیں تو صبح کو کسی کی چارپائی دو کلومیٹر دور پڑی ہے، وہ وہیں سو رہا ہے، کوئی جنگل میں پڑا ہے، کوئی نہر کے کنارے سو رہا ہے۔ طلباء پریشان ہیں، مدرسہ اجڑ جائے گا اور ہم کچھ لوگوں کو لے آئے تھے، جو کہتے تھے: ہم جنات کو نکال دیتے ہیں، انہوں نے کچھ عمل کیا، لیکن جنات نے ان کو بھی اچھی طرح سے مارا، وہ بھی بھاگ گئے۔ والد صاحب نے کہا: مجھے تو کوئی عمل نہیں آتا۔ حدیث شریف میں ایک خط مبارک ہے جو حضور پاک ﷺ نے جنات کی طرف لکھا تھا۔ حدیث مبارک کی کتاب منگوائی اور وہ خط نقل کر کے کہا کہ یہی تم لکھ کر مدرسہ میں ہر جگہ لگا دو۔

کافی عرصہ کے بعد وہ مولوی صاحب ملے تو والد صاحب نے ان سے پوچھا تو اس نے کہا:...... الحمد للہ...... بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ جب ہم نے خط لگائے تو ایک دن کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارے جن طالبوں پر جنات کا اثر تھا، اس نے دیکھا کہ پوری فوج کی فوج ہے، ان کا سردار آیا اور اس نے کہا: یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔ اب اس مدرسہ کو چھوڑ دو۔ تو وہ سب وہاں سے سامان لے کر چلے گئے اور انہوں نے کہا کہ پہلے یہاں ہمارا گھر تھا، تم نے یہاں مدرسہ بنایا، تم نے ہماری زمین چھینی ہے، اس لیے ہم تمہارے ساتھ لڑتے رہے۔ ہم نے کہا: ہمیں کیا پتہ کہ یہاں تمہارا گھر ہے یا نہیں ہے؟ انہوں نے کہا: اچھا اب ہم نے اس کو چھوڑ دیا ہے، اب ہم تنگ نہیں کریں گے۔ اس کے بعد...... الحمد للہ...... مدرسہ میں کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

جنات سے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی بہرحال نہ ڈرے۔ اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور جو بھی قرآن کی آیت یاد ہو پڑھنا شروع کر دے،...... ان شاء اللہ...... تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

جنات کے حملہ کی بعض وجوہات:

بہرحال اللہ پاک بچائے۔ جن ہوتے ہیں، لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بعض جنوں کی عورتیں مردوں پر مسلط ہو جاتی ہیں، بعض مرد خوبصورت عورتوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اور یہ جنات زیادہ حرکتیں اس وقت کرتے ہیں جب آدمی جنابت کی حالت میں ہو، پلید کپڑوں میں پڑا رہے۔ اسی طرح عورتیں حیض میں ہیں، پھر گندی جگہ پر چلی

گئیں، غسل وقت پر نہ کیا، پاکی پلیدی کا خیال نہ رکھا تو اس زمانے میں جن زیادہ حملہ کرتا ہے، ورنہ آدمی اگر پاک صاف رہے اور قرآن پڑھتا رہے، گھر میں داخل ہوتے وقت آیت الکرسی پڑھ لے اور نکلتے وقت آیت الکرسی پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پھر جنات فتنہ نہیں کر سکتے۔

(حدیث) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ لوگوں کی طرف نکلے، جو کافی سارے جمع تھے۔ آپ نے فرمایا: کون ہے جو مجھے یہ بتائے کہ قرآن میں سب سے زیادہ اعظم آیت کون سی ہے؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اچھا ہے کہ تم نے جاننے والے سے مسئلہ پوچھا ہے۔ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قرآن میں سب سے اعظم آیت آیت الکرسی ہے۔ [ابن کثیر بحوالہ: ابن مردویہ]

(حدیث) حضرت اسما بنت یزید بن السکن کہتی ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ ان دو آیات میں اسم اعظم ہے: ایک آیت الکرسی اور دوسری ﴿الٓمّٓ ① اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ②﴾ [البقرۃ: آل عمران: ۱، ۲] ان کے اندر اسم اعظم ہے۔ [مسند احمد: ۶/ ۴۶۱]

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ روایت صحیح ہے۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں: ''یا حی! یا قیوم!'' اسم اعظم ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں: یا اللہ اسم اعظم ہے۔

بہرحال! جو اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں ان ناموں کو یاد کر لو (یہ سب سے بڑی نعمت ہے)۔ بس قرآن و حدیث پر یقین ہونا چاہیے اور اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ ایک دو دفع جب پڑھیں گے تو یاد ہو جائیں گے۔ ان کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اوّل و آخر درود شریف پڑھ کر دعا ختم کر دی، اس پر عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے سارے کام شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے کچھ اور طریقے بھی لکھے ہیں کہ جیسے اللہ تعالیٰ کے نام ہیں، جس نام کی جس کام سے مناسبت ہے اس نام کو زیادہ پڑھو۔ مثلاً: ایک گناہگار انسان ہے، وہ چاہتا ہے کہ میرے گناہ پر پردہ پڑ جائے تو ''یا ستار! یا ستار!'' پڑھتا رہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ پردہ ڈالنے والے ہیں۔

کم ذات کو علم نہ سکھاؤ:

اس لیے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کہا تھا کہ جو کم ذات لوگ ہوتے ہیں، جن کی نسل نہیں ہوتی وہ جب پڑھ جاتے ہیں تو سب سے پہلے استاذ کے خلاف کام شروع کرتے ہیں۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ ایک مرتبہ ایک شہر میں جا رہے تھے۔ ایک

بستی سے گزرے تو کتے حضرت سعدی رحمہ اللہ کو کاٹنے کے لیے دوڑ پڑے تو بڑے غور سے دیکھنے لگے۔ شاگرد نے پوچھا: حضرت! کیا دیکھ رہے ہیں؟ فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں، میں نے ان کو کبھی پڑھایا تو نہیں، یہ مجھے کیسے کاٹتے ہیں؟ اور یہ واقعی تجربہ ہے کہ ہمیں ہر لحاظ سے جو نقصان پہنچایا ہے وہ لوگ تھے جو میرے پاس پانچ پانچ سال پڑھتے رہے تھے۔ غیر آدمی تو ایک دن آتا ہے محبت سے درس سنے گا، اس نے کسی کا کیا برا کرنا ہے؟ بہر حال اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ہدایت دے اور انہیں بھی ہدایت دے۔

(حدیث) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم کہ جس سے دعا مانگی جائے وہ دعا پوری ہوتی ہے۔ ان تین سورتوں کے اندر ہے: سورۃ البقرۃ، آلِ عمران، طٰہٰ ہے، سورۃ البقرۃ میں آیت الکرسی ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵] کے اندر سورۃ، آلِ عمران میں ﴿الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝﴾ [آلِ عمران: ۲،۱] میں اور سورۃ طٰہٰ میں ﴿وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ﴾ [طٰہٰ: ۱۱۱] میں۔ [مشکل الآثار: رقم: ۴۳۵۹]

(حدیث) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے اس کے جنت میں داخل ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں، مگر موت؛ کہ موت کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرما دیں گے۔ [سنن النسائی الکبریٰ: رقم: ۹۹۲۸]

(حدیث) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی فرمائی کہ ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرو۔ جو پڑھے گا اس کے دل کو شاکرین سے اور زبان کو ذاکرین سے اور اس کو منیبین کا ثواب اور صدیقین کے اعمال نصیب کروں گا۔ اس پر کوئی ہمیشگی نہیں کر سکتا، مگر پیغمبر یا صدیق یا ایسے بندے جس کے دل کو مانجھ کر صاف کر دیا ہے یا ایسا بندہ جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے شہید ہونا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۷۷]

یہ حدیث منکر ہے (کیونکہ اس میں محمد بن الحسن النقاش راوی ہے۔ محدث برقانی نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے اور لیکن اس طرح کی ایک روایت حضرت جابر سے بھی مروی ہے، اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ (حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو سورۃ المؤمن ''اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ'' تک اور آیت الکرسی پڑھے تو صبح تک اللہ تعالیٰ اس کو حفاظت میں رکھتے ہیں۔ اور جو صبح کو پڑھے شام تک اللہ تعالیٰ اس کو حفاظت میں رکھتے ہیں۔ [الترمذی: رقم: ۲۸۷۹]

لیکن یاد رکھیں! جب تقدیر آتی ہے پھر پڑھا ہی نہیں جاتا۔ خدا کی قدرت اور اس کا نظام ہے۔ ہر چیز برحق ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ تقدیر کا کوئی فیصلہ فرمادیں تو ہوجاتا ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آیت الکرسی کی فضیلت میں بہت ساری روایات ہیں، لیکن وہ ضعیف ہیں۔ اور بعض کی اسناد درست نہیں ہے، اس وجہ سے ہم نے ذکر نہیں کیا ہے۔

آیت الکرسی کے دس جملوں کی تشریح:

اس آیت مبارک میں اللہ تعالیٰ نے دس جملے ارشاد فرمائے ہیں:

پہلا جملہ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ﴾ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہی ایک ذات ہے، جو الوہیت کی مستحق ہے، تمام مخلوقات کے لیے کوئی خدا نہیں ہے، مگر اللہ۔ ''اِلٰہ'' کا معنی ہوتا ہے معبود برحق کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ تعالیٰ؛ کیونکہ لوگوں نے جھوٹے معبود تو بڑے بنا لیے تھے، عبادت کی جتنی انواع واقسام ہیں صرف اسی کے لیے ہیں، اس کے لیے آدمی خیال رکھے۔ سب سے اہم مسئلہ توحید، الوہیت ہے۔ ایک ہے خدا کو ماننا، وہ تو سب مانتے ہیں۔ جو نہ ماننے والے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی وقت خدا کا نام لے لیتے ہیں۔ اس لیے اصل معنی یہ ہے کہ اس کی الوہیت میں کسی کا قائل نہ ہو کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔

دوسرا جملہ: ﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ جو زندہ ہے اپنی ذات میں اور اس زندگی میں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ تم زندہ ہو، لیکن تمہیں خدا نے زندہ کیا ہے۔ جب چاہیں گے ماردیں گے، لیکن اس کی زندگی ذاتی حیات ہے۔ جیسا کہ فرمایا ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ [الحدید: ۳] سب سے پہلے بھی اس کی ذات ہے اور سب سے آخر میں بھی اس کی ذات ہے۔ اس سے پہلے بھی کوئی نہیں تھا، اس کے بعد کوئی نہیں ہوگا۔ وہ ایسا زندہ ہے، اس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ وہ خود بھی زندہ ہے بذاتہ اور ﴿الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ ہے، دوسروں کو بھی سنبھالنے والا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ﴿الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ کی بجائے ''القیام'' پڑھتے تھے جو چیزیں دنیا کے اندر ہیں سب اس کی محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات غنی ہے، اس کو کسی کی احتیاج نہیں ہے۔ اور کوئی نہیں جو اس کائنات کو سنبھالنے والا اور چلانے والا ہو، مگر اس کے حکم سے اور اس کی ذات سے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ۭ﴾ [الروم: ۲۵] اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت کی نشانیوں میں یہ نشانی ہے کہ وہی ذات ہے جس کے حکم

سے زمین و آسمان قائم ہیں، وہی ان کو سنبھالنے والا ہے اور کوئی نہیں جو ان آسمان و زمین اور جو ان کے اندر ہے تھام سکے۔

تیسرا جملہ: ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ﴾ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ اس کو اپنی مخلوق میں کوئی نقص غفلت اور ذہول پیش نہیں آ سکتا، اس کی ذات تمام صفاتِ نقصان سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام صفات و کمال و جلال و صفات شان کے ساتھ متصف ہے۔ وہ غفلت سے پاک ہے۔ وہ ایسی صفت قیوم کے ساتھ متصف ہے کہ اس کو بھی اونگھ نہیں آتی اور اس کو نیند بھی نہیں آتی۔ ''سِنَةٌ'' چھوٹی نیند کو کہتے ہیں، جیسے آدمی اونگھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بھی پاک اور منزہ ہے۔ اور نیند اونگھ سے زیادہ شدید ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔

(حدیث) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر چار کلمات کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَنَامَ'' اللہ پاک کبھی نہیں سوتا اور اس کو زیبا بھی نہیں کہ سو جائے؛ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ سو جائے تو مخلوق کہاں جائے گی؟ ''يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ'' اس کی شان ہے کہ وہ میزان کو اونچا کرے یا نیچا کرے۔ ''يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ وَعَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ'' دن کے تمام اعمال اللہ کے دربار میں پیش ہوتے ہیں رات آنے سے پہلے اور جو رات میں مخلوق اعمال کرتی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوتے ہیں۔ ''حِجَابُهُ النُّوْرُ وَ النَّارِ لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهَى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ'' اللہ تعالیٰ کے حجابات نور کے حجابات ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے حجابات کو کھول دیں تو اس کے چہرے کی تجلیات کی وجہ سے جہاں تک مخلوق میں نظر جائے گی وہاں سب کچھ جل جائے گا، کوئی برداشت نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت دنیا میں ممکن نہیں ہے، قیامت میں ...... ان شاء اللہ تعالیٰ ...... مومنین کو رؤیت نصیب ہوگی۔ [صحیح مسلم: رقم: ۱۷۹]

مفسر فرماتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ملائکہ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نیند کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو تین راتوں تک جگائے رکھو، سونے نہ دو۔ ملائکہ نے ان کو جگائے رکھا۔ جب تین راتیں گزر گئیں تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: اب ان کو دو شیشے کی بوتلیں پکڑا دو اور کہو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ان کی حفاظت کرو۔ خبردار! یہ چھوٹنی نہیں چاہئیں۔ تین دن کے جاگے ہوئے تھے، کھڑے ہیں۔ جب نیند آتی ہے تو خبردار ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔

اس طرح کرتے کرتے ایسا زور کا جھٹکا لگا کہ شیشہ شیشے پر لگا اور ٹوٹ گیا۔ (ابن جریر نے اس روایت کو ایسے ہی بیان کیا ہے۔ حسن بن یحییٰ عن عبدالرزاق روایت ہے۔ کیا حضرت موسیٰ کو اتنا بھی اللہ تعالیٰ کے متعلق علم نہیں تھا؟ یہ ایک انوکھی بات ہے)۔ [ابن کثیر: ۱/ ۱۷۸، ۱۷۹]

اسی طرح ایک اور روایت بھی ابن کثیر نے مرفوعاً نقل کی ہے، مگر اس پر بھی ''غَرِیْبًا جِدًّا'' اور اسرائیلی ہونے کا حکم لگایا گیا ہے۔ اسی طرح سے ابن کثیر نے تیسری روایت بھی نقل کی ہے (انور)۔

چوتھا جملہ: ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اس کا وہی مالک ہے، ساری کائنات اس کی مملوک ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ إِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ [مریم: ۹۳] جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملک ہے۔ تو اس کے ملک میں کوئی دوسرا کیسے تصرف کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: صرف یہی نہیں کہ میرے ملک میں ہیں، بلکہ قیامت والے دن سب علیحدہ علیحدہ ہو کر میرے دربار میں آئیں گے۔ تو جب وہ خود میرے دربار میں پیشی دیں گے تو تمہارے نفع ونقصان کے مالک کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس لیے اگر ساری کائنات مل کر تمہیں نفع پہنچانا چاہے تو نفع نہیں پہنچا سکتی جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ اور ساری کائنات مل کر نقصان پہنچانا چاہے تو نقصان نہیں پہنچا سکتی جب تک کہ اللہ تعالیٰ نقصان نہ پہنچائے۔

اس لیے ہمیشہ اپنے ایمان اور عقیدوں کو صحیح رکھیں۔ ساری زندگی اگر آپ حج وعمرے کرتے رہیں اور عقیدوں میں وہی شرک وبدعت ہو تو کوئی فائدہ نہیں۔

جیسا کہ ایک آدمی نے کسی سے پوچھا کہ ایک کتا ہمارے کنویں میں گر گیا تو کتنا پانی نکالیں؟ تو کسی نے کہا: سو ڈول نکال لو، اور کسی نے کہا: دوسو ڈول نکال لو، اور کسی نے کہا: تین سو ڈول نکال لو، اور کسی نے کہا: پانی کی پیمائش کر لو اتنا پانی کھینچ لو؛ کیونکہ نیچے سے پانی آتا رہتا ہے۔ آخر میں وہ آدمی ایک صحیح عالم دین کی خدمت میں مسئلہ پوچھنے کے لیے آیا، انہوں نے کہا: کیا تمہیں کسی نے یہ بھی کہا کہ پہلے کتا نکالو؟ اس نے کہا: یہ تو کسی نے نہیں کہا۔ انہوں نے کہا: اگر کتا نہ نکالو گے تو ساری زندگی کنواں پاک نہیں ہوگا۔

اس لیے یاد رکھیں کہ چاہے ساری زندگی زمزم سے نہاتے رہیں جب تک شرک اندر موجود ہے اگر اس کو اندر سے نہیں نکالا تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔

پانچواں جملہ: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کون ہے جو میرے آگے سفارش کر سکے؟ مگر میرے اذن سے۔ اور فرمایا: اللہ کے ملائکہ اور اللہ کے انبیاء سفارش نہیں کریں گے، مگر اس کی جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائیں گے اور اجازت دیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال وکبریائی ہے کہ کوئی جرات نہیں کر سکتا کہ کسی کے لیے اللہ کے آگے سفارش کرے، مگر اللہ تعالیٰ اذن عطا فرمائیں۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے سجدے میں چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ مجھے سجدے میں رہنے دیں گے جتنا چاہیں گے، پھر مجھے حکم دیا جائے گا کہ اپنا سر اٹھالیں۔ آپ کہیں آپ کی بات سنی جائے گی اور آپ سفارش کریں گے آپ کی سفارش منظور کی جائے گی۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ میرے لیے بھی ایک حد مقرر فرمائیں گے۔ میں ان کی شفاعت کر کے ان کو جنت میں داخل کراؤں گا۔

کیا بداعمالیوں پر ہمیں پیر فقیر چھڑا دیں گے؟

اس آیت سے یہ مسئلہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں کوئی شفاعت نہیں کر سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اجازت نہ دیں، جبکہ ہمارے بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہم چاہے کتنے گناہگار ہوں، ہمارا پیر پہنچا ہوا ہے، قیامت والے دن پیر ہمیں خود ساتھ لے جائیں گے اور جا کر جنت میں داخل کر دیں گے۔ نماز روزے سے کیا ہے؟ کتنے نماز روزے رکھنے چھوٹ گئے؟ نماز روزہ تو ایک فرض ہے۔ اگر کر سکتے ہو تو کرتے رہو، ورنہ اصل بات یہ ہے کہ اپنا مرشد راضی ہو۔

یہ سب جاہلانہ اور کفر کے عقیدے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں ہمارے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مقابلہ میں نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ کوئی قیامت تک پیدا ہوگا، حضور اکرم ﷺ سے بڑی شان والا کوئی نہیں ہے۔ ہمارا ایمان یہی ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو اگر اللہ تعالیٰ ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے پلڑے میں حضور اکرم ﷺ کو تب بھی آپ کی شان زیادہ ہوگی۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنی بیوی کو، اپنی بیٹی کو اور اپنے اہل بیت کو نام لے کر فرمایا: خبردار! اس گمان میں نہ رہنا کہ ہم محمد کی بیٹی، بیوی ہیں۔ اپنے عمل ٹھیک کر لو۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے فاطمہ! اگر دنیا میں مجھ سے کچھ مانگنا ہے تو مانگ لو، میں دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن قیامت کے دن اور قبر حشر میں یہ نہ کہنا کہ میں نبی کی بیٹی ہوں، چھوٹ جاؤں گی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمادیا: ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ [الاحزاب: ۳۲] ساری کائنات کی عورتیں تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ تمہاری ایسی شان ہے کہ تمہارے حجرے میں اور تمہارے گھروں کے اندر اللہ تعالیٰ کا قرآن نازل ہوتا ہے۔ اگر تم نے کوئی غلطی کی تو ہم تم کو لوگوں سے دگنا عذاب دیں گے۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم کو چھوڑ دیں گے۔

اور اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نمونہ دکھادیا کہ حضرت لوط علیہ السلام اپنے گھر والوں کو اور بچوں کو لے کر رات کے آخری پہر میں نکل جاؤ اس بستی سے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا، ہم اس بستی پر اپنا قہر نازل کرنے والے ہیں، لیکن آپ کی بیوی کو پناہ نہیں ملے گی، حالانکہ جب حضرت لوط علیہ السلام بستی سے باہر نکلے تو بیوی بھی ساتھ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کی بیوی جا کر اپنی قوم کے بندوں کو چغل خوری کرتی تھی، لہٰذا اس پر بھی وہ قہر ٹوٹے گا جو تیری قوم پر ٹوٹا ہے۔ ان کی بیوی کو برباد کردیا گیا، حضرت لوط علیہ السلام ان کو بچا نہ سکے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا باپ کے سامنے غرق ہوگیا۔ یہ قرآن میں ہے، یہ کوئی ہیر رانجھے کا قصہ نہیں ہے۔

لہٰذا یہ عقیدہ رکھنا کہ ہمیں پیر چھڑا لے گا یا ہمیں قلندر چھڑا لے گا، یہ کیا عقیدے ہیں؟ ایسے جھوٹے اور مکار لوگ آگئے کہ کبھی لوگوں کو رو رو کر دھوکہ دیتے ہیں، کبھی اپنی جھوٹی کرامات سناتے ہیں، کبھی اپنے جھوٹے خواب سناتے ہیں اور کبھی اللہ کے نبی سے ایسا تعلق بتاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ رات دن ان کا حضور اکرم ﷺ سے رابطہ قائم ہے۔ اور دنیا دھوکے میں جارہی ہے۔

(واقعہ) ایک پیر صاحب جب باہر نکلتے تھے تو ان کا دور تھا کہ ملک کے صدر اور وزیر ان کے مرید تھے۔ ان کے آگے پیچھے گاڑیاں ہوتی تھیں، ایک بڑا کارواں ہوتا تھا۔ راستے میں جب دیکھتے کہ کہیں خوبصورت جگہ آگئی تو وہاں کہتے: گاڑی روکو۔ اور گاڑی سے اتر کر ہاتھ باندھ کر دور کھڑے ہوجاتے، سارے لوگ بیٹھے ہیں اور پیر صاحب وہاں کھڑے ہیں۔ آدھا گھنٹہ، گھنٹہ جتنا برداشت ہوسکا، اس کے آنسو بہہ رہے ہیں اور خلیفے پاؤں پر پڑے ہیں کہ حضرت! کیا ہوگیا؟ تو کہا: حضور پاک ﷺ کی سواری جارہی تھی تو میں ملاقات کے لیے گیا تھا...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ......

حالانکہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد یہ دعویٰ تو بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی نہیں کرسکیں، بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی نہیں کرسکیں۔ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد چھ ماہ بستر پر پڑ گئیں، پھر وفات ہوگئی۔ وہ

فرماتی تھیں: میں کیسے اٹھوں؟ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آجاتا ہے۔ اور یہ دعویٰ تو خادم رسول ﷺ حضرت انس رضی اللہ عنہ نہیں کر سکے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نہیں کر سکے اور نبی کے سارے صحابہ یہ دعویٰ نہیں کر سکے کہ ابھی ابھی حضور اکرم ﷺ مدینے جارہے تھے اور ہم مل کر آرہے ہیں۔ چودہ سو سال کے بعد یہ پیر اتنی ترقی کر گئے کہ صحابہ اہل بیت رسول ﷺ سے بھی بڑھ گئے۔

یادرکھیں! عالم دنیا کا الگ نظام ہے اور عالم آخرت کا الگ نظام ہے۔ جس شخص کی موت کفر پر، قبر پرستی پر اور بت پرستی پر آئی، چاہے وہ سورج کا پجاری ہو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پجاری ہو، حضرت عزیر علیہ السلام کا پجاری ہو یا کسی قبر والے کا پجاری ہو، اگر موت شرک پر آگئی تو اس کی سزا ہمیشہ کے لیے جہنم ہے۔ اس کی شفاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

شفاعت کس کی کن کے لیے ہوگی؟

جن کی موت ایمان پر آگئی اور جہنم کے پروانے مل گئے، لیکن ابھی جہنم میں داخل نہیں ہوئے، وہاں بھی اللہ تعالیٰ نبیوں کی سفارش پر چھوڑ دیں گے۔ بعض کو جہنم کے پروانے بھی مل جائیں گے اور جہنم میں ڈال دیے جائیں گے، پھر بھی نبی سفارش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو بھی چھوڑ دیں گے۔

اسی طرح اگر کسی آدمی کے چھوٹے نابالغ دودھ پینے والے یا دودھ پینے کے بعد بلوغت سے پہلے پہلے مر گئے، وہ بھی قیامت میں اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے: اے اللہ! ہم بھی تیرے بندے ہیں، ہمارا ابا جہنم کی طرف جارہا ہے، ہم اکیلے جنت میں کیسے جائیں؟

حافظ قرآن اور شہدا بھی سفارش کریں گے ان ایمان والوں کے لیے جن کی موت توحید پر آئی ہوگی اور ان کے ذمہ گناہ ہیں۔ اور وہ شفاعت بھی اس طرح ہوگی کہ پہلے اللہ تعالیٰ سے اجازت لیں گے: یا اللہ! میں تیرے اس بندے کی سفارش پیش کرنا چاہتا ہوں، اجازت ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اجازت ہے۔ تو پھر شفاعت ہوگی۔ اگر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اجازت نہیں ہے، تو پھر شفاعت نہیں ہوگی۔

(حدیث) حدیث مبارک میں ہے: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جبرئیل! مجھے تیرے ملنے کا بڑا اشتیاق رہتا ہے، تم ذرا جلدی آیا کرو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: حضور! مجھے بھی آپ کی زیارت کی تڑپ ہوتی ہے، لیکن

جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دیں ہم ہل بھی نہیں سکتے۔

چھٹا جملہ: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ﴾ اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا جاننے والا بھی اللہ ہے، جو کچھ پیچھے گزرا اس کا جاننے والا بھی اللہ ہے اور جو کچھ آگے ہوگا اس کا بھی اللہ تعالیٰ کو علم ہے۔ جیسا کہ ملائکہ نے کہا تھا: ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۖ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴾ [مریم: ۶۴]

ساتواں جملہ: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ﴾ کوئی شخص میرے علم میں سے کسی شے پر مطلع نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی اطلاع نہ کروں۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ﴾ [الجن: ۲۶، ۲۷] ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں اتنا ہی علم رکھتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمایا ہے اور جتنا اللہ تعالیٰ نے علم نہیں دیا کوئی جان نہیں سکتا۔

اس لیے محدثین علماء نے فرمایا کہ مسلمان اپنا عقیدہ یہ رکھے کہ اے اللہ! ہمارا تیری ذات پر بھی ایمان ہے اور تیری جمیع صفات پر بھی ایمان ہے۔ اور صفات وہ جو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں بتائی ہیں یا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بتائی ہیں، یعنی بندہ اپنی طرف سے بھی صفتیں نہ بنائے۔ ان صفات کو اس طرح مانے جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمائی ہیں۔ جو اپنی طرف سے صفتیں بنائے وہ بھی شرک میں پڑ جاتے ہیں۔

آٹھواں جملہ: ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ﴾ ڈھانپ لیا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمینوں کو۔ اس سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے فرمایا کہ کرسی سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو اپنے احاطہ میں لے لیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ کرسی سے مراد قدم رکھنے کی جگہ اور عرش کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔

ابو مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: کرسی عرش کے نیچے ہے۔

حضرت سدی رحمہ اللہ نے فرمایا: آسمان زمین گویا کرسی کے پیٹ کے اندر ہیں۔ کرسی ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور کرسی عرش کے آگے ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں پھیلائی جائیں، پھر ایک دوسرے کے ساتھ سب کو جوڑ دیا جائے تو کرسی کے مقابلے پر ایسے ہوں گے جیسا کہ ایک حلقہ بڑے میدان کے اندر پڑا ہوا ہو تو وہ چھوٹی سی جگہ رو کے گا۔

ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات آسمانوں اور سات زمینوں کی حیثیت کرسی کے سامنے ایسے ہے جیسا کہ ایک ڈھال میں سات درہم ڈال دیں تو وہ کتنی جگہ روکیں گے؟

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ کرسی عرش کے مقابلہ پر ایسے ہے جیسا کہ کوئی لوہے کا کڑا آپ میدان میں ڈال دیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کرسی...... جس کا ذکر قرآن میں ہے...... اس سے کیا مراد ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! سات آسمان اور سات زمینیں کرسی کے مقابلے پر ایسے ہیں جیسا کہ ایک کھلے میدان میں ایک کڑا ڈال دیں تو وہ کڑا کتنی جگہ رو کے گا!؟ اور اللہ تعالیٰ کا عرش کرسی سے ایسے بڑا ہے جیسے میدان اس کڑے سے بڑا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس نے عرض کیا: حضور! میرے لیے دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرمادیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بیان فرمایا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کی کرسی اتنی بڑی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو اپنے احاطہ میں لے لیا ہے۔ آسمانوں سے آواز آتی ہے جیسے کوئی پالان اونٹ پر نیا رکھیں، اس پر بوجھ پڑتا ہے تو چڑ چڑ کی آواز آتی ہے، اسی طرح آسمانوں سے آواز آتی ہے۔ کیونکہ آسمانوں پر اللہ تعالیٰ کی اتنی مخلوق ہے کہ کوئی جگہ ایک بالشت برابر خالی نہیں ہے، ہر جگہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فرشتہ سجدہ میں یا قیام میں ہے یا رکوع میں ہے۔ سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس بیان کر رہے ہیں۔

بعض روایات میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ کرسی قیامت والے دن ہو گی جب اللہ تعالیٰ عدل فرمائیں گے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بات اس آیت میں ذکر نہیں ہے۔ یہاں تو مطلقاً کرسی کا ذکر ہے۔

بعض متکلمین کی یہ تحقیق ہے کہ کرسی دراصل آٹھویں آسمان کا نام ہے، اس کا نام فلک ثوابت ہے، اس کے بعد

فلک التاسع ہے اور اسی کا نام فلک الاثیر ہے اور اسی کا نام الاطلس بھی ہے، لیکن بہت سارے لوگوں نے ان کے قول کو رد کیا ہے۔

اس طرح ایک قول حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ کرسی اور عرش ایک چیز ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کرسی اور چیز ہے اور عرش علیحدہ چیز ہے۔ عرش کرسی سے بڑا ہے۔ اسی پر اقوال و آثار ہیں۔ مفسر ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن خلیفہ عن عمر والی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے اس روایت کی صحت میں اعتراض ہے۔

یہ تمام اقوال ہیں جو کرسی کے بارے میں ہیں، لیکن سلف نے فرمایا کہ جتنا قرآن میں آیا اتنا درست ہے، ہمیں زیادہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کتنا بڑا عالم بن جائے، اس کا علم کم ہے، علم کامل نہیں ہوتا۔ دنیا کے اندر دیکھ لیں! جو لوگ کسی بھی فن کے عالم ہیں، مثلاً: ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں، ریاضیات کے ماہر ہیں، طبیعیات کے ماہر ہیں، اقتصادیات کے ماہر ہیں، فلکیات کے ماہر ہیں، سیاسیات کے ماہر ہیں اور ہر فن کے عالم موجود ہیں، لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری تحقیق نقطۂ آخر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل کو کوئی اور بات نکل آئے۔

آپ دیکھیں! پوری دنیا میں بحث ہوتی رہی ہے کہ کیا زمین گردش کرتی ہے یا سورج اور چاند گردش کرتے ہیں؟ جدید محققین کی یہ تحقیق رہی ہے کہ زمین گردش کرتی ہے۔ چاند اور سورج اپنی جگہ پر ہیں۔ اس پر انہوں نے کتابیں لکھیں اور تحقیقات کر ڈالیں۔ لیکن پھر ایک دور ایسا آگیا اور کہا گیا کہ زمین گردش نہیں کرتی، بلکہ چاند اور سورج گردش کرتے ہیں۔ اور اس پر دلائل کے انبار لگا دیئے گئے۔ اس ریسرچ پر کروڑوں روپے خرچ کر دیئے۔ اب پھر تحقیق آگئی کہ دونوں گردش کرتے ہیں۔ اب پھر جھگڑا ہوگیا کہ ان کی گردش ایک دوسرے کے متوازی ہے یا مخالف ہے۔

تو میرے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ جتنی تحقیقات کر لیں، آپ کا فیصلہ حرفِ آخر نہیں بن سکتا۔ جب آپ کے سامنے نئی نئی چیزیں آئیں گی تو آپ کو رائے بدلنی پڑے گی۔ جب ہمارے علم حسیات تک نہیں پہنچے تو مغیبات تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ جن کو ہم نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ اس لیے موٹی بات یاد رکھ لیں کہ جو قرآن پاک میں ہے: آمنّا۔ ہمیں سمجھ آگیا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور اگر ہمیں سمجھ نہیں آیا تو ہماری عقل میں نقص ہے، خدا کے کلام میں کوئی قصور نہیں ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ہم ہر بات کی تہہ تک پہنچ جائیں۔

نواں جملہ: ﴿وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝﴾ جب آسمان، زمین کرسی اور عرش اتنا بڑا ہے، اللہ تعالیٰ پر ان کا حفاظت کرنا باعثِ بوجھ نہیں ہے اور نہ کوئی تکان ہے۔ وہ ہر صفتِ نقصان سے پاک ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر بندے پر نگران ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہا ہے، نہ اس سے کوئی چیز دور ہے اور نہ اس سے کوئی چیز چھپ سکتی ہے۔ تمام دنیا کی اشیاء اس کے سامنے کمزور ہیں اور بالکل عاجز ہیں، محتاج ہیں اور فقیر ہیں۔

دسواں جملہ: ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝﴾ [البقرۃ:۲۵۵] جتنی اللہ تعالیٰ کی صفات قرآن میں یا صحیح احادیث میں ہیں تو ہمارے سلف صالحین کا طریقہ یہ ہے کہ تشبیہ کے بغیر سب صفات کو مانو کہ یہ بھی نہ کہو کہ ایسا اترتا ہے، یہ بھی نہ کہو کہ اترتا نہیں ہے اور یہ بھی نہ کہو کہ اس کا سننا ایسا ہے، بلکہ وہ سننے والا ہے جیسا کہ اس شان کو زیبا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾ [الشوریٰ:۱۱] اس کی ذات کی کوئی مثال نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی صفات کی بھی کوئی مثال نہیں ہے۔

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۲۵۶]

''دین میں زبردستی نہیں۔ بے شک ہدایت گمراہی سے جدا ہو چکی ہے۔ اب جو گمراہ کرنے والوں کو نہ مانے اور اللہ پر یقین رکھے تو اس نے مضبوط حلقہ تھاما، جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔''

کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟

دین کے اندر جبر نہیں ہے۔ دشمنوں نے ایک بات بڑی مشہور کر دی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ اور پوری دنیا کے میڈیا نے زور لگایا ہوا ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں، مسلمان قاتل، وحشی اور ڈاکو ہیں، مسلمانوں کا کام لوگوں کو قتل کرنا ہے، لوگوں کے مالوں کو مالِ غنیمت بنا لیتے ہیں اور لڑکیوں کو اپنی کنیزیں بنا لیتے ہیں۔

اس طرح وہ دنیا کے سامنے یہ تصور دیتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کی ایک دہشت بن جائے اور دنیا میں جہل پھیل جائے۔ کہیں کوئی واقعہ پیش آیا ادھر ادھر تلاش کر کے مسلمانوں کے ذمہ لگا دیں گے۔ اور یہ وہ تصور ہے جس سے بچنے کے لیے آج ہمارے مسلمان کہہ بیٹھتے ہیں کہ ہم بنیاد پرست نہیں، ہم تو معتدل مسلمان ہیں اور

ہمارے اندر بڑی مساوات ہے۔ یہ اس لیے کہتے ہیں، تا کہ یہ لوگ ہم سے راضی ہو جائیں۔ یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ کے فیصلے کبھی نہیں بدلا کرتے۔ قرآن فرماتا ہے: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ﴾ [البقرۃ:۱۲۰] اے میرے مدنی! یہ یہود و نصاریٰ کبھی آپ سے راضی نہیں ہوں گے، کبھی ان کے دل آپ کے لیے صاف نہیں ہو سکتے جب تک تم ان کا دین اور ان کا طریقہ اختیار کر کے ان کی طرح نہ بن جاؤ۔

(جواب) کفار کا اسلام پر یہ اعتراض اتنا جھوٹا ہے کہ پوری انسانیت کے اندر اتنا بڑا جھوٹ کبھی نہیں بولا گیا۔ جھوٹ بولنے والے وہ لوگ ہیں جن کی تلواریں مسلمانوں کے خون سے رنگین ہیں۔ وہ لوگ آج مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ تم دہشت گرد ہو۔ آپ دیکھ لیں! کشمیر کے اندر کیا ہو رہا ہے؟ بوسنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ کہاں مسلمانوں کا خون نہیں بہایا جا رہا ہے؟ اور کہاں مسلمانوں کا قتلِ عام نہیں ہو رہا؟ اس کے باوجود اسلام کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ اسلام دہشت گرد ہے۔ آپ کے ملک میں دس، بارہ، بیس آدمی مرتے ہیں، ان کے پیچھے بھی دراصل یہود و ہنود کی قوت ہے اور وہ سازشی ذہن ہمیں لڑا رہا ہے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمارے اہل اقتدار کو سمجھ عطا فرمائے۔

آپ پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں! جہاں جہاں یہودیت کو موقع ملا، اس نے کیا کیا مظالم توڑے، جہاں جہاں نصرانیت کو موقع ملا، اس نے کیا کیا مظالم توڑے۔ ان کے برخلاف اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں کوہِ قاف اور دریائے جیحون تک اسلام کا پرچم لہرایا گیا۔ مسلمان جہاں گئے وہ رحمت بن گئے، وہ غریبوں کے مدد کرنے والے بن گئے، ان کے نزدیک مسلم کی بیٹی، ہندو کی بیٹی اور غیر مسلم کی بیٹی کی حفاظت میں کوئی فرق نہیں تھا؛ کیونکہ اسلام کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۟ؕ﴾ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ کسی کو ہم زبردستی تلوار کے زور پر کلمہ پڑھائیں، اسلام اس کا مخالف ہے۔

انصار کے قبیلہ بنو سالم بن عوف کے حضرت حصین رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے، اور ان کے دو بیٹے تھے، لیکن ان کے دونوں بیٹوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں مسلمان ہو گیا ہوں، لیکن میرے دونوں بیٹے کافر ہیں، نصرانی ہیں۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ان کو جبر کر کے مذہب میں داخل کر دوں؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۟ؕ﴾ اللہ تعالیٰ دین میں جبر کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ جو جبر سے اسلام لائے اس کا اسلام قبول نہیں کیا جاتا؛ کیونکہ اسلام کا معنی

ہے کہ دل کے اندر تصدیق ہو، اگر زبان پر اسلام ہے اور دل میں نہیں ہے تو اس اسلام کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

[تاریخ ابن اسحاق]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایک بڑھیا عورت پر گزر ہوا، وہ کافرہ عورت تھی۔ آپ نے فرمایا: اے اماں جان! میں آپ کو دعوتِ اسلام دیتا ہوں۔ بوڑھیا کہنے لگی: اے امیر المومنین عمر! میں بوڑھی عورت ہوں، موت میرے قریب ہے، میں مرنے والی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ اپنے باپ دادا کے دین کو تھوڑی سی دیر کے لیے چھوڑ دوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہاری مرضی ہے۔ ہم تم پر کسی قسم کا جبر نہیں کریں گے۔

یاد رکھیں! اگر جبر کا اسلام قبول ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرعون کا اسلام بھی قبول کر لیتے؛ کیونکہ جب فرعون کو غوطہ لگا تھا تو اس نے بھی کہا تھا: ﴿اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۝﴾ [یونس: ۹۰] اے پروردگار! میں مانتا ہوں کہ تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا سچا رب ہے، میں اسلام لاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تمہیں جب غوطہ لگا یا تو یاد آیا ہے؟ اس لیے اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو جائے اور پھر کوئی اسلام قبول کرے تو وہ اسلام معتبر نہیں ہوتا۔

دوسرا اعتراض:

وہ یہ کرتے ہیں کہ اگر اسلام جبر سے نہیں پھیلا تو یہ جہاد کیا ہے؟ زانی کو پتھر مار مار کر مار ڈالا تو یہ جبر تو ہو رہا ہے، اس کی آزادی چھینی جا رہی ہے۔ اتنی سخت سزائیں تو جنگل کا قانون لگتا ہے۔ اور آج تو دنیا بہت ترقی کر گئی ہے، لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرنے کے لیے وہ اس طرح مثالیں دیتے ہیں۔

(جواب) یاد رکھیں! اسلام نے جہاد کا حکم اس لیے نہیں دیا کہ تلوار کے ذریعے سے ان سے کلمہ پڑھوایا جائے۔ اگر یہ بات ہوتی تو اسلام کافروں کو یہ کیوں اجازت دیتا؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ان لوگوں سے جہاد کرو جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے، یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، جب تک کلمہ نہ پڑھیں یا وہ جزیہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور وہ اپنی ذلت مان لیں تو ان سے جزیہ لے کر ان کا تحفظ کرو۔ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تو جزیہ لینے کا کیا مطلب ہے؟ پھر ان کا تحفظ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے صلح کی اور مشرکین سے معاہدہ کیا، تا کہ کل کو کوئی یہ اعتراض نہ کر سکے کہ اسلام کے اندر مصلحت کا جذبہ نہیں ہے۔ اگر اسلام

تلوار کا نام تھا تو اللہ تعالیٰ نے کیوں فرمایا: اے مسلمانو! اگر کافر تم سے صلح کرنا چاہیں تو ان سے صلح کرلو۔

جہاد کا مقصد:

اسلام میں جہاد اس لیے ہوتا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی زمین سے فساد ختم کیا جائے۔ یعنی جب کفر حد سے بڑھ جائے، مسلمانوں کے دین اور مال و عزت کو تحفظ نہ ملے اور کفر فساد پھیلا کر، جرائم بے حیائی اللہ تبارک و تعالیٰ کی بغاوت پر آمادہ ہوجائے تو ان سے جہاد کرو۔

آج دنیا کے اندر کوئی ایک ایسا ملک دکھادیں جو اپنے باغی کو معاف کردے۔ اگر تمہارے باغی کی سزا موت ہے تو اللہ تعالیٰ کے باغی کی سزا موت کیوں نہیں ہوسکتی؟ اگر تمہارے باغی کی سزا موت ہے تو کیا حضور اکرم ﷺ کے باغی کی سزا موت نہیں ہوسکتی؟ اگر تیری گستاخی کرنے والے کی سزا ہے محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان میں ذرے کے برابر تنقیص کرنے والے کی سزا موت کیوں نہیں ہوسکتی؟

تو یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے جہاد رفعِ فساد کے لیے رکھا ہے۔ جہاد کے اندر اسلام نے حکم دیا ہے کہ کسی بچے کو قتل نہ کیا جائے، کسی بوڑھے کو قتل نہ کیا جائے، کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے اور کسی مذہب کے بڑے پادری، پنڈت کو قتل نہ کیا جائے جب تک کہ وہ قتال نہ کریں۔ تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام جبر سے پھیلا ہے؟

آپ اندازہ فرمائیں کہ مشرکین مکہ نے ظلم کا کون سا حربہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نہ آزمایا ہو؟ صحابہ کو انگاروں پر لٹایا گیا، بی بی سمیہ کو کلمہ پڑھنے کی یہ سزا دی گئی کہ ان کی دونوں ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر دو اونٹوں کے ساتھ باندھ دیا اور ظالم ابوجہل اس شہیدہ کی شہادت کا نظارہ کرنے کے لیے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہے۔ دوسری طرف دیکھیں کہ جس دن حضور اکرم ﷺ مکہ کو فتح کرنے کے لیے آرہے ہیں، دس ہزار کا لشکر جرار آپ کے ساتھ ہے اور صحابہ کی زبان پر ہے کہ آج کے بعد قریش کا کوئی بچہ بھی نہیں بچے گا۔ ان ظالموں نے ہم پر اتنا ظلم کیا ہے، آج اللہ تعالیٰ نے ہمیں موقع دیا ہے۔

روایات میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو جھنڈا دیا تو ان صحابی نے جوش میں آکر پرچم لہرایا کہ آج کشتوں کے پشتے لگادیں گے۔ اس بات کو ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے سن لیا، جو اس وقت کافر تھے۔ انہوں نے بھی دھمکی دے دی تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس سے پرچم واپس لے کر اس کے والد کو دیا جائے۔

جب حضور اکرم ﷺ مکہ کے قریب آئے تو فرمایا: پہلے میری تعلیمات سن لو۔ جو آدمی مسجد الحرام میں داخل ہو جائے اس کو امان ہے، جو آدمی اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اس کو بھی امان ہے، جو آدمی اپنے ہتھیار پھینک دے اس کو بھی امان ہے اور جو آدمی ابو سفیان کی حویلی کے اندر چلا جائے اس کو بھی امان ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: ہر طرف امان ہوگئی تو ہم کس کو قتل کرتے؟ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ جس اونٹنی پر حضور اکرم ﷺ سوار تھے، میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ سے اونٹنی کی مہاریں پکڑے ہوئے تھے، لیکن آپ نے اپنی گردن اتنی جھکائی ہوئی تھی کہ پالان کے ساتھ گردن لگ گئی۔ مکہ کے جو سردار بچ گئے تھے وہ گرفتار ہو کر حضور اکرم ﷺ کے سامنے لائے گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے سرداروں سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے قریش مکہ! اے سرداران قریش! آج بتاؤ کون سا ظلم ہے جو تم نے مجھ پر اور میری جماعت پر نہیں توڑا؟ آج بتاؤ میں تمہارے حق میں کیا فیصلہ کروں؟ کفارِ قریش کی گردنیں نیچی ہیں اور کہنے لگے: ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ لیکن ہمیں امید ہے کہ آپ بڑے کرم والے بھائی ہیں، کرم کریں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں آج وہی فیصلہ کرتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کیا تھا کہ آج کے بعد میں تمہیں طعنہ بھی نہیں دوں گا۔ جاؤ آج کے بعد تم سب آزاد ہو۔

کیا یہ اسلام جبر کر رہا ہے؟ کیا اسی کا نام دہشت گردی ہے۔ عجیب بات ہے! تم مسلمانوں پر ظلم کرتے ہو وہ مظلوم تڑپیں تو اس کو دہشت گردی کا نام دیتے ہو۔

کفار کا مسلمانوں پر ظلم:

تم ملعون رشدی جیسے لوگوں کا تحفظ کرو، وہ اپنے نبی کی عصمت کے لیے چیخے تو تم اس کو دہشت گردی کا خطاب دیتے ہو۔ تم صحابہ کے خلاف اپنے میڈیا میں گالیاں دلواؤ، مسلمانوں کی تکہ بوٹیاں کر ڈالو، مسلمانوں کی عصمتیں لٹوا ڈالو، ایک ایک لڑکی سے سو سو آدمی زنا کریں، اسی حالت میں لڑکیاں تڑپتے تڑپتے مر جائیں۔ اس پر اگر کوئی بھائی غیرت کر کے اٹھے تو تم اس کو دہشت گرد کہتے ہو۔ عجیب بات ہے!!!

شعر
خرد کا نام جنوں رکھ دیا اور جنوں کا نام خرد
جو چاہے تیرا حسن کرشمہ ساز کرے

تم اس پر نازاں ہو کہ طاقت تمہارے پاس ہے، جدید ذرائع تمہارے پاس ہیں، لیکن یاد رکھیں کہ یہ تمام

طاقتیں اس اللہ کے فیصلے کے سامنے ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی مسلمان کی فریاد پر راضی ہوگیا تو تمہارے مٹنے میں بھی دیر نہیں لگے گی۔

کیا اسلام کی سزائیں سخت ہیں؟

جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام کی سزائیں سخت ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ یہ سزائیں کیوں رکھی جاتی ہیں؟ تم اگر کہیں مارشل لاء لگا دو تو تم سے کوئی پوچھتا ہے کہ تم کیا سزائیں دے رہے ہو؟ تم اگر کہیں اپنے قوانین بنا دو تم سے کوئی پوچھتا ہے کہ کیا سزائیں دے رہے ہو؟ اسلام نے تو یہ سزائیں اس وقت دیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے جنگ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور وہ زمین میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے سزائیں تجویز کی ہیں۔ اگر کوئی آدمی تمہارا شہری بن جائے تو وہ تمہارے قانون کا پابند ہے، تمہارے ملک میں ڈرائیونگ لائسنس لے لے تو ٹریفک کے قوانین کا پابند ہے اور جب محمد مدنی ﷺ کا کلمہ پڑھ لے تو اسلام کے قانون کا پابند ہونا کیوں جرم ہے؟

دنیا کے قوانین کی کمزوریاں:

دنیا کا کوئی قانون لے لیں! سب قوانین جرم کو پیدا کرتے ہیں اور مجرم کی حفاظت کرتے ہیں۔

مثلاً: ایک آدمی کسی کا ایک لاکھ ریال چوری کر لے تو آپ کا قانون کہتا ہے کہ پہلے تو مقدمہ بھی نہیں ہوسکتا؛ کیونکہ آپ کہتے ہیں: نوٹوں جیسے نوٹ ہیں۔ آپ کہتے ہیں: کیا آپ کے پاس نوٹوں کے نمبر ہیں؟ اب کون آدمی نمبر لے کر رکھتا ہے؟ پولیس والے کہتے ہیں: اس طرح تو پرچہ نہیں ہوگا، اس لیے آپ کہیں کہ اس کے ساتھ ایک بریف کیس بھی تھا، اس کے اندر میرا ایک پرس بھی تھا؛ کیونکہ کل جب ہم برآمدگی کریں گے تو کیا شو کریں گے؟ کیونکہ نوٹوں جیسے تو نوٹ ہوتے ہیں۔ بہر حال اگر چوری پکڑی گئی تو آپ کے قانون میں ہے کہ تین سال کی سزا دے دو تو آپ اس کو جیل میں بھیجیں گے۔ بہترین پکا مکان ہوگا کہ اس کے باپ کے پاس بھی ایسی بلڈنگ نہیں ہوگی۔ پولیس کا پہرہ ہوتا ہے، عین وقت پر کھانا ملتا ہے، باقاعدہ واک کے لیے باہر نکالا جاتا ہے، تاکہ شریف آدمی کی صحت خراب نہ ہو جائے۔ جب وہ تین سال کی سزا بھگت کر آ گیا، اب اگر وہ تین ہزار تنخواہ لیتا تو وہ تین سال کے اندر کتنا بچا سکتا تھا؟ اس لیے وہ کہتا ہے: یہ بڑا اچھا سودا ہے، اس لیے دوبارہ ڈاکہ مارو۔ اگر تین سال اندر چلے گئے

تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ تمہارا قانون جرم بناتا ہے، مجرم کی حفاظت کرتا ہے؛ کیونکہ جیل کے اندر استادان فن بیٹھے ہوتے ہیں۔

جبکہ اسلام کہتا ہے کہ اس کا ہاتھ لمبا ہو گیا ہے، کاٹ دو کہ تھوڑا چھوٹا ہو جائے اور اس کی لعنت ہر وقت اس کے گلے میں لٹکتی رہے، پوری دنیا کے لیے عبرت بن جائے۔ اسلام کی سزائیں عینِ عدل ہیں، کوئی جبر واکراہ نہیں۔

﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ﴾ بعض علماء نے فرمایا: ''لا'' نافیہ ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: ''لا'' نافیہ ہے، لیکن نہی کے معنی دے رہا ہے، اس لیے یہاں ترجمہ ہوگا: تم کسی پر جبر نہ کرو کہ وہ اسلام میں داخل ہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو دلائل سے روشن کر دیا ہے۔ اب ایک اندھیرا ہے اور ایک روشنی ہے۔ اب جس کی مرضی آئے اندھیرے میں چلے اور جس کی مرضی آئے روشنی میں چلے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہدایت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ جس کو اسلام کی ہدایت دیتے ہیں اس کے سینے کو کھول دیتے ہیں، اس کی بصیرت کو روشن کر دیتے ہیں اور وہ دلیل کے ساتھ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ اور جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ اندھا کر دیں، مہریں لگا دیں ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر، ان کو اگر آپ دین میں زبردستی توڑ کر بھی داخل کریں گے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

شانِ نزول:

انصار میں ایک واقعہ پیش آیا جس کی بنا پر یہ آیت مبارکہ اتری، مگر اس کا حکم عام ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کبھی ایسے بھی ہوتا تھا کہ عورت کی اولاد نہیں ہوتی تھی۔ اب وہ کبھی منتیں مانتی تھی کہ اگر مجھے بچہ ہو گیا اور وہ طویل العمر ہو گیا تو میں اس کو یہودی بناؤں گی۔ بنو نضیر کے بارے میں جب حکم دے دیا گیا کہ ان کو مدینہ سے نکال دیا جائے تو انصار میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جن کی اسی وجہ سے اولادیں یہودیوں کے پاس رہ گئی تھیں، انہوں نے کہا: ہم تو اپنے بچوں کو نہیں چھوڑتے، ان کو لے آتے ہیں؛ کیونکہ ہماری اولادیں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی کہ اب وہ یہودی بن چکے ہیں اور زبردستی اسلام میں نہیں ہے، اسلام میں دلائل اور روشنی کے ساتھ داخل ہو۔ اور جو اسلام میں داخل نہیں ہونا چاہتا، اندھیرے میں بھٹکنا چاہتا ہے، اس کی مرضی ہے، وہ بھٹکتا رہے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں آپ نظر ڈالیں تو کوئی آدمی زبردستی نظریہ قبول نہیں کرتا۔ وقتی طور پر کہہ دے گا، لیکن جب موقع ملے گا تو اٹھ کھڑا ہوگا۔ اسلام اپنے حسنِ خلق اور قوتِ دلائل سے پھیلا ہے، اسلام اپنی جامعیت و اکملیت سے پھیلا ہے۔ جس نے بھی اسلام میں نظرِ انصاف سے غور کیا تو اس کو ماننا پڑا کہ

اسلام سچا دین ہے۔

ایک غلام کہتا ہے کہ میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا مملوک تھا اور نصرانی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مجھ پر اسلام پیش فرماتے کہ اسلام قبول کرلو، میں انکار کرتا۔ تو وہ فرماتے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ میں جبر نہیں کرتا، لیکن اسلام پیش کرتا ہوں کہ اسلام قبول کرلو۔ اگر تم اسلام قبول کرلو گے تو ہم تجھ سے مسلمانوں کے معاملات میں بڑا کام لیں گے (کیونکہ یہ پڑھا لکھا تھا، لیکن مسلمان نہ ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنی وفات سے پہلے آزاد کردیا تھا)۔

بعض علماء فرماتے ہیں: ﴿لَآ اِكْرَاهَ﴾ کا حکم صرف اہل کتاب کے لیے ہے۔ جو ان کے دین میں داخل ہوگیا، جب تک ان کا دین صحیح موجود تھا، اس کو بدلا نہیں گیا تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں: یہ حکم اس وقت تک تھا جب تک اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم جاری نہیں کیا تھا۔ آیتِ جہاد جب اتری تو یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ اب ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم ساری دنیا کو اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ قبول کرلیں تو الحمدللہ۔ اگر اسلام کی دعوت قبول نہ کریں تو ہمیں جزیہ ادا کریں، ہمارے باج گزار بن کر رہیں۔ اگر وہ اس کو بھی قبول نہ کریں تو ہمیں ان سے جہاد کا حکم ہے اس وقت تک کہ جب وہ ان دو چیزوں میں سے ایک قبول نہ کرلیں۔

علماء فرماتے ہیں: اصل بات یہ ہے کہ قتال کا حکم اپنی جگہ ہے کہ مثلاً: ہمارے ساتھ ایک ملک ہے، ہم اس کو دعوت دیں گے۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو خط لکھے تھے کہ تم اسلام میں داخل ہوجاؤ۔ اگر وہ اسلام میں داخل نہ ہوں، لیکن مسلمانوں کے تابع رہیں، تاکہ فساد نہ کرسکیں۔ دنیا میں کفر کو پھیلانے کا مزید ذریعہ نہ بن سکیں۔ اگر وہ یہ بات بھی قبول نہ کریں تو لڑائی کی اجازت ہوگی۔

صحیح حدیث مبارک میں آیا ہے: "عَجِبَ رَبُّكَ مِنْ قَوْمٍ يُقَادُوْنَ إِلَى الْجَنَّةِ فِي السَّلَاسِلِ" تیرا رب تعجب فرماتا ہے ایسی قوم سے جو اسلام کی طرف زنجیروں میں جکڑے ہوئے آتے ہیں، یعنی کسی جگہ جہاد ہوا، کافر قید ہوگئے، ان کو زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا، لیکن پھر وہ مسلمان ہوگئے اور جنت میں داخل ہوگئے۔

[صحيح البخاري: رقم: ٣٠١٠]

حدیث مبارک میں آیا ہے کہ ایک آدمی کو کہا گیا: اسلام لے آؤ۔ اس نے کہا کہ میں اسلام لے آیا، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کہنے لگا: میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں، یعنی خوشی نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چاہے تم اپنے آپ کو مجبور پاتے ہو اسلام پر رہو۔ یہ حدیث صحیح اور تین راویوں سے مروی ہے۔

اس حدیث سے تو یہ بات معلوم ہوتی کہ اکراہ درست ہے اور ادھر قرآن کہتا ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾۔
محدثین نے فرمایا: اس کو حضور اکرم ﷺ نے جبر کر کے یا اکراہ کر کے اسلام میں داخل نہیں کیا، بلکہ حضور اکرم ﷺ نے اس کو اسلام پیش کیا اور وہ مسلمان ہو گیا، لیکن اس نے یہ بتایا کہ اسلام کو میرا نفس قبول نہیں کر رہا۔
فرمایا: اسلام لے آؤ، اگرچہ تم اس کو ناپسند کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں حسن نیت اور اخلاص عطا فرما دیں گے۔
[مسند احمد: ۳/۱۸۱]

مثال کے طور پر آپ ایک جگہ ڈیوٹی کر رہے ہیں۔ اگر آپ کی طبیعت نہ بھی چاہتی ہو، لیکن آپ کو ڈیوٹی پر جانا پڑے گا۔ اس لیے ہم بھی اللہ تعالیٰ کے دروازے پر لگے رہیں، چاہے عبادت میں لذت حاصل نہ ہو رہی ہو، حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: ریا سے عبادت برباد ہو جاتی ہے، لیکن اگر کوئی آدمی عمل کر رہا ہے اور اس کے دل میں بالکل ریا ہے کہ لوگ دیکھیں کہ بڑا عابد وزاہد ہے، پھر بھی یہ عمل کرتا رہے۔ اس عمل کی برکت سے ...... ان شاء اللہ ...... ریا ختم ہو جائے گی۔

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرة: ۲۵۶]

اسلام کا معنی یہ نہیں ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو مانے، بلکہ اسلام کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کو ماننے اور طاغوت کا انکار کرے، تب وہ مسلمان بنے گا۔ طاغوت کا معنی شیطان باطل ہے۔ جو بندہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور غیروں کی عبادت کا انکار کرے تو اس کی مثال ایسے ہے جیسے اس نے ایک کڑے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اور اللہ تعالیٰ ہر بات کو سننے اور ہر بات کو جاننے والے ہیں۔ اسلام کا کڑا مضبوط ہے، وہ کبھی ٹوٹتا نہیں ہے، لیکن اگر رسی مضبوط ہو، مگر مضبوط باندھی نہ گئی ہو تو وہ چھوٹ جائے گی۔ اسلام مضبوط ہے، لیکن ہم بھی اس کو مضبوطی سے پکڑیں، اللہ تعالیٰ کی توحید پر جمیں اور شرک سے نفرت کریں، تب جا کر کامل اسلام نصیب ہوتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قرآن میں "جِبْت" کا لفظ آتا ہے اور "إِنَّ الْجِبْتَ السِّحْرُ وَالطَّاغُوْتُ الشَّيْطَانُ" جبت سے مراد جادو اور طاغوت سے مراد شیطان ہے۔ "وَإِنَّ كَرَمَ الرَّجُلِ دِيْنُهُ وَحَسَبَهُ خُلُقُهُ وَإِنْ كَانَ فَارِسِيًّا وَنَبَطِيًّا" انسان کی عزت اس کا دین ہے، انسان کا حسب اس کا خلق ہے۔ یہ عزت نہیں کہ فلاں قوم یا برادری سے ہے، بلکہ اس کے خلق کو دیکھو! اگر اس کا خلق اچھا ہے تو سمجھو اس کا حسب اچھا ہے۔ اور وہ دین پر ہے

قائم ہے تو سمجھو یہ عزت والا آدمی ہے۔ یہ نہ دیکھا کرو کہ یہ عرب ہے یا عجم ہے، بلکہ یہ دیکھو کہ اگر وہ دین پر قائم ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ عزت والا ہے؛ کیونکہ اسلام کے اندر قومیتوں کے جھگڑے...... جو ہمارے ہاں چل رہے ہیں...... یہ کفر کی سازشیں ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے تو قومیں اس لیے بنائی تھیں، تا کہ ہم ایک دوسرے کی پہچان کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے قومیں اس لیے نہیں بنائی تھیں کہ ان کو پوجنا شروع کر دیں۔ جس طرح کسی قبر پر سجدہ کرنا شرک ہے، اسی طرح قومیت کا نعرہ لگا کر اس کے نیچے مرجانا بھی شرک ہے۔

عروۃ وثقیٰ کی تفسیر:

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عُرْوَةِ الْوُثْقٰى'' سے مراد کلمہ طیبہ ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے مراد قرآن ہے۔

حضرت سالم بن ابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عُرْوَةِ الْوُثْقٰى'' سے مراد اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرنا اور اللہ تعالیٰ کے لیے بغض کرنا ہے۔ یہ سب اقوال متقاربۃ المعنی ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کلمہ پر جم گیا وہ اس کو جنت میں پہنچائے گا، ہاتھ سے نہیں چھوٹے گا۔

ایک جنتی مسلمان کا واقعہ:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: محمد بن قیس بن عبادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: میں مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا، اس کے چہرے پر عبادت کا اثر تھا، اس نے مسجد میں آ کر دو رکعت نماز پڑھی۔ جو لوگ مسجد میں بیٹھے تھے وہ آپس میں کہنے لگے کہ دیکھو! یہ جنتی آدمی ہے۔ جب وہ مسجد سے نماز پڑھ کر باہر نکلا، میں اس کے پیچھے چلا گیا، حتیٰ کہ وہ گھر پہنچے تو مجھے بھی گھر میں بٹھایا اور کہنے لگے: کیسے آئے ہو؟ میں نے کہا: آج مسجد میں آپ کی زیارت کی اور وہاں جتنے لوگ بیٹھے تھے سب کہہ رہے تھے: یہ جنتی ہے۔ اس نے کہا: ایسی بات تو نہیں کہنی چاہیے۔ آدمی وہ بات کرے جس کا پتہ ہو۔ ہمیں کیا پتہ کل کیا ہوگا؟ جہنم اور جنت کے فیصلے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اور اس کے بعد اس نے کہا: اصل وجہ یہ ہے کہ میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک کڑا لگا ہوا ہے۔ میں ایک باغ میں ایک ستون کے ساتھ کھڑا ہوں۔ ایک آدمی آ کر مجھے کہتا ہے: اس پر چڑھ جاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ میں اس پر نہیں چڑھ

سکتا۔ وہ کہتا ہے: اس پر چڑھو۔ میں کہتا ہوں: میں اس پر کیسے چڑھوں؟ میں تو نہیں چڑھ سکتا۔ اتنی دیر میں ایک آدمی آ کر چڑھنے کا طریقہ بتاتا ہے کہ وہ میرے کپڑوں کو باندھتا ہے اور مجھے بتاتا ہے۔ میں چڑھنا شروع کرتا ہوں، چڑھتے چڑھتے میں آخری ستون تک پہنچ جاتا ہوں۔ وہاں جو کڑا ہوتا ہے اس کو میں مضبوطی سے پکڑ لیتا ہوں۔ اس کے بعد میری نیند کھل جاتی ہے۔ میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں نے ایسے ایسے خواب دیکھا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ باغ گویا ایک دین ہے، عمود ''شَہَادَۃُ أَنْ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ'' ہے اور جب تم نے اس کڑے کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہاری موت اسلام پر آئے گی۔ اس لیے اب لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنتی ہے؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کی بشارت موجود ہے، ورنہ معاملہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۵۷]

''اللہ ایمان والوں کا کام بنانے والا ہے، ان کو اندھیروں سے اجالے میں نکالتا ہے۔ اور جو منکر ہیں ان کے رفیق شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے اندھیروں میں نکالتے ہیں۔ وہی دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

قرآن کے اندر ایمان کی صفت نور آئی ہے۔ جیسے روشنی میں آدمی دھکے سے بچ جاتا ہے، کانٹے سے بچ جاتا ہے، سیدھے راستے پر چلتا ہے۔ تو جو ایمان میں آ گیا گویا وہ جہنم سے بچ گیا، سزاؤں سے بچ گیا اور اس کو جنت کا سیدھا راستہ مل گیا۔ اور جو کفر میں ہے وہ اندھیروں میں ہے، وہ بھٹک رہا ہے، کوئی چاند کو خدا بنا کر، کوئی تاروں کو خدا بنا کر، کوئی انسانوں کو خدا بنا کر اور کوئی مردوں کو خدا بنا کر ظلمات کے اندر بھٹکتا رہا۔ جو کافر ہیں ان کے دوست شیاطین ہیں، وہ ان کو نورِ ایمان سے نکال کر کفر کے اندھیروں میں لے جاتے ہیں۔ یہی جہنم کے ساتھی ہیں، اس کے اندر ہمیشہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر بتایا کہ جس کو ہم چاہتے ہیں ہدایت عطا فرمائیں اس کو سیدھے راستے پر چلا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو کفر و شرک اور شک و شبہ کے اندھیروں سے نورِ حق کی طرف لے جاتے ہیں، جو روشن، واضح اور آسان راستہ ہے، اس پر چلاتے ہیں۔ کافروں کے دوست شیطان ہے، وہ ان کو ان کی جہالتوں اور گمراہیوں کو مزین کر کے دکھاتا ہے کہ جو تم کام کر رہے ہو یہ بہت اچھا کام ہے، اسی کے اندر لگے رہو اور اس کو نہیں چھوڑنا چاہیے، لاکھ تمہیں لوگ کہتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ''النُّوْرِ'' مفرد استعمال کیا ہے اور ''الظُّلُمٰتِ'' جمع کا لفظ استعمال کیا؛ کیونکہ حق کا راستہ ایک ہے، حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سب ایک راستہ ہے، توحید و رسالت اور معاد پر ایمان ہو۔

کفر ظلمات ہے، اس کے اندر اندھیرے ہیں۔ ہندوؤں کے پینتیس کروڑ دیوتا ہیں، بعض سورج کو خدا سمجھے بیٹھے ہیں اور بعض آگ کو خدا سمجھے بیٹھے ہیں۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ؁ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰي قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؁ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُـحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰي وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ؀﴾ [البقرۃ: ۲۵۸-۲۶۰]

"کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا اس کے رب کے بارے میں اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی ہے۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا تو رب وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے تو اس نے جواب دیا: میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ بے شک اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال لا۔ تو وہ کافر یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اور اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔ یا (کیا تو نے غور نہیں کیا) اس شخص کے حال پر جو گزرا ایک بستی پر دراں حالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں پر۔ وہ کہنے لگا: کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد؟ سو اللہ نے اس شخص کو سو سال تک مردہ رکھا۔ پھر اسے زندہ کیا۔ فرمایا: کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا؟ اس نے کہا: میں ٹھہرا ہوں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تو ٹھہرا رہا ہے سو سال۔ پس اب دیکھ اپنے کھانے کی طرف اور اپنے پینے کی طرف، یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو۔ اور یہ سب اس لیے کہ ہم تجھے بنائیں گے نشانی لوگوں کے لیے۔ اور دیکھ ان ہڈیوں کی طرف کہ ہم انہیں کیسے جوڑتے ہیں؟ پھر ہم ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پھر جب اس کے لیے حقیقت روشن ہوگئی تو اس نے کہا: میں جان گیا ہوں۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب! مجھے دکھا دے تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے ہو؟ بولا: ایمان تو رکھتا ہوں، لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا: چار پرندے لے لو اور انہیں اپنے سے ہلا لو۔ پھر ان کو ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پہ ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ۔ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اور جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکیم ہے۔"

ربطِ آیات:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر کچھ قصے بیان فرمائے ہیں، جن سے ذاتِ باری کا اور اس کی صفات کا اثبات ہے۔ اس کے بعد کفر کا احساس اور اس کے بعد اثباتِ حشر، حشر معاد، یہ سارے مسئلے بھی ہیں۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کا دوست بن جاتا ہے اس کو کیسے نور ایمان میں لے آتا ہے؟ اور شیطان جس کا دوست بن جاتا ہے اس کو کیسے روشنی سے نکال کر کفر میں لے آتا ہے؟ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تین واقعات بیان فرمائے ہیں۔ پہلا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے، جو بادشاہ نمرود کے ساتھ پیش آیا۔

دنیا کے چار بڑے بادشاہ:

(واقعہ) دنیا میں چار بادشاہ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے تقریباً ساری دنیا پر بادشاہی کی ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ دو مسلمانوں میں گزرے ہیں اور دو کافروں میں گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کمالِ عدل دیکھیں! دو ایمان والے گزرے ہیں۔

1 ......ان میں سب سے بڑی سلطنت سیدنا سلیمان علیہ السلام کو ملی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی سلطنت عطا فرمادی کہ کسی کو ان کے مقابلہ پر آج تک ویسی سلطنت نہیں ملی کہ ان کی حکومت صرف انسانوں پر نہیں، بلکہ جنات، طیور اور حیوانات پر بھی ان کی حکومت تھی۔

2 ......دوسرے بادشاہ ایمان والے حضرت ذوالقرنین ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے مشارق الارض سے لے کر مغارب تک بھیجا۔ ان کو طاقت، سلطنت اور عزت دی۔ جن کا واقعہ قرآن پاک کے اندر موجود ہے۔

3 ......دو کافر بادشاہوں میں: ایک نمرود ہے جس کا پایہ تخت بابل تھا۔

4 ......دوسرا بختِ نصر بادشاہ ہے۔

نمرود بابل کا بادشاہ تھا۔ یہ اپنے اقتدار میں، اپنی دولت وحکومت کے گھمنڈ میں آکر اتنا کمزور ہوگیا کہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔ قاعدہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ دولت، طاقت اور قوت دیتے ہیں اس کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ ایمان کی قوت عطا فرمادیں تو آدمی سیدھے راستے پر رہتا ہے اور اگر ایمان کی دولت سے محروم کردیں تو سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات کو اس لیے بیان فرمایا؛ کیونکہ مکہ والے یہودی اور عیسائی بھی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے واقعات کو سامنے رکھا۔

مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ مناظرہ ہوا۔ اس سے علماء نے مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کبھی علماء حق کو ضرورت پڑے تو باطل کے ساتھ مناظرہ بھی کرنا جائز ہے۔ مناظرہ کے اندر موضوع معین ہوجاتا ہے اور اس پر دلائل دیئے جاتے ہیں، تاکہ لوگوں پر حق اور باطل واضح ہوجائے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالے جانے کے بعد کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو بچالیا تو معجزہ دیکھ کر ان کی لوگوں کے اندر ایک طاقت بنی۔ اب بادشاہ نے بھی کوشش کی کہ بات سے مسئلہ حل ہو جائے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کوشش کی کہ بات سے مسئلہ حل ہو جائے؛ کیونکہ جو مسائل گفتگو سے حل ہو سکتے ہیں وہ کبھی طاقت سے حل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے تمام دینی جماعتوں کو یہ سامنے رکھنا چاہیے کہ انبیاء کا منہج تشدد نہیں ہوتا، بلکہ صبر ہوتا ہے۔ کبھی دین کسی کو مارنے یا کسی کو کافر کہنے سے نہیں پھیلا، بلکہ ایک اسلوب اور طریقہ سے پھیلا ہے۔ جب تک دینی جماعتیں ایسے منہج نبوی پر نہیں آتیں اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اکیلے نمرود کے پاس گئے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ﴾ کیا آپ نے دیکھا نہیں؟ تو یہاں رؤیت سے مراد رؤیت علمی ہے کہ کیا آپ نے جانا نہیں؟ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے کلام کو لاتے ہیں کہ آدمی ذرا آنکھیں بند کرے تو اب بھی معلوم ہوگا کہ کیسے حضرت ابراہیم ﷺ وقت کی قوت کو للکار رہے ہیں؟

حضرات ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرہ:

نمرود نے حضرت ابرہیم علیہ السلام سے جھگڑا اس لیے کیا کہ ﴿أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس کو بادشاہت دی تھی، حالانکہ اس کو چاہیے تھا کہ وہ ملک ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بن جاتا، نہ کہ خدا کا انکار کر دیتا اور دعویٰ کر دیا کہ میں خود خدا ہوں۔ دولت اور طاقت کا نشہ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے، مگر وہ لوگ جو سب طاقتوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں۔ وہ جتنی قوت والے ہوتے ہیں اتنے جھکتے چلے جاتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام جب نمرود کے پاس آئے تو سیدھے چلے آئے۔ نمرود نے کہا: تم نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے اللہ کو سجدہ کرتا ہوں۔ نمرود نے کہا: اچھا تم میرے سوا اور خدا مانتے ہو؟ آپ نے فرمایا: تم تو ایک بندے ہو۔ نمرود نے کہا: تم جس کو خدا مانتے ہو اس کی کوئی صفت بیان کرو۔ آپ نے فرمایا: میرا خدا وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ نمرود کہنے لگا: میں بھی مارتا ہوں اور جلاتا ہوں۔ اور اس نے دو قیدی بلائے: ایک وہ جس کو سزائے موت ہو چکی تھی، اس کو کہا: بھاگ جاؤ۔ اور جس کو آزادی ملنی تھی اس کی تلوار سے گردن اڑا دی۔ اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہنے لگا: دیکھو! میں نے بھی ایک کو مار دیا اور ایک کو بچالیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ تو بالکل اپنی طاقت کے نشہ میں چور ہے یا عقل سے کورا ہے؛ کیونکہ جلانا ہوتا ہے غیر چیز میں روح کا ڈالنا، داخل کرنا، جیسے پیٹ کے اندر بچہ ہوتا ہے اس میں روح ڈالنا، یہ جلانا ہے۔ اور مارنا یہ ہے کہ زندہ انسان ہے، اس کے اندر سے روح کا نکالنا، ورنہ ایک چھوٹا سا لڑکا کسی کو چھری سے مار دے تو کیا وہ بھی خدا بن جائے گا؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اس سے ایسی بات کی جائے جو اس کی سمجھ میں بھی آ سکے اور لوگوں کی عقل میں آ سکے؛ کیونکہ "کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ" لوگوں کی عقل کے مطابق بات کرو تو بات بنتی ہے۔ آپ نے فرمایا: میرا رب روزانہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، مغرب میں غروب کرتا ہے۔ تم اگر رب ہو تو سورج کو ایک دن مشرق کی بجائے مغرب سے نکالو۔ ﴿فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ﴾ نمرود حیران رہ گیا کہ سورج کو کیسے مغرب سے نکالے؟

علماء نے فرمایا: وہ بدبخت یہ تو کہہ سکتا تھا کہ میں نہیں نکال سکتا، تم اپنے رب سے کہو کہ مغرب سے نکالے، لیکن وہ بات بھی نہ کر سکا؛ کیونکہ وہ ایسا بے ہوش ہوا کہ اس کو یہ بات کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دوسرا وہ سمجھ چکا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سچے نبی ہیں اور ان کا خدا سچا ہے۔ اگر میں نے یہ مطالبہ کر دیا کہ اپنے رب سے کہو کہ سورج کو مغرب سے نکالے اور خدا نے مغرب سے سورج کو نکال دیا تو ساری دنیا مسلمان ہو جائے گی۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اگر اگلا سوال کرتا ہوں تو سب کچھ جاتا ہے، ورنہ خاموش ہوں گا تو کم از کم وہ لوگ متاثر ہوں گے جو دیکھ رہے ہیں یا جن تک بات پہنچے گی اور سورج کا معاملہ تو ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ اس لیے اس نے ڈر کے مارے یہ بات نہیں کی تھی۔

علماء کرام نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں کہ قیامت سے پہلے ایک وقت ایسا آئے گا کہ اللہ تعالیٰ سورج کو مغرب سے نکالیں گے۔ اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ پھر جو مسلمان ہے مسلمان رہے گا اور جو کافر ہے کافر رہے گا۔ سورج کو مغرب سے نکال کر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا اظہار دنیا میں بھی فرما دیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرۃ:۲۵۸] اللہ تعالیٰ اس قوم کو ہدایت نہیں دیتے جو اپنے اوپر خود ظلم کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ نمرود کے سامنے حق واضح ہو گیا، لیکن پھر بھی اس نے نہ مانا تو اس نے اپنی جان پر خود ظلم کیا۔ آج کتنے لوگ ہیں جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ولی کی قبر ہے، اس کو بھی آخر موت آئی، جنازہ پڑھا گیا، قبر کھودی گئی اور قبر میں دفن کر دیا گیا، لیکن پھر بھی کہتے ہیں: یا پیر! مہربانی کر، بچے دلوا۔ اب حق واضح ہو گیا، لیکن پھر بھی وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا ہے تو کرتا رہے۔ اگر وہ خود جہنم میں جانا چاہتا ہے تو جائے۔

نمرود کا نسب نامہ:

نمرود حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا نسب یوں ہے: نمرود بن کنعان بن کوش بن سام بن نوح۔ اور دوسرے قول کے مطابق نسب یوں ہے: نمرود بن فالخ بن عابر بن سالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام۔ بہر حال یہ سامی النسل ہے؛ کیونکہ حضرت نوح کے تین بیٹے تھے: سام، حام اور یافث۔ دنیا کے اندر جتنی مخلوق پھیلی ہے وہ ان تینوں بیٹوں سے ہے۔ پہلا قول حضرت مجاہد کا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ:

بعض علماء نے فرمایا کہ نمرود نے یہ انتظام کیا تھا کہ لوگ خوراک کے لیے اپنا وفد بنا کر آتے تھے اور وہ ان کو خوراک دیتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس ضمن میں آئے اور اس سے مناظرہ ہوگیا تو نمرود نے سب کو گندم، آٹا دیا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہ دیا۔ آپ جب واپس آئے تو راستے میں اپنی بوریوں میں ریت ڈال لی، تاکہ بچوں کو کچھ دیر مطمئن کرلوں گا۔ جب گھر پہنچے تو اس ریت کو رکھ کر سو گئے۔ جب اٹھے تو کھانا تیار تھا۔ بیوی سے پوچھا کہ آٹا کہاں سے آگیا؟ اس نے کہا: آپ جو بوریاں بھر کر لائے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے۔ کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ رزق بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔

نمرود کا انجام:

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے پاس ایک فرشتہ کو بھیجا، اس نے کہا: تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرلو۔ نمرود نے کہا: میں نہیں مانتا ہوں۔ جو دعوت دیتے رہے تو وہ نہ مانا۔ تو اس فرشتہ نے نمرود سے کہا: تم بھی اپنا لشکر تیار کرو، ہم بھی اپنا لشکر لے کر آتے ہیں۔ فلاں دن تمہارا ہمارا مقابلہ ہوگا۔ نمرود نے اپنا لشکر نکالا اور طلوعِ شمس کے وقت اپنی قوت طاقت لے کر آگیا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: تھوڑے سے مچھر بھیج دو۔ مچھروں نے ان سب کو فنا کر ڈالا، کچھ نہ بچا۔ ایک مچھر نمرود کی ناک میں داخل ہوکر سیدھا دماغ میں چلا گیا۔ جب وہ حرکت کرتا تو نمرود کو درد شروع ہوجاتا۔ کہا: ہاتھ سے مارو۔ جب ہاتھ سے تنگ آگیا تو کہا: جوتے سے مارو۔ لکڑی کے جوتے بنائے گئے، اس سے مارا جاتا تھا۔ چار سو سال تک اس عذاب میں مبتلا رہا۔ یہ روایات اسرائیلیہ ہیں۔ ان میں یہ بھی لکھا ہے کہ نمرود کا سب سے پیارا بندہ وہ ہوتا

تھا جو زور سے سر میں جوتا مارتا تھا؛ کیونکہ جب وہ جوتا مارتا تھا تو مچھر کچھ دیر آرام کر جاتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم تو خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے اور ایک چھوٹے سے مچھر کا مقابلہ بھی نہیں کر سکے۔

دوسرا قصہ:

حضرت عزیر علیہ السلام نے ایک ویران بستی کو دیکھا تو کہا: اللہ تعالیٰ جب اس کو دوبارہ زندہ کریں گے تو اس کی کیفیتیں کیا ہوں گی؟ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی قدرت کا نظارہ دکھانے کے لیے حکم دیا کہ آپ مر جاؤ۔ ان کو سو سال تک موت آ گئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندہ کیا اور فرمایا کہ بتاؤ تم کو کتنی دیر گزری ہے؟ کہنے لگے: معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ گزرا ہے کہ جب میں سویا تھا تو سورج یہاں تھا اور اب یہاں ہے اور مجھے یہ یاد نہیں کہ کل تھا یا آج تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے بندے! تو نے ایک سو سال گزارا ہے۔

کیا صاحبِ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے؟

قرآن میں ان کا نام نہیں لیا گیا؛ کیونکہ قرآن کا مقصد نام بیان کرنا نہیں ہوتا، دلائل مقصود بیان ہوتا ہے۔ یہ مفسرین و مورخین نے کام کیے ہیں۔ اختلاف ہمیشہ اس مسئلے میں ہوتا ہے جس کے بارے میں نص نہیں ہوتی، یعنی قرآن نے جو مسئلے کھول کر بیان کر دیے ان میں اختلاف نہیں ہو سکتا، جو چیزیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھول کر واضح کر دی ہیں ان میں کبھی اختلاف نہیں ہو سکتا، بلکہ اختلاف وہاں ہوتا ہے جہاں نص نہیں ہے۔

مثلاً: قرآن نے کسی واقعہ کو بیان کیا اور نام نہیں لیا، اس کے اندر اختلاف ہوتا ہے۔ اب جب مفسرین نے نام ڈھونڈنے کی کوشش کی تو وہ اختلافات میں الجھ گئے۔ اس آیت میں مذکور واقعہ کے بارے میں:

- ...... بعض مفسرین نے فرمایا: وہ حضرت ارمیا علیہ السلام تھے۔
- ...... دوسرا قول ہے کہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔
- ...... تیسرا قول ہے کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔
- ...... چوتھا قول یہ ہے کہ وہ حضرت خرقیل بن بورا علیہ السلام تھے۔
- ...... پانچواں قول ہے کہ وہ کوئی اسرائیلی تھا۔
- ...... اور بعض لوگوں نے کہا: وہ آدمی نبی تو کیا وہ مسلمان بھی نہیں تھا؛ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ پر یہ کہا کہ اللہ

تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ وہ انکار کر رہا ہے تو یہ نبی کیسے ہوسکتا ہے؟ راجح قول یہ ہے وہ اللہ کے نبی تھے اور ان کا یہ انکار نہیں تھا؛ کیونکہ دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ہے، انہوں نے عرض کیا تھا: اے اللہ! آپ مردوں کو کیسے جلاتے ہیں؟ اس لیے بات سمجھیں! اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ نہیں کر سکتے، یہ کفر ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ کس طرح زندہ ہوں گے۔

بستی کی تعیین:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرآن میں "عَلٰی قَرْیَۃٍ" آیا ہے، وہ کونسی بستی تھی؟ قرآن نے اس کا بھی ذکر نہیں فرمایا۔
بعض علماء نے فرمایا: وہ بیت المقدس تھی؛ کیونکہ جب بختِ نصر بادشاہ نے بیت المقدس پر چڑھائی کی اور یہودیوں کو قتل کیا، بیت المقدس کو ویران کر ڈالا اور مسجد میں جتنی چیزیں لگی ہوئی تھیں سب اکھاڑ کر لے گیا۔ اس نے چھ لاکھ آدمی قتل کیے، ستر ہزار سے زیادہ کو قید کر کے ساتھ لے گیا۔ ایسی کیفیت میں جب اللہ کے نبی کا وہاں سے گزر ہوا تو ویرانی اور بربادی کا منظر نظر آیا۔ فوراً پیغمبر کے ذہن میں یہ سوال آیا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ سوال رکھا۔
بعض علماء فرماتے ہیں: بیت المقدس سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر ایک اور بستی تھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔
جب وہاں سے حضرت عزیر علیہ السلام گزرے اور دیکھا کہ پوری کی پوری بستی ویران ہوچکی ہے، بندے مر گئے، درخت اکھڑ گئے اور مکان گر گئے تو انہوں نے تعجب سے اپنے اللہ تعالیٰ سے احیائے موتیٰ کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا۔ اس بستی میں اختلاف اس لیے ہوا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام نہیں لیا۔

عقیدہ حیات الانبیاء:

﴿فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک سو سال موت دی، پھر زندہ کرنے کے بعد فرمایا کہ دیکھو! ہم نے تمہاری کسی چیز کو بدلنے بھی نہیں دیا۔ اگر ناخن بڑھتے تو سو سال تک کہاں تک پہنچ جاتے!؟ اگر کپڑے بوسیدہ ہوجاتے تو ان کی کیفیت کیا ہوتی!؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: صرف یہی چیزیں نہیں ہم نے محفوظ رکھیں، بلکہ اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو! جو تبدیل نہیں ہوئیں۔
اس لیے احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے اجسام کو زمین پر حرام کردیا ہے۔ انبیاء کرام کے جسم محفوظ رہتے ہیں، ان کے اندر کسی قسم کا تغیر نہیں آتا۔ دیکھیں! اللہ کا نبی ہے، زمین کے اوپر ہے اور موت کو سو

سال گزر گئے، لیکن مجال ہے کہ زمین ہاتھ لگائے، کوئی نقصان پہنچا سکے۔

مطعومات، مشروبات، حیوانات اور انسان علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو زندہ کرنے کی کیفیات دکھادیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اپنے اس گدھے پر نظر ڈالو، جس پر تم سواری کر کے آرہے تھے۔ تو اس کا ڈھانچہ پڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب اس کی طرف غور سے دیکھو کہ ان ہڈیوں کو ہم کیسے زندہ کرتے ہیں؟ ان ہڈیوں پر ہم گوشت کیسے چڑھاتے ہیں؟ جب اللہ تعالیٰ نے یہ ساری کیفیات کھول دیں تو اللہ کے نبی نے کہا: میں جانتا ہوں کہ میرا اللہ ہر چیز پر قادر ہے، میں کیفیات دیکھنا چاہتا تھا۔

دونوں واقعات میں فرق کیا ہے؟

نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ تمہارا رب کون ہے؟ انہوں نے فرمایا: جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ تو یہ ایک سوال ہے۔ اور حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ کے اندر بھی سوال ہے کہ اس بستی والوں کو مرنے کے بعد کیسے زندہ کریں گے؟ ان دونوں سوالوں کے اندر فرق ہے۔ ایک سوال صرف عناد اور جھگڑے کے لیے ہوتا ہے اور ایک سوال بات سمجھنے کے لیے ہوتا ہے۔ ان دونوں سوالوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا تھا: ﴿رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرۡ إِلَيۡكَ﴾ [الاعراف: ۱۴۳] اے اللہ! مجھے اپنی رؤیت نصیب فرمائیں۔ اور بعینہٖ یہی سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے جو برگزیدہ لوگ تھے انہوں نے بھی کیا تھا کہ ہم تو کبھی تسلیم نہیں کریں گے، ہمیں کیا پتہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یا نہیں؟ ورنہ آپ ہمیں اللہ تعالیٰ کو دکھائیں۔ تو ان دونوں سوالوں کے اندر بڑا فرق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال کے اندر بڑا ادب ہے کہ میں آپ کے دیدار کا مشتاق ہوں، مہربانی فرما کر اپنا دیدار نصیب فرمائیں۔ اور ان کی قوم نے دیدار کا سوال کیا، اس کے اندر گستاخی تھی کہ آپ نے ہمیں کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے کلام کیا ہے، ہمیں کیا پتہ شاید یہ کلام کرنے والا کوئی اور ہو۔ اس لیے فوراً بجلی آئی اور ان کو مار دیا گیا! کیونکہ ایک اللہ کے نبی کو جھٹلایا اور دوسری یہ جرات کی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے آئے۔

اسی طرح نمرود اور حضرت عزیر علیہ السلام کے سوال کے اندر بڑا فرق ہے۔ نمرود کے سوال کے اندر انکار اور عناد تھا اور حضرت عزیر علیہ السلام کے سوال کے اندر تحقیق ہے کہ میرا مولا! مجھے یقین ہے کہ آپ موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہیں، لیکن میں احیائے موتیٰ کی کیفیت دیکھنا چاہتا ہوں، تاکہ میرا علم الیقین عین الیقین بن جائے۔

عجائباتِ قدرت:

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی بات سمجھنا چاہے تو اللہ تعالیٰ نے اتنے ذرائع اور اسباب رکھے ہیں کہ سمجھنا مشکل نہیں ہوتا۔

1 مثلاً: آپ روٹی کا نوالہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہیں۔ اگر صرف اس پر غور کرلو کہ یہ نوالہ منہ تک کیسے پہنچا؟ سب سے پہلے زمین بنائی گئی، بیج ڈالا گیا، پانی لگایا گیا، اس کی حفاظت کی گئی، پھر جا کر کھیتی تیار ہوئی، اس کو کاٹا گیا، ان دانوں کو علیحدہ کیا گیا، پھر ان دانوں کو پیسا گیا، پھر وہ آٹا بنا اور اس کو گوندھا گیا۔ تو غور کریں! کتنی مخلوق کام میں لگی!؟ اور نوالہ ہمارے منہ تک پہنچا ہے۔ اگر دنیا میں یہ ساری متفرق چیزیں اللہ تعالیٰ اکٹھی کرنے پر قادر ہیں تو ہمارے مرنے کے بعد ہماری ہڈیوں کو اکٹھا کرنے پر بھی قادر ہیں۔

2 علماء نے فرمایا کہ غور کرو! اللہ تعالیٰ نے کھانے اور پینے کے لیے ایک راستہ رکھا ہے، لیکن نکالنے کے لیے دو راستے بن گئے ہیں۔ جو چیزیں تم کھا رہے ہو اس سے خون کیسے بنتا ہے؟ اور خون کن ذرائع کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہر عضو میں پہنچا رہے ہیں؟ اس خون سے تولید کا مادہ کیسے بنتا ہے؟ پھر مادۂ تولید کو اللہ تعالیٰ نے بندے میں کہاں محفوظ رکھا ہوا ہے؟ اور پھر وہ مادۂ تولید ذکر وانثیٰ ایک مقام پر قرار پکڑتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے ایک بندہ پیدا فرماتے ہیں۔ اگر اسی پر غور کریں تو کیا اللہ تعالیٰ دوبارہ ہماری ہڈیوں کو جمع کرنے پر قادر نہیں ہیں!!؟ اگر آدمی غور کرے تو واضح بات ہے۔ یا اس کے دل پر زنگ لگ جائے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہریں لگ جائیں اور ہدایت کے راستے بند ہو جائیں تو اس کو سمجھ آنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔

عجائباتِ بیت المقدس:

بیت المقدس کی تعمیر بھی عجیب ہوئی ہے اور اس کی تخریب بھی عجیب ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی اور جنوں کو لگایا۔ ایسی تعمیر کی پورے عالم میں کوئی مثال نہیں ہے۔ ایسے ایسے موتی، ہیرے اور جواہرات حضرت سلیمان علیہ السلام نے لگوائے تھے کہ مؤرخین لکھتے ہیں: مسجد کا قبہ ایسے روشن ہوتا تھا کہ معلوم ہوتا چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ آج کے انجینئر اور آرکیٹیکٹ ان کو بڑا ناز ہے کہ ہم نے پچاس پچاس، سو سو اور دو دو سو منزلہ مکان بنا دیئے ہیں اور اوپر ریوالونگ چیزیں بنا دی ہیں کہ پورا محل پھر رہا ہے، ادھر سے ادھر آ جاتے ہیں، لیکن ہزاروں سال پہلے جو اللہ کے نبی نے نقشہ دیا ہے نہ آج تک کوئی بنا سکا ہے اور نہ آئندہ کوئی بنا سکتا ہے۔ اہرامِ مصر کو آج تک عجائبات

میں سمجھا جاتا ہے، اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو لگایا تو ان کا کون مقابلہ کرے؟ ایک جن اتنا بڑا پتھر اٹھا کر لے آتا تھا کہ تم اگر کئی کرینیں لگاؤ تب بھی وہ نہ اٹھا سکیں اور اس مسجد کے اندر جمال تھا، وہ ایک عظیم عمارت تھی۔

اس کی بربادی اس طرح ہوئی کہ ظالم بادشاہ سب کچھ اکھاڑ پچھاڑ کر لے گیا، اس کو ویران کر دیا۔ جتنے خزائن وہاں دفن تھے لے گیا اور وہاں کے آٹھ لاکھ بندوں کو مار دیا اور باقیوں کو قید کر کے ساتھ لے گیا۔ اب جب گزرنے والا وہاں سے گزرا تو وہ حیران ہو گیا کہ اتنی بڑی عمارت عظیمہ کو کیسے بربادی آگئی؟

موت اور نیند میں فرق:

اللہ تعالیٰ نے اس گزرنے والے کو موت دی تھی، نیند نہیں دی تھی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی موت کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں موت ہی مراد ہے۔ اور اصحابِ کہف کے قصہ میں نیند کا ذکر ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا﴾ [الکہف: ۱۱] ہم نے ان کے کانوں پر مہر لگا دی، ان کو بند کر دیا۔ ساری دنیا میں آج تک نیند کو کسی نے اس محاورہ میں پیش نہیں کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

اصحابِ کہف کی نیند کی حالت:

علماء نے اس سے مسئلہ لکھا ہے کہ نیند کے لیے ضروری ہے کانوں میں شور نہ ہو، ورنہ سکون کی نیند نہیں آتی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب اصحابِ کہف کو سلایا تو ان کے کانوں کو بند کر دیا۔ ﴿وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ﴾ [الکہف: ۱۸] سونے والا جس کروٹ سو رہا ہو تو بستر گرم ہو جاتا ہے، پھر آدمی کروٹ بدل لیتا ہے۔ اب چونکہ وہ زندہ تھے، گرمی تو ہوگی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اتنی دیر کے بعد ان کو الٹ دیا کرو، تاکہ ان کو آرام و سکون سے نیند قائم رہے۔

بیت المقدس کی ویرانی اور آبادی:

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے پر موت طاری کر دی تو ستر سال کے بعد بیت المقدس آباد ہو گیا، لوگ بھی آباد ہو گئے، بنی اسرائیل جو باہر بھاگے تھے وہ بھی واپس آگئے اور جو لوگ پیدا ہوئے تھے وہ بھی جوان ہو گئے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا مشاہدہ:

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عزیر علیہ السلام کو سو سال کے بعد اٹھایا تو سب سے پہلے ان کی آنکھوں کے اندر حیات ڈال دی، تاکہ میرا بندہ دیکھے کہ ہم اس کا باقی بدن کیسے زندہ کرتے ہیں؟ آنکھوں سے وہ دیکھتے رہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔ جب وہ پوری طرح زندہ ہو کر برابر ہو کر بیٹھ گئے، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھیجا کہ ان سے جا کر پوچھو کہ کتنا عرصہ گزرا ہے۔ جب ان کو موت آئی تھی تو وہ دن کا پہلا وقت تھا، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندہ کیا تو وہ دن کا آخری حصہ تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ سورج ڈوبنے والا ہے تو انہوں نے گمان کیا کہ آج کا سورج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے! تو سو سال تک مردہ رہا ہے، تم اپنے کھانے کی چیزوں کو دیکھو! پینے کی چیزوں کو دیکھو! ہم نے ان کو خراب نہیں ہونے دیا۔ مفسرین فرماتے ہیں: آپ کے پاس انگور بھی تھے، انجیر بھی تھے، ان کا نکلا ہوا جوس بھی تھا اور ساری کی ساری چیزیں ویسی کی ویسی موجود تھیں۔

تیسرا واقعہ:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا: اے میرے نبی! یاد کریں! جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا کہ مجھے دکھائیں کہ آپ کس کیفیت سے مردوں کو زندہ کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تمہیں اس بات پر ایقان نہیں ہے کہ میں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہوں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: بالکل سو فیصد یقین ہے کہ آپ قادر ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اطمینانِ قلب کی دولت نصیب ہو جائے۔ اس سے پہلے والے واقعہ کے اندر کچھ سوئے ادب نظر آتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام بھی نہیں لیا اور بستی کا نام بھی نہیں لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو سوال کا فوراً جواب بھی نہیں دیا، بلکہ سو سال تک موت دینے کے بعد جواب دیا۔

سوال میں جتنا ادب ہوگا اتنی اللہ تعالیٰ کی رحمت زیادہ آئے گی۔ اس لیے جب آدمی دعا کرے تو یقین وایقان، تضرع وعاجزی سے کرے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تمہیں رونا نہ آتا ہو تو کم از کم رونے والوں کی شکل تو بناؤ۔

یاد رکھیں! ایک ایمان ہوتا ہے اور ایک اس پر اطمینان ہوتا ہے۔ اطمینان یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے غیب کی خبر دی ہے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خبر دی ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اور ایک ایمان کے بعد مقامِ اطمینان ہے؛

کیونکہ قاعدہ ہے: ''اَلْخَبَرُ لَیْسَ کَالْمُشَاھَدَۃِ وَالْمُعَایَنَۃِ'' خبر جتنی پکی کیوں نہ ہو، لیکن مشاہدہ کے بعد جو آدمی کو اطمینان قلب حاصل ہوتی ہے وہ صرف خبر سے نہیں ہو سکتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑی شان والے نبی ہیں، جن کی ذریت سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا، وہ احیائے موتی کی کیفیت کے بارے میں سوال کر رہے ہیں کہ ہمارا ایمان ہے آپ مردوں کو زندہ کریں گے، لیکن ان کو کیسے زندہ کریں گے؟ اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ بکھری ہوئی ہڈیاں جن کو کچھ پانی بہا کر لے گیا ہے اور کچھ ہوائیں اڑا کر لے گئیں، کوئی عرب میں دفن ہوئے، دریاؤں نے کھینچا اور عجم پہنچا دیا، کس کو دریاؤں نے کھینچا اور سمندروں میں ڈال دیا؟ ان کا وجود نہیں ملتا کہ وہ ہڈیاں کہاں ہیں؟ ان کو زندہ کرنے کی کیفیت کیا ہوگی؟

شیخ عبدالقادر رحمہ اللہ کی کرامت کا ایک جھوٹا قصہ:

ہمارے بعض جہلاء نے مسلمانوں کے عقیدوں کو ایسا تباہ و برباد کیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ خدا جانے ان کو خود حشر کا کوئی ڈر نہیں ہے! جو لوگوں کو گمراہی کا سبب بنتے ہیں اور پھر اللہ والوں پر بھی الزام لگاتے ہیں۔

ایک کتاب اس کا نام ''زین المجالس'' ہے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ پیرانِ پیر حضرت عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا ایک مرید خاص تھا، جو آپ کی بڑی خدمت کرتا تھا اور آپ کو بڑا آرام پہنچاتا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ وہ مر گیا۔ ملک الموت اس کی روح نکال کر لے جانے لگے تو پیرانِ پیر نے ملک الموت کو کہا: ٹھہر جاؤ!۔ وہ ٹھہر گئے، ان کو پیرانِ پیر نے کہا: میرے ملازم کی روح واپس کرو۔ ملک الموت نے کہا: حضرت! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ہوں، اس کی موت کی گھڑی آ گئی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں نے اس کی روح نکالی تو واپس کیسے کردوں؟ پیرانِ پیر نے کہا: واپس کرو۔ انہوں نے کہا: میں تو واپس نہیں کر سکتا۔ پیرانِ پیر جلال میں آ گئے اور ملک الموت کو ہاتھ مارا۔ اس نے جو ساری روحیں نکالی ہوئی تھیں سب تھیلے سے نکل گئیں اور لوگ زندہ ہو گئے۔ ملک الموت خالی ہاتھ اللہ تعالیٰ کے پاس جا کر کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: کیا ہوا؟ انہوں نے واقعہ سنایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم نے میرے محبوب کو کیوں ناراض کیا؟ تم خالی ہاتھ آ گئے ہو، اب میں اس کا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟

اندازہ کرو! اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقل دی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ایک پیر کو اتنی طاقت دی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟ حالانکہ اللہ کے نبی ہیں، وہ یہ نہیں جانتے کہ کیفیتِ احیاء کیا ہوتی؟ اور پیرانِ پیر کو پتہ ہے کہ زنبیل روحوں کی بھری ہوئی ہے۔ غصہ میں آئے تو سب کچھ چھوڑ دیا۔ اس عقیدے سے بڑا بھی کوئی کفر و شرک

ہو سکتا ہے؟

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ اگر خدا سے مانگو تو کوئی یقینی بات نہیں مانے یا نہ مانے؟ اور اگر نبی کے روضے پر جا کر دعا مانگو تو وہ بھی یقینی نہیں ہے کہ منظور ہو یا نہ ہو؟ لیکن میرے پاس آ کر مانگو گے تو کبھی خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے، میں اسی وقت پوری کر دیتا ہوں؛ کیونکہ میں خود مشکل کشا ہوں۔

کتاب میں تیسری جگہ لکھا ہے کہ اگر کوئی میرا مرید مشرق میں ہے یا مغرب میں ہے اور مجھے وہیں سے پکارے تو میں اس کی مدد کو وہیں پہنچ جاتا ہوں اور فوراً اس کے کام کر دیتا ہوں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ...... اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو شرک سے بچائے۔ ان لوگوں کو یہ بھی نہیں پتہ کہ خود پیرانِ پیر کا عقیدہ کیا ہے؟ ان کی اپنی کتابیں موجود ہیں: ''الفتح الربانی'' اس کا اردو ترجمہ ''فیوضِ یزدانی'' چھپ چکا ہے۔ ''غنیۃ الطالبین'' اس کے اندر شیخ نے اپنے مریدوں کو لکھا ہے کہ خبردار! جو آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے گا یا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر سے نفع نقصان کی امید رکھے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا۔ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے وہی نفع نقصان دینے والا ہے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کے اپنے یہ اعتقادات ہیں، لیکن اس ظالم نے ایک جھوٹی کتاب لکھ کر اس کی نسبت بھی حضرت کی طرف کر دی۔ ساری زندگی حضرت نے توحید کا کام کیا اور رفض کے خلاف کیا، اب یہ دونوں فرقے مشرکین اور روافض حضرت کے دشمن بن گئے اور مختلف کتابیں لکھ کر حضرت کو بدنام کرنے کے لیے پوری دنیا میں تقسیم کر دیں، ورنہ ان کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

معجزاتِ انبیاء اور کراماتِ اولیاء حق ہیں۔ لیکن یہ کیسی کرامت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ملک الموت کو فرمائیں: روح نکال لے کر آؤ۔ اور پیر کہے کہ میں نے چھین لیا، جاؤ کہہ دو۔ بھلا یہ بھی کرامت ہے!!؟ بلکہ یہ تو کفر صریح ہے، جس میں کسی تاویل کی گنجائش بھی نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا مقصد:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے بطورِ استفہام سوال کیا کہ مجھے دکھائیں مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تمہارا ایمان نہیں ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو جانتے تھے۔ علماء نے فرمایا: یہ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تاکہ کل کو کوئی جاہل معاند حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اعتراض نہ کر سکے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایسے سوال کرنے کا کیا مقصد تھا؟ اللہ تعالیٰ نے سوال کر کے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب لے کر ہمیشہ کے لیے

دشمنوں کا منہ بند کر دیا، ورنہ اللہ تعالیٰ کو تو پتہ ہے کہ میرے خلیل کا ایمان وایقان مکمل ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال اس لیے تھا کہ ہمارا علم الیقین عین الیقین میں بدل جائے۔

اطمینانِ قلب سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

بعض علماء نے یہاں ایک سوال پیدا کیا ہے کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ایمان ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جنت ہے، جبکہ میں نے جنت نہیں دیکھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہنم ہے، جبکہ میں نے جہنم نہیں دیکھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میزان ہے جس سے عمل کے وزن ہوں گے، جبکہ میں نے وہ نہیں دیکھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غلمان ہیں، حوریں ہیں، جہنم میں یہ عذاب ہیں اور اللہ تعالیٰ مجھے حوضِ کوثر دیں گے، یہ سب غیب ہے، جبکہ ہم نے یہ سب بھی نہیں دیکھا، لیکن میرا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر اتنا پکا یقین ہے کہ اگر آج اللہ تعالیٰ پردہ ہٹا کر جنت دکھا دیں تو مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

اشکال:

علماء نے سوال کیا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اتنا یقین بغیر دیکھے حاصل تھا تو خلیل کو حاصل کیوں نہیں تھا؟ آج کے دور کے اندر کوئی یہ بات کہے کہ خیر القرون کے زمانہ میں جو لوگ تھے ان سے زیادہ ہم نے دین کو سمجھا ہے تو یہ کوئی عقل کی بات ہے؟ کیونکہ خیر القرون حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین کا زمانہ ہے۔ جس صحابی نے خود سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ سمجھا ہو تو کیا ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ ہم نے اپنے استادوں سے قرآن پڑھا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے براہِ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پڑھا تو ان کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ اور پھر وہ جس نے صحابہ سے قرآن پڑھا اس کا مرتبہ اعلیٰ ہے اور اس کے بعد تبع تابعی کا درجہ آ گیا۔

جواب:

اس سوال کے علماء کرام نے دو جواب دیئے ہیں: ایک جواب یہ ہے کہ جیسے تقویٰ کی قسمیں ہیں: ایک تقویٰ یہ ہے کہ آدمی شرک سے بچے، دوسرا مرتبہ تقویٰ کا یہ ہے کہ شرک سے بھی بچے اور کبیرہ گناہوں سے بھی بچے، تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ شرک سے بھی بچے، بڑے گناہوں سے بھی بچے اور چھوٹے گناہوں سے بھی بچے اور ایک تقویٰ یہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کا دل میں خیال ہی نہیں ہے۔ یہ سب سے اونچا مقام ہے۔

علماء نے فرمایا: اس طرح اطمینان کے بھی درجات ہیں: ایک عامۃ المومنین کا اطمینان ہے، ایک اطمینان اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کا ہے، ایک اطمینان تابعین و تبع تابعین کا ہے، ایک اطمینان انبیاء علیہم السلام کا ہے، ایک اطمینان خلیل اللہ کا ہے اور ایک اطمینان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ ہر کسی کے اطمینان کا فرق ہے، لہٰذا جو اطمینان سیدنا خلیل علیہ السلام چاہتے تھے وہ مقام بلند ہے، اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں پہنچ سکتے۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان اگرچہ بہت بلند ہے، لیکن وہ نبی نہیں ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقابلہ کافروں سے تھا، جو اللہ کے بھی منکر تھے اور کہتے تھے: ''أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ'' میں بھی مارتا ہوں اور زندہ کرتا ہوں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: اس سے ایک تو مجھے اطمینانِ قلب ہو جائے گا اور جو منکر بعث ہیں وہ بھی سمجھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اور احیائے موتیٰ پر قیامت تک ایک ایسی بات سامنے آجائے کہ قیامت تک کوئی آدمی انکار نہ کر سکے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ چاند نکلا ہوا ہے اور ایک آدمی کہے کہ چاند نہیں ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

مردوں کو زندہ کرنے کی ایک صورت:

علماء نے ایک حکایت لکھی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ میرا حکم پورا کرو کہ زندوں کو مردہ کیسے کرتے ہیں (کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرو)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: اے اللہ! میں آپ کے حکم کے تابع ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ حکم کریں اور میں تعمیل نہ کروں۔ یہ علماء کا ایک علمی نقطہ ہے، کوئی مسئلہ نہیں ہے اور نہ کسی کتاب کے اندر یہ لکھا ہوا ہے، بلکہ دونوں واقعات کو ملا کر علماء نے ایک بات مستنبط کی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو قبول فرما لیا اور ان کو حکم دیا: میرے خلیل! تم چار پرندے پکڑو۔ ﴿فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ﴾۔ ایک قراءت ''فَصُرْهُنَّ'' اور ایک قراءت ''فَصِرْهُنَّ'' ہے۔ اس طرح اس لفظ کے دو ترجمے ہیں کہ یہ پرندے ہیں اور وہ بھی آپ کی آواز کے عادی ہو جائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم نے ان چار پرندوں کو زندہ کرنا ہے تو وہ آپ کی آواز کے بھی عادی ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ پہچاننے میں غلطی نہ لیں کہ یہ وہی پرندے ہیں اور آ گئے ہیں۔ جب یہ بات ہو جائے تو ان کو ذبح کرو، پھر ان کے گوشت اور ہڈیوں کو توڑ کر

آپس میں ملالو اور پھر ان کو تقسیم کرلو۔

اور یہ حکم نہیں دیا کہ چار بکریاں پکڑلو، چار گائیں پکڑلو، اللہ تعالیٰ نے پرندوں کا حکم کیوں دیا؟ اس کے اندر کیا حکمت تھی؟ اس پر مفسرین نے لکھا ہے کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان کو تسلیم و رضا کا خوگر ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے، چاہے ہمیں اس کے اندر کوئی حکمت سمجھ آئے یا سمجھ نہ آئے۔

بعض علماء نے وجوہات لکھی ہیں کہ پرندوں کا تعلق عالمِ علو سے ہے کہ وہ فضا میں اڑتے ہیں اور جانوروں کا تعلق ارضیات سے ہوتا ہے۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال اونچا تھا اور جواب دینے والی ذات سب سے اعلیٰ تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو منتخب فرمایا جس کا تعلق عالم علوی سے تھا؛ کیونکہ جتنا بڑا سوال ہوتا ہے اتنے بڑے جواب کا اہتمام ہوتا ہے۔

اب خدا کیا کر رہا ہے؟

(واقعہ) امام محمد رحمہ اللہ سے بادشاہ نے سوال کیا کہ آپ کا خدا اس وقت کیا کر رہا ہے؟ امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: آپ نے جو سوال کیا ہے وہ خدا کے بارے میں ہے۔ اس کی شان بلند ہے، وہ عرش پر ہے اور آپ سوال کر رہے ہیں، میں زمین پر کھڑا ہوں، میں اس کا جواب ایک شرط پر دینے کے لیے تیار ہوں کہ آپ اپنے تخت سے نیچے آجائیں اور مجھے اپنے مقام پر بٹھائیں، پھر میں جواب دوں گا۔ بادشاہ اتر کر نیچے بیٹھ گیا اور امام محمد رحمہ اللہ تخت پر گئے اور بادشاہ سے کہا: اب سوال کریں!۔ بادشاہ نے کہا: میرا سوال یہ ہے کہ آپ کا خدا کیا کر رہا تھا؟ آپ نے فرمایا: یہی تو کر رہا تھا کہ آپ کو تخت سے اتار دیا اور مجھے بٹھا دیا۔ بادشاہ کو بات سمجھ آگئی۔

وہ پرندے کون سے تھے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ تو حکم دیا کہ چار پرندے لے لیں، لیکن یہاں پرندوں کا نام نہیں لیا۔ مفسرین نے کچھ اقوال ذکر کیے ہیں کہ چار پرندوں میں ایک مور، دوسرا باز، تیسرا مرغا اور چوتھا کوا تھا۔ بعض نے کوے کی بجائے غرنوق کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی کوے سے ملتا جلتا ہے۔

چار پرندوں کے اندر حکمت ہے۔ دو، پانچ یا سات کا حکم کیوں نہیں دیا؟ اس کے بارے میں علماء نے جواب لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو یہ سوال کیا تھا کہ آپ مجھے دکھائیں کہ مردو کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا: تو نے سوال کیا کہ مردے کو زندہ کیسے کرتے ہیں؟ اب میری ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ تم نے ایک سوال کیا ہم تمہیں چار دکھاتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس کے اور جواب بھی لکھے ہیں۔ اصل میں انسان اربعہ عناصر سے مرکب ہے: مٹی، پانی، ہوا اور آگ ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی چار کا حکم دے دیا، تاکہ عناصر اربعہ کا پورا نکھر جانا، پورا بکھر جانا اور پھر پورا مل جانا، ساری کیفیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے آجائے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کے اندر ایک حکمت یہ ہے کہ مشہور جہات چار ہیں: مشرق، مغرب، شمال اور جنوب۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: چار پرندے لو اور ایک ایک جہت میں رکھو، تاکہ کوئی معاند یہ سوال نہ کر سکے کہ مشرق والی ہوائیں چلی، اس سے تو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا، لیکن اگر مغرب سے چلتی تو زندہ نہ کرتے۔ اگر شمال سے چلتی تو زندہ نہ کر پاتے۔ اگر جنوب کی ہوا ہوتی تو زندہ نہ کر پاتے۔ بعض ہواؤں میں نمو کی کیفیات ہوتی ہیں اور بعض میں نہیں ہوتیں۔

بعض علماء نے فرمایا کہ پرندوں میں سے ان چار کو کیوں پسند کیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مور اپنے جمال پر فریفتہ رہتا ہے اور انسان بھی شہوات کے ساتھ زینت پکڑتا ہے۔ اسی طرح باز جھپٹنے میں اور دوسرے کو مارنے اور اس کے گوشت کو نکالنے میں بڑی ہوس رکھتا ہے، اس طرح انسان میں بھی یہ بڑی تمنا ہے۔ اس طرح کوا دن رات محنت کر کے، چاہے اچھا ملے یا برا ملے، کھاتا رہتا ہے اور انسان بھی جب بھٹکتا ہے تو ہر طرف منہ مارتا رہتا ہے۔ مرغ کے اندر قوتِ شہوانیہ زیادہ ہے، انسان بھی اس قوتِ شہوانیہ کی وجہ سے برباد ہوا ہے۔ اس مناسبت سے ان پرندوں کو لینے کا حکم دیا گیا۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ان پرندوں کو اپنے ساتھ ہلا لو اور اس کے بعد حکم دیا ان کو ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ یاد رکھیں! قرآن میں ہمیں کسی جگہ یہ لفظ نہیں ملتا کہ ان کو ذبح کرو، ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ تو یہ مفہوم کہاں سے لیا گیا؟ بعض علماء نے فرمایا: لفظ ''صُرْهُنَّ'' کا معنیٰ ''قَطِّعْهُنَّ'' ہے۔ اور اگلا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ ہر پہاڑ پر کچھ حصہ رکھ دو، یہ نہیں فرمایا کہ ایک پہاڑ پر ایک پرندے کو باندھ آؤ، لہٰذا ذبح کا حکم قرآن میں موجود ہوا۔

بعض جاہل صوفی یہ کہتے ہیں کہ زندہ کرنا مردہ کرنا یہ تو محض اشارے ہیں، ورنہ معنیٰ یہ تھا کہ میرا دل مردہ ہو گیا، اس کو زندہ کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اس طرح انہوں نے ایک اور تفسیر بدل دی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ مسلمان زندہ ہے اور کافر مردہ ہے۔ یہاں بھی ایک زندگی کی بات ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال یہ تھا کہ

میرا دل مکاشفات اور تجلیات میں اس مقام پر نہیں جا رہا جہاں میں پہنچنا چاہتا ہوں، وہ بند ہوگئی ہے، اس کو زندہ کر کے کھول دیں، تاکہ میری تجلی زیادہ پرواز کر سکے اور مجھے تسکینِ قلب ہو سکے۔ اس ضمن میں قرآن میں یہ واقعہ ذکر ہوا ہے۔

یاد رکھیں! یہاں تو وہ تاویلیں کر سکتے ہیں، لیکن پہلے قصہ میں کیا تاویل کریں گے کہ اس کے اندر موت کا لفظ موجود ہے اور اس کے بعد بعث کا لفظ موجود ہے۔ وہاں تو یہ تاویلیں نہیں چل سکتیں۔ وہاں بھی مقصود احیائے موتی کی کیفیت ہے، یہاں بھی وہی سوال ہے تو بہانے بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

بعض نے کہا: چار پہاڑ تھے۔ اور بعض نے کہا: سات پہاڑ تھے۔ اور مقصد یہ تھا کہ ہمیں کیا ضرورت ہے اس میں بحث کرنے کی؟ بس جو ان کے سامنے پہاڑ تھے اور مقصد یہ تھا کہ تم ان کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر کے ان کا قیمہ بنا کر اور پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے جزء پہاڑ پر رکھ دو اور پھر ان کو آواز دو تو وہ تیری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے۔

قیامت کے دن بھی ایسا ہوگا کہ جب صور پھونکا جائے گا اور ساتھ کہا جائے گا: اے بوسیدہ ہڈیو! اکٹھی ہو جاؤ، اے مردو! زندہ ہو جاؤ۔ تو سب کھڑے ہو جائیں گے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا کہ تم بھی ان پرندوں کو آواز دو تو وہ تیرے پاس دوڑتے ہوئے آئیں۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے پرندوں کا تو کام ہے کہ وہ اڑتے ہوئے آتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ دوڑتے ہوئے آئیں گے، تاکہ کوئی معاند کل کو یہ نہ کہے کہ یہ تو دوسرے پرندے ہیں جو اڑتے ہوئے ادھر آگئے ہیں۔

﴿يَأْتِينَكَ سَعْيًا﴾ یہ قرآن کا اسلوب ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان باتوں پر عمل کیا تو وہ دوڑتے ہوئے آگئے۔

﴿وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ [البقرۃ: ۲۶۰] اے میرے پیغمبر! اپنے علم کو اور پکا کر لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہیں۔ وہ چاہیں تو مردہ کر دیں اور وہ چاہیں تو زندہ کر دیں۔ وہ چاہیں تو ہلاک کر دیں اور وہ چاہیں تو دوبارہ زندہ کر کے آباد کر دیں۔ اس کے اندر اس کی حکمتیں ہیں کہ اتنا عرصہ گزر گیا، ابھی قیامت نہیں آئی۔ ان آیات سے بھی مقصود اثباتِ معاد ہے کہ ہر مسلمان کا اعتقاد پکا ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مارنے پر بھی قادر ہیں اور مرنے کے بعد جب اللہ چاہے جب ہماری ہڈیاں بکھر جائیں تو زندہ کرنے پر بھی قادر ہیں۔

سوال کی وجوہات:

بعض علماء نے حضرات ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کرنے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک دفعہ سمندر کے کنارے گزرے۔ وہاں ایک مردہ جانور سمندر کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ جب پانی کی لہر آتی تو سمندر کے جانور آ کر اس مردہ جانور کو نوچتے۔ جب پانی اتر تا تو جنگل کے جانور بھی جا کر اس کو کھانا شروع کر دیتے تھے۔ جب یہ سب کھا پی لیتے ہیں اور کچھ تھوڑا بچ جاتا ہے تو بہت بڑے پرندے آتے ہیں اور اس کو کھاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کہ اللہ میاں! اس کے کچھ ٹکڑے سمندری جانوروں کے پیٹ میں چلے گئے، کچھ جنگلی جانوروں کے پیٹ میں چلے گئے اور کچھ فضائی جانوروں کے پیٹ میں چلے گئے، اے اللہ! آپ ان سب سے اس کو کیسے اکٹھا کر کے زندہ کریں گے؟ وہ مجھے دکھا دیں، تا کہ اطمینانِ قلب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں حکمت والا ہوں، غالب ہوں۔ تو ان پرندوں کو دیکھو! کیسے ان کی ہڈیاں گوشت ملا ہوا ہے۔ اس طرح جب ہم حکم دیں گے تو جہاں کہیں کسی کی ہڈی وغیرہ پڑی ہے اپنی جگہ پر آ جائے گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال پر علماء نے کئی اسباب ذکر فرمائے ہیں: ان میں سے جس سبب کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے اس کو پہلے ذکر فرمایا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے سامنے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اثباتِ وجود باری تعالیٰ پر دلیل دی تھی کہ ﴿رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کروں کہ مجھے علم الیقین سے عین الیقین تک پہنچا دیں۔

بعض علماء کرام نے اسی وجہ کو بیان کرنے میں تھوڑی تفصیل فرمائی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال میں صفتِ خداوندی کا ذکر کیا کہ ﴿رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ تو نمرود نے جواب دیا: ﴿أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ﴾ اور اس نے ایک قیدی کو قتل کر دیا اور ایک کو چھوڑ دیا اور اس نے لوگوں کو دھوکہ دیا کہ میں بھی مارتا ہوں اور میں بھی زندہ کرتا ہوں۔ اس لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے چاہا کہ میرا علم علم الیقین سے عین الیقین میں بدل جائے اور دوسرا لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ زندہ کرنا اور چیز ہے اور کسی قیدی کو چھوڑ دینا اور چیز ہے، کسی بندے کو قتل کر دینا اور چیز ہے۔ تو زندہ کرنے کا معنی تو ہے کہ کسی مردے میں روح ڈالی جائے اور مارنے کا معنی یہ ہے کہ کسی زندہ سے اس کی روح کو خارج کر دیا جائے اور وہ اپنی موت مرے۔ یہ معنی نہیں ہوتا کہ کسی کو تلوار سے مار دو تو تم بھی مارنے والے بن گئے۔

ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کے اہل ہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث نقل کی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نَحْنُ أَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ إِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ: رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ" [بخاری، رقم: ۳۳۷۲] ہم تو ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اس بات پر شک کریں۔ انہوں نے جب اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اے میرے رب! آپ مجھے دکھائیں! آپ مردوں کو کیسے زندہ کریں گے؟

مفسر فرماتے ہیں: کبھی لفظ شک کا ہوتا ہے، لیکن اس کا معنی وہ نہیں جو ہم استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً: عام آدمی حدیث کو پڑھے اور محدث لکھے: یہ حدیث صحیح نہیں، ضعیف ہے۔ تو عام آدمی سمجھتا ہے کہ صحیح نہیں کا مطلب ہے کہ یہ غلط ہے، لیکن یہ بے وقوفی والی بات ہے۔ احادیث کے درجے ہوتے ہیں: بعض کا درجہ صحت ہوتا ہے، بعض حسن کے درجے پر پہنچتی ہے، بعض حدیثیں ضعیف کے درجے کے پہنچتی ہیں، بعض حدیثیں غریب ہوتی ہیں، بعض روایات منقطع ہوتی ہیں، بعض روایات مرسل طریق پر بیان ہوتی ہیں اور بعض روایات موقوف ہوتی ہیں۔ یہ اصطلاحِ محدثین ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جتنی اونچی دی تھی اتنی تواضع دی تھی۔ جیسا کہ جو درخت ثمر آور ہوتا ہے، اس کی ڈالی اتنی جھکی ہوئی ہوتی ہے، اگر اس پر ثمر نہ ہو تو وہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں چاہیے تھا کہ ہم سوال کرتے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کر کے بات ختم کر دی؛ کیونکہ جتنا قیامت کا قرب آتا چلا جائے گا فرق پڑے گا۔ اس لیے شک کا معنی وہ نہیں ہے جو عام لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان بیان کی ہے۔

قرآن میں ارجیٰ آیت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے نزدیک یہ آیت مغفرت کی زیادہ امید لگانے والی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا سوال کرے اور اللہ تعالیٰ پورا کر دے بندے کے اطمینان قلب کے لیے تو اس سے بڑی رحمت کیا ہوگی؟

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾﴾ [البقرۃ:۲۶۱]

”جولوگ اللہ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے سات بالیں اگیں، ہر بالی میں سو سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اس سے بھی زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اللہ وسعت والا ہے جاننے والا ہے۔“

انفاق فی سبیل اللہ کی مثال:

تیسرے پارے کے شروع میں آپ نے پڑھ لیا تھا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾﴾ [البقرۃ:۲۵۴]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان والوں کو حکم دیا تھا کہ جو رزق ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو۔ اور فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ﴾ [البقرۃ:۲۴۵]

کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے، جہاں قرض ڈوبنے کا اندیشہ بھی نہیں اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا کر کے لوٹائیں گے۔ یہ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم ہے۔ آپ پہلے ان دو آیات کے اندر پڑھ چکے ہیں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسئلۂ معاد کو بیان کر کے فرمایا: جب تمہیں یقین ہے کہ ہم نے مرنا ہے اور مرنے کے بعد اٹھنا ہے تو اس کے لیے کوئی تیاری بھی کی ہے یا ایسے بیٹھے ہوئے ہو؟ اگر تم نے سفر کرنا ہے تو کوئی سامانِ سفر بھی باندھا ہے یا ایسے جا کر کھڑے ہو جاؤ گے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب ہم نے قیامت کو واضح کر دیا تو اس کے لیے تیاری کرو کہ میرے راستے میں خرچ کرو، یعنی مسکینوں، یتیموں کو کھلاؤ، مدارس ومساجد کو بناؤ، اپنا مال خرچ کر کے دنیا میں دین کو پھیلاؤ۔

انفاق فی سبیل اللہ کا ثواب:

اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی کاشت کرنے والے نے ایک بیج دانہ ڈالا، اس سے ایک کونپل پھوٹی، اس کے

بعد اس کے اوپر سٹے بن گئے، ہر سٹہ کے اندر سو سو دانہ بھر دیا کہ ڈالنے والے نے ایک دانہ ڈالا اور ہم نے اس کو سات سو دانہ بنا دیا۔ اس ایک مردہ دانہ کو میں نے جیسے زندہ کیا اسی طرح مردہ بندے کو بھی زندہ کرنے پر قادر ہوں۔ تم نے یہ دانہ گھر سے اٹھایا اور ہل چلا کر زمین کو نرم بنا کر اس کے اندر ڈال دیا، لیکن ہم نے دانے کی کیسے حفاظت کی ہے کہ اگر دریاؤں کو بھیج دوں تو وہ سب کچھ لتا کر پھینک دے۔ ﴿ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ [الواقعۃ: ۶۴] کیا تم یہ کاشت کرتے ہو یا ہم کاشت کرتے ہیں؟ اصل تو میں کرنے والا ہوں، تو سبب ہے۔ جب اس چھوٹے سے دانے کو ہم گم نہیں ہونے دیتے تو کیا یہ چھ فٹ کا بندہ مرنے کے بعد گم ہو جائے گا؟ کیا ہمیں پتہ نہیں چلے گا کہ یہ ہڈیاں کس کی ہیں؟ کیا ہم ان کو دوبارہ نہیں جوڑ سکیں گے؟

﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ [البقرۃ: ۲۶۱] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں اگر چاہوں تو سات سو گنا سے بھی زیادہ ثواب بڑھا دوں جس کے لیے چاہوں۔

مسجد الحرام کے اندر ایک نیکی ایک لاکھ نیکی بن جاتی ہے۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ نے جیش العسرۃ کے لیے چندہ مانگا اور فرمایا: بڑا مشکل مقابلہ ہے کہ ایک تو دشمن سے مقابلہ ہے اور دوسرا روم کی طاقت سے مقابلہ ہے جو منظم فوج ہے اور پہلی دفعہ مسلمان ان سے لڑ رہے ہیں، گرمی شدید ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے چندہ مانگا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ایک ہزار اونٹ بمع پالان اور سامان کے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ آج ایک اونٹ کی قیمت لگا لو کہ کتنے کا ملتا ہے؟ اور ایک ہزار دینار بھی چندہ میں دیئے۔ حضور اکرم ﷺ گود میں پیسے لے کر خوش ہو رہے ہیں اور ان کو ہلا کر فرما رہے ہیں: عثمان! تجھے مبارک ہو! آج کے بعد جو تو کرے تیرا نقصان نہیں ہوگا۔ تمہاری جنت کا فیصلہ اللہ نے کر لیا ہے۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے غلطی کرنے نہیں دے گا، یہ معنی نہیں کہ گناہ کر و تو چھٹی ہے)۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس زمانے میں اپنے باغ کا نصف حصہ دیا ہے، جس زمانے میں اس کی قیمت چار ہزار دینار تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جتنا چاہے ثواب دے۔ اللہ تعالیٰ تمام خزانوں کے مالک ہیں۔ جتنا تمہارا اخلاص زیادہ ہوگا اتنا ثواب زیادہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پیسوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ تیرے دل کو دیکھتے ہیں۔ اگر تو نے اخلاص کے ساتھ کسی کو ایک گلاس پانی پلا دیا ہے تو شاید اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔ تم نے کسی اندھے کا ہاتھ پکڑ کر راستہ عبور کرا دیا تو اس میں اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں گے۔ تم نے مسلمان

کے سامنے مسکر دیا ہے اسی پر اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔ تم نے ایک دھیلا خیرات کیا ہے، شاید اسی پر اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔ اس لیے ان آیات کے اندر حکم دیا گیا کہ اگر قیامت پر ایمان ہے تو اس کے لیے تیاری کرو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

پورے دین کا خلاصہ:

علماء کرام فرماتے ہیں: ہم پورے دین کا خلاصہ نکالیں تو دو چیزوں میں خلاصہ نکلے گا:

- ......ایک ''عَظْمَةُ الْخَالِق'' کہ دل میں اپنے خالق کی عظمت پیدا ہو جائے۔
- ......دوسری چیز ''اَلشَّفْقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللهِ'' مخلوق پر شفقت پیدا ہو جائے۔

ان دونوں کا نام دین اسلام ہے۔ اس لیے ہماری ہر اہم عبادت ''اللہ اکبر'' سے شروع ہوتی ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا دل میں اقرار ہو جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دل میں خالق کی عظمت بیٹھ جائے۔

نکات:

جب اذان سنی، دل کے اندر اللہ تعالیٰ کی عظمت ہے تو وہ گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مثال کے طور پر: آپ کو کوئی گھر بلانے آئے اور آپ کو گھر والے کہیں کہ آپ کو کوئی آدمی بلانے آیا تھا۔ آپ پوچھتے ہیں: کون آیا تھا؟ تو وہ بتاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں: ٹھیک ہے، میں مل لوں گا۔ اس کے بعد اگر کوئی آپ کو کہے کہ بادشاہ نے آپ کو بلایا ہے تو آپ کہیں گے: چلو کس وقت بلایا ہے؟ وہ کہتا ہے: ابھی نہیں، تین دن بعد جانا ہے۔ تو آپ تیاری کر رہے ہیں، ایک ایک سے پوچھ رہے ہیں کہ بادشاہ نے مجھے بلایا ہے، بادشاہ کے دربار میں آدمی کیسے جاتا ہے؟ میں کیا بات کروں؟ کیسے بات کروں؟ تین دن اس کے اندر لگے ہوئے ہیں؛ کیونکہ بلانے والا بادشاہ ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ کی بڑائی دل میں ہو، بلانے والا بلا رہا ہے ''اللہ اکبر...... اللہ اکبر'' اور کوئی نماز کے لیے نہیں آ رہا تو اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت نہیں آئی۔ اگر دل میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی ہوتی تو یہ گھر میں نہ بیٹھ سکتا۔

جن لوگوں نے اللہ کے نبیوں اور رسولوں کا انکار کر دیا تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت نہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغام کا کبھی انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی دل میں عظمت ہو تو اللہ تعالیٰ کے اوامر کا انکار نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی دل میں عظمت ہو تو اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے اس کا ارتکاب

بھی کبھی نہیں کر سکتا۔ تمام شرائع پر عمل تب ہوگا جب اللہ تعالیٰ کی عظمت دل میں بیٹھ جائے گی۔ اس لیے اولیاء اللہ اللہ کے ذکر پر زور دیتے ہیں، کثرت سے ذکر کرواتے ہیں، کبھی جہراً اور کبھی سراً ذکر کرواتے ہیں، اور کبھی کبھی کہتے ہیں: دل پر غور کر کے بیٹھ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا مکاشفہ کرو، تاکہ دل میں اس کی عظمت بیٹھ جائے۔ جب اللہ تعالیٰ کی عظمت دل میں بیٹھ جائے تو بندہ گناہ نہیں کرتا ہے۔ اگر گھر میں سات یا آٹھ سال کا بچہ ہو تو میاں بیوی بھی آپس میں نہیں ملتے کہ بچہ جاگ رہا ہے، بچہ دیکھ لے گا۔ تو بچے کا اتنا حیاء، لیکن گناہ کرتے ہوئے یہ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں؟ آپ سارے پیغمبروں اور اولیاء کے واقعات پڑھ لیں کہ جب ان پر اس قسم کا ابتلا آیا تو انہوں نے کہا: معاذ اللہ! خبردار! میں اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ حضرت بی بی مریم علیہا السلام نے دیکھا مرد آرہا ہے تو کہا: ﴿إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ﴾ [مریم: ۱۸] میں اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتی ہوں، تم غیر محرم ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ہو تو گناہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا مخلوق پر شفقت ہو۔ چھوٹا غریب ہمسایہ ہے، سب کے لیے دل کے اندر ہمدردی ہو کہ میں اس کی مدد کروں۔ جب دل کے اندر ان کی شفقت آجائے گی تو وہ آدمی زکوٰۃ ادا کرے گا، تاکہ ان کا بھلا ہو۔ یہ دو چیزیں جب آجائیں تو اسلام آجاتا ہے۔

اب انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا ہے کہ اگر تیرے دل میں میری عظمت ہو گئی ہے اور تمہیں موت کے بعد دوبارہ زندگی پر یقین آگیا ہے تو اس آخرت کے گھر کے لیے بھی کوئی تیاری کی ہے یا نہیں کی ہے؟

(حکایت) جیسا کہ ایک بادشاہ نے اللہ کے ولی سے پوچھا کہ مجھے مرنے سے بڑا ڈر لگتا ہے، حالانکہ مجھے یقین ہے کہ میں نے مرنا ہے، موت ٹل نہیں سکتی ہے۔ مہربانی فرمائیں! کوئی وظیفہ بتائیں۔ اللہ کے ولی نے فرمایا: مجھے ایک بات بتائیں کہ ایک آدمی کو محل سے نکال کر ویران جنگل میں بھیجا جائے تو اس کو جنگل میں جانے سے ڈر لگے گا یا نہیں لگے گا؟ بادشاہ نے کہا: اس کو ڈر لگے گا۔ اللہ کے ولی نے پوچھا اور جو جنگل میں پڑا ہے اس کو محل میں بھیجا جائے؟ تو بادشاہ نے کہا: وہ خوشی خوشی بھاگتا ہوا آئے گا۔ اس بزرگ نے کہا: اے بادشاہ! تم نے اگلا گھر تو برباد کر رکھا ہے اور دنیا والا گھر بنایا ہوا ہے، اس لیے تمہیں ڈر لگے گا۔ جن اللہ والوں نے اپنا آخرت والا گھر آباد کر رکھا ہے وہ تو سمجھتے ہیں کہ دنیا عارضی گھر ہے، ہم نے تو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک نیکی پر دس گنا ثواب ہے۔ جیسا کہ قرآن میں نص آگئی: ﴿مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ

أَمْثَالِهَا ﴾ [الانعام:۱۶۰] جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا ملے گا۔ جیسے ہم پانچ نمازیں پڑھیں تو پچاس لکھی جائیں گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی رحمت سے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں بعض خیرات وحسنات کو سات سو گنا بڑھادیتا ہوں اور اگر میں چاہوں تو سات سو گنا سے بھی جتنا مرضی ہے بڑھادوں، حتیٰ کہ قرآن کے اندر آ گیا: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [الزمر:۱۰] جن لوگوں نے دنیا میں مصیبتوں پر صبر کیا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو قیامت میں بغیر حساب کے ثواب دیں گے، بلکہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ان پر ثواب انڈیلا جائے گا۔

مقام کی وجہ سے نیکی کی فضیلت:

علماء نے فرمایا: بعض نیکیاں مقام کے اعتبار سے بڑھتی ہیں۔ ایک نماز گھر میں پڑھتے ہو اس کو ایک نماز لکھا جائے گا، اگر گھر سے نکل کر تم نے محلے کی مسجد میں ادا کی تو پچیس گنا ثواب ملے گا، گر محلے کی مسجد کو چھوڑ کر بڑی جامع مسجد میں آ گئے جہاں جمعہ ہوتا ہے تو پانچ سو گنا ثواب بڑھ گیا، تم مسجد اقصیٰ پہنچ گئے تو ہزار گنا نماز بڑھ گئی، اگر تم مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں نماز پڑھی تو پچاس ہزار گنا نماز بڑھ گئی اور اگر مسجد حرام میں آ گئے تو ایک نماز کا ایک لاکھ بڑھ گیا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

اوقات کے اعتبار سے نیکی کی فضیلت:

اور کبھی ثواب باعتبار اَزمنہ کے بڑھتا ہے کہ ایک عبادت تم روز کرتے ہو، لیکن اگر عشرہ ذی الحجہ میں عبادت کرو تو ثواب بڑھ گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عشرہ ذی الحجہ میں ثواب عمل اتنا افضل ہے کہ جہاد سے بھی افضل ہے۔ اسی طرح رمضان المبارک کے مہینے میں اعمال صالحہ کئے تو ستر گنا ثواب بڑھ گیا اور تم نے لیلۃ القدر میں عبادت کی تو ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں سے بڑھ گئی۔

نیت کی وجہ سے نیکی کی فضیلت:

اور کبھی فضیلت نیت کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی ہے جو میرے مہمان کو اپنے گھر لے جائے؟ ایک صحابی ان کو گھر لے آئے۔ انہوں نے اپنی بیوی سے پوچھا: گھر میں کیا ہے؟ اس نے کہا: اتنی سی روٹی ہے جو بچے کھالیں اور تھوڑا ہم بھی کھالیں گے۔ اس صحابی نے بیوی سے کہا: ایسا کرو بچوں کو سلا دو اور تم اس طرح کرنا جو تھوڑا سا ہے تم دے دینا۔ میں مہمان کے آگے رکھ دوں گا اور تم بڑے خیال سے دیئے کو بجھا دینا۔ تم بھی

منہ ہلاتی رہنا اور میں بھی منہ ہلاتا رہوں گا، تا کہ مہمان تو پیٹ بھر کر کھا لے۔...... یہ اخلاص ہے کہ خود بھوکے ہیں اور بچے بھوکے ہیں، لیکن پھر بھی تمنا یہ ہے کہ مہمان راضی ہو جائے۔ صحابی نے اس طرح عمل کیا اور مہمان نے اچھی طرح سے روٹی کھالی۔...... بہر حال جب صبح کی نماز ہوئی تو حضور اکرم ﷺ نے اس صحابی کو بلایا اور فرمایا: رات جو تم نے میرے مہمان کی خدمت کی ہے وہ واقعہ تم مجھے سناتے ہو یا میں تجھے سناؤں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے ابھی جبرائیل خبر دے کر گئے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ میرے مدنی! تیرے صحابہ استقامت کے پہاڑ ہیں۔ یہ اپنے آپ پر بھی دوسرے کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود بھی ان کو حاجت کیوں نہ ہو۔ یہ اپنی حاجت کو چھوڑ دیتے ہیں اور پہلے دوسرے کی حاجت کا خیال کرتے ہیں۔

یہ اخلاص ہے، اس کی وجہ سے ثواب بڑھ جاتا ہے۔ یاد رکھیں! جس طرح کچھ شروط صحۃ الصلاۃ کے لیے ہیں اور کچھ شروط بقاء الصلوۃ ہیں۔ صحۃ الصلوۃ کی شروط یہ ہیں کہ وضو ہو، تمہارا بدن حدث اصغر اور حدث اکبر سے پاک ہو، لباس پاک ہو اور جب تم نے "اللہ اکبر" کہا تو اب ہر چیز جو اللہ تعالیٰ نے حلال کی منع ہوگئی۔ اب نماز میں اگر تم کھانا شروع کر دو یا تین گلاس پانی پینا شروع کر دو تو نماز باقی نہیں رہے گی، اسی طرح ایک صحتِ انفاق اور شرطِ انفاق ہے کہ جو خیرات کر رہے ہو وہ پیسہ حلال ہو۔ اگر حرام کا پیسہ ہے تو خیرات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ رشوت بھی کھاتے رہو اور خیرات بھی کرتے رہو۔

ایک ڈاکو کا واقعہ:

جیسے ایک آدمی مجھے سنا رہا تھا کہ فلاں ڈاکو کو آپ جانتے ہیں؟ میں نے کہا: مجھے کیا پتہ ہے؟ اس نے کہا: فلاں بلوچ بڑا شریف ڈاکو تھا۔ میں نے کہا: بڑی عجیب بات ہے!۔ میں اس کے سامنے ہنس بھی نہیں سکتا تھا، عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ میں نے کہا: وہ ڈاکو تھا اور پھر شریف کیسے تھا؟ اس نے کہا: وہ بڑے لوگوں کے ہاں ڈاکے مارتا تھا اور غریبوں کو دیتا تھا، جہاں بیوہ عورت ہے اس کو کھانا پہنچاتا، کسی لڑکی کی شادی ہے اِن کو پیسے دیتا، سارے غریبوں کو خرچہ دیتا تھا۔ میں نے کہا: یہ اچھا شریف ڈاکو ہے کہ لوگوں کا گھر لوٹ کر دوسرے لوگوں پر خرچ کر دو، یہ کیسے شریف ہو گیا؟ میں نے کہا: ایک بات بتائیں! ایک آدمی کو عورت کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی عورت جا کر اس کی خواہش پوری کرتی رہے تو یہ بھی شریف زانیہ ہوگئی؟ میں نے کہا: ڈاکہ ڈاکہ ہے۔ گھر میں ڈاکہ ڈالنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا ہے کہ کافر کو بھی نہ لوٹو، دشمن کے گھر میں بھی مداخلت نہ کرو، کسی غیر کے مال میں تصرف نہ کرو۔ وہ اچھا

شریف ڈاکو ہے کہ مسلمانوں کے گھر میں ڈاکہ ڈالتا ہے اور شریف ہے۔

خیر ان کو بات سمجھ آ گئی تو یہ بھی خیرات نہیں ہوتی، بلکہ خیرات خالص حلال مال سے ہوگی۔ جیسے پلید پانی سے وضو نہیں ہوتا اسی طرح پلید مال سے صدقہ نہیں ہوتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ خیرات خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ یہ نہ ہو کہ یا اللہ! پنجتن پاک کی نیاز اور خیرات تیرے نام پر ہے۔ نذر و نیاز حسین اور خیرات اللہ تعالیٰ کے واسطے۔ تو اللہ تعالیٰ بھی فرماتے ہیں: یہ اپنی خیرات لے جاؤ۔ جس کے نام پر کی ہے اس کو دے دینا اور اس سے ثواب لے لینا، میرے پاس ثواب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں وہ صدقہ خیرات قبول کروں گا جو خالص میرے لیے ہو، اس میں کسی دوسرے کی شراکت نہ ہو۔

تیسری بات یاد رکھو کہ جب خیرات کرو تو دل میں یہ خیال نہ آئے کہ لوگ کہیں کہ بڑا خیرات کرتا ہے! کیونکہ جب ریا آ گئی تو ثواب ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تم نے دکھانے کے لیے عمل کیا ہے، میرے خزانے میں کوئی ثواب نہیں ہے۔

اگر تم نے کسی غریب کی امداد کی اور پھر ہر بات میں اس کو سناتے ہو کہ ہم دو سال سے تمہیں روٹی دے رہے ہیں، دو سال سے تیرے بچوں کا داخلہ کر رہا ہوں اور دو سال سے میں تمہیں کپڑے دے رہا ہوں۔ اگر تم احسان جتلا رہے ہو تو تم نے نیکی کو برباد کر دیا۔

اسی طرح کسی کو خیرات دی ہے اور اس کے بعد اس کو قول سے یا فعل سے تکلیف دی، مثلاً: کسی کو خیرات دی اور پھر وہ آیا تو اس کو کہو کہ تم ذلیل ہو، روزانہ مانگنے کے لیے آ جاتے ہو، تمہارا تو باپ بھی بھکاری تھا، تم تو بھکاریوں کے ٹھیکے دار ہو۔ یہ لو دو روپے، لے جاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس کا بھی کوئی ثواب نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ تم اس کو نہ دو، اس سے بات تو میٹھی کرلو۔

ثواب کیسے بڑھتا ہے؟

بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرے۔ بعض نے فرمایا: جہاد میں خرچ کرے۔ حالانکہ جہاد بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب آدمی جہاد میں خرچ کرتا ہے، حج میں خرچ کرتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ایک درہم کا ثواب سات سو درہم تک عطا فرماتے ہیں۔ اس لیے بعض علماء نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو آدمی حج میں خرچ کرتا ہے تو اس کو ایک کا سات سو گنا ملے گا۔ جب وہ گھر سے نکلا اور راستے

میں خرچ کیا تو سات سوگنا ثواب ملے گا۔ لیکن حرم میں ایک نیکی ایک لاکھ کی ہو جاتی ہے تو بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں ایک لاکھ کو سات سو سے ضرب دیں، یعنی ایک نیکی پر اللہ تعالیٰ اس کو سات کروڑ نیکیاں دیں گے۔

مثال کے ذریعے جو بات سمجھائی جائے وہ بات آدمی کے دل و دماغ اتر جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ [الحشر: ۲۱] (ہم نے قرآن میں مثالیں بیان کی ہیں، تاکہ لوگ زیادہ تفکر و تدبر کر سکیں) کیونکہ ایک آدمی کے ذہن میں آ سکتا تھا کہ ایک کی سات سوگناہ نیکی بڑھ جائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہارے ایک دانے کو سات سو دانے بنا دیتے ہیں تو ایک نیکی کو سات سوگنا بنانے میں کیا مشکل ہے؟ تم زمین میں کھجور کی ایک گٹھلی ڈالتے ہو، اس سے ہم کھجور کا ایک درخت بنا دیتے ہیں، اس پر گوشے لگا دیتے ہیں اور ہر سال لگاتے رہتے ہیں۔ اگر ایک کھجور کی عمر پچاس سال ہو تو سوچو ایک گٹھلی سے کتنی کھجوریں لگیں!؟ جو خدا ان چیزوں کے بڑھانے پر قادر ہے تو وہ تمہاری نیکیوں کو بڑھانے پر بھی قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ اعمالِ صالحہ کو بڑھاتے ہیں۔ جیسا کہ تم زمین میں دانہ ڈالتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو بڑھاتے ہیں، لیکن اگر دانہ خراب ہو تو کچھ نہیں نکلے گا۔ دانہ ٹھیک ہو، لیکن زمین خراب ہو پھر بھی کچھ نہیں اگے گا۔ دانہ ٹھیک ہے، زمین بھی بالکل ٹھیک ہے، لیکن تم نے پانی زہریلا لگا دیا، تب بھی دانہ جل جائے گا۔ اسی طرح تم نے خیرات کی، لیکن پیسہ حرام کا ہے تو کوئی ثواب نہیں ہوگا، یا تم نے خیرات کی اور غلط کام میں پیسہ دیا تو زمین ہی غلط ہوگئی، وہاں تو اور زیادہ گناہ ملے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی تھوڑی خیرات کرے، لیکن اپنے خالص مال سے صحیح جگہ پر خرچ کرے۔

قاضی احسان احمد رحمہ اللہ کا تقویٰ:

(واقعہ) قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمہ اللہ بیمار ہوئے تو نواب امیر محمد خان...... کالا باغ کے گورنر تھے...... تشریف لے آئے۔ نواب صاحب ان سے آکر ملے، ان کی صحت اور خیریت پوچھی تو قاضی صاحب نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ ''الحمد للہ'' بیماری بھی آتی ہے، صحت بھی آتی ہے۔ گورنر صاحب نے کچھ پیسے دیئے تو قاضی صاحب نے فرمایا: آپ کی بڑی مہربانی ہے! آپ نواب ہو کر غریبوں کو پوچھنے کے لیے دعا کے لیے آگئے، ہمارے لیے اتنا اعزاز کافی ہے، میں پیسے نہیں لیتا۔ نواب صاحب سمجھدار تھے، انہوں نے کہا: حضرت! یہ پیسے میں نے نہیں دیئے ہیں، یہ میری والدہ کا ہدیہ ہے اور ان کی خالص اپنی جائیداد اور اپنی آمدنی جو ایک ایک پائی علیحدہ رکھتی ہیں یہ ان کا پیسہ ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ آپ قبول فرمائیں یا قبول نہ فرمائیں۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمہ اللہ نے

فرمایا: اب میں لے لیتا ہوں۔

کیونکہ ان کو پہلے خیال تھا کہ یہ نواب صاحب کے پیسے ہیں، پتہ نہیں کیسے پیسے ہوں؟ اس دور کے اندر اتنا خیال ہوتا تھا اور نوابوں کے گھر میں اتنا خیال تھا کہ حلال کی کمائی علیحدہ رکھو، تا کہ کسی مدرسے کو دیں، خیرات دیں اور کسی عالم کو دیں تو خالص حلال سے دیں؛ کیونکہ جب حلال دیں گے تو اس کی برکتیں ہوں گی اور جب حرام دیں گے تو آپ کو ثواب نہ ملا اور دوسرا جس کے بدن میں حرام گیا اس نے اس میں بھی اپنا اثر دکھاتا ہے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بیماری کا واقعہ:

حضرت بشار بن ابی سیف الجرمی رحمہ اللہ حضرت عیاض بن غطیف سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بیمار تھے، ہم ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے۔ (کیونکہ مریض کی عیادت کرنا سنت ہے۔) ان کو تکلیف تھی، ان کی بیوی ان کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم نے ان کی بیوی سے پوچھا: کیا حال ہے؟ ابوعبیدہ نے رات کیسی گزاری؟ انہوں نے کہا: بڑے ثواب کے ساتھ گزاری۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جب بیوی کا جواب سنا تو اس نے کہا کہ میں نے کوئی ثواب میں نہیں گزاری۔ عیادت کرنے والے حیران ہو گئے کہ کیوں اس طرح کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سات سو گنا ثواب دیتے ہیں، لیکن اگر کوئی آدمی اپنی بیوی بچوں، اپنے اہل وعیال پر اور اپنے نفس پر یا بیمار ہو جائے اور خرچ کرے تو اس کو دس گنا اجر ملتا ہے، سات سو گنا اجر نہیں ملتا تو میں نے تکلیف کے اندر کوئی اچھا کام کیا تو مجھے کم اجر ملا۔

نیک لوگ کیوں بیمار ہوتے ہیں؟

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ بعض اللہ والوں کی بڑی بڑی بیماریاں ہوتی ہیں۔ بعض جاہل لوگ عجیب خدشات میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا ولی تھا تو اس کو ایسی بیماری کیوں لگ گئی؟ یہ جہالت ہے؛ کیونکہ بیماریاں تو انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آئیں، حضرت ایوب علیہ السلام پر بیماری آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر مریض ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا امتحان لیا ہے۔ وہ صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو گرا دیتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کا ولی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت میں درجات لکھے ہیں کہ ہم اس کو فلاں مقام پر پہنچانا ہے اور وہ اپنے اعمال کے

ذریعہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو تکلیف دیتے ہیں کہ کچھ رفعِ درجات اعمال کے ذریعہ کر دو اور کچھ رفعِ درجات مصیبت کے ذریعے کر دو۔

یاد رکھیں! تکلیفوں کا فرق ہوتا ہے: ایک تکلیف مومن کو ملتی ہے، وہ اس کے گناہوں کو مٹانے کے لیے ہوتی ہے۔ اور ایک تکلیف کافر کو ملتی ہے، وہ اس کے لیے عذاب بڑھانے کے لیے ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: طاعون ایک عذاب ہے، لیکن مومنوں کے لیے رحمت ہے۔ کوئی اس میں مر گیا تو اس کو شہید کا ثواب ملے گا۔

نیکیوں کا بڑا انعام:

(حدیث) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضور پاک ﷺ کی خدمت میں مہار ڈالی ہوئی اونٹنی لے آیا (یعنی بڑی اونٹنی لے آیا) اور کہا: یہ اونٹنی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات کرتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تجھے اس کے بدلے میں سات سو اونٹنیاں عطا فرمائیں گے۔ بعض علماء ان احادیث مبارکہ کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سات سو گنا ثواب دیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: جو حضور اکرم ﷺ کا فرمان مبارک ہے اس کو اسی پر رکھو کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت میں سات سو اونٹنیاں ہی دیں گے۔

روزہ کا ثواب:

(حدیث) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ابن آدم جب کوئی اچھا عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ثواب دیتے ہیں، مگر روزہ کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: روزہ میرے لیے ہے اور روزہ کا بدلہ میں خود دوں گا۔ بعض علماء نے اس حدیث کو یوں بھی پڑھا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ یہ ہے کہ میں اس بندے کو اپنی زیارت نصیب کروں گا۔

اصل وجہ یہ ہے کہ ہر عبادت میں ریا کا خدشہ ہو سکتا ہے، لیکن روزہ ایک ایسی چیز ہے جو بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں ہے۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ روزہ سے ہے یا نہیں ہے۔

(حدیث) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ہر ابن آدم کے عمل کو دس گناہ سے سات سو گنا تک بڑھاتے ہیں اور جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں اس سے زیادہ بڑھا دیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: روزہ میرے لیے ہے، اس کی جزا میں دوں گا۔ میرے بندے نے اپنا کھانا پینا صرف میری رضا کے لیے چھوڑا کہ میں

راضی ہو جاؤں۔

(حدیث) روزہ دار کو دو خوشیاں نصیب ہوں گی: ایک خوشی نصیب ہوگی جب آدمی افطار کرتا ہے اور دوسری خوشی اس وقت ہوگی جب اپنے رب کے پاس جائے گا۔

(حدیث) مومن روزہ دار کے منہ سے جو ہوا نکلتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک سے بھی زیادہ بہتر ہے۔

(حدیث) روزہ ڈھال ہے۔ یعنی گناہوں سے روکنے والا ہے، زنا سے روکنے والا، قوتِ حیوانیہ کو توڑنے والا اور قوتِ ملکیہ کو ابھارنے والا ہے۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے ثواب کو سات سو گنا بڑھاتے ہیں۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: روزہ نماز اللہ تعالیٰ کا ذکر یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے بھی زیادہ ہے اللہ تعالیٰ اس کا ثواب سات سو گنا بڑھا دیتے ہیں۔

جہاد میں خرچ کرنے کا ثواب:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا، مجاہد جہاد میں جا رہے تھے، ان کی مالی مدد کی اور خود اپنے گھر میں رہا، خود جہاد پر نہیں گیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو ایک درہم پر سات سو درہم کا ثواب عطا فرمائیں گے، لیکن جو شخص خود جہاد میں گیا اور اپنا مال بھی خرچ کیا اللہ تعالیٰ اس کو ایک درہم پر سات ہزار درہم عطا فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ مزید جتنا بڑھا دیں وہ بڑھانے پر قادر ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کے بھی حالات ہیں۔ ایک آدمی نے مال خرچ کیا، لیکن وہ خود مجاہد نہیں ہے، اس کو اللہ تعالیٰ سات سو گنا ثواب دیں گے۔ ایک آدمی مجاہد بھی ہے اور اپنا مال بھی خرچ کر رہا ہے اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ ہر درہم پر سات ہزار درہم دیں گے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو دو لاکھ درہم کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

ان آیات سے ثواب کی تحدید نہیں ہوتی، بلکہ کثرت کا بیان ہوتا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ

اللہ﴾ تو حضور اکرم ﷺ نے دعا کی: ''رَبِّ! زِدْ أُمَّتِي'' اے اللہ! میری امت کے لیے اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ﴾ [البقرۃ: ۲۴۵]۔ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! میری امت کو اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرما تو یہ آیت اتری: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [الزمر: ۱۰] اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیری امت میں جو صبر کرنے والے لوگ ہیں ان کو میں ایسا ثواب دوں گا جس کی کوئی حد و شمار نہیں ہوگی۔

دوسری حدیث کے اندر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن صابرین کو بلا کر ایک طرف کریں گے اور ان پر ثواب کو ایسے انڈیلا جائے گا کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوگا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ﴾ کی تفسیر میں منقول ہے: جس آدمی کا جتنا اخلاص زیادہ ہوگا اتنا اللہ تبارک وتعالیٰ ثواب بھی زیادہ عطا فرمائیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۶۱] اللہ تعالیٰ کا فضل اتنا زیادہ ہے کہ ساری مخلوق بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اللہ تعالیٰ جاننے والے علم والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کون ثواب کا مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۶۲ تا ۲۶۴]

"جو لوگ اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو احسان جتلاتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے ہاں ثواب ہے۔ نہ تو ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ نرم جواب دینا اور درگذر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد ستانا ہو۔ اللہ (بندوں کے صدقہ سے) غنی ہے، تحمل والا ہے۔ اے ایمان والو! احسان جتلا کر اور ایذاء پہنچا کر اپنی خیرات ضائع نہ کرو، جیسے وہ شخص جو کہ اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کی غرض سے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا (جیسے منافق) اس کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور اس کو بالکل صاف کر دے۔ ایسے لوگ اپنی خیرات کا ثواب نہ پائیں گے اور اللہ کافروں کو راہ نہیں دکھاتا۔"

صدقہ خیرات کرنے کا ادب:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر اپنے ان بندوں کی مدح فرمائی ہے جو خیرات وصدقات کرنے کے بعد اپنا احسان نہیں جتلاتے کہ میں نے آپ پر اتنا خرچ کیا، میں نے آپ کو یہ دیا۔ یعنی اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے بھلائی کی ہے تو بھلائی کو بھول جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے صدقات خیرات کرنے کے بعد ایذاء بھی نہیں پہنچاتے جو ان کی نیکی کو ضائع کرنے والی بن جائے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کو بہت بڑا اجر دوں گا۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ خود بدلہ دیں گے اور کوئی نہیں دے گا۔

یاد رکھیں! اللہ تبارک وتعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب دیتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہیں، ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ ان کو آگے آنے والے احوال کا کوئی ڈر نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے چھپالیں گے۔ ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرۃ: ۲۶۲] اور نہ ان کو یہ غم ہوگا کہ ہم نے جو پیچھے اپنی اولاد چھوڑی ہے ان کا کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ ان کی اولادوں کی حفاظت فرماتے ہیں اور ان کو اپنی دنیا میں جو گھر محل چھوڑ کر آئے اس کا بھی غم نہیں ہوگا: کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو آگے ایسا دے دیں گے کہ وہ پچھلا بھول جائیں گے کہ دنیا کی نعمت کیا چیز ہے!؟

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی پرہیزگاری:

تاریخ میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ آتا ہے کہ آخری وقت میں ان کے پاس ان کے دوست آئے۔

انہوں نے کہا: تم بیمار ہو اور انسان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ تم نے ساری جائیداد اللہ تعالیٰ کے راستے میں لٹا دی ہے، اب اولاد کا بھی کوئی حق ہے۔ آپ مہربانی کر کے خلیفۃ المسلمین عبدالملک کو لکھ دیں...... کہ وہ آپ کا بڑا احترام کرتا ہے اور آپ کا سسر بھی ہے...... اس کو لکھ دیں، تاکہ آپ اپنی اولاد کے لیے کوئی جاگیر چھوڑ دیں، ورنہ آپ کی موت کے بعد آپ کی اولاد کیا کرے گی؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسکرائے اور فرمایا: تم نے اچھی نصیحت کی ہے! لیکن یہ بتاؤ کہ میری اولاد یا تو صالحین میں ہوگی یا برے لوگوں میں ہوگی۔ اگر وہ اچھے صالحین بنیں گے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ میں صالحین کا خود متولی ہوں، ان کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میں ان کی حفاظت کروں گا۔ اگر میری اولاد بری ہوگی اور میں ان کو دولت اکٹھی کر کے دے جاؤں اور وہ گناہ کرتے رہیں تو میں ان کے گناہ کا حصہ دار کیوں بنوں؟

وصیت و نصیحت کرنے والے خود لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ہم نے یہ دیکھا کہ جن وزیروں نے اولاد کے لیے کروڑوں کی جائیداد چھوڑی تھی وہ بھیک مانگتے ہوئے دیکھے گئے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی عزت دی اور دین میں بھی عزت دی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پرہیزگاری:

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ عیادت کرنے کے لیے تشریف لائے۔...... یہ اس دور کی بات ہے جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفۃ المسلمین تھے...... انہوں نے ان سے ان کا حال پوچھا تو انہوں نے کہا: الحمد للہ۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر چاہو تو تمہارے علاج کے لیے طبیب بھجوا دوں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: طبیب ہی نے تو مجھے بیمار کیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ)، تو کیا آپ طبیب بھیجیں گے؟ آپ کوئی تکلیف نہ کریں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر آپ اجازت دیں تو آپ کو کچھ ہدیہ بھیج دوں، تاکہ بیماری میں کچھ کام آئے؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب میں تندرست تھا، پیسے خرچ کرنے کا موقع تھا، اس وقت آپ نے مدد نہیں کی۔ اب جب بیمار ہو گیا ہوں تو کیا خرچ کروں گا؟ لہٰذا اب مجھے ضرورت نہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں ہدیہ بھیجتا ہوں، آپ اس کو قبول فرمالیں، وہ آپ کے بچوں کے کام آئے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے امیر المومنین! میرے بچوں کو بھی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی رات کو ایک دفعہ سورۃ الواقعہ پڑھ لے اس کو اللہ تعالیٰ کبھی بھوکا نہیں مارتے۔

میرے بچوں کو سورۃ الواقعہ یاد ہے، وہ روزانہ اس کو پڑھتے ہیں، اس لیے ان کو پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مقام ہر کسی کو نہیں ملتا ہے۔ بہر حال آدمی جتنی بھی کر سکے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے تو اس کو ریا، شہرت وغیرہ سے ضائع نہ کرے۔ لوگوں پر خرچ کرے تو ان پر احسان بھی نہ جتلائے اور نہ لوگوں کو تکلیف پہنچائے۔

بہترین صدقہ:

حضرت عمرو بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ہاں اس صدقہ سے زیادہ کوئی صدقہ محبوب نہیں کہ مسلمان سے تم اچھے کلمہ سے بات کرو۔ یہ سب سے بہتر صدقہ ہے۔ اور اگر کسی ساتھی سے کوئی بات سرزد ہو جائے تو اس کو معاف کر دو۔ یہ سب سے بہتر صدقہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ غنی ہیں، اس کو اپنی مخلوق سے کوئی حاجت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفت حلیم ہے کہ اتنے کروڑوں بندوں کی غلطیاں دیکھ کر عذاب نہیں فرماتے، اللہ تبارک وتعالیٰ مہلت عطا فرما دیتے ہیں۔ تو بندے کو بھی سیکھنا چاہیے کہ جب خدا سب کچھ کرنے پر قادر ہے، اپنے بندوں کو مہلت دے رہا ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کی غلطیوں پر پکڑنا چاہے تو کوئی ایک بندہ بھی زمین پر چلتا ہوا نظر نہ آئے؛ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں گناہ پر پکڑے تو کون بندہ ہے جو گناہ سے پاک ہو؟ سوائے انبیاء علیہم السلام کے کہ وہ معصوم تھے، صحابہ محفوظ تھے اور اللہ تعالیٰ کے اولیاء گناہ سے بچتے ہیں، ورنہ ہر آدمی کے اندر کوئی نہ کوئی گناہ ہے، کوئی غیبت کر رہا ہے اور کوئی جھوٹ بول رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی غیبت سے پرہیز:

ایک آدمی نے حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے آ کر کہا کہ میں نے اتنا عرصہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے درس میں گزارا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں نے امام صاحب کی زبان سے کبھی کسی کی غیبت نہیں سنی۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ ہنس پڑے اور فرمایا: تم کیا سمجھتے ہو امام صاحب اتنے کم عقل تھے کہ لوگوں کے گلے کر کے اپنی نیکیاں ضائع کر دیتے۔

تین قسم کے لوگ اللہ کی رحمت سے محروم:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو پاک بھی نہیں فرمائیں گے۔ (ایسے شخص کا انجام خود ہی سوچ لیں کہ کیا ہوگا!!؟) ایک وہ بندہ

ہے جو لوگوں کو خیرات دیتا ہے، غریب رشتہ داروں کی مدد کرتا ہے اور یتیموں کی مدد کرتا ہے، لیکن مدد کرنے کے بعد احسان جتلاتا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ بھلائی کی اور یہ کیا ہے۔

دوسرا وہ شخص جو اپنی چادر گٹوں سے نیچے لٹکا کر چلنے والا ہو (چاہے وہ شلوار ہو پینٹ ہو)، وہ بطور تکبر اس طرح کرتا ہے کہ آدھا خود زمین پر چل رہا ہے اور آدھا اس کے کپڑے چل رہے ہیں۔ کیونکہ پہلے زمانے کے اندر چادروں کا رواج تھا، اس لیے چادر کا ذکر ہے، جیسا کہ کئی لوگوں کا پائنچہ جوتی کے اندر ہوتا ہے۔ یہ ان کے بڑے آدمی ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ اور جو ماڈرن لڑکیاں ہوتی ہیں، ان کی نشانی یہ ہے کہ ان کی شلواریں اونچی ہو۔ اب ترقی ہوگئی ہے، عورتوں کے لیے ایک شلوار نکالی ہے، اس کا نام بھی مولوی شلوار ہے۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ایسی عورتیں جو باریک کپڑے پہنیں لعنتی ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں: بڑی سوشل عورت ہے...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ...... تمہاری بات مانیں یا نبی کی بات کو مانیں۔ تمہاری بات ماننے سے اگر قیامت میں چھٹکارا ملتا ہے اور نبی کی بات ٹھکرانے سے جنت ملتی ہے تو اسی طرح کرو، جبکہ ہمارا ایمان ہے جو حضور اکرم ﷺ کی بات کو ٹھکرائے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

تیسرا آدمی وہ ہے جو اپنی چیزوں کو بیچنے کے لیے جھوٹی قسم کھاتا ہے کہ اس پر بھی اللہ تعالیٰ قیامت میں نظر نہیں فرمائیں گے۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جو جنت میں داخل نہیں ہوں گے:

1 ...... جو اولاد اپنے والدین کی نافرمان ہے۔

2 ...... دوسرا وہ شخص جو خیرات کرتا ہے، پھر لوگوں پر احسان جتلاتا ہے کہ ہم نے تمہاری اتنی خدمت کی۔ تم غریب تھے ہماری روٹی پر پلتے رہے۔

3 ...... اور شراب کا عادی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو جھٹلانے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

مسلمان کے لیے سخت وعید کا مطلب:

یاد رکھیں! بہت ساری احادیث میں آتا ہے: ''لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ'' اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ وہ بالکل جنت میں

کبھی نہیں جائے گا؛ کیونکہ یہ سزا تو کافر کو ہوگی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومن کو جنت دینی ہے، بشرطیکہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو، اس کے عقیدے میں کفر وشرک، قبر پرستی نہ ہو اور غیروں کی نذر ونیاز اور چڑھاوے نہ ہوں تو وہ جنت میں جائے گا۔

ان احادیث میں جو فرمایا گیا: ''لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ'' علماء فرماتے ہیں: یہ وعید شدید ہے، یعنی سخت تنبیہ ہے کہ اس نے ایسا گندا کام کیا ہے کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا، یعنی اوّل اوّل حالت میں اَبرار، اَخیار کے ساتھ داخل نہیں ہوگا، بلکہ اپنے عذاب بھگتے گا، پھر اس کو جہنم سے نکالا جائے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا۔

مثلاً: ایک لڑکا تو وہ ہوتا ہے جو سارے مدرسے میں فرسٹ آ گیا تو اس پر فخر کیا جاتا ہے اور ایک لڑکا وہ ہوتا ہے جو عشرہ اوائل میں آ گیا، یعنی پہلے دس لڑکوں میں اس نے نام حاصل کیا، وہ پاس ہو گیا۔ اور ایک لڑکا وہ ہوتا ہے جس نے درجہ ممتاز حاصل کر لیا، وہ بھی پاس ہو گیا، اور ایک نے جید جدا لیا وہ بھی پاس ہو گیا، اور ایک وہ ہوتا ہے جس نے تھرڈ ڈویژن لی وہ بھی پاس ہو گیا، لیکن ہر کوئی اس کو کہتا ہے تیرا پاس ہونا نہ ہونے کے برابر ہے، تم پھر امتحان دو۔ اس لیے اگر کوئی رگڑے کھا کر جنت میں گیا تو گویا نہ گیا۔ اس لیے فرمایا جاتا ہے کہ نافرمان جنت میں نہیں جائے گا۔

''وَلَا مُکَذِّبٌ بِقَدَرٍ'' اگر وہ تقدیر کو جھٹلاتا ہے تو وہ کافر ہو گیا، لیکن اگر وہ عقیدۃً تو نہیں جھٹلاتا، لیکن عملاً اس کی تکذیب کرتا ہے، اس کو بھی ابتدائی طور پر دخولِ جنت نہیں ہوگا۔

دوسری حدیث کے اندر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر نہیں فرمائیں گے (یعنی نظر رحمت نہیں فرمائیں گے، ورنہ نہ دنیا میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے چھپی ہوئی ہے اور نہ قیامت میں چھپی ہوئی ہے): 1 ......اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ 2 ......شراب کا عادی 3 ......اور صدقہ خیرات دینے کے بعد احسان جتلانے والا۔

غریب لوگ اللہ کے ہاں تمہارے قاصد ہیں:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں جب کوئی مسکین خیرات مانگنے کے لیے آ جاتا تو آپ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کرتے اور اس کے لیے اپنی چادر بچھاتے، ان کو بٹھاتے اور جتنا اللہ تعالیٰ توفیق دیتے ان کو عطا فرماتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ یہی غریب لوگ تو ہیں جو ہمارا صدقہ آخرت میں لے کر جا رہے ہیں۔ اگر یہ فقیر نہ ہوتے

تو ہم خیرات کس کو دیتے؟ اس لیے قرآن نے بھی فرمایا: ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴾ [الضحیٰ:۱۰] اگر کوئی تمہارے پاس کوئی سوال کرنے والا آئے تو اس کو نہ جھڑکو، چاہے وہ علم کا سوال کرے یا مال کا سوال کرے۔ اگر نہ دو تو اس کو آرام سے ٹال دو۔ جیسے عرب کہہ دیتے ہیں: ''اِنَّهٗ عَلٰى بَابِ اللّٰهِ'' میں بھی اللہ تعالیٰ کے دروازے پر بیٹھا ہوں، میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ مظلوم آدمی کے دل سے جو بددعا نکلتی ہے سیدھی عرش پر جاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مظلوم کی بددعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا، وہ سیدھی اللہ تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن جھوٹے بھی محتاج بن کر مانگتے ہیں۔ اگر یہ جھوٹے مانگنے والے نہ ہوتے تو مانگنے والے محتاج کو ٹالنے پر آدمی کی سخت گرفت ہوئی۔

اللہ کے لیے دین کی پہچان:

اگر تم کسی کو دے کر احسان جتلاتے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں دیا ہے، ورنہ احسان نہ جتلاتے۔ علماء نے فرمایا: بندے کے امتحان کا ایک طریقہ ہے کہ اگر یہ بندہ اللہ تعالیٰ کے لیے دے رہا ہے تو یہ دیکھو کہ جس سے اس کا کوئی جھگڑا ہے اس کو بھی دیتا ہے؟ اگر اس کو نہیں دیتا تو اس کا مطلب ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں دے رہا، بلکہ اپنی دوستی نبھا رہا ہے، اپنے تعلقات بنا رہا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دورِ سلطنت میں ایک حکم نامہ جاری فرمایا تھا کہ میری سلطنت میں اگر کوئی یہودی، نصرانی، مجوسی یا مشرک ہے وہ بوڑھا اور معذور ہو گیا ہے تو اس کو بیت المال سے وظیفہ دو۔ بعض لوگوں نے عرض کیا: حضرت! وہ تو کافر ہیں؟ آپ نے فرمایا: جب وہ جزیہ دیتے تھے اس وقت وہ کافر نہیں تھے؟ ان سے ہم لیتے رہے، جب وہ بوڑھے ہو گئے تو کیا اب ان کی مدد نہ کریں؟ اس سے اندازہ لگائیں کہ اسلام کتنا رحمت والا مذہب ہے!!

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک عورت کو جہنم کا عذاب دیتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا، اس کو چھوڑا نہیں، تا کہ وہ کھا پی لے اور خود بھی پانی نہیں پلایا۔ اور وہ بلی تڑپتی ہوئی مر گئی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو جہنم میں ڈال دیا۔

صحیح حدیث مبارک میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ ایک عورت جو بے انتہاء بدکردار عورت تھی، اس نے ایک کتے کو پانی پلا دیا جو تڑپ رہا تھا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے۔

والدین کا نافرمان ہونا بھی بہت بڑا جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ علقمہ رضی اللہ عنہ پر ان کی

والدہ ناراض تھیں تو موت کے وقت ان کے بیٹے کی زبان بند ہو گئی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ علامات قیامت میں ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی اپنے دوستوں کے ساتھ بڑے وفادار ہوں گے، لیکن والدین کے نافرمان ہوں گے۔ اپنی بیوی کے بڑے تابعدار ہوں گے، لیکن ماں کے نافرمان ہوں گے۔ اور آج ہر گھر کا یہ مسئلہ ہے کہ بیوی نے کہہ دیا کہ میں تمہاری ماں کے ساتھ نہیں رہتی تو علیحدہ کر دیا۔ بیوی نے کہا: ماں کو گھر سے نکال دو تو اس کو نکال دیا...... انا للہ وانا الیہ راجعون......

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ [البقرۃ:۲۶۵]

''اور ان لوگوں کی مثال...... جو اپنے اموال کو اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں...... اس باغ کی مثل ہے جو بلند ہموار جگہ پر ہو کہ اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ دونا پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کو کافی ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔''

جو لوگ اخلاصِ دل سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں ان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے مال کبھی کم نہیں ہوتا۔

اہل بیت پر خرچ کرنے کا عجیب واقعہ!

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے خواب دیکھا۔ ان کو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم فلاں جگہ ایک آدمی ہے اس کو جا کر خوشخبری دے دو کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں جنت کے اندر اس کو اتنا اونچا درجہ دیں گے کہ وہ میرے قریب ہوگا۔ آپ وہاں تشریف لے گئے اور جب آدمی کو جا کر ملے تو وہ آدمی آگ کا پجاری تھا اور کافر تھا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں حیران ہو گیا کہ میرا خواب بھی سچا ہے اور حضور اکرم ﷺ نے خواب میں بشارت دی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی ایسی حفاظت فرمائی ہے کہ شیطان خواب میں ہر کسی

کی شکل بنا سکتا ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا ہے۔ کوئی شیطان طاقت نہیں رکھتا کہ وہ نبیوں کی شکل بنا کر کسی کو دھوکہ دے سکے۔ اور یہ آدمی مسلمان نہیں ہے اور میں اس کو جنت کی بشارت دے رہا ہوں۔ اس آدمی نے مجھے بٹھالیا۔ اس کی عمر ایک سو بیس سال ہو چکی تھی، بھنویں آنکھوں پر گر گئی تھیں۔ جب دیکھتے تو بھنویں اٹھا کر دیکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے احترام سے بٹھایا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا؟ اس نے کہا: اور تو مجھے کچھ یاد نہیں۔ بس یہ یاد ہے کہ میرے بچوں کی شادی تھی، کئی دن تک کھانے چلتے رہے۔ آخری دن میں باہر سے آ رہا تھا تو گلی کے اندر مجھے کسی گھر سے رونے کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھا کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم مسلمان ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا: تمہارے بچے کیوں رو رہے ہیں؟ اس نے کہا: تم جاؤ، اپنا کام کرو۔ میں نے جب اس کو مجبور کیا تو اس عورت نے مجھے بتایا کہ میرے بچے بھوکے ہیں اور اتنے دن سے ہمارے گھر میں فاقہ ہے اور تمہارے گھر کے اندر کھانے اڑ رہے ہیں؛ کیونکہ ہم مسلمان ہیں، بغیر کسی اجازت کے کیوں آئیں؟ کہتے ہیں: میں نے فوراً گھر آ کر کھانا اٹھایا اور کافی سارا راشن اٹھوایا، کپڑے اٹھائے، پیسے اٹھائے اور اس گھر میں سارا سامان پہنچایا۔ بچوں کے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔ بچے کھانا کھانے کے بعد خوش ہو کر دعا کرنے لگ گئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت میں تجھے وہ مقام دے کہ ہمارے نبی کے قریب تمہیں جگہ مل جائے؛ کیونکہ وہ آلِ رسول تھے۔ ان بچوں نے دعا کی تھی میں تو سمجھا نہیں؛ کیونکہ میں تو نہ نبی کو مانتا تھا اور نہ خدا کو مانتا تھا، اس لیے میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ ان بچوں کو آتا ہے وہ دعا کر رہے ہیں۔ میں واپس آ گیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان یتیم بچوں کی دعا سن لی ہے، لہٰذا آپ مجھے کلمہ پڑھائیں۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اسی وقت وہ میرے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے، صرف اتنا خرچ کرنے سے وہ اتنا قریب آ گیا۔

صدقات کے فضائل:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! کبھی غریب سے نفرت نہ کرنا، کبھی مسکینوں سے نفرت نہ کرنا۔ ان کو اپنے قریب کرنا، اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے قریب کر دیں گے۔

ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا کر رہے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ! أَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَأَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ'' یا اللہ! مجھے زندہ بھی غریبوں کے ساتھ رکھ، مجھے موت بھی مسکینوں کے ساتھ عطا فرما اور قیامت میں بھی

مجھے مسکینوں کے ساتھ کھڑا کرنا۔ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: آپ ایسی دعائیں کیوں مانگ رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہیں تو دنیا و دولت دے دیں، سارے خزانے آپ کے حوالے کردیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ مسکینوں کے ساتھ رہوں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جب اہل جنت کو جنت میں داخل کردیں گے تو اس وقت کے فقرا غنیوں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرا تعلق مسکینوں کے ساتھ رہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ گزرے...... یہ وہ صحابی ہیں جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، مدینہ کی طرف بھی ہجرت کی، بدر کے اندر بھی حاضری دی اور غزوہ احد میں شہید ہوئے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن ہوئے...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس حالت میں دیکھا کہ ایک چمڑے کو کاٹ کر گلے میں ڈالا ہوا ہے اور نیچے کھجوروں کے پتوں سے اس کو سلائی کیا ہوا ہے۔ آپ رونے لگ گئے اور فرمایا: جانتے ہو یہ وہ آدمی ہے جب کافر تھا تو صبح کو ایک جوڑا پہنتا تھا اور شام کو اور جوڑا پہنتا تھا۔ اس کے دستر خوان پر ہر قسم کے کھانے ہوتے تھے۔ یہ بڑی امیرانہ زندگی گزارتا تھا اور آج تم دیکھ رہے ہو کہ یہ کس حالت میں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر ہمارے پاس ہوتے تو ہمارے کام نوکر کرتے اور ہم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے فارغ کر دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اس حال میں زیادہ افضل ہو۔

ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک کھجور پر کھجوریں اتارنے کے لیے چڑھے۔ ان کی پنڈلیاں کمزور تھیں؛ کیونکہ غربت تھی۔ ایک صحابی نے جب ان کی پنڈلیوں کو دیکھا تو ان کو ہنسی آگئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ان کی پنڈلیوں کو دیکھ کر ہنس رہے ہو جو اللہ نے پیدا کی ہیں، اس اللہ کی قسم ہے! میرے عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیاں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دو اور ساری دنیا دوسرے پلڑے میں رکھ دو تو اس کی شان بھاری ہو جائے گی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسکینوں کو اپنے ساتھ رکھو، مسکینوں کے ساتھ محبت کرو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو بندہ کسی یتیم پر ہاتھ رکھ لے، کسی یتیم کا خرچہ برداشت کر لے اور کسی یتیم کو اپنا بیٹا بنا لے، قیامت میں وہ میرے قریب ہوگا۔

جو شخص اپنے مال کو خرچ کرے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا ڈھونڈے، کسی اور کی رضا کو درمیان میں شامل نہ کرے اور اپنے دل میں یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے ان کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی اونچے ٹیلے پر باغ ہو اور اس پر بارش آتی ہے، پانی لگتا ہے، وہ باغ دوگنا پھل لے آتا ہے۔ اگر اس اونچی جگہ والے باغ میں بارش بھی نہ برسے تو جو شبنم ہوتی ہے اس سے بھی زندہ رہ جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔

قادیانیوں نے بھی اپنے شہر کا نام ربوہ رکھ لیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ربوہ میں اتارا تھا اور ان کی حفاظت بھی کی تھی تو قادیانی نے یہ دلیل دی کہ دنیا میں کوئی اور ربوہ دکھاؤ...... نعوذ باللہ...... معلوم ہوا کہ یہ عیسیٰ ہے۔

لیکن یاد رکھیں! ربوہ ہر اونچی جگہ کو کہتے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ یہ ایک ملک میں ہے اور کسی دوسرے ملک میں نہیں۔ منیٰ کے اندر جہاں خیمہ لگاتے ہیں اس کو بھی ربوہ کہہ سکتے ہیں؛ کیونکہ وہ اونچا حصہ ہے۔

زکوٰۃ کے مستحقین کی ترتیب:

﴿وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ﴾ بعض علماء نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ کس جگہ ہم اپنے صدقات کو خرچ کریں؟ اور بعض علماء نے اس کا ترجمہ کیا: ''إِحْتِسَابًا'' اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتا دیا کہ جب تم خیرات کرو تو اس کے سب سے زیادہ مستحق تمہارے رشتے دار ہیں، اس کے بعد جو تیرے محلے کے مستحق لوگ ہیں، اس کے بعد دوسرے محلے والے، پھر اپنے شہر والے اور پھر ملک والے مستحق ہیں۔ ہاں اگر مسلمانوں کے ایسے حالات پیدا ہو جائیں، جیسا کہ بوسنیا میں ہیں یا مسلمانوں کے جو حالات کشمیر میں ہیں، تو زکوٰۃ وہاں بھی بھیج سکتے ہیں۔ اس کے اندر بھی علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

﴿كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ﴾ جو باغ اونچی جگہ پر ہو وہ خوبصورت لگتا ہے، دور سے نظر آتا ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ جتنی جگہ اونچی ہوتی ہے اتنا موسم لطیف ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کسی نے اونچی جگہ باغ بنایا اور وہاں پانی برسا اور باغ میں پھل آیا تو وہ دوگنا، سہ گنا ہو گیا یا برسات معمولی سی بھی آگئی تو اس کو تھوڑی سی شبنم بھی کافی ہو گئی تو ایسے باغ سے بڑی امیدیں ہوتی ہیں۔

''رَبْوَة'' اس کے اندر تین قراءتیں ہیں: (۱)...... بعض لوگوں نے اس کو ''رِبْوَة'' پڑھا اور بعض نے ''رُبْوَة'' پڑھا اور بعض نے ''رَبوة'' پڑھا ہے۔ ''وَابِلٌ'' کا معنی تیز بارش۔ مومن اگر تھوڑی خیرات کرے گا تب بھی پھل آئے گا اور اگر زیادہ خیرات کرے گا تب بھی پھل آئے گا۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اگر تیرے پاس کچھ بھی نہیں ہے تو ایک مسلمان کو مسکرا کر مل لیا کرو، اس پر بھی اللہ تعالیٰ تجھے صدقہ کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

صدقہ میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ تم لاکھوں خرچ کرو، بلکہ اگر تم ایک کھجور کے دانے کے برابر بھی خیرات کرو تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر پہاڑ کے برابر ثواب عطا فرماتے ہیں۔ اس لیے جتنا اللہ تعالیٰ توفیق دے خیرات کرو، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ مال حلال ہو، نیت خالص ہو، اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور صدقہ کرنے کے بعد احسان جتلانا اور تکلیف دینا نہ ہو۔

مسجد بنوانے میں احتیاط:

ہمارے ہاں ایک رواج ہے کہ جب بڑا آدمی چندہ مانگے تو لوگ لاکھوں دیتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں ایک آفسر آئے تھے۔ اس نے اپنے دماغ میں سوچا کہ لوگ صبح سے لے کر شام تک عدالتوں میں رہتے ہیں، مسجد کوئی نہیں ہے۔ اس نے ایک اصول بنالیا کہ جو آدمی کام کے لیے آتا تو اس کو کہتے ہیں کہ اتنے پیسے دو، ہم مسجد بنا رہے ہیں۔ اور مجھے بتایا تو میں نے کہا: اس طرح تو مسجد نہیں بنے گی، البتہ کمرہ بن جائے گا اور فقہاء کے نزدیک نماز بھی ادا نہیں ہوگی۔ لوگ تو تمہارے ڈر کی وجہ سے ٹیکس سمجھ کر دے رہے ہیں، مسجد کا چندہ تو نہیں دے رہے ہیں۔ ایسے پیسوں سے مسجد بنانا جائز نہیں ہوتا، تو لوگوں سے زبردستی لینے والی بات ہے۔ حتیٰ کہ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر ایک آدمی تقریر کرے اور لوگوں کو تقریر میں ایسا مدہوش کرے کہ اب ہر آدمی پیسے ڈال رہا ہے، یہ بھی جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس نے لوگوں کو اپنی تقریر کے جادو میں پھنسا کر پیسہ نکال لیا ہے۔ صدقہ وہ ہے جو آدمی اپنے دل سے دے، اپنی رضا سے اور خالص مال حلال سے دے۔

آج سب سے خوبصورت مسجدیں بینک والے بناتے ہیں، حالانکہ اس مسجد میں نماز کیسے بہتر ہوسکتی ہے؟ کیونکہ خالص حرام (یعنی سود) کے پیسے سے بنی ہوتی ہے۔ اس کی بجائے تم سڑک پر چٹائی رکھ کر نماز پڑھ لو وہ زیادہ بہتر ہے۔

ہمارے مولویوں میں یہ بھی بیماریاں پھیل گئی ہیں کہ ایک مولوی مجھے ملا۔ اس کو میں نے کہا: میرا ارادہ ہے اس ملک میں کوئی ایسا ادارہ قائم کروں کہ جو لوگ وفاق سے فارغ ہوجاتے ہیں ان بے چاروں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا، ہم ان کو تخصص بھی کروائیں اور ان کو انگریزی، عربی میں ایم اے بھی کروائیں، تاکہ باہر کی دنیا کے لیے وہ داعی بن سکیں، اس کے لیے مجھے کوئی جگہ چاہیے، آپ کوئی مدد کریں۔ اس نے کہا: رات میں آپ کو جگہ دکھاؤں گا۔ رات کو وہ گاڑی لے کر آگیا اور مجھے جگہ دکھائی۔ میں نے اس سے پوچھا: یہ کس کا پلاٹ ہے؟ اس نے کہا: سرکاری پلاٹ پڑا ہوا تھا، ہم نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا: تمہیں مبارک ہو! اس نے کہا: انہوں نے اس مقصد کے لیے رکھا تھا، جب ٹاؤن بن رہے تھے تو اس میں کچھ پلاٹ رکھے جاتے ہیں، کچھ سنیوں کے لیے، کچھ شیعہ کے لیے اور کچھ فلاں کے لیے۔ مجھے موقع مل گیا میں نے چاردیواری دے کر حافظ بٹھا دیئے۔ دو سال سے میرا اس پر قبضہ ہے۔ کسی کے باپ کی طاقت ہے جو آکر خدا کے اس گھر کو گرائے!؟ میں نے کہا: مجھے تو قیمت سے چاہیے اگر کہیں مل جائے۔ اس نے کہا: آپ خرید نہیں سکتے، لاکھوں کروڑوں کی قیمت ہے۔ میں نے اس کو کہا: اگر ہم یہاں مسجد بنا لیں تو کیا نماز ہو جائے گی؟ کہنے لگے: بعد میں الاٹمنٹ کرالیں گے۔ میں نے کہا: جب تک الاٹمنٹ نہ ہو اس وقت تک نماز ہو جائے گی؟ کہنے لگے: یہ چھوٹے بچے رکھے ہوئے ہیں، ان پر نماز فرض ہی نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں ایک اور بھی بہت بری بات ہے۔ مثلاً: دو زمینداروں میں جائیداد کا جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: بھائی کو نہ دو اور مسجد بنادو۔ یہ بھی ناجائز ہے۔ جب بھی خدا کا گھر بنائیں تو خالص حلال سے بنائیں۔ اگر اس میں چار بھائی ہیں تو چاروں راضی ہوں۔ اگر اس میں کسی ایسے بچے کا حصہ ہو جو نابالغ ہے، جب تک وہ بالغ ہو کر اجازت نہ دے تب تک وہاں اللہ کا گھر نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانے میں مسجدیں کچی تھیں، لیکن ان میں مسلمان پکے تھے اور اب مسجدیں پکی بن گئیں، لیکن مسلمان کچے ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ کی اپنی مسجد کا یہ عالم تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: جب بارش برستی تھی بارش اندر آجاتی تھی۔ کیونکہ اوپر کھجور کی چھڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حضور اکرم ﷺ کی داڑھی مبارک میں بارش گر رہی ہے اور حضور اکرم ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور نیچے چھوٹی چھوٹی کنکریاں پڑی ہوئی تھیں۔ جو گرمیوں میں اتنی گرم ہو جاتی تھیں، ہم لوگ جب نماز میں آتے تو کنکریاں اٹھا کر کھڑے رہتے کہ جتنی دیر ہاتھ میں رہیں گی، ٹھنڈی رہیں گی، پھر ان کو گرا کر ان پر سجدہ کر لیتے تھے، لیکن جب سے ہماری مسجدیں پکی بن گئیں، ایئر کنڈیشنڈ بھی لگ گئے، بڑے خوبصورت پتھر بھی لگ گئے اور

اعلیٰ سے اعلیٰ قالین بھی بچھ گئے، لیکن ہمارے ایمان کچے ہو گئے۔

؎ مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی تھا برسوں سے نمازی بن نہ سکا

اس لیے خیرات کرو تو حلال مال سے کرو۔ اللہ تعالیٰ کا گھر بناؤ تو جتنا ٹکڑا ہو خالص حلال کا ہو۔ اس پر خالص حلال کے پیسے لگاؤ۔

﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۶۶]

''بھلا تم میں سے کسی کو یہ پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا، اس کے نیچے نہریں چلتی ہوں، اس شخص کے یہاں اس باغ میں اور بھی ہر قسم کے میوے ہوں۔ اور اس شخص پر بڑھاپا آ گیا ہو اور اس کے بچے چھوٹے ہوں۔ پھر اس باغ پر تیز آندھی چلے، جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جائے۔ اللہ اسی طرح سے تمہارے لیے نشانیاں بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور کرو۔''

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر انگور اور کھجور کی مثال دی ہے؛ کیونکہ مثال کا فائدہ اس وقت ہوتا ہے جب اگلا بندہ اس چیز کو جانتا بھی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن میں کسی جگہ اجمالی لفظ ہے ﴿فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ﴾ [الرحمن:۶۸] اس میں پھل بھی ہوں گے، کھجوریں بھی ہوں گی اور انار بھی ہوں گے۔ جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں خصوصیت سے نام لیا ہے، اس کے اندر حکمت ہے کہ اس پھل کے اندر باقی چیزوں کی بنسبت زیادہ منافع ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں فرمایا کہ ''جو لوگ میری ذات پر اور میرے ملائکہ پر ایمان لاتے ہیں'' تو فرشتوں کے اندر سارے فرشتے آ گئے، لیکن آگے کچھ فرشتوں کا نام لے لیا: ''جبرائیل اور مکائیل'' تو ان کے نام لینے سے ان کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا قرآن میں ذکر کیا ہے اجمالی طور پر۔ جتنے انبیاء گزرے ہیں سب برحق ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے اور ہم ان میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی پر

ایمان لے آئیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں، بلکہ ہمارا سب پر ایمان ہے۔ لیکن جن پچیس کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے ان کی فضیلت باقی پر زیادہ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خاص موقع پر پانچ پیغمبروں کا نام لیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ [الشوریٰ: ۱۳]

تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا؛ کیونکہ ''اولوالعزم من الرسل'' ہیں، ان کی بڑی شان اور عظمت ہے۔

کھجور اور انگور کے فوائد:

اس لیے علماء فرماتے ہیں: یہاں بھی نخیل اور اعناب کے ذکر کرنے میں بڑی حکمت ہے۔ کیونکہ ان کے اندر بڑے فوائد ہیں۔ کھجور کا کوئی ایک ذرہ ایسا نہیں ہے جو استعمال نہ ہوتا ہو، حالانکہ بعض درختوں کی لکڑی استعمال نہیں ہوتی، بعض چیزوں کی کھال استعمال نہیں ہوتی۔

اب جدید تحقیق یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی بارہ دانے کھجور کھالے اور پورے دن میں کوئی چیز نہ کھائے تو سارے وٹامن اس میں پورے ہوجاتے ہیں۔ اور کھجور ایک ایسا پھل ہے راستے میں جتنی رکاوٹیں آجائیں دھوپ پڑ جائے، سردی پڑ جائے، یہ اپنی حالت پر رہتی ہے، خراب نہیں ہوتی۔ علماء نے لکھا ہے کہ کھجور کا انسانوں کے ساتھ ایک تعلق ہے کہ جیسے بندے کا ایک ہاتھ کٹ جائے بندہ زندہ رہتا ہے، اگر اس کی ٹانگیں کاٹ دو تب بھی زندہ رہتا ہے، اس کے اعضاء و جوارح سارے زخمی کردو تب بھی زندہ رہتا ہے، لیکن اگر گردن کاٹ دو تو انسان زندہ نہیں رہتا۔ کھجور کی اوپر سے گردن کاٹ دو تو یہ بھی مرجاتی ہے۔ سارے درخت نیچے سے پانی لیتے ہیں، صرف کھجور ایک ایسا درخت ہے جو اوپر سے پانی لیتا ہے۔ بارش ہوئی اور اس کو جو پانی لگے گا وہی اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ فرماتے ہیں کہ ہمارے کئی کئی دن ایسے گزرتے تھے کہ ہر بندے کے لیے صرف ایک کھجور کا دانہ ہوتا تھا، اس کے ساتھ ہم اپنی زندگی گزار لیتے تھے۔ احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ کھانا کھانے سے قبل دو تین دانے کھجور کے استعمال کرلے، دس پندرہ منٹ کے بعد کھانا کھائے، خدا کی قدرت ہے یہ بھوک کو بڑھاتی بھی ہے۔

اسی طرح انگور کے بارے میں اطباء کی تحقیق ہے کہ آپ جو چیزیں کھاتے ہیں وہ دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہیں: یا تو اس کا خون بن جائے اور جو فضلہ بچے گا وہ پیشاب میں بدل جائے گا۔ انگور واحد پھل ہے کہ اس کا فضلہ نہیں بنتا اور دنیا میں کوئی ایسا پھل نہیں ہے جس کا فضلہ نہ بنتا ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں۔ اس لیے فرمایا: اگر تم میری نعمتوں کو شمار کرو شمار نہیں کر سکتے۔ انگور ایک ایسا پھل ہے کہ بوڑھے سے بوڑھا، بچے سے بچہ اور جوان ہر آدمی اس کو کھا سکتا ہے۔ چھوٹے بچے کو اگر آپ کوئی چیز دیں تو ڈر ہوتا ہے کہ اس کو موافق آئے یا نہ آئے، لیکن انگور کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ شوگر والے کو کہتے ہیں: کوئی میٹھی چیز مت کھاؤ، لیکن جدید تحقیقات ہیں کہ شہد اور کھجور کے اندر جو میٹھا ہے وہ اتنا نقصان دہ نہیں ہے جتنا براہِ راست میٹھا کھانے میں نقصان ہے۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾ [البقرة: ۲۶۷تا۲۶۹]

''اے ایمان والو! زکوٰۃ دو عمدہ مال سے جو تم کماؤ اور ان (دانوں اور پھلوں) میں سے بھی عمدہ چیز جس کو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیا ہے۔ اور ردی چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کر دو، حالانکہ تم خود اس کو لینے والے نہیں ہو، مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔ اور یہ یقین رکھو کہ اللہ محتاج نہیں، تعریف کے لائق ہے۔ شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی بخشش اور زیادہ دینے کا۔ اور اللہ وسعت والا، جاننے والا ہے۔ جس کو چاہتا ہے علم نافع دیتا ہے اور جس کو علم نافع مل جائے اس کو بڑی خیر مل گئی۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔''

حلال اور طیب میں فرق:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ کے اندر فرمایا ہے کہ میرے راستہ میں پاکیزہ چیز خرچ کرو، جو خالص حلال ہو۔

طیب سے مراد وہ مال ہے جو حلال بھی ہو اور پسندیدہ بھی ہو؛ کیونکہ لفظِ حلال کے اندر حلال چیزیں آتی ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر حلال ہر بندے کو پسند بھی ہو؛ کیونکہ بعض پھل اور سبزیاں اور گوشت ہیں جو ایک آدمی کو پسند ہیں اور دوسرے آدمی کو پسند نہیں ہیں، لیکن طیب کا معنی یہ ہوتا ہے کہ حلال بھی ہو اور پسندیدہ بھی ہو۔

جیسا کہ ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں، میرے پاس دو باغ ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم سارا خرچ نہ کرو۔ اس صحابی نے عرض کیا: میں اس میں سے ایک باغ اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے اجازت دے دی تو اس نے عرض کیا کہ حضور! جو مجھے سب سے زیادہ باغ پسند ہے، جس میں چھ سو درخت ہیں، ان کو میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں۔

خیرات کرنے کی چند شرائط:

خیرات کرنے میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ نیت خالص ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ چیز حلال ہو، حرام سے نہ ہو، رشوت، سود، جوئے اور دھوکہ سے حاصل کی ہوئی دولت نہ ہو۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی چیز آدمی حرام مال خرچ کرے اور اس پر ثواب کا یقین رکھے تو کافر ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آج کل بینک ہیں جن کا سودی کاروبار ہے۔ ان لوگوں نے اپنے عملہ اور عوام کو خوش رکھنے کے لیے اسکیمیں بنائی ہیں، قرعہ اندازی کریں اور جس کا نام نکل آئے گا اس کو حج پر بھیجیں گے۔ اور خالص سود اور حرام کے پیسوں سے حج پر بھیجیں گے۔

جدید مالیاتی سکیمیں:

یہودیت نے عالم انسانیت کو ان کی گردنوں کو اقتصادی طور پر اس طرح کس لیا ہے کہ اس سے کوئی نہیں نکل سکتا، مگر وہ جس کو اللہ تعالیٰ نکالے۔ انہوں نے اس طرح کی اسکیمیں بنائی ہیں جیسا کہ حج کے موقع پر لوگوں نے ٹریول چیک لیے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کو بڑا محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ اس پر سائن کر کے پیسے لے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیک گم ہو جائے تو دوسرا چیک مل جاتا ہے؛ کیونکہ اگر نوٹ گم ہو جائے تو کوئی نہیں دے گا۔

بظاہر اس کے اندر بڑا فائدہ ہے اور ہر بندے کو لالچ ہے کہ میں سفر پر جا رہا ہوں، میرا پیسہ محفوظ ہے، لیکن آپ کو پتہ نہیں ہوگا کہ جن لوگوں نے بیٹھ کر یہ اسکیم بنائی ہے ان کو سال میں کتنا بچتا ہے، آپ اس کے بارے میں نہیں

سوچ سکتے؛ کیونکہ وہ اس چیک کے سروس چارجز لیتے ہیں۔

دوسرا اگر کسی آدمی کو اس ٹریولر چیک کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دو سال، چار سال اس نے اس کو استعمال نہیں کیا وہ لاکھوں ڈالر بنے جو انہوں نے استعمال نہیں کیے، لیکن وہ لوگ جنہوں نے آپ سے پیسہ لیا ہوا ہے اس کو استعمال کر رہے ہیں۔

تیسرا اگر وہ آدمی جس کے نام ٹریولر چیک ہے وہ مر گیا ہے اور وہ چیک سفر میں رہ گیا، اس کی اولاد کو پہلے تو پتہ نہیں ہوتا اور اگر پتہ چل جائے تو اتنا لمبا پروسیجر ہے کہ تریاق آتے آتے بندہ مر جائے گا۔

اس کے علاوہ انہوں نے اب ایک اور راستہ نکال دیا کہ انہوں نے کارڈ بنا دیئے کہ یہ سلور کارڈ ہے، یہ گولڈن کارڈ ہے اور یہ ماسٹر کارڈ ہے، یہ جی ایم کارڈ ہے اور یہ ویزا کارڈ ہے۔ اس سے آپ کو چیک رکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بڑے سے بڑے سٹور میں جا کر سامان خریدیں، کارڈ دے دیں۔ وہ آپ کے کارڈ کو چیک کر کے اپنا بل اس بینک کو بھیج دیں گے۔ اس کارڈ پر فوٹو موجود ہے اور دستخط موجود ہیں، کوئی دوسرا آدمی اس کو استعمال نہیں کر سکتا۔ آپ کے پیسے اس طرح محفوظ ہو گئے اور آپ خوش ہو گئے۔

اور انہوں نے اس کے ساتھ ایک اور لالچ بھی دے دیا کہ آپ جو بھی شاپنگ کریں گے اور پیسے خرچ کریں گے اور آپ کے کارڈ کی ویلیو مثلاً: پچاس ہزار روپے ہے تو آپ وہ رقم تین مہینے کے اندر اندر بھیج سکتے ہیں۔ آدمی خوش ہو گیا کہ مجھے تین مہینے کا ادھار مل گیا۔ اور جس برانچ کے اندر آپ پیسے جمع کرا دیں، آپ کا حساب وہیں چلا جائے گا، لیکن ان کارڈوں کے بدلے میں ان کے پاس بلین ڈالرز بچے ہوئے ہیں کہ کارڈ والا مر گیا، لیکن ان کے پاس پیسہ جمع ہے اور وہ یہ سارا پیسہ اپنے دین کی اشاعت اور اسلام کو مٹانے میں خرچ کرتے ہیں۔ مثلاً: دیہات میں ڈسپنسری لگا کر لوگوں کو کہا کہ ہم عیسائی ہیں، لیکن مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں، حالانکہ وہ اپنے مذہب کی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ اگر انسانیت کی خدمت ہوتی تو بوسنیا کے اندر لاکھوں مسلمانوں کو کیوں مروا ڈالا؟ وہاں انسانیت کی خدمت کیوں بھول جاتی ہے؟

ہمارے اپنے ملکوں کے اندر انہوں نے مشنری سکول کھول دیئے ہیں۔ پہلی سے لے کر ایف اے اور بی اے تک بچے پڑھ رہے ہیں۔ جب بچہ سکول میں جاتا ہے تو اس کی وردی علیحدہ ہے اور صلیب کا نشان سامنے ہے۔ صبح جو سب سے پہلے اپنا ترانہ پڑھاتے ہیں کہ اس کے اندر عیسائیت کا بھرا ہوا زہر ہے کہ جب بچہ دس سال کے بعد

ان کے سکول سے نکلے تو وہ عیسائی تو نہیں ہوتا، لیکن وہ عیسائیت کا پچاس فیصد زہر اپنے اندر لے چکا ہوتا ہے۔ ظاہراً وہ کہے گا کہ میں مسلمان ہوں، عیسائی نہیں ہوں، لیکن ہر وہ کام کرے گا جو عیسائی کرتے ہیں۔ اور ہم خوش ہیں کہ کتنے اچھے لوگ ہیں ان کو کتنی انسانی ہمدردی ہے؟ ورنہ ان کو کیا ضرورت تھی کہ ہمارے بچوں کو تعلیم دیتے۔

ہمیشہ یاد رکھیں کہ جتنے سودی کاروبار ہیں، یہ ہماری فلاح کے لیے نہیں ہیں، بلکہ ہماری بربادیوں کے لیے ہیں؛ کیونکہ اوپر بیٹھے ہوئے سارے مال کی کریم کھا رہے ہیں اور بچا کھچا کبھی اس کو مل گیا اور کبھی اس کو مل گیا۔

اب بینک خیرات کرے، وہ حلال نہیں ہے۔ اب تو...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... دینی مسائل پر اتنی بے حسی ہوگئی ہے کہ کوئی بات کرنے پر بھی تیار نہیں ہے اور کہہ دیتے ہیں کہ وہ سود حرام ہے جو حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تھا، جیسے مہاجن سود لیتا تھا، ہندو سود لیتا تھا۔ وہ کہتے ہیں: بینک کا تو سود نہیں ہے، بلکہ خالص حلال ہے؛ کیونکہ بینک والے جو رقم کاٹتے ہیں وہ سروس کی مد میں کاٹتے ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ......

پاکیزہ کو پاکیزہ چاہتا ہے:

﴿وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪﴾ (اور جو کچھ ہم نے زمین سے نکالا)۔ اس سے اشارہ فرمایا کہ اگر میں وہ زمین سے نہ نکالوں تو کون نکالے گا؟ اور اگر تیری فصل برباد کر دوں تو کہاں سے فصل اگائے گا؟ اگر میں زمین کے اندر بیج جلا ڈالوں اور کوئی چیز باہر نہ نکلے تو کون نکال سکتا ہے؟ تو جو میں نے زمین سے اگایا ہے اس کو میرے راستے پر خرچ کرو۔ پہلے طیب کو ذکر کر کے خبیث کو ذکر فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ عورتوں اور بدکردار عورتوں کو انہی لفظوں کے ساتھ ذکر کیا: ﴿وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ﴾ [النور: ۲۶] پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں کہ جن عورتوں کو کبھی کسی نے ہاتھ نہیں لگایا وہ ان مردوں کے لیے ہیں جنہوں نے کبھی حرام کی نظر کسی غیر عورت پر نہیں ڈالی۔ اور آگے فرمایا: بدکردار عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں۔ اور یہ حالات کے اعتبار سے الٹ بھی ہو جاتا ہے۔ کئی صالحین شب بیدار ہیں، لیکن گھر میں بے حیاء عورت آگئی اور کئی عورتیں بڑی دیندار تہجد گزار ہیں، لیکن جہاں رشتہ ہوا وہ مرد خبیث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے، اس لیے کہ ان کی خواہش ایسے ہوتی ہے کہ پاکباز پاکباز کو چاہتا ہے، خبیث خبیث کو چاہتا ہے۔ سب سے پاک ذات اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو جب اللہ تعالیٰ پاک ہے تو میں تیرا پلید کیسے قبول کروں؟

مثال:

مثال مشہور ہے کہ کسی کا بکری کا بچہ گم ہوا۔ کوئی پکڑ کر مولوی صاحب کے پاس لے آیا اور کہا کہ یہ راستے میں مجھے مل گیا ہے۔ میں نے کہا: اس کو کوئی درندہ کھا جائے گا، اس سے تو بہتر ہے کہ کسی مسلمان کے پیٹ میں چلا جائے۔ مولوی صاحب نے کہا: ہم تو نہیں لیتے ہیں، کیونکہ کوئی پتہ نہیں کس کا ہے؟ ساتھ کوئی پولیس والا (مہربان) بھی بیٹھا تھا، اس نے کہا: مولوی صاحب! آپ نے اچھا کیا۔ آپ مجھے دے دیں۔ اگر آپ لیں گے تو یہ آپ کو تنگ کرے گا۔ مولوی صاحب کو سمجھ نہ آئی تو اس نے پوچھا: کیسے تنگ کرے گا؟ اس نے کہا: جب آپ اس کو پیٹ میں بھیج دیں گے تو آگے کچھ نہیں ہے۔ یہ اکیلا باں باں کرتا پھرے گا اور ادھر تو ریوڑ کھڑے ہیں۔ ادھر آئے گا تو ان کے ساتھ مل جائے گا۔

صدقات میں عمدہ چیز خرچ کرو:

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے راستے میں پلید چیزوں کو خرچ کرنے کا ارادہ بھی نہ کرو۔ تم میرے راستے کے اندر گندی چیز کرتے ہو، ذرا غور کرو کہ تمہیں اگر کوئی گندی چیز دے تو کیا تم قبول کرتے ہو؟ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ چشم پوشی کر کے لے لے، ورنہ تم اپنے لیے گندی چیزیں نہیں لیتے ہو اور خدا کے لیے گندی چیزیں دیتے ہو۔ فرمایا: اگر میرے راستے کے اندر خرچ کرنا ہے تو خالص میرے لیے اور حلال ہو۔ اور جتنا وہ تیرا محبوب ہوگا اتنا بڑا تجھے انعام ملے گا، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب سے زیادہ پیار اپنے بیٹے سے تھا۔ ان کو ہر وقت اٹھاتے تھے، جہاں جاتے بیٹا ساتھ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری محبت کے دعوے کرتے ہو اور دوسرے کو محبوب بناتے ہو، یہ میری غیرت گوارہ نہیں کرتی۔ بچے کو لے جا کر بیابان میں چھوڑ دو اور واپس آ جاؤ، ملنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اپنی اولاد سے محبت کرنا منع نہیں ہے، وہ تو مرغوب ہے...... ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ کی گود میں بچوں کو دیکھا تو کہا: میرے دس بچے ہیں، لیکن مجھے یاد نہیں کوئی میری گود میں بیٹھا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ معاف کرے اور دل کو نرم کرے...... پھر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم دے دیا کہ میرے راستے میں اس بچے کو ذبح کر دو۔ جب یہ امتحان انتہاء کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دے دیا کہ تم امتحان میں کامیاب ہو گئے، اللہ تعالیٰ کے راستے میں اللہ کے خلیل نے اپنا خلیل دیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہمیں تمہاری قربانی اتنی پسند آئی ہے کہ

ہم قیامت تک تمہاری اس قربانی کو زندہ و جاوید بنادیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں محبوب چیز دینے کا صلہ ہے کہ آج ہزاروں سال گزر گئے قربانی زندہ اور باقی ہے۔

بعض آدمی صدقہ کرتے ہیں اور بعض آدمی صدقہ نہیں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اگلی آیت میں بیان فرمائی ہے کہ شیطان تمہیں ڈراتا ہے کہ بے وقوف آدمی! بڑی مشکل سے ایک ماہ بعد تجھے یہ تنخواہ ملی ہے، اس کے اندر سے دوسو تو نے دیا تو سال میں چوبیس سو یہ چلا گیا۔ تم خوامخواہ ان مولویوں کی چکر میں پڑ گئے ہو، یہ تمہیں بھوکا کرنا چاہتے ہیں اور اپنی جیبیں بھرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح تم بھوکے مرو گے، اس دوسو کو خرچ کرنے کی بجائے ہزاروں ریال تم بینک میں ڈال دو تو سال بعد تمہیں سات سو ریال اوپر ملیں گے۔ خیرات کے اندر تمہارا نقصان ہو رہا ہے اور سود کے اندر تمہارا پیسہ بڑھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر وہ شیطان تمہیں برائیوں کا حکم دیتا ہے کہ تم نے ایک غریب آدمی کو اتنے پیسے دے دیئے، لیکن تمہیں کیا ملا ہے؟ زیادہ سے زیادہ کوئی یہ کہہ دے گا کہ قیامت والے دن اجر ملے گا، پتہ نہیں کب موت آئے گی؟ اور کب قیامت آئے گی؟ پتہ نہیں اٹھیں گے یا نہیں اٹھیں گے؟ اور پھر شیطان کہتا ہے کہ تم اس طرح کرو کہ ایک سو ریال کی شراب خریدو اور ایک سو کا شباب خریدو اور ساری رات مزہ لو۔ لیکن اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرماتے ہیں کہ جب تم میرے راستے میں خرچ کرو گے تو میں تیرے گناہ معاف کر دوں گا، میں تمہاری بلائیں ٹال دوں گا، میں تمہاری مصیبتیں دور کر دوں گا، میں تمہاری بیماریاں رفع کر دوں گا۔ تم تو سوچ رہے ہو کہ ایک ہزار ریال میں سے دوسو خیرات کی تو آٹھ سو بچ جائیں گے۔ اگر میں تیرے اوپر بیماریاں مسلط کروں، تیرے بیس ہزار بیماری پر لگ جائیں تو پھر کیا کرو گے؟ اس کے علاوہ تم برائی کے اندر پڑو گے اور جبکہ میں مغفرت کا وعدہ کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اور زیادہ دوں گا۔ اور میں بڑے فضل والا اور علیم ہوں کہ تم جہاں بھی خیرات کرو گے، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

اس سے اندازہ کریں کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا اس نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کا اعتبار کیا اور جو خرچ نہیں کرتے انہوں نے شیطان کی بات مانی ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ تم رحمانی ٹولے میں شامل ہو جاؤ یا شیطانی ٹولہ میں شامل ہو جاؤ۔

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝﴾

[البقرة:٢٥٩]

حکمت کا معنی ہوتا ہے: گہرائی سے بات کو سمجھنا۔ اللہ کے فرامین میں اور شیطان کے وساوس میں فرق کر کے حق تک پہنچنے کا نام ''حکمت'' ہے۔ جس کو حکمت ملتی ہے اس کو سب سے بڑی بھلائی مل گئی۔ میرے قرآن اور میرے فرمان سے عقل والے نصیحت پکڑتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنی عقل شراب و کباب میں ضائع کر دی ہے وہ شیطان کی ذریت بن گئے ہیں اور ان کو میرا قرآن سمجھ نہیں آسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان والے بندوں کو انفاق کا حکم فرمایا ہے۔ انفاق سے مراد صدقہ ہے؛ کیونکہ انفاق: نفقہ، اپنے والدین اور بیوی بچوں پر خرچ کرنے کو بھی شامل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ سے مراد وہ پاکیزہ مال ہے جس کو تم نے حاصل کیا ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے جو تمہارے لیے تجارت آسان کر دی ہے، یہ بھی میں نے تمہیں علم دیا اور آسانیاں پیدا کیں۔ میں نے سمندر کے اندر کشتیوں کے انتظام کیے، اس لیے تم میرے راستے میں خیرات کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو میں نے سونا اور چاندی تمہیں دیا ہے اس میں سے صدقہ ادا کرو اور جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین سے پھل اور سبزیاں نکالی ہیں سب سے صدقہ خیرات کرو۔

اللہ تعالیٰ رزق سب کو دیتے ہیں، ایمان نہیں:

حدیث: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللهَ قَسَمَ بَيْنَكُمْ أَخْلَاقَكُمْ كَمَا قَسَمَ بَيْنَكُمْ أَرْزَاقَكُمْ وَإِنَّ اللهَ يُعْطِي الدُّنْيَا مَنْ يُحِبُّ وَمَنْ لَا يُحِبُّ إِلَّا يُعْطِي الْإِيمَانَ إِلَّا مَنْ يُحِبُّ فَإِنْ ضَنَّ أَحَدُكُمْ بِالْمَالِ أَنْ يُنْفِقَهُ وَهَابَ اللَّيْلَ أَنْ يُكَابِدَهُ وَخَافَ الْعَدُوَّ أَنْ يُجَاهِدُوْا فَلْيُكْثِرْ مِنْ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ وَ سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللهُ أَكْبَرُ")) [مسند احمد بن حنبل: ۱/ ۳۸۷، مجمع الزوائد: ۱۰/ ۹۰]

اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان اخلاق کو تقسیم کیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان رزق تقسیم کیا۔ اللہ تعالیٰ

دنیا، دولت اور پیسہ اس کو بھی دیتے ہیں جس کو محبوب رکھتے ہیں اور اس کو بھی دیتے ہیں جس کو محبوب نہیں رکھتے۔یعنی دولتِ دنیا کافر کو بھی ملتی ہے اور مسلمان کو بھی ملتی ہے۔صالح کو بھی ملتی ہے اور طالح کو بھی ملتی ہے۔اچھے کو بھی ملتی ہے اور برے کو بھی ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنا دین کس کو دیتے ہیں؟

اور اللہ اپنا دین نہیں دیتے، مگر اس کو جس کو محبوب رکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ جس کو دین عطا فرماتے ہیں تو گویا اللہ پاک نے اس کو محبوب رکھ لیا ہے۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری زندگی ہے! مسلمان بندہ نہیں بن سکتا جب تک اس کا دل اور زبان مسلمان نہ بنے اور بندہ مسلمان نہیں بن سکتا جب تک اس کا ہمسایہ اس کے ظلم سے محفوظ نہ ہوجائے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: بوائقہ کا کیا معنی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو اپنے ہمسایہ کے ساتھ دھوکہ کرے یا ظلم کرے تو سمجھے میرا ایمان کامل نہیں ہے۔کوئی بندہ حرام مال کمانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے اور یہ سمجھے کہ اس میں برکت بھی ہوگی اور کوئی صدقہ ایسا نہیں ہوتا جو یہ سمجھے کہ حرام کا قبول بھی ہوجائے گا اور نہ کوئی حرام مال اپنے بچوں کے لیے چھوڑ کر جائے، مگر یہ سمجھے کہ میں نے جہنم کے اسباب پیدا کردیئے ہیں۔اللہ تعالیٰ کبھی حرام مال کو قبول بھی نہیں فرماتے۔اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک ریال حلال کا دیا ہے وہ خیرات کرو۔یہ ضروری نہیں کہ تم ایک لاکھ یا ایک ہزار خرچ کرو۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: تیرے دروازے پر کوئی خیرات مانگنے والی عورت آجائے تو چاہے کھجور کا آدھا حصہ بھی ہو دے دیا کرو۔اللہ تعالیٰ اس سے بھی تم کو جہنم سے دور کردیں گے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی شرط یہ ہے کہ مال حلال ہو اور اچھے سے اچھا ہو۔

ایک مدرسہ کے مہتمم کی اعلیٰ ظرفی:

ہمارے ایک دوست نے دین کا مدرسہ بنایا، ان کا نام نہیں بتاتا؛ کیونکہ ریا ہوجائے گی۔وہ رمضان المبارک میں آئے اور ان کا ارادہ ہوا کہ اپنے طلباء کے لیے رومال بھیجیں، آگے عید آرہی ہے۔جو بچے مدرسے میں رہتے ہیں ان کو بھی ایک ایک رومال اور ایک ایک ٹوپی ہدیہ دیں گے، وہ خوش ہوجائیں گے۔ہم نے دکاندار کے پاس جاکر رومال دیکھے، اس نے کہا: ایک رومال دس ریال کا، ایک پندرہ ریال کا اور ایک بیس ریال کا ہے۔دوست نے مجھ

سے پوچھا: جو آپ نے پہنا ہوا ہے یہ کتنے کا ملتا ہے؟ میں نے کہا: حضرت! ایسا رومال بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو مہنگا ہے۔ کہنے لگے: نہیں! ہم پہنیں تو اچھا اور طالب پہنیں تو کیوں برا ہے؟ اگر ہم نے عید پر اپنے بیٹوں کے لیے اچھا خریدنا ہے تو وہی طالبوں کے لیے خریدیں۔ آخر وہ بھی کسی کے بچے ہیں۔

یہ جذبہ قابلِ قدر ہے کہ آدمی جو اپنے لیے پسند کرے وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے بھی پسند کرے۔

(بقیہ حدیث) اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ساتھ نہیں مٹاتے، بلکہ اللہ تعالیٰ برائی کو نیکی سے مٹاتے ہیں۔ (پلید کپڑا پاک پانی سے پاک ہوگا، پلید پانی سے پاک نہیں ہوگا) جو گندی چیز ہے وہ کبھی گندی چیز کو نہیں مٹاتی، بلکہ جب تم نیکی کا کام کرتے ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہاری برائیوں کو مٹا دیتے ہیں۔

موافاتِ مدینہ:

حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیت اس سبب میں اتری کہ مدینہ منورہ میں انصاریوں کے باغ تھے۔ جب کھجور کے کٹنے کا وقت آتا تو انصار پورا پورا گوشہ کاٹ کر مسجد رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں اصحابِ صفہ کے لیے لے آتے اور اس کو لٹکا دیتے تھے۔ اس گوشہ میں کوئی بسر ہوتی، کوئی تمر ہوتی، اچھا اچھا لیتے رہے۔ اور بعض آدمی اس طرح کرتے کہ اس کو اچھوں میں شامل کر دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اپنے لیے اچھی کھجوریں پسند کرتے ہو اور خیرات کرنے کے لیے لوگوں کو گندی کھجوریں دیتے ہو۔ اللہ تعالیٰ پاک ہیں، وہ پاک چیز کے علاوہ کسی چیز کو پسند نہیں فرماتے ہیں۔

پہلے دور کے اندر یہ جذبہ ہوتا تھا کہ جب مہاجرین مدینہ منورہ میں آگئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار و مہاجرین کو بلا لیا۔ اور انصار کو فرمایا: یہ تمہارے بھائی ہیں، جو گھر بار سب کچھ چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے راستے میں آگئے اور تم یہاں گھر والے اور اہل والے ہو۔ اب میں یہ کرتا ہوں کہ ایک انصاری اور ایک مہاجر کو بھائی بناتا ہوں۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ منورہ جانے کے بعد پہلا قدم تھا۔

ویسے اگر آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے کہ مہاجرین کو بھی عطا فرما تو قبول ہو جاتی، لیکن آپ نے یہ سبق دیا کہ جب تک مہاجر اور اور انصار بھائی نہیں بنیں گے اس وقت تک دنیا امن میں نہیں رہ سکتی۔ جب تمہارے اندر قبائلیت، قومیت اور عصبیت پیدا ہو جائے گی اس دن تباہی کے دروازے کھل جائیں گے۔ جب ایک آدمی نے کلمہ پڑھ لیا، چاہے وہ کسی قوم کا ہے، سب اللہ تعالیٰ کی نظر میں برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی شان زیادہ ہے

جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔ آج چودہ سو سال کے بعد وہی نفرتیں، کدورتیں اور عصبیتیں جب سے ابھاری گئی ہیں قتل عام ہے اور مسلمانوں کو کہیں چین نہیں ملتا ہے۔

انصار نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! بے شک آپ ان کو ہمارا بھائی بنائیں۔ جب سب بھائی بن گئے اور انصار جب مہاجرین کو لے کر اپنے گھروں میں گئے تو انہوں نے کہا: ایک بھائی ہوتا ہے جو ایک ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، اس بھائی میں تو شبہ ہو سکتا ہے، لیکن تمہیں ہمارا بھائی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے بنایا ہے، تمہارے بھائی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ ہمارا باغ ہے: آدھا تمہارا اور آدھا ہمارا ہے۔ یہ ہمارے گھر کے دو کمرے ہیں: ایک کمرہ تمہارا ہے اور ایک کمرہ ہمارا ہے۔ دو اونٹ ہیں: ایک اونٹ تمہارا اور ایک اونٹ ہمارا ہے، حتیٰ کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ بھی کر دیا کہ میری دو بیویاں ہیں: تمہاری نہیں ہے، میں فلاں کو طلاق دے دیتا ہوں، عدت کے بعد تم شادی کر لو۔

مہاجرین نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: انصار نے ایسی قربانی دی جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ وہ تو ہمارا ثواب بھی لے کر جنت میں چلے جائیں گے، ہم ان کا حصہ نہیں لیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارا ثواب نہیں لے جائیں گے، تم ان کے لیے دعا کرتے رہو، برکتیں مانگتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری دعاؤں سے ان کو بدلہ عطا فرمائیں گے اور تمہاری نیکی میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کے راستے میں چاہے تھوڑا خرچ کرو، لیکن خالص حلال سے خرچ کرو۔ اس کی جو برکت ہوتی ہے اس کا دنیا میں کوئی شے مقابلہ نہیں کر سکتی۔

پرانے اکابر کا مقام:

جب تک والدین اپنے بچوں کو حلال کھلاتے تھے، مائیں وضو کر کے دودھ پلاتی تھیں، مدرسہ میں خالص حلال کی روٹی پکتی تھی تو امام بخاری، امام ترمذی، امام مسلم، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن القیم رحمہم اللہ پیدا ہوئے۔ جس دن سے ہمارے اندر آرام آ گیا تو ویسا ایک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اب مدرسوں میں ایسے طالب علم ہوتے ہیں جو کہتے ہیں: ہمیں الماری چاہیے، پلنگ چاہیے، اس پر بیڈ چاہیے، ہر ہفتہ میں دو دفعہ یا تین دفعہ اس کی چادر اور سرہانے تبدیل ہونے چاہئیں، ورنہ ان سے ہمیں بدبو آتی ہے۔ جبکہ پہلے دور میں سرہانہ اینٹ ہوتی تھی اور اوپر چادر اوڑھ کر سو گئے۔ جب سردیاں ہوتیں تو چٹائیوں کے

اندر لیٹ جاتے تھے یا جنگل سے لکڑیاں لاتے تھے اور کمرے کا دروازہ بند کر کے لکڑیاں جلاتے تھے کہ کمرہ گرم ہو جائے گا تو آرام سے سو سکیں۔

شیخ گمانی رحمہ اللہ کا مقام:

حضرت شیخ حبیب اللہ گمانی رحمہ اللہ نے مجھے ایک دفعہ حکم دیا کہ ہمارے مدرسہ کا جلسہ ہے اور تم نے تقریر کرنی ہے۔ کہنے لگے: آپ بڑے آدمی ہیں۔ میں نے کہا: حضرت! آپ کا حکم ہے، ہم پہنچ جائیں گے۔ خدا کی شان ہے! استاد کی بات میں حکمت ہوتی ہے۔ بہر حال مجھے اس جلسہ کی تاریخ بھول گئی تو میں ان کے مدرسہ سے تقریباً تیس میل دور بیٹھا تھا۔ عصر کے بعد یاد آیا تو میں نے سوچا آج جلسے کا آخری دن ہے۔ اگر نہ پہنچا تو ساری زندگی ناراض ہو جائیں گے۔ میں بڑا گھبرایا کہ سواری بھی میرے پاس نہیں ہے۔ ساتھ ایک تھانہ تھا، میں نے نام پوچھا۔ انہوں نے نام بتایا۔ میں نے سوچا چلو اس نے نام تو سنا ہوگا۔ بہر حال اس تھانے دار نے بڑی عزت اور احترام کیا۔ میں نے ان سے کہا: میرا یہ مسئلہ ہے۔ آپ مجھے مہربانی کر کے کسی ٹرک میں بٹھا دیں؛ کیونکہ استادوں کا مدرسہ سڑک کے اوپر تھا۔ انہوں نے کہا: کوئی مسئلہ نہیں، میں خود کھڑا ہوتا ہوں اور آپ کو چڑھاتا ہوں۔ وہ روڈ پر آ گیا اور ٹرک روکا۔ اس کے سارے کاغذات لے کر اپنے پاس رکھ لیے اور اس کو رسید دی۔ میں نے کہا: اس طرح کیوں کیا؟ انہوں نے کہا: اگر یہ آپ کو دس پندرہ میل کے بعد اتار دیں تو ہم کیا کریں گے؟ اس لیے اس کے کاغذات رکھے ہیں۔ یہ آپ کا خط لائے گا تو یہ کاغذات لے جائے گا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی۔ رات کو گیارہ بجے میں پہنچ گیا اور ساڑھے بارہ بجے میں نے تقریر کی اور جلسہ ختم ہو گیا۔ استاد خوش ہو گئے اور فرمایا: مولوی کی! تم نے گھر سونا ہے؛ کیونکہ ادھر جگہ نہیں ہے۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ کہنے لگے: ایک بستر ہے، میں مسجد چلا جاتا ہوں اور تم ادھر سو جاؤ۔ میں نے کہا: حضرت! مجھے بھی مسجد میں رات گزارنی آتی ہے۔ مجھے فرمانے لگے: آپ تھک گئے ہیں، آپ سو جائیں۔ حضرت کا بستر یہ تھا کہ پرانی سی گدی، پرانا سا لحاف اور پرانا سا سرہانہ تھا۔ یہ اس شیخ کا بستر تھا۔...... میرے خیال میں پورے ملک میں ان کے برابر کا ایک عالم بھی نہیں ہے۔ حضرت کشمیری رحمہ اللہ کے خصوصی شاگرد تھے، حضرت حسین علی رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے۔ والد صاحب فرماتے تھے جس نے چلتا پھرتا علم کا مکان دیکھنا ہو اس کو دیکھ لو...... مجھے اس بستر پر کہاں نیند آنی تھی۔ استاد کے حکم پر کچھ دیر لیٹا، پھر باہر آ کر نوکر کو آگ جلانے کا کہا اور میں آگ کے قریب بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹہ بعد حضرت آئے اور فرمایا: ماشاء اللہ آپ تہجد کے لیے

اٹھ گئے ہیں! میں آپ کو اٹھانے آیا تھا۔ میں نے کہا: حضرت! یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

صدقہ میں اچھی چیز دو:

ابن ابی حاتم نے روایت نقل فرمائی کہ حضور اکرم ﷺ نے دو قسم کی کھجوروں کے بارے میں فرمایا کہ یہ صدقہ میں قبول نہیں کی جائے گی اور یہ نہ دیا کرو؛ کیونکہ ردی قسم کی کھجوروں کو اللہ کے راستے میں صدقہ خیرات کرنا مناسب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اس آیت: ﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ﴾ [البقرۃ: ۲۶۷] کا ترجمہ فرمایا کہ مسلمان کی کمائی پلید نہیں ہوسکتی، بلکہ حلال ہوگی، لیکن اس کے اندر کھوٹی چیزیں اور نہ چلنے والے پیسے تم نکال کر نہ دو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اچھی چیزیں نکال کر خیرات میں دو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور اکرم ﷺ کے سامنے کھانے کے لیے گوہ لائی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں اس کو پسند نہیں کرتا، میں اس کو نہیں کھاتا۔ گھر والوں نے کہا کہ اسے مسکینوں کو دے دیں؟ فرمایا: جو تم خود کھانے کے لیے پسند نہیں کر رہے تو مسکینوں کو کیوں دیتے ہو؟ ان کو بھی وہ چیز دو جو خود پسند کرتے ہو۔

دوسری حدیث مبارک ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے اس سے کراہت آتی ہے، لیکن جنہوں نے کھائی ان کو آپ نے منع نہ فرمایا، لہٰذا وہ حرام تو نہیں ہے۔ بہر صورت بعض ائمہ اس کی کراہت کے قائل ہیں اور بعض ائمہ اس کی کراہت کے قائل نہیں ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: اگر ایک آدمی کا کسی پر قرضہ ہو تو وہ قرضہ میں ناقص چیز کو قبول نہیں کرتا۔ تم اپنے قرضہ میں ناقص چیز کو قبول نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے لیے ناقص چیز دیتے ہو!؟

صدقہ کا ثواب تمہیں ہی لوٹتا ہے:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾ [البقرۃ: ۲۶۷] اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے جو فرمایا ہے کہ تم پاکیزہ چیزیں خیرات کرو۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے، میں غنی ہوں، ساری مخلوق میری محتاج ہے۔ اس کا فائدہ تمہیں ہونا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: جو تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربانی کرتے ہو اللہ کو نہ اس کے گوشت کی ضرورت ہے اور نہ اس کے

خون کی ضرورت ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ تو یہ دیکھتے ہیں کہ بندے نے میرے حکم کی تعمیل کر کے اپنی پیاری چیز قربان کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا فضل والا ہے، اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ حمید بمعنی محمود ہے کہ اس کے تمام اقوال واحکام پسندیدہ اور محمود ہیں۔ کوئی رب نہیں، مگر اللہ ساری دنیا اللہ کے دروازے کی محتاج ہے۔ وہ چاہے تو بغیر اسباب کے بھی دے، وہ چاہے تو زمین سے پانی کی بجائے سونا نکل آئے، وہ چاہے تو پتھروں سے سونا، چاندی، تیل اور دیگر نعمتیں دے دے۔ اور اگر لینا چاہے تو سب کچھ دے کر چھین لے۔ اس کی مرضی ہے۔ وہ تو غنی ہے، تم اس کے راستے میں دو گے تو اس کا فائدہ اور بدلہ تمہیں ملے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بندے کے ساتھ شیطان بھی ہے اور فرشتہ بھی ہے۔ شیطان بندے کو وسوسہ ڈالتا ہے، اس کے دماغ میں برائی ڈالتا ہے کہ خیرات کرو گے تو پیسے ختم ہو جائیں گے، تیرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔ اور اللہ کا فرشتہ بندے کے دل میں ڈالتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلو، اللہ تمہیں برکتیں عطا فرمائیں گے اور تمہیں دنیا وآخرت میں بدلہ عطا فرمائیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر دل میں اچھے خیالات پیدا ہوں اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا جذبہ پیدا ہو تو سمجھ لو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس فرشتے کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اللہ نے مجھے توفیق بخشی ہے۔ اور گر دل میں خیال آئے کہ خرچ نہیں کرنا چاہیے، صدقہ نہیں کرنا چاہیے تو یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اس وقت ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' پڑھو، اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑو۔

نیک لوگوں پر اعتراض:

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اعتراض بھی وہی لوگ کرتے ہیں جو کبھی خیرات نہیں کرتے ہیں کہ یہ مدرسہ والے کھائیں گے۔ مولوی پیسہ کھا رہے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ تم نے کتنا دیا ہے؟ تو کہے گا میں نے تو کبھی نہیں دیا۔ اور کہیں گے: تبلیغی جماعت والے کھا گئے؟ پوچھا جائے: تم نے کبھی ان پر خرچ کیا؟ تو کہے گا: دیا تو نہیں ہے، لیکن یہ کہاں سے کھاتے ہیں؟ کبھی اس ملک میں جا رہے ہیں اور کبھی اس ملک میں جا رہے ہیں۔ تو لازمی بات ہے کہ کہیں سے ان کو ملتا ہے۔ اور اعتراض کرنے والا وہ ہوتا ہے جس نے کبھی دین پر ایک دھیلا بھی نہیں لگایا ہوتا۔ جو لگائے گا وہ اعتراض کیوں کرے گا؟

حکمت کا معنی:

﴿یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ﴾ حضرت مجاہد فرماتے ہیں: حکمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحیح بات کرنے کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں حکمت سے مراد نبوت تو نہیں، لیکن مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں، قرآن وحدیث کی سمجھ عطا فرمادیتے ہیں۔ حضرت ابوالعالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حکمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خشیت اور ڈر عطا فرمادیتے ہیں۔ جب دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت آگئی تو سب چیز آگئی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حکمت کی اصل واصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو جائے۔ حضرت امام مالک: فرماتے ہیں میرے دل میں آتا ہے کہ حکمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی سمجھ پیدا ہو جائے اور ایسا امر اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے دلوں میں ڈالتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آپ نے بعض لوگوں کی دیکھا ہوگا جو دنیا کے معاملہ میں بڑے عقل منداور سمجھ دار ہوتے ہیں، کروڑوں کا حساب منٹ کے اندر کر کے دے دیں گے اور بڑی دور کی سوچیں گے کہ اس میں فائدہ ہے یا نقصان ہے؟ لیکن جب دین کی بات کرو تو کچھ بھی نہیں جانتے، نماز کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ اوران کے مقابلہ پر ایک آدمی ایسا ہوتا ہے کہ اس کو دنیاوی امور کا پتہ نہیں چلتا، اس سے اگر حساب کرالو تو ایک ہزار کے پیسے بھی نہ گن سکے، لیکن جب اس سے دین کی بات پوچھتے ہیں تو بڑی اچھی طرح بتا دیتا ہے۔

اس لیے اصل حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دین کی سمجھ عطا فرمادے۔ جن لوگوں کو قرآن وحدیث کی سمجھ مل گئی وہ غنی لوگ ہیں۔ دنیا و دولت تو ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ ہم نے اپنے مشائخ اور اساتذہ میں دیکھا ہے کہ ان کو دنیا کے معاملہ کو پتہ نہیں ہوتا تھا۔

حضرت مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کے بیٹے اس وقت چودہ پندرہ سال کی عمر کے تھے۔ حضرت نے ایک دن شاگرد سے کہا: سائیکل لے جاؤ اور بازار سے سبزی لے آؤ۔ وہ جا کر لے آیا تو حضرت نے اس سے پوچھا کہ تیل کتنے کا ڈلوایا تھا؟ شاگرد نے کہا: حضرت! اس میں تو تیل نہیں ڈالا جاتا۔ یہ تو پاؤں سے چلتا ہے۔ بہرحال اس شاگرد نے استاد کے سامنے سائیکل کھڑا کیا اور ہاتھوں سے اس کو چلا کر دکھایا کہ اس طرح بیٹھ کر یہاں پاؤں لگاتے

ہیں، یہ پاؤں سے چلتا ہے، تیل موٹر سائیکل میں ڈالا جاتا ہے۔ فرمانے لگے: کمال ہے ہمارا لڑکا تو اتنا عرصہ سے ہم سے تیل کے بھی پیسے لیتا ہے۔ جب ان کے پاس بیٹا آیا تو غصہ میں تھے، تم نے ہم سے دھوکہ کیا۔ آخر وہ بھی مولوی کا بیٹا تھا۔ اس نے سوچا ایک تو ابا جان غصہ میں ہیں، دوسرا روز کے پانچ روپے بھی گئے۔ وہ جا کر سائیکل کی گدی اتار کر لے آیا اور کہا: اس میں سوراخ کیوں ہے؟ آپ مجھے بتائیں! کہنے لگے: اس کمبخت کو پتہ نہیں تھا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

آپ ان کی دین کی کتابیں پڑھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے، لیکن سادگی کا یہ عالم تھا۔

مولانا رسول خان صاحب کا واقعہ:

حضرت مولانا رسول خان صاحب رحمہ اللہ جو استاذ الکل تھے، ان کے زمانہ میں ان کے مقابلے کا کوئی عالم نہیں گزرا، جس کے وہ استاد نہ ہوں، پٹھان تھے۔ ایک دن کہنے لگے: مجھے اردو زبان پر عبور حاصل ہو گیا ہے۔ چونکہ دار العلوم دیو بند میں صدر مدرس رہے، دہلی کا شاگرد تھا۔ اس نے کہا: استاد جی کمال کرتے ہیں! پٹھان اور اردو کا کیا جوڑ ہے!؟ انہوں نے فرمایا: میں اتنے سال سے تمہیں یہاں پڑھا رہا ہوں۔ میں تم سب کو اردو میں پڑھاتا ہوں۔ شاگرد نے کہا: پڑھا لینا اور زبان بول لینا علیحدہ بات ہے، لیکن زبان کو سمجھنا اور لغت پر عبور حاصل ہو جانا الگ بات ہے۔ جس آدمی کی زبان ہے اسی کو پتہ ہوتا ہے۔ فرمایا: مجھ سے کچھ پوچھو۔ شاگرد نے کہا: ہمارے ہاں بولا جاتا ہے: ''کریلا اور نیم چڑھا'' اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ درمیان میں ''اور'' جو عطف ہے، یہ گڑ بڑ کر رہا ہے۔ شاگرد نے کہا: عطف نکال دیتے ہیں: ''نیم چڑھا'' اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: کریلا آدھا کچا اور آدھا پکا۔ انہوں نے ''نیم'' فارسی سے لیا، جس کا معنی ہے آدھا۔ اور ''چڑھا'' کو پکنے کے معنی میں لے لیا۔ شاگرد نے کہا: حضرت! یہ معنی نہیں ہے، بلکہ یہ محاورہ ہے۔ جس کا معنی ہے جب کوئی آدمی بہت تلخ مزاج ہو، ایک تو کریلا کڑوا ہوتا ہے اور اگر اس کی بیل نیم کے درخت پر چڑھ جائے تو اور کڑوی ہو جائے گی؛ کیونکہ نیم بھی تو کڑوی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ بھی حد سے زیادہ گرم آدمی ہے۔ کہنے لگے: ہاں بھائی! پھر تو ہمیں اردو نہ آئی۔ ایسے بڑے بڑے لوگ تھے، لیکن دنیا کے معاملات کا کوئی پتہ نہیں۔

اس لیے مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرما رہے ہیں: بعض آدمی دنیا کے معاملات میں بڑے ماہر ہوتے ہیں، لیکن دین کا

مسئلہ پوچھو تو کہتا ہے: میں عمرہ پر آیا ہوں، لیکن احرام جدہ سے باندھا ہے۔ اس نے بلاوجہ بغیر احرام کے میقات سے تجاوز کرلیا، اس پر دم بھی پڑ گیا اور ثواب بھی کم ہو گیا کہ حل سے احرام باندھا، لیکن اس کو یہ سمجھ نہیں ہے۔

حفظِ قرآن کی فضیلت:

حکمت کا لفظ عام ہے۔ اس کا اعلیٰ درجہ نبوت، پھر رسالت اور اس کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی سنتوں کی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ''مَنْ حَفِظَ الْقُرْآنَ فَقَدْ أُدْرِجَتِ النُّبُوَّةُ بَيْنَ كَتِفَيْهِ غَيْرَ أَنَّهُ لَا يُوْحٰى إِلَيْهِ'' ''جس نے قرآن حفظ کیا تو گویا اس کے دو کندھوں کے درمیان نبوت رکھ دی گئی، حالانکہ وہ نبی نہیں ہے، اس پر وحی نہیں آئے گی، لیکن نبوت کا مقام قرآن ہے اور قرآن اس کے سینہ میں محفوظ ہو گیا ہے۔ علماء فرماتے ہیں: جس شخص کے گھر میں ترمذی شریف موجود ہو اور وہ اس کا پڑھنا بھی جانتا ہے، اس کو سمجھ سکتا ہے تو گویا اللہ کا نبی اس کے گھر میں بول رہا ہے۔

دو چیزوں میں حسد جائز ہے:

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ''لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ حِكْمَةً فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا'' حسد نہیں کرنا چاہیے، مگر دو آدمیوں پر: 1 ...... ایک وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی اور وہ اس کو حق کے راستے میں لٹا رہا ہے 2 ...... اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، وہ اس کو پڑھا رہا ہے، کبھی تبلیغ، کبھی تدریس اور کبھی دعوت، ہر وقت اس کے اندر لگا ہوا ہے کہ اے اللہ! مجھے بھی ایسی ہی توفیق عطا جس طرح سے یہ کر رہے ہیں۔ [ابن ماجہ: رقم: ۴۲۰۸]

جس علم سے لوگوں کو فائدہ نہ پہنچے اس علم سے اللہ کے نبی نے پناہ مانگی ہے۔

بڑے بڑے علماء بستیوں میں بیٹھے مر گئے، جن کے ہم جوتے اٹھانے کے قابل نہیں، لیکن ان کی پوری زندگی بستی کے اندر گزر گئی، کسی کو قاعدہ بھی نہیں پڑھایا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ چاہے تو چھوٹے چھوٹے طالب علموں سے بھی بڑا کام لے لیتا ہے۔

---

[1] [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰۴]

﴿وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ۝ اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۷۰، ۲۷۱]

''اور جو کچھ تم خیرات دیتے ہو یا کوئی نذر پوری کرتے ہو اللہ کو سب معلوم ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اگر تم ظاہر کر کے صدقات دو تو یہ اچھا ہے اور اگر تم ان کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دے گا اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔''

تفسیری آیات:

جو کچھ تم خرچ کرتے ہو خرچ کرنا یا منت مانتے ہو منت ماننی کہ میرا کام ہو جائے تو میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اتنی خیرات کروں گا۔

منت ماننا جائز ہے، لیکن خالص اللہ کے نام پر منت مانی جائے۔ اگر منت غیر کے نام کی مانی جائے یا کوئی منت مانتا ہے کہ میں قبر پر اتنی دیگیں پکاؤں گا، اتنی خیرات کروں گا اور اتنے دنبے ذبح کروں گا تو وہ مشرک بن جاتا ہے۔ پہلے تو منت کی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ حدیث مبارک میں آتا ہے: اللہ تعالیٰ نے اگر کسی بندے کا کوئی کام کرنا ہے وہ منت مانے یا نہ مانے وہ کام ہو جائے گا اور اگر نہیں ہونا ہوتا تو وہ نہیں ہوگا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: منت کا اتنا فائدہ ہے کہ بعض بخیلوں کا کچھ مال نکل جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو تم خرچ کرتے ہو یا منت مانتے ہو تحقیق اللہ جانتے ہیں کہ تم نے کیا خرچ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جاننے کا مطلب یہ ہے کہ جب چاہتے ہیں تو پورا پورا بدلہ دیں گے۔ اگر تمہارا صدقہ خیرات ''مَنّ وَ اَذٰی (احسان جتلانے اور تکلیف دینے)'' سے خالی ہے تو اللہ تعالیٰ دس گنا یا سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ بڑھا دیں گے۔

اور اگر تمہاری منت یا تمہارا خرچہ حرام ہے، غیر اللہ کے لیے ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت والے دن سزا دیں گے۔ اور منکروں کے لیے اس دن کوئی مدد کرنے والا نہیں ہوگا اور نہ ان کا کوئی سفارشی ہوگا اور نہ ان کی کوئی مدد کرے گا۔

اگر تم ظاہر کر کے خیرات کرو تو یہ بھی اچھی بات ہے اور تم اس کو چھپاؤ اور غریبوں کو پہنچاؤ وہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دیں گے۔ تم جو عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والے ہیں۔

علماء نے فرمایا: جو صدقاتِ واجبہ ہیں ان کو لوگوں کے سامنے دو، تاکہ لوگوں کے اندر جذبہ پیدا ہو؛ کیونکہ وہ تم نے دینا ہی ہے، اس کے اندر ریا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو صدقاتِ نافلہ ہیں کہ کسی بیوہ کی مدد ہے یا یتیم کی مدد ہے، بوسنیا والوں کی مدد ہے یا کشمیر والوں کی مدد ہے تو اس معاملے میں تم چپکے دے آؤ تو تمہیں زیادہ ثواب ملے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: اگر کبھی مسلمانوں کو ضرورت پیش آ گئی، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر چندہ فرمایا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تم کیا لائے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: جو میرے گھر میں تھا میں نے آدھا آدھا کر دیا ہے۔ آدھا گھر چھوڑ آیا اور آدھا لے آیاں ہوں؛ کیونکہ میرے گھر میں بہت مال تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے پوچھا، انہوں نے کہا: ایک ہزار اونٹ پلان اور سامان کے ساتھ اور ایک ہزار دینار بھی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: ابوبکر! تم کیا لائے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: حضور! میرے گھر میں جو کچھ تھا سب اٹھا کر لے آیا ہوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: تم نے آج بھی ہمیں نمبر نہیں لینے دیا اور تم نے کسی جگہ بھی ہمیں نمبر نہیں لینے دیا۔

اب علماء نے لکھا ہے کہ ایسے موقع پر دل کھول کر خرچ کرو، تاکہ لوگوں کو بھی رغبت پیدا ہو۔ اگر ویسے خیرات کرنی ہے تو اس انداز سے کرو کہ اگر دائیں ہاتھ سے دیا ہے تو بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتے ہیں، تم ظاہر کرو گے وہ بھی جانتے ہیں اور تم چھپ کر خیرات کرو گے وہ بھی جانتے ہیں۔ تم نے اللہ سے بدلہ لینا ہے وہ تو جانتا ہے، اس پر تمہیں پورا پورا بدلہ اور ثواب عطا فرمائیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جاننے والے ہیں۔ دنیا میں ہر عمل کرنے والا جو بھی عمل کر رہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کو پوری پوری جزا اور بدلہ دیں گے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ اور اس کے اندر ان لوگوں کے لیے وعید ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی خبروں کو جھٹلاتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ غیروں کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کے لیے قیامت کے دن کوئی مددگار نہیں ہوگا، جو ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے چھڑا سکے۔

افضل صدقہ:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اَلْجَاهِرُ بِالْقُرْآنِ كَالْجَاهِرِ بِالصَّدَقَةِ وَالْمُسِرُّ بِالْقُرْآنِ كَالْمُسِرِّ بِالصَّدَقَةِ'' جو قرآن کو زور سے پڑھنے والا ہے وہ ایسے ہے جیسے کوئی صدقہ ظاہراً کرنے والا ہے اور جو آدمی قرآن پاک کو آہستہ تلاوت کر رہا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی صدقہ کرنے والا آدمی اس طرح صدقہ کرے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

اگر زور سے قرآن پاک پڑھ رہا ہے تو خیال رکھنا کہ اگر ساتھ کوئی آدمی نماز پڑھ رہا ہے تو اس کی نماز میں حرج ہوگا۔ اس لیے حالات کے مطابق حکم ہے۔ ہمارے بعض بھائی طواف کے دوران زور زور سے دعائیں مانگتے ہیں۔

آہستہ دعا کا حکم:

یہ ادب اور سنت کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے بھی خلاف ہے؛ کیونکہ دعا وہ ہوتی ہے جو خفیہ مانگی جائے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا مانگی تو فرمایا: ﴿إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا ③﴾ [مریم: ۳] رات کا وقت ہے، علیحدہ ہیں، لیکن بالکل آہستہ آہستہ دعا مانگ رہے ہیں۔

اسی طرح جب یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے ابا کے سامنے اقرار گناہ کیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: عنقریب تمہارے لیے استغفار کروں گا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ تہجد کے وقت تمہارے لیے استغفار کی دعا کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ دعا میں چیختے ہیں، اللہ پاک حد سے زیادہ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

آج مشکل یہ ہوگئی ہے کہ پہلے تو ہم اللہ تعالیٰ کے کاموں میں نہیں آتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کے کام کرتے ہیں تو ان کو بھی صحیح طریقہ سے ادا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مثلاً: آپ کے ساتھ کوئی آدمی نماز پڑھ رہا ہے اور وہ زور زور سے امام کے پیچھے پڑھ رہا ہے کہ سارے مقتدی اب اس کی سنیں یا امام کی سنیں، لیکن جیسے کسی کی عادت بن گئی وہ لگا ہوا ہے۔ یہ ساری چیزیں انسان کو سمجھنی چاہیں۔

اس لیے اگر آپ قرآن پاک کی تلاوت کریں تو اعتدال سے کریں، جیسا کہ ایک رات حضور اکرم ﷺ گزرے اور دیکھا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تہجد میں اونچی آواز سے قرآن پڑھ رہے ہیں۔ آپ ﷺ آگے تشریف لے گئے اور دیکھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے ہیں اور قرآن شریف آہستہ آہستہ پڑھ رہے ہیں۔ صبح

جب موقع ملا تو آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: رات تم زور زور سے قرآن پڑھ رہے تھے، کیا بات تھی؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میرا مقصد یہ تھا کہ نیند میں جو لوگ غافل پڑے ہیں ان کو جگا دوں اور شیطان کو بھگا دوں۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تم آہستہ کیوں پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے عرض کیا: میں اپنے اللہ کو سنا رہا تھا اور کسی کو سنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آہستہ پڑھو تو اللہ سنتے ہیں اور زور سے پڑھو تو بھی سنتے ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم کچھ زور سے پڑھا کرو۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم آواز کو کچھ آہستہ کرو۔ درمیان میں رہو، اتنا زور سے نہ پڑھو کہ کسی کی عبادت میں حرج ہو اور اتنی آہستہ بھی نہ پڑھو کہ آدمی خود بھی نہ سن سکے کہ میں نے کیا پڑھا ہے؟ جہاں زور سے کچھ پڑھنے کا حکم ہے تو اس سے مراد یہ نہیں کہ تم اتنا زور سے پڑھو کہ صفا و مروہ والے پریشان ہو جائیں کہ کوئی لڑائی ہو گئی ہے، بلکہ جہر اس کو کہتے ہیں کہ تمہارا پڑھنا ساتھ والے سنیں اور سر کا معنی ہوتا ہے بالکل آہستہ کہ جو تم سن رہے ہو، ورنہ زیادہ زور لگانا ہر جگہ منع ہے۔ ہاں ایک مدرس ہے، جو درس دے رہا ہے، مجبور ہے کہ اس کی آواز سب تک پہنچے۔ ایک امام نماز پڑھ رہا ہے وہ بھی مجبور ہے کہ زور سے تکبیر کہے۔

اسی طرح صدقہ و خیرات ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو کھل کر بھی دو، تا کہ لوگ تمہیں دیکھ کر نیکی کا کام کریں۔ اگر ضرورت نہ ہو تو چپکے سے بھی دو کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

عرش کے سائے میں جگہ پانے والے:

بخاری و مسلم میں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

((سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ: إِمَامٌ عَدْلٌ، وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللّٰهِ، وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ، وَرَجُلاَنِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ، اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ، وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ: إِنِّي أَخَافُ اللّٰهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ، وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا، فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ)) [صحیح البخاری:۱/۱۶۸،۲/۱۳۸، صحیح مسلم: رقم:۹۱، باب: الزکوٰۃ]

یعنی سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی رحمت کے سائے کے نیچے رکھیں گے، جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہیں ہوگا۔

❁..... پہلا آدمی امام عادل ہے، یعنی بادشاہ ہو جو انصاف کرنے والا ہو۔

۞......اور دوسرا وہ نوجوان لڑکا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پرورش پا رہا ہے۔ (کیونکہ جب آدمی ساٹھ سال کا ہو جائے، ریٹائرڈ ہو جائے تو ہاتھ میں تسبیح یاد آ جاتی ہے، ٹوپی یاد آ جاتی ہے اور کہتے ہیں: اب ہم نے سب کچھ بچوں کو دے دیا ہے اور اب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کو دے دیا ہے۔ یہ کیوں بات نہیں کرتے کہ بلی تین سو ساٹھ چوہے کھا کر حج کو چلی ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ جب نوکری والوں نے تم کو ہٹا دیا کہ خدا کے لیے اب ہماری جان چھوڑ دو تو کیا اب تم اللہ کے پاس آئے ہو؟ جب بندوں کے نزدیک تم کام سے بے کار ہو گئے، حالانکہ عبادت جوانی کی ہے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ جوانی کے اندر گناہوں کو چھوڑو، طاقت ہے، لیکن گناہ نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے آپ کو لگا دو۔)

۞......تیسرا وہ دو آدمی جن کی محبت اللہ کے لیے ہے (ان کی دوسری غرض نہیں ہے)۔ جب ملتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے لیے ملتے ہیں اور اگر کبھی جدائی بھی ہوتی ہے تو بھی اللہ تعالیٰ کے لیے جدا ہوتے ہیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سائے میں ہوں گے۔

۞......چوتھا وہ آدمی جس کا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کی مسجد میں اٹکا ہوا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگا ہوا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہوگی تو مسجد کے ساتھ، اس کے نبی کے ساتھ محبت ہوگی، پھر اللہ کے اولیاء بھی محبوب ہوں گے۔ ایسے آدمی کا دل ہر وقت یہ کرتا ہے کہ مسجد میں جاؤں، نماز پڑھوں)۔ یہ بھی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سائے کے نیچے ہوگا۔

۞......پانچواں وہ بندہ جو اکیلا بیٹھا ہے، اس کو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے، اللہ کا ذکر بھی کر رہا ہے اور آنسو بھی بہا رہا ہے، اللہ کے لیے رو بھی رہا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کے نیچے ہوگا۔

۞......چھٹا وہ آدمی جس کو ایک ایسی عورت نے اپنی محبت اور خواہش کے لیے بلایا جو جمال والی بھی ہے اور دولت والی بھی ہے (یعنی حسن خود مائل ہے، لیکن جب وہ بلاتی ہے) تو کہتا ہے کہ (اے میری بہن! اے میری بیٹی!) میں اپنے رب سے ڈرتا ہوں، میں گناہ نہیں کر سکتا، تیرے قریب نہیں آ سکتا۔ (میرا اللہ تو دیکھ رہا ہے)۔ تو یہ آدمی بھی قیامت کے دن اللہ کی رحمت کے سائے کے نیچے ہوگا۔

۞......ساتواں وہ آدمی ہے جو میرے راستے میں اس طرح خیرات کرتا ہے کہ دائیں ہاتھ سے کرے تو بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلتا۔ یہ بھی قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے سایہ رحمت کے نیچے ہوگا۔ اور یہ اس دن ہوگا جب کوئی

دوسرا سایہ نہیں مل سکے گا اور سورج سر پر کھڑا ہو گا۔

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دینے والے ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے ہیں۔

مظفر علی شمسی رحمہ اللہ اور حضرت لاہوری رحمہ اللہ:

ایک شیعہ جس کا نام مظفر علی شمسی تھا، جو حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے ساتھ ختم نبوت کے مسئلے میں ساتھ رہا۔ وہ جیل میں قید ہو گیا۔ اس نے لوگوں کو خود سنایا کہ میں جب جیل سے گھر پہنچا تو گھر والوں نے کہا: گھر میں اتنا عرصہ کچھ نہیں ہوتا تھا، پڑوسیوں سے کبھی آٹا ادھار لیا، کبھی گندم اُدھار لی، اسی طرح ہم نے یہ وقت گزارا ہے۔ اور ہماری غربت کا یہ عالم ہے کہ آج جیل سے آئے ہو اور گھر میں اتنا بھی نہیں کہ آپ کے لیے کھانا پکا سکیں۔ اس نے کہا: جو کچھ اللہ کو منظور ہو گا وہ ہو جائے گا۔ کہتا ہے: ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے، کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میں نے اپنے بچے کو بھیجا۔ باہر ایک ریڑھی پر کچھ آٹے کی بوریاں، دالیں، کچھ چاول اور ایک لفافہ تھا۔ ایک آدمی نے سر پر کپڑا لپیٹا ہوا ہے۔ اس نے کہا: یہ سارا سامان شمس صاحب کو دے دیں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ شمس صاحب کہتے ہیں: بچے کو جب دیر ہوئی تو میں باہر آیا۔ اس سے پوچھا، اس نے کہا: ایک بزرگ نے کپڑے سے چہرہ چھپایا ہوا تھا، انہوں نے یہ لفافہ بھی دیا اور سامان بھی دیا ہے اور وہ جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں: میں ان کے پیچھے دوڑا کہ میں اپنے محسن کو تو دیکھوں۔ جب دیکھا تو وہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تھے۔ وہ مجھے کہنے لگے: تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔ میں نے کہا: حضرت! میں محسن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ حضرت لاہوری رحمہ اللہ نے فرمایا: میں نے کیا احسان کیا ہے!؟ تم نے محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جیل کاٹی ہے، مجھے نہیں پتہ کہ تم کس مسلک کے ہو؟ میں نے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے پیش نظر سوچا کہ تمہاری مدد کروں۔

اس لیے حضرت شاہ جی رحمہ اللہ جب جوش میں آتے تو فرماتے تھے: اللہ کے نبی کی ختم نبوت کا دشمن قادیانی جو بھی ہو اگر اس کے خلاف جنگل کا خنزیر بھی میری مدد کرے تو میں اس کو بھی چومنے کے لیے تیار ہوں۔

خفیہ صدقہ کی طاقت:

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ الْأَرْضَ جَعَلَتْ تَمِيدُ، فَخَلَقَ الْجِبَالَ، فَأَلْقَاهَا عَلَيْهَا فَاسْتَقَرَّتْ، فَتَعَجَّبَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ خَلْقِ الْجِبَالِ، فَقَالَتْ: يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ؟ قَالَ: نَعَمْ، الْحَدِيدُ. قَالَتْ: يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الْحَدِيدِ؟ قَالَ: نَعَمْ، النَّارُ، قَالَتْ: يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ النَّارِ؟ قَالَ: نَعَمْ، الْمَاءُ. قَالَتْ: يَا رَبِّ! فَهَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الْمَاءِ؟ قَالَ: نَعَمْ، الرِّيحُ. قَالَتْ: يَا رَبِّ! فَهَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الرِّيحِ؟ قَالَ: نَعَمْ، ابْنُ آدَمَ يَتَصَدَّقُ بِيَمِينِهِ يُخْفِيهَا مِنْ شِمَالِهِ)) [مسند احمد بن حنبل: ۳/ ۱۲۴]

جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا فرمایا تو زمین حرکت کرنے والی تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا کر کے زمین پر لگا دیا، تاکہ زمین ہلنا بند ہو جائے۔ جب پہاڑ پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین پر رکھا اور ان کو زمین کی میخیں بنا دیا۔ فرشتوں نے عرض کیا: اے اللہ! یہ پہاڑ بڑی سخت شے ہے، اس سے بھی کوئی سخت شے آپ نے بنائی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے سخت لوہا ہے۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ! کوئی ایسی بھی چیز ہے جو لوہے کو ختم کر دے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے سخت چیز آگ ہے، جو لوہے کو بھی پانی بنا دے۔ فرشتوں نے عرض کیا: اس سے بھی زیادہ قوت اور طاقت والی چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے طاقت والی چیز پانی ہے، جو آگ کو بجھا دیتا ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا: اے اللہ پانی سے زیادہ طاقت والی کوئی چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے زیادہ طاقت والی چیز ہوا ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا: ہوا سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا: ہاں! ابن آدم میرا بندہ جب میرے راستہ میں چپکے چپکے خرچ کرے وہ ان سب چیزوں سے بھاری ہے۔

اس لیے قرآن میں فرمایا: اے میرے بندو! جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے ہے۔ زمین پر تم رہتے ہو، نہریں جاری کرتے ہو، چشمے نکالتے ہو، پھل کھاتے ہو اور تم کو میں نے اپنے لیے بنایا ہے کہ تم صرف میری عبادت کرو، میرے سوا غیر کو سجدہ نہ کرو اور میرے سوا کسی غیر کو رکوع نہ کرو۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے آیت الکرسی کی فضیلت میں روایات ذکر کی ہیں۔ اس میں بھی یہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ افضل صدقہ کون سا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو چپکے چپکے فقیر تک پہنچایا جائے یا وہ صدقہ کہ نہ ہونے کے باوجود کوشش کر کے دیا جائے۔

جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے سارا دن مزدوری کی تو چند کھجوریں ملیں۔ میں وہ گھر لے آیا، تاکہ

بچے یہ کھا کر گزارہ کریں گے۔راستہ میں آیا تو ایک سائل نے آواز دی۔میں نے اس کو دے دیں۔

کہنا تو آسان ہے،مگر کر کے دکھانا بڑا مشکل ہے۔

میرے استاذ کا واقعہ:

ہمارے ایک استاذ بہت غریب آدمی تھے۔انہوں نے مجھے ایک دفعہ جلسے پر بلایا۔انہوں نے گائے کا گوشت پکایا اور مجھے بطور خاص فرمایا: آج میں نے تمہارے لیے گوشت منگوایا ہے بڑی محنت سے۔اور وہ گوشت مجھ سے کھایا نہ جائے۔استاذ ساتھ تھے،انہوں نے پوچھ لیا کہ تم کھا نہیں رہے؟ میں نے کہا: آپ جائیں ......ان شاء اللہ......میں آرام سے کھاؤں گا،میں آہستہ آہستہ کھا رہا ہوں۔جب استاد صاحب چلے گئے تو میں نے کسی کو دے دیا،یعنی اتنے غریب آدمی تھے کہ ایک پلیٹ گوشت بنایا تھا اور فرمایا: میں نے تمہارے لیے کتنی محنت کی ہے!!؟ وہ مدینہ شریف آئے اور ایک دکان سے تسبیح خریدی۔دکاندار نے کہا: پانچ ریال کی ہے۔مجھے تو پتہ تھا کہ یہ دو ریال کی چیز ہے۔استاد سے عرض کیا کہ یہ دو ریال کی چیز ہے۔استاد صاحب نے فرمایا: چپ کرو۔اس کو پانچ ریال دے دیئے۔فرمانے لگے: یہ مدینہ شریف کے ہمسائے ہیں،ہم تو ان کی خدمت کے لیے آئے ہیں،یہاں بحث کرنے نہیں آئے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کی دعا سے ہمیں معاف کردے،یعنی غربت کا یہ عالم تھا اور مدینہ منورہ کا اتنا احترام تھا!! جب تیرا پیسہ اللہ کے راستے میں آگیا تو سمجھ لو کہ میرا رب راضی ہوگیا اور جب گناہ کے کام میں گئے تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہوگئے ہیں،اپنے راستے پر نہیں آنے دیتے۔

''صَدَقَةُ السِّرِ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ عَزَّوَجَلَّ'' جو آدمی چھپ کر خیرات کرتا ہے اس کا یہ صدقہ کا طرز اللہ تعالیٰ کے غضب کو بجھا دیتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: اگر کوئی آدمی نفلی صدقہ خیرات چپکے چپکے دیتا ہے،اللہ تعالیٰ ستر گنا ثواب بڑھا دیتے ہیں۔اور اگر کوئی آدمی زکوٰۃ اور صدقہ واجبہ کھل کر دیتا ہے اس کو پچیس گنا ثواب ملتا ہے۔

﴿وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّـَٔاتِكُمْ﴾ جو تم اللہ کے راستہ میں صدقات و خیرات کرتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں اور تمہیں ایسی ایسی چیزیں حاصل ہوتی ہیں کہ گناہ تو مٹ جاتے ہیں،گناہ نہ ہوں تو تمہارے درجات بلند ہوجاتے ہیں۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۷۲تا۲۷۴]

''آپ ﷺ پر ان کو ہدایت پر لانا لازمی نہیں اور لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت پر لاتا ہے۔ اور جو تم خرچ کرتے ہو مال سے تو اپنے فائدے کے لیے جب تک کہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرو گے۔ اور جو کچھ تم مال خرچ کرتے ہو تمہیں پورا ملے گا اور تمہارا حق نہ رہے گا۔ خیرات ان محتاجوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں مقید ہو گئے ہوں، وہ لوگ دنیا میں کہیں چلنے پھرنے کا امکان نہیں رکھتے، ناواقف ان کو دولت مند سمجھتا ہے ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے، تم ان کو ان کی علامت (کمزوری اور آثار مشقت) سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے۔ اور جو مال تم خرچ کرو گے تو وہ اللہ کو معلوم ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں رات اور دن میں پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں تو ان کو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ملے گا اور نہ ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔''

آپ پچھلی آیات سے انفاق فی سبیل اللہ کے فضائل، اس کے احکام، اس کی تفصیلات اور اس کی شرائط پڑھ رہے ہیں۔ اب بھی اس کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو اس سورت میں بڑا کھول کر بیان فرمایا ہے؛ کیونکہ دنیا میں دو قسم کے حقوق ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ پر نہیں ہے کہ آپ ان کو توفیق وہدایت دیں، بلکہ توفیق وہدایت میرے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے ذمہ اتنا تھا کہ آپ نے ایک چیز کھول کر دلائل کے ساتھ بیان کر دی، اب بھی اگر اس کو سمجھ نہیں آتا وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف خرچ کرتا ہے تو آپ غم نہ کریں۔ بعض غریب اور مسکین لوگ ہوتے ہیں، وہ اتنا بڑا کام کر جاتے ہیں کہ بڑے سے بڑا سرمایہ کار بھی نہیں کر پاتا۔ اللہ پاک ان کو جتنی توفیق دیتے ہیں وہ ایک ایسی نیکی کی بنیاد

رکھ دیتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اس نیکی کا اتنا ثمر آور کر دیتے ہیں کہ بندہ حیران ہو جاتا ہے۔

دینی کام اللہ کی توفیق سے ہوتے ہیں:

میرے ایک دوست ہیں، انہوں نے ایک دفعہ ملاقات میں ذکر کیا کہ ہماری ایک اہم جگہ ہے۔ آبادی ہے، بڑی سڑک ہے، گرمیوں کے زمانے میں جب لوگ آتے ہیں تو سب کو وہاں سے گزرنا ہوتا ہے۔ وہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جو پرانی اور چھوٹی سی ہے، مسافروں کے لیے بڑا مسئلہ ہے، خاص طور پر سرد علاقوں میں اگر گرم پانی نہ ملے تو آدمی نماز کیسے پڑھے؟ اتفاق سے میرے ایک دوست تھے، جو امیر لوگ ہیں، وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ ان سے بھی کہا: انہوں نے کہا: میں جا کر دیکھوں گا۔ بہر حال انہوں نے وہ موقع دیکھا اور کہا کہ یہ جگہ چھوٹی ہے، اس کے ساتھ اور جگہ خرید لیں، نقشہ بنائیں، اس پر جتنا خرچ ہوگا میں کر دوں گا۔ زمین خرید لی گئی اور نقشہ بن گیا، ان کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے ایک لاکھ بھجوا دیے اور کہا: اس سے زیادہ میں خرچ نہیں کر سکتا، اب میرے حالات نہیں ہیں۔ تو کام کھٹائی میں پڑ گیا؛ کیونکہ ایک لاکھ کی تو زمین نہیں تھی، چہ جائیکہ مسجد بنتی۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا۔ میں نے کہا: اس کو کہنے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کو جتنی توفیق دینی تھی اس نے دے دیے۔ ہم لوگوں کی غلطی ہے کہ ہم نے بڑے لوگوں کا سہارا لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دیکھو! کیسے بن گئی؟ اس لیے اب کسی بڑے آدمی کو کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ مسجد بن جائے گی، اللہ تعالیٰ رحمت کریں گے۔ چند دنوں کے بعد اس کا خط آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور آدمی پیدا کر دیا ہے، اس نے کام شروع کروا دیا ہے۔ پھر اطلاع آئی کہ اس نے عظیم الشان مسجد بنوا دی اور لوگ نماز پڑھ رہے ہیں۔ یاد رکھیں! بعض غریب لوگ ایک چھوٹے مدرسے کی بنیاد رکھ جاتے ہیں، پھر وہ مدرسے بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے بھی زیادہ کام کرتے ہیں۔

صدقہ کا فائدہ خود صدقہ کرنے والے کو پہنچتا ہے:

﴿وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ﴾ (جو کچھ تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہو در اصل وہ تم اپنے نفسوں کی بھلائی کر رہے ہو)۔

علماء نے لکھا ہے ایک اللہ کے ولی اللہ کے راستے میں بڑا خرچ کرتے تھے۔ جب کوئی پوچھتا تو کہتے: واللہ! مجھے تو اللہ کی قسم ہے! میں نے تو کسی کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کی ہے۔ ایک دن ایک شاگرد نے کہا: حضرت! آپ

چوبیس گھنٹے تو بھلائی کرتے رہتے ہیں اور جب ہم آپ سے پوچھتے ہیں تو آپ قسم بھی کھا جاتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: ﴿وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو کچھ تم خرچ کر رہے ہو اپنے نفس کی بھلائی کے لیے خرچ کر رہے ہو۔ میں تو اپنی بھلائی کر رہا ہوں، غیر کی بھلائی تو نہیں کر رہا ہوں۔

اللہ کے خزانے بہت ہیں:

حدیث قدسی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: میرے بندو! سنو! تمہارا پہلا اور تمہارا بعد والا، تمہارا زندہ اور تمہارے مردہ، تمہارے جوان اور تمہارے بوڑھے اگر سب مل کر پاک بن جائیں، صالح بن جائیں اور سب سے بڑے متقی بن جائیں، اس کا مجھے کوئی فائدہ نہیں۔ اور تمہارے سارے بندے اگر سب سے بڑی شقی بن جائیں تو میری سلطنت میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ جتنی مخلوق ہے سارے ایک کھلے میدان میں کھڑی ہے اور ہر بندہ اپنی تمنا مانگے، میں ہر بندے کو دے دوں گا تو میرے خزانہ قدرت میں اتنی بھی کمی نہیں ہوگی جیسا کہ کوئی ایک شخص سوئی لے کر دریا میں ڈالے اور اس کو نکالے تو اس سے کتنا سمندر کا پانی کم ہوگا؟ صحابہ نے عرض کیا: کچھ بھی کم نہیں ہوگا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو اس کا مانگا ہوا دے دے تو اس کے خزانہ میں اتنی بھی کمی نہیں آسکتی۔ بعض علماء نے فرمایا: چلو سوئی کو تو کچھ نہ کچھ پانی لگا، دریا کے پانی کے کم ہونے کی نسبت ہوسکتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے خزانے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو تم بھلائی کے کام کرتے ہو اس کا فائدہ تم کو ملتا ہے اور جو برائی کے کام کرتے ہو اس کا وبال تم پر گرتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہیں، اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے اندر جو سخی آدمی ہے، اللہ کی قدرت ہے دنیا کے اندر وہ کبھی بھوکا نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے خزانوں میں سے عطا فرماتے ہیں۔ کسی ایک آدھ پر امتحان کے طور پر کچھ کمی آجائے تو اور بات ہے۔ تم جو کچھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے، شرط یہ ہے کہ تم خرچ کرو۔

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ [البقرۃ: ۲۷۳]

فقراء سے مراد مہاجرین ہیں اور اس کے بعد جو آئیں گے، جن کو گھروں سے نکالا گیا، عزت والا آدمی اگر غریب

ہوجائے اس کے لیے بڑی مصیبت ہے، نہ تو وہ سوال کرسکتا ہے۔ ساری زندگی جس نے نہ مانگا ہو وہ کیسے مانگ سکتا ہے؟ اور ایک وہ جن کا کام ہی مانگنا ہے اس کے لیے تو مانگنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایسے لوگ قیامت تک مانگتے ہی رہیں گے، ان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں جو لوگ مہاجر بنے کہ ان کا گھر گیا، وطن گیا اور مدینہ میں آ گئے۔ اب وہ بیٹھے ہوئے ہیں، کہیں جا بھی نہیں سکتے ہیں۔ اسی طرح آج کے زمانے میں متوسط زیادہ طبقہ ہے اور ان کے لیے بڑی مشکلات ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کا ذکر کیا جو فقراء ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں انہوں نے اپنے آپ کو بند کر دیا ہے، ان کے پاس طاقت نہیں ہے کہ وہ سفر کریں، تجارت کریں؛ کیونکہ ان کے پاس کچھ ہوگا تو تجارت کریں گے۔ جو ان کو نہیں جانتا وہ جب ان کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے...... ماشاء اللہ!...... بڑا غنی ہے! کیونکہ جو شریف اور عزت والے لوگ ہوتے ہیں وہ اپنے بڑے وقار کے ساتھ رہتے ہیں کہ دیکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ ...... ماشاء اللہ!...... یہ کوئی ضرورت مند نہیں ہے؛ کیونکہ وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا اور استغنا کے ساتھ رہتا ہے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

میں نے اپنی آنکھوں سے حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا، ان کے گھر میں گیا۔ کہنے لگے: چائے پیو گے؟ میں نے کہا: پلا دیں۔ فرمانے لگے: نمک کی چائے ہے، گھر میں چینی نہیں ہے۔ میں نے کہا: حضرت! مجھے ابھی اجازت دیں، میں شہر سے جا کر چینی لے آتا ہوں۔ فرمایا: اگر اتنی غیرت اور حیاء تھی تو آتے ہوئے لے آتے۔ اب بیٹھ جاؤ۔

یہ لوگ تھے، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس کو ان کے بارے میں علم نہ ہو وہ ان کو غنی سمجھتا ہے۔

چھپا کر صدقہ کرنا:

﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ لوگوں سے سوال نہیں کرتے ہیں، اپنے آپ کو بچا کر رکھتے ہیں، وہ اپنی نشانیوں سے پہچانے جاتے ہیں۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۷۳] جو کچھ تم خیرات کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کے جاننے والے ہیں، یعنی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمہارے ہر پیسے پر اللہ تعالیٰ تمہیں بدلہ عطا فرمائیں گے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً﴾ ایمان والے لوگ جو خرچ کرتے ہیں ان کو قبر اور حشر کی سختی کا بھی کوئی ڈر نہیں ہے؛ کیونکہ ایسے لوگ جب فوت ہوتے ہیں اللہ کے فرشتے ان کو آ کر خوشخبری دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ جو اپنے پیچھے آل و اولاد چھوڑ کر جا رہے ہیں ان کو ان کا بھی کوئی غم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرے گا اور ان پر اپنی رحمتیں فرمائے گا۔ مومن کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ دن میں بھی خرچ کرتا ہے اور رات میں بھی خرچ کرتا ہے، کھل کھل کر بھی خرچ کرتا ہے چھپا کر بھی خرچ کرتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مجھے اس کا بدلہ دنیا میں بھی دیتے ہیں اور آخرت میں بھی دیں گے۔ اور کبھی بدلہ جلدی مل جاتا ہے اور کبھی دیر میں ملتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ بدلہ ضرور عطا فرماتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اس بات کو ناپسند سمجھتے تھے کہ ہم ان سے لیں جو مشرکین میں سے ہمارے رشتہ دار ہیں یا کسی کے پاس ہو اس کے مشرک رشتہ دار غریب ہے اس کو دیا کرے۔

یاد رکھیں! خیرات کرنا مسلمان کے لیے اولیٰ ہے، فقیر اگر کافر ہے اس کو بھی آپ دے سکتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مسلمان کی مدد کرنے میں زیادہ ثواب ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ آپ کے ہاتھ میں ہدایت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت عطا فرمائیں۔

کافر پر خرچ کرنا جائز ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا: تم خیرات نہ دیا کرو، مگر مسلمانوں کو۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم فرمادیا کہ آپ بالکل ایسا نہ کریں، ہدایت ہمارے ہاتھ کے اندر ہے۔ جو بھی سوال کرے کافر ہے، مشرک ہے، یہودی ہے، یا نصرانی ہے اور وہ محتاج ہے تو اس کو دینا چاہیے، اس میں کوئی فرق نہ کریں۔

صدقہ خیرات میں زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہے:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مومن جو اپنے نفس پر خرچ کرتا ہے اور مومن نہیں خرچ کرتا، مگر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے۔

حضرت عطاء الخراسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب تم نے کسی کو اللہ کے لیے خیرات دے دی، اب تمہارے ذمہ نہیں ہے کہ اس کا عمل تلاش کرتے پھرو؛ کیونکہ بعض اوقات تمہاری یہی بھلائی اس کی ہدایت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ خیرات کرنے والے نے جب خیرات اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کی ہے تو گویا اس کا اجر اللہ پر اس کی رحمت سے واجب ہو گیا، اب اس کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس کے عمل تلاش کرتا پھرے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری نیت کو دیکھنا ہے۔ اگر تمہاری نیت ٹھیک نہیں ہے، جیسا کہ آج کل کسی کے گھر میں کوئی رشتہ دار بیٹھا ہو تو وہاں بڑی نیکی اور خیرات کرتے ہیں، تاکہ کسی طرح یہاں بات چیت بن جائے، اسی طرح اگر کوئی نوجوان بیوہ ہو تو وہاں بھی مسلمان بڑی خیرات پہنچاتا ہے، بوڑھی ہو تو نہیں پہنچاتا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے کھوٹ جانتے ہیں۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((قَالَ رَجُلٌ لَأُتَصَدَّقَنَّ اللَّيْلَةَ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدِ زَانِيَةٍ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلَى زَانِيَةٍ، قَالَ: اللّٰهُمَّ! لَكَ الْحَمْدُ عَلَى زَانِيَةٍ، لَأُتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدِ غَنِيٍّ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصُدِّقَ عَلَى غَنِيٍّ، قَالَ: اللّٰهُمَّ! لَكَ الْحَمْدُ عَلَى غَنِيٍّ، لَأُتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدِ سَارِقٍ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصُدِّقَ عَلَى سَارِقٍ، فَقَالَ: اللّٰهُمَّ! لَكَ الْحَمْدُ عَلَى زَانِيَةٍ، وَعَلَى غَنِيٍّ، وَعَلَى سَارِقٍ، فَأُتِيَ فَقِيلَ لَهُ: أَمَّا صَدَقَتُكَ فَقَدْ قُبِلَتْ، أَمَّا الزَّانِيَةُ فَلَعَلَّهَا تَسْتَعِفُّ بِهَا عَنْ زِنَاهَا، وَلَعَلَّ الْغَنِيَّ يَعْتَبِرُ فَيُنْفِقُ مِمَّا أَعْطَاهُ اللّٰهُ، وَلَعَلَّ السَّارِقَ يَسْتَعِفُّ بِهَا عَنْ سَرِقَتِهِ)) [صحیح البخاری: رقم: ۱۴۲۱، مسلم: ۱۰۲۲]

ایک آدمی نے کہا: اے اللہ! آج میں چپکے سے خیرات کروں گا کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ تو ایک عورت جا رہی ہے، اس نے صدقہ اس عورت کو دے دیا۔ اس کو پتہ نہیں تھا کہ یہ عورت زانیہ ہے اور اپنے شکار کے تلاش میں پھر رہی ہے۔ جب صبح ہوئی تو لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ زانیہ عورت کو خیرات دی گئی ہے۔ اس نے دل میں کہا: اللہ! تیرا شکر ہے جو تو نے لکھا تھا وہی ہوا، میں نے خیرات کی تھی۔ دوسری رات وہ پھر نکلا کہ آج پھر خیرات کرتا ہوں تو آگے جو بندہ تھا اس نے اس کو پکڑا دیا، وہ امیر آدمی تھا۔ صبح لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ اچھی خیراتیں کرتا ہے وہ غنی امیر آدمی کو دے آیا۔ اس نے کہا: اے اللہ! تیری مرضی ہے، تو نے میرے سامنے وہ بندہ بھیج دیا، میں نے اس کو خیرات دے دی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ امیر ہے غریب ہے۔ میں نے تیرے راستے میں خیرات دے دی۔ تیسری رات اس نے کہا: آج پھر میں خیرات کروں گا تو آگے جو آدمی ملا اس کو خیرات دے دی، وہ چور تھا، چوری کرنے کے لیے جار

ہاتھ۔ صبح صبح لوگ بات کرنے لگے کہ بڑا اچھا خیرات کرتا ہے، رات چور کو خیرات دے آیا ہے۔ اس کو پتہ لگا، اس نے کہا: اے اللہ! تیرا شکر ہے، میرے نصیب میں وہی چور آگیا تو میں کیا کرتا؟ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے! میں نے تیری ساری خیراتیں قبول کرلی ہیں۔ تو نے زانیہ کو خیرات دی، ہوسکتا ہے میں اس کو اس پیسے سے زنا سے بچالوں کہ اس کے دماغ میں آجائے کہ خدا مجھے بغیر زنا کے بھی پیسے دے سکتا ہے تو میں کیوں خواہ مخواہ زنا کروں؟ اور تو نے جو پیسے غنی کو دیئے تھے اس کے لیے یہ تازیانہ بن گیا کہ یہ تو خیراتیں کررہا ہے اور میں تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات نہیں کرتا ہوں۔ اس طرح یہ اس کی ہدایت کا ذریعہ بن گیا، میں نے تیرا صدقہ قبول کرلیا۔ اور تو نے جو چور کے ہاتھ میں رکھا، میں نے وہ بھی قبول کرلیا۔ جب اس کو پیسے ملے تو وہ چوری سے بچ گیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تم جو کچھ بھی میری رضا کے لیے کرتے ہو میں اس کو قبول کرتا ہوں۔

دارالکفر سے ہجرت کا حکم:

ایک ہجرت دارالحرب سے ہوتی ہے کہ ایک ایسا ملک ہے، حکومت کافروں کی ہے اور کافر مسلمانوں سے نبرد آزما ہیں، یعنی بروقت مسلمانوں کو قتل کردیا جاتا ہے، مسلمانوں کو فرائض ادا کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی، ان کو نماز نہیں پڑھنے دیتے، روزہ نہیں رکھنے دیتے اور مسجدیں نہیں بنانے دیتے۔ ایسے ملک سے ہجرت کرنا مسلمانوں کے لیے بھی لازم ہے۔

اور ایک دارالامان ہوتا ہے کہ کافر حکومت ہے، لیکن مسلمانوں کو امان حاصل ہے۔ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، عیدین پڑھیں، اپنی مسجدیں بنوائیں اور نکاح سب آرام سے ہورہا ہے تو وہاں سے ہجرت ضروری نہیں ہوتی؛ کیونکہ وہ دارالامان ہے اور ان کی زندگی اچھی گزر رہی ہے، لیکن اگر مسلمان اس ملک کو چھوڑ دیں تو بڑی اچھی بات ہے۔

کفار کے ملک میں رہنے کے مسائل:

ہمارے ہاں ایک رواج بن گیا ہے کہ پیسے کے لیے کوئی کسی ملک جارہا ہے اور کوئی کسی ملک میں جارہا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہاں جائیں گے، پیسہ اور دولت ملے گی۔ یہ شرعاً ناجائز ہے۔ دارالکفر کے اندر مسلمان کا سفر کرنا جائز نہیں، مگر ضرورت ہو تو سفر کرسکتا ہے، مثلاً: تعلیم کی ضرورت ہے کہ اس ملک کے بغیر کسی دوسری جگہ وہ ڈگری نہیں ملتی ہے، اسی طرح کوئی مسلمان اس لیے سفر کررہا ہے کہ اس کے تجارتی تعلقات اس قسم کے ہیں کہ اس کا

تجارتی سامان اس ملک کے علاوہ کہیں اور نہیں مل رہا، اس نے وہاں بزنس کے لیے جانا ہے تو یہ سفر جائز ہے۔ فقہاء نے تیسری شکل یہ لکھی ہے کہ کوئی مسلمان بیمار ہے اور اس کا علاج کافر ملک میں ہے، مسلمان ملک میں اچھا ہسپتال اور اچھا ڈاکٹر کوئی نہیں تو وہ بھی مجبوراً سفر کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیں کہ اگر کوئی مسلمان دار الکفر میں رہتا ہے، ان کے ساتھ باعتبار عقیدے کے بغض نہیں رکھتا، اللہ کے نبی نے فرمایا: اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مومن کی محبت ضروری ہے، اسی طرح کفر سے براءت کا اعلان بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر کوئی مسلمان مشرکوں کے ملک میں ہے اور ان کی تہذیب میں ڈھلا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بندے بڑے اچھے ہیں، ان کے پاس بڑا ڈسپلن ہے، ان کے پاس عدل و انصاف ہے، ان سے بڑا پیار ہے۔ اس کا کفر سے پیار اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے اندر ایمان نہیں ہے۔ فقہاء کرام نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر تم کسی کافر ملک میں رہنے پر مجبور ہو گئے، مثلاً: تمہارے باپ دادا وہاں مزدوری کرنے لگے، وہاں اولادیں ہو گئیں، تعلیم وہاں ہوگئی اور آدمی کی شہریت وہاں کی ہوگئی، اس لیے ضروری ہے کہ اپنے دین کا اظہار کرے اور ان کے دین سے نفرت کرے اور ان کو اپنے دین کی تبلیغ کرے۔ اگر یہ کام نہیں کرسکتا تو شریعت کے مطابق اس کا وہاں رہنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ قاعدہ ہے کہ برائی جلد اثر کرتی ہے اور اچھائی بڑی دیر سے اثر کرتی ہے۔ آپ دیکھ لیں کہ اگر کوئی عمارت تعمیر کرنی ہو تو بڑا وقت لگتا ہے، لیکن اگر عمارت توڑنی ہو تو منٹ بھی نہیں لگتا۔

آج بھی اگر مسلمان کفر کو اپنا دشمن سمجھ لے اور عالم اسلام کفر سے بائیکاٹ کر لے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو محتاج نہیں کیا، لیکن کافر پھر بھی مسلمان کا محتاج ہے، لیکن اگر ہم خود ان کے بوٹ پالش کرنے والے بن جائیں تو ہماری مرضی ہے اور وہ ٹھوکریں ماریں گے؛ کیونکہ ان کو پتہ ہے کہ یہ چپڑاسی ہے۔ ان کو پتہ ہے کہ یہ مکہ مدینہ میں پڑھنے میں فخر محسوس نہیں کرتے، لیکن اگر ہم کافروں کے کسی ملک میں پڑھ لیں تو بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت کے اندر فقراء مُہاجرین کا بیان فرمایا ہے کہ ان کے پاس کوئی مال بھی نہیں کہ تجارت کرسکیں، سفر کرنے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں، وہ اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ منورہ میں آگئے۔

مانگنے والوں کے متعلق مسائل:

فرمایا: مسکین وہ ہوتا ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہوتا اور وہ سوال سے بچتا ہے، دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ...... ماشاء

اللہ...... یہ بڑا آدمی ہے، اس کا ہر وقت اچھا لباس ہے، اچھا کھانا ہے اور اچھے گھر میں رہتے ہیں، حالانکہ ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ ان کی ضروریات، حالات اور تقاضے کیا ہیں؟

یاد رکھیں! یہ جو بھیک مانگنے والے لوگ ہیں ان کو دینا بھی گناہ ہے؛ کیونکہ ہم ان کو عادی کر رہے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی معذور ہے، نابینا ہے، لنگڑا ہے، اس نے اس کو پیشہ نہیں بنایا ہوا، ورنہ آج کل معذوری کو بھی کاروبار بنایا ہوا ہے۔ میرے ایک دوست نے بتایا کہ ہمارے ملک سے دو اندھے یا دو لنگڑے ہیں، ان کو لوگ یہاں لے آتے ہیں کہ ہم تمہارا ٹکٹ بھریں گے اور تم کو رمضان میں لے جائیں گے۔ رمضان سے محرم تک بھیک مانگو گے، جو پیسے ملیں گے آدھے تمہارے اور آدھے ہمارے ہوں گے۔

اگر اس سے بڑا بزنس کرنا ہے تو راستے میں کہیں قبر دیکھ لو، جہاں سایہ وغیرہ ہو، اس پر دو چار ریشمی غلاف ڈال کر بیٹھ جاؤ۔ جو بھی وہاں سے گزرے اس کو سلام کرے تو چپ ہو کر بیٹھا رہتا ہے۔ پندرہ دن کسی کے ساتھ نہ بولے اور رات دن چپ کر کے بیٹھا رہے، قبر کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ اندر کوئی بندہ ہو، بلکہ لکڑی رکھ کر قبر بنالو، پندرہ دن کے بعد وہاں مٹکا رکھ لو اور پانی پلانے کے لیے کچھ برتن بھی رکھ لو اور جو گزرے اس کو کہو: فلاں بزرگ اجمیر شریف میں تھے، وہ یہاں آگئے ہیں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میری قبر پر مجاور بن کر بیٹھ جاؤ۔ ایک ماہ کے اندر منتیں شروع ہو جائیں گی اور چھ ماہ کے بعد بزنس ٹاپ پر پہنچ جائے گا۔ پھر تمہاری نسلوں کو بھی اور کاروبار کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ قبر سے جہنم شروع ہوگی اور آخرت تک ہوگی، لیکن دنیا میں مزے کرلو۔

میں ہمیشہ دوستوں سے کہتا ہوں کہ اگر خیرات کرنی ہے تو یہ آدمی جو حرم شریف میں کام کرتے ہیں یہ زیادہ مستحق ہیں، کسی سے سوال نہیں کرتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ ایک دفعہ میں نے گاڑی روکی تو کالے لڑکے آگئے، جو زور والے تھے۔ انہوں نے آب زمزم بھرنے کے لیے ڈبے زور سے نکال لیے۔ ایک لڑکا کمزور تھا، وہ کھڑا رہ گیا، اس کو دھکا دے کر انہوں نے ہٹا دیا۔ جب وہ پانی بھر کر لے آئے تو مجھے اس بچے پر بڑا ترس آیا۔ میں نے اس کو بلایا اور اس کو دو ریال دیئے۔ اس نے کہا: میں نہیں لیتا ہوں۔ میں نے کہا: تم نے مانگے تو نہیں ہیں؟ اس نے کہا: میں نے آپ کا ڈبہ نہیں بھرا، میں بھیک نہیں لینا چاہتا۔ یہ ایمان ہے۔ جب میرے نصیب میں ہوگا میں ڈبہ بھروں گا۔ اللہ پاک مجھ کو روزی دے گا، ورنہ بھوکا سو جاؤں گا، کوئی بات نہیں۔ ایسے لوگ امداد کے مستحق ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے پاس پیسے تو نہیں ہوتے تھے، ان کے کندھے پر ایک رومال ہوتا تھا۔ وہ

جب کہیں گاڑی سے اترتے تو قلی کو بلاتے اور اس کو کہتے میرا یہ رومال اٹھاؤ۔ وہ قلی لے لیتا اور کبھی قلی حیران رہ جاتا کہ مولوی صاحب ہمیں بے وقوف بناتے ہیں۔ بہر حال جب گیٹ تک آتے، تانگہ پکڑتے تو اس کو پانچ روپے دے دیئے۔ کئی دفعہ مولویوں نے کہا: حضرت! ویسے دے دیتے؟ فرمایا: ایسے دینے سے اس کی توہین ہوگی کہ مجھے غریب اور بھکاری سمجھ کر دے رہا ہے۔ اب میں نے اس سے کام لیا ہے اور اس کو معاوضہ دیا ہے، اس کی عزت نفس کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ ایسے لوگ خیرات کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کو تم ڈھونڈو، یہ نہیں کہ وہ تمہیں ڈھونڈیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مسکین یہ نہیں ہوتا جو ایک کھجور یا دو کھجوریں لیتا ہے، ایک لقمہ یا دو لقمے لیتا ہے، بلکہ مسکین وہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں جو اس کی حاجت پوری کر سکے اور لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے کہ یہ مسکین بھی ہے یا نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی سے سوال کرتا ہے۔

ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی بندے سے نہ مانگا کرو۔ ایک صحابی کہتے ہیں: اس دن کے بعد اگر گھوڑے پر میں بیٹھا ہوتا اور میرا بید گر جاتا، ساتھ کوئی آدمی کھڑا ہوتا میں اس کو نہ کہتا کہ میرا بید اٹھا کر دو، بلکہ میں گھوڑے سے اتر کر خود اٹھاتا تھا کہ جب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سوال نہ کرو تو اب سوال نہیں کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی نے فرما دیا ہے: جو بھی مانگنا ہے اپنے اللہ سے مانگو اور جب بھروسہ کرو تو اس ذات کا بھروسہ کرو جو حی ہے اور دائم ہے۔ ان پر توکل نہ کرو جو خود مر جائیں گے تو تیرا توکل کس کام کا ہوگا؟

واقعہ:

بنی اسرائیل میں ایک آدمی تھا، اس کا نام کفل تھا۔ وہ بڑا آدمی تھا، جس قسم کے گناہ کا موقع ملتا تھا وہ اس کو نہ چھوڑتا تھا۔ ایک لڑکی بڑی خوبصورت تھی، اس پر اس کی نظر تھی۔ اس نے اس کو مجبور کیا، لیکن لڑکی نے بات نہ مانی۔ اس نے کہا: میں گناہ نہیں کرتی۔ کچھ حالات ایسے ہوئے کہ ایک دن وہ لڑکی اس کے دروازے پر آگئی اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ وہ باہر نکلا اور حیران ہوگیا کہ وہ لڑکی کہ جس کے پیچھے اتنے عرصے سے پھر رہا ہوں، آج وہ میرے دروازے پر خود آگئی ہے۔ اس نے اس سے پوچھا: کیوں آئی ہو؟ اس نے کہا: میں آج مجبور ہو کر تیرے دروازے پر آئی ہوں۔ مجھے ساٹھ دینار کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا: ایک ہی شرط پر مدد کروں گا کہ تجھ سے زنا کروں گا۔ اگر راضی ہو تو ساٹھ دینار لے لو۔ اس لڑکی نے کہا: میں بھی تو مجبور ہو کر تیرے دروازے پر آئی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تو نے مجھے مفت کب دینے ہیں، میں راضی ہوں۔ اس نے ساٹھ دینار دے دیئے، اس کو کمرے

میں لے گیا۔

حدیث کے الفاظ ہیں کہ جیسے ایک مرد اپنی بیوی کے ساتھ جماع کے وقت بیٹھتا ہے ایسے تیار ہو کر جب بیٹھا تو لڑکی رونے اور کانپنے لگ گئی۔ اس نے کہا: کیوں روتی ہو اور کیوں پریشان ہوتی ہو؟ میں نے تم پر کوئی جبر تو نہیں کیا ہے۔ اس نے کہا: تو نے جبر نہیں کیا، لیکن میرا رب جانتا ہے کہ میں نے کبھی یہ گناہ نہیں کیا، لیکن یہ مجبوری کروا رہی ہے۔ اس نے کہا: تو سچ کہتی ہے؟ اس نے کہا: میں سچ کہتی ہو۔ اللہ کی قسم جس خدا نے مجھے پیدا کیا ہے! میں نے کبھی زنا نہیں کیا ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور کپڑے پہن لیے اور کہا: تم یہ ساٹھ دینار بھی لے جاؤ، تم مجبور ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں گناہ گار ہوں، لیکن میں کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ آج تم میری بھی گواہ بن جاؤ کہ مجھے بھی اپنے رب کی قسم ہے کہ آج کے بعد گناہ نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے! وہ اسی رات مر گیا۔ صبح کو جب لوگ آئے تو اس کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ میں نے اس کو جنت میں داخل کر دیا ہے۔

یہ مطلب ہے کہ جب آدمی صحیح معنی میں کسی مجبور کو دیتا ہے اور پھر اپنی غرض نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ اس لیے حکم ہے: تم سوچ سمجھ کر دو جب بھی دو اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دو۔

مانگنے کے لیے لپٹ جانا:

﴿لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سوال میں چمٹ جانا اور بار بار مانگنا الحاف ہے۔ اور لوگوں کو ایسی تکلیف دینی جس کی اس کو ضرورت بھی نہیں ہے، لہٰذا وہ ہر سوال جو بغیر ضرورت کے لیے کیا جائے الحاف میں آتا ہے۔ الحاف کا اصل معنی ہوتا ہے کہ مثلاً: ایک ریال دے دیا، لیکن وہ پیچھے پڑ جائے کہ دو ریال دے دو۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس کو ضرورت نہیں ہے، لیکن پھر بھی مانگ رہا ہے۔

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ قبیلہ بنو مزینہ کا ایک آدمی تھا، اس کو اس کی والدہ نے کہا کہ تم حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں جا کر سوال کرو۔ وہ کہتے ہیں: جب مجھے میری والدہ نے بھیجا تو میں سوال کرنے کے لیے آیا تو حضور اکرم ﷺ خطبہ پڑھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: جو شخص سوال سے بچتا ہے اللہ بھی اس کو سوال سے بچا لیتا ہے، یعنی کسی کے آگے اپنی فقیری غریبی ظاہر نہیں کرتا تو اللہ بھی اس کو غنی بنا دیتے ہیں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس پانچ اوقیہ کی بھی مالیت ہو تو وہ کسی سے سوال نہ کرے۔ اگر وہ سوال کرے گا یہ الحاف ہے۔......... غلام بھی پانچ اوقیہ سے قیمتی ہے تو میں کیوں سوال کروں؟ جب کوئی آدمی سوال کا عادی ہو جاتا ہے تو

وہ ساری زندگی مانگتا رہتا ہے۔ اس کو جتنا مل جائے اس کا دل نہیں بھرتا، وہ اور مانگتا رہے گا۔ اور جو لوگ سوال سے بچتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بغیر سوال کے بھی دے دیتے ہیں۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا صدقہ کی اشرفیاں قبول کرنے کا واقعہ:

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے بارے میں واقعہ آتا ہے کہ ان کے ایک مرید نے اس زمانہ میں آ کر اشرفیاں پیش کیں کہ حضرت! ان کو قبول فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا: مجھے ضرورت نہیں ہے، کسی ضرورت مند کو جا کر دے دو۔ اس نے کہا: حضرت! آپ ان کو مدرسہ میں خرچ کر دیں۔ فرمایا: مدرسہ بھی موجود ہے اور طالب علم بھی موجود ہیں۔ مدرسہ میں جا کر جمع کرا دو۔ وہ محبت کے ساتھ آیا تھا، اس نے دیکھا کہ حضرت نہیں مانتے، میں کیا کروں؟ جب حضرت نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے، جوتا باہر رکھ دیا۔ اس آدمی نے جوتے کے اندر اشرفیاں چھپا کر رکھ دیں اور خود نماز میں شریک ہو گیا اور نماز پڑھ کر چلا گیا۔ حضرت جب نماز پڑھ کر باہر نکلے تو شریعت کے اندر حکم یہ ہے کہ اگر تم نے جوتا باہر رکھا ہو تو اس کو پہننے سے پہلے ہلا لو، ممکن ہے کوئی ایذا دینے والی چیز کیڑا مکوڑا، کوئی بچھو اس میں داخل ہو گیا ہو اور تم بغیر دیکھے پہن لو، اس لیے اس کو ہلانا چاہیے۔ بہر حال حضرت نے جب جوتا ہلایا تو اشرفیاں باہر آ گئیں۔ حضرت ہنس پڑے اور طالب علموں سے کہا: دیکھو! دنیا بڑی بدبخت چیز ہے۔ اس کے پیچھے بھاگو تو یہ ملتی نہیں ہے، اس سے بھاگو تو یہ پاؤں میں آ کر پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ان کو اٹھا کر مدرسہ میں جمع کرا دو اور فقیر کو ان کی ضرورت نہیں ہے۔

اصل بات اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے کہ آدمی کا اپنے اللہ پر کیا یقین ہے!! حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرماتے تھے: دو آدمی ہوتے ہیں، آم بیچنے کے لیے نکلتے ہیں: ایک آدمی سڑک کے کنارے یا محلے کے کنارے ریڑھی لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے دماغ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈالی ہے کہ میں یہیں کھڑا رہوں گا اور میرے آم یہیں بکیں گے اور اس کے آم بھی بک جاتے ہیں۔ اور دوسرا آدمی سر پر ٹوکرا رکھ کر ساری گلیاں پھرتا رہتا ہے، آم اس کے بھی بک جاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ پر اپنا اپنا یقین ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو رزق دیں گے، کوئی بھیک مانگ کر کھائے گا، کوئی گھر بیٹھ کر کھائے گا اور کوئی تجارت سے کھائے گا۔ رزق جو اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے وہ ملنا ہے۔

حدیث قدسی:

ایک روایت مبارک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی آدم کو خطاب فرماتے ہیں: اے ابن آدم! میں نے تم کو اپنی

عبادت کے لیے پیدا کیا، تم کھیل کود میں اپنے وقت کو ضائع کر رہے ہو۔ چند دن کی گھڑیاں ہیں، بعد میں موت ہے۔ عبادت اور اطاعت میں محنت کرو۔ اے ابن آدم! میں نے تیرا رزق لکھ دیا ہے، تیرے پیدا ہونے سے بھی پہلے لکھا گیا ہے، تم بلا وجہ اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ پر یقین کرو اور کوشش کرو۔ باقی رزق دینے والا اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اپنے آپ کو رزق کے لیے اتنی مصیبتوں میں نہ ڈالو کہ ضمیر بیچنا پڑے تو بیچ دو، اپنی غیرت بیچنی پڑے تو بیچ دو، عزت بیچنی پڑے تو بیچ دو، حرام کھانا پڑے تو کھالو، سود لینا پڑے تو لے لو اور رشوت لینی پڑے تو لے لو۔ یہ سب حرام ہے۔ یہ زیادہ نہیں ملتا ہے؛ کیونکہ یہ وقتی طور پر امتحان ہوتے ہیں۔ کبھی جب یہ مال زیادہ ہو جاتا ہے تو انسان کی تباہی و ہلاکت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ میرے پاس بڑا مال آ رہا ہے، لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ سارا مجھے غرق کرنے کے لیے آ رہا ہے، اس لیے آدمی اپنے اللہ پر بھروسہ رکھے اور اپنی طاقت کے مطابق جدو جہد کرے، اسباب تلاش کرے اور باقی یہ سمجھ لے کہ جو میرے اللہ نے لکھ دیا ہے وہ مجھے مل کر ہی رہنا ہے، اس کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو میرے مقدر میں نہیں لکھا ہے، میں چاہے الٹا بھی لٹک جاؤں، وہ مجھے نہیں ملے گا۔ لہٰذا پریشان ہونے اور غم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ماں باپ بڑے غریب تھے، اولاد کو اللہ تعالیٰ نے غنی بنا دیا۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ بڑی مشکل سے پیٹ پالتے ہیں اور بعض انگوٹھا لگانے والے کروڑوں میں کھیلتے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا نظام ہے۔ اس کے نظام پر ہر آدمی کو رہنا چاہیے۔ روزی نہ عقل سے ملتی ہے، نہ تعلیم سے ملتی ہے اور نہ طاقت سے ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر میں چاہتا تو اپنے سارے بندوں پر رزق کھلا کر دیتا، لیکن دنیا میں فساد ہو جاتا؛ کیونکہ جب دولت ملے گی تو فساد، بے حیائی اور برائیاں پیدا ہوں گی۔ اس لیے ہم نے ایک کو غنی بنایا اور ایک کو فقیر بنایا۔ یہ اس کے پیسے کا محتاج ہے اور وہ اس کے عمل کا محتاج ہے۔ اگر کوئی کسی کا محتاج نہ ہوتا تو دنیا میں فساد ہو جاتا، سارا نظامِ عالم تہہ و بالا ہو جاتا۔ اس لیے آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں! جن کو دولت ملی ان میں سے اکثر قارون، ہامان، فرعون، ابو جہل، عتبہ اور شیبہ بنے اور جو فقیر تھا وہ کوئی ابوذر بنا، کوئی سلمان بنا اور کوئی بلال بنا رضی اللہ عنہم۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی آدمی سوال کرے، لیکن اس کے پاس اتنا ہے کہ وہ رات دن روٹی کھا سکتا ہے، وہ محتاج نہیں ہے۔ قیامت والے دن اس کا چہرہ پھٹا ہوا ہوگا، وہ سوال اس کے چہرے پر ظاہر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں رسوا کریں گے اور محشر کے دن بھی رسوا کریں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کتنا ہو تو آدمی

غنی ہے؟ فرمایا: پچاس درہم ہیں یا اتنا سونا ہے۔

یا پچاس ریال کی گھڑی ہے تو وہ غنی ہے، اس کو سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

دنیا کی حقیقت اور بادشاہ کی حکایت:

ایک بادشاہ نے اللہ والے کے پاس لکھ کر بھیجا کہ میں نے دیکھا ہے کہ آپ کے لنگر میں روزانہ پانچ چھ سو آدمی آکر کھاتے ہیں، اس لیے میں نے مناسب یہ سمجھا کہ میں اپنی سلطنت میں فلاں جاگیر لنگر کے لیے وقف کرتا ہوں، آپ وہ جاگیر قبول فرمائیں۔ ان اللہ والوں نے اس خط کے پیچھے لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اتنی بڑی جاگیر دی ہوئی ہے کہ تیری جاگیروں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بعض خوشامدیوں نے بادشاہ کو بھڑکایا کہ بزرگ نے آپ کی توہین کی ہے۔ بادشاہ نے غصہ میں آکر آرڈر کردیا کہ ان سے کہو کہ یا تو جاگیر قبول کریں یا میرے ملک سے نکل جائیں۔ ان بزرگوں کو اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا: جاگیر ہم قبول نہیں کرتے اور باقی بادشاہ نے لکھا ہے کہ ملک سے نکل جاؤ۔ ملک اللہ کا سمجھتے ہیں، بادشاہ کا ملک ہم نہیں سمجھتے ہیں، لہٰذا ہم نہیں نکلتے۔

بادشاہ اور زیادہ جوش میں آگیا کہ میرے آرڈر کی تعمیل نہیں ہوتی۔ ابھی وہ بادشاہ کچھ فیصلہ کرنے والا تھا کہ اس کے پیٹ میں درد شروع ہوگیا، اتنی تکلیف بڑھ گئی کہ طبیب ڈاکٹر سب دوڑ کر دیکھ رہے ہیں، لیکن کوئی چیز فائدہ نہیں دے رہی تھی۔ بادشاہ کی والدہ زندہ تھی، اس کو پتہ چلا کہ بیٹے کو تکلیف ہے، اس نے پوچھا، طبیبوں نے کہا: کچھ سمجھ نہیں آتی۔ والدہ سمجھدار تھیں، اس نے پوچھا کہ ان دو چار دنوں میں کوئی واقعہ تو نہیں گزرا کہ کسی مسکین غریب کو ستایا ہو اور اس کی بددعا لگ گئی ہو؟ بادشاہ نے کہا: اور تو کوئی نہیں، مگر فلاں بزرگ کے ساتھ میرا یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ والدہ نے کہا: تم نے ان کو کیوں چھیڑا تھا؟ بادشاہ نے کہا: اماں جان! اب تو غلطی ہوگئی۔ بادشاہ کی ماں نے کہا: تم ان سے معافی مانگو۔ اس نے کہا: میں اب کیسے معافی مانگوں؟ میں تو ان کے ساتھ زیادتی کر بیٹھا ہوں۔

والدہ نے کہا: میں حضرت کے دروازے پر جاتی ہوں اور وہ حضرت کے دروازے پر پہنچیں اور کہا: فلاں بادشاہ کی والدہ ہوں، اس کو معاف کردو، اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ بزرگوں نے کہا: ٹھیک ہے، ہم معاف کردیں گے، لیکن ہم بھی بغیر عوض کے معاف نہیں کرتے۔ اس کو کہو: ایک بوتل میں اپنا پیشاب بھجوائے اور ساتھ ایک پروانہ لکھ کر بھیجے کہ یہ آدھا ملک تمہارا ہے اور آدھا ملک ہمارا ہے۔ اس طرح وہ ٹھیک ہوجائے گا، ورنہ درد کو بھگتے۔ بادشاہ نے کہا: میری تو جان بچنی چاہیے، اسی وقت اس نے لکھ کر دے دیا۔ بزرگ نے فرمایا: بادشاہ کو جاکر کہہ دو کہ تیرے

آدھے ملک کی قیمت یہی پیشاب کے قطرے ہیں۔ اور انہوں نے وہ پروانہ پیشاب کی بوتل میں ڈال کر دیا اور فرمایا: اس کو کہو: یہ اپنی جائیداد سنبھال کر رکھو، مجھے تمہارے ملک کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم جس ملک میں رہتے ہیں ہم کو اس کی ضرورت ہے۔

اس لیے جو اللہ والے ہوتے ہیں ان کو کسی کے محتاج ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، ان کو تو اللہ تعالیٰ سے لینا ہے۔ اور جو لوگوں سے مانگے تو سمجھ لو کہ یہ کبھی اللہ والا نہیں ہو سکتا۔

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اللہ والے نوجوان سے ملاقات کا واقعہ:

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ میں حج پر گیا۔ راستہ میں ایک خوبصورت نوجوان کو احرام باندھے ہوئے دیکھا کہ وہ پیدل چل رہا ہے۔ میں نے اس کو روکا، وہ آکر ملا۔ میں نے اس سے پوچھا: اکیلے ہو یا کوئی جماعت بھی ساتھ ہے؟ اس نے کہا: کوئی جماعت نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا: کوئی سواری ہے؟ اس نے کہا: کوئی سواری نہیں ہے۔ میں نے کہا: اتنا دور کا سفر ہے، تم اکیلے آدمی ہو۔ کوئی زادِ راہ ہے؟ اس نے کہا: کچھ نہیں ہے۔ میں نے کہا: کیا کر رہے ہو؟ وہ نوجوان ہنس پڑا اور میرا نام لے کر کہنے لگا: مالک بن دینار! سخی کے دروازے پر کچھ لے کر جانے سے شرم آتی ہے۔ مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حیران ہو گیا کہ اس نے میرا نام کیسے لیا ہے؟ میں نے تو اس کو زندگی میں کبھی دیکھا بھی نہیں ہے۔ بہرحال میں نے اس کو پیشکش کی کہ میرا ایک اونٹ قبول کر لو اور یہ سامان قبول کر کے میرے سفر کے ساتھی بن جاؤ۔ اس نے کہا: اللہ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے، مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

فرماتے ہیں: وہ پھر گم ہو گیا، میں نے اس کو بڑا تلاش کیا۔ میں جب حج میں پہنچا تو اس کو دیکھا کہ طواف کر رہا ہے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ طواف ختم کروں اور اس کو مل لوں، لیکن وہ مجھے نہ ملا۔ اور جب ہم منیٰ میں آگئے، مسجد خیف میں رات کے وقت مجھے رونے کی آواز آئی۔ فرماتے ہیں: میری آنکھ کھلی، میں نے دیکھا: وہی نوجوان کھڑا ہے اور اپنے اللہ کے آگے رو رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! پیسے والے لوگ قربانیاں کر رہے ہیں، میرے پاس تو اپنی جان کے سوا کچھ نہیں ہے، اگر قبول کرنی ہے تو کر لیں۔ اور ''اللہ اکبر'' کہہ کر سجدہ میں گیا اور فوت ہو گیا۔

یہ اللہ والے لوگ ہوتے ہیں، ان کی نظر دولت پر کبھی نہیں ہوتی، بلکہ ان کی نظر اللہ پر ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی بندے سے سوال نہیں کرتے، نہ اشارۃً، نہ کنایۃً اور نہ ان کو کبھی اس بات کی غرض ہوتی ہے۔

حدیث:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس چالیس درہم ہیں وہ سوال کرے تو وہ ملحف ہے۔ اور اس کی قیمت ریت کی طرح ہوگی، یعنی اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

ان آیات مبارکہ میں وہ شخص بھی داخل ہے جو اپنے گھر والوں پر خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو صدقہ کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ تجھ کو اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے، حتیٰ کہ جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو اس کا بھی اللہ تمہیں بدلہ عطا فرمائیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! گھر والوں پر خرچ کرنا تو واجب ہے، پھر اس پر ہمیں صدقہ کا ثواب کیوں ملتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم یہی پیسے کسی گندی عورت کو کھلاتے تو تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا یا نہ آتا!؟ اس لیے جب تم اپنے جائز مصرف پر خرچ کر رہے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس پر صدقہ کا ثواب دیں گے۔

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت میں یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو جہاد کے لیے گھوڑے پال رہے ہیں اور دن رات ان کو کھلا رہے ہیں۔ ان کو بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۷۵]

''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) نہیں اٹھیں گے، مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہو جس کو جن لپٹ کر خبطی بنا دے۔ یہ حالت اس وجہ سے ہوگی کہ انہوں نے کہا تھا کہ بیع بھی سود کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے سوداگری کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ پس جس کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ پہلے لے چکا ہے وہ اسی کا رہا اور اس (کی معافی) کا معاملہ اللہ کے حوالہ رہا اور جو شخص پھر سود لے گا تو وہ لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

ربطِ آیات:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ربوا کی حرمت اور ربوا کھانے والوں کے احوال کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ اس سے پہلے صدقات وخیرات کا بیان تھا، جن کا بہت بڑا ثواب ہے۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ربوا کو بیان فرمایا ہے، جسے آپ آج کل سود کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں یہ طرز ہے کہ ہر دو ضدین کا ذکر کیا جاتا ہے، یعنی اگر کافروں کا ذکر آئے گا تو ان کے بعد مومن کا بھی ذکر آئے گا اور اگر جنت کے احوال آئیں گے تو اس کے بعد جہنم کا ذکر بھی آئے گا؛ کیونکہ ضدین سے بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے۔ اسی طرح جہاں جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے تو اس کے بعد جہنم کے عذابوں کا بھی ذکر ہے اور جہاں احوالِ سعداء کا ذکر ہے تو اس کے بعد احوالِ اشقیاء کا بھی ذکر ہے۔

اب دیکھیں کہ صدقہ وخیرات میں غریب کی ہمدردی اور اعانت مقصود تھی اور سود کے اندر غریبوں پر ظلم اور اپنا فائدہ مقصود ہے تو یہ ضدین ہیں۔ خیرات میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے اور سود میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہے۔ صدقات وخیرات کے فوائد دنیا میں بھی ہیں اور آخرت میں بھی ہیں، سود کی بربادی دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی ہے۔ یہ دونوں ضدین ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے پہلے صدقات ونفقات کا بیان فرمایا تو اب ان آیات مبارکہ میں سود کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

سود کی اقسام:

ہمارے ہاں ''ربوا'' کو سود کہا جاتا ہے، سود کا لفظ عربی کا لفظ نہیں ہے۔ عربی میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا، بلکہ لفظ ''ربوا'' استعمال ہوتا ہے۔ ربوا دو قسم پر ہے: 1...... ربوا نسیئہ: کہ آپ نے کسی کو ایک ہزار بطور قرض دیئے اور کہا کہ دو مہینے کے بعد آپ مجھے گیارہ سو واپس کریں گے۔ 2...... ربوا الفضل: آپ کے پاس بھی کھجور ہے اور دکاندار کے پاس بھی کھجور ہے۔ دکاندار نے کہا: میری کھجور زیادہ اچھی ہے، میری ایک کلو کھجور کے بدلے میں آپ اپنی دو کلو کھجور دے دو۔ اس کو ''ربوا الفضل'' کہتے ہیں؛ کیونکہ ان کی جنس ایک ہے۔ اس طرح سے تبادلہ کرنا بھی سود کے حکم میں ہے اور یہ حرام ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے دور میں زیادہ تر ربوا النسیئہ تھا۔ اس لیے زیادہ تر اس کے بارے میں احکام ذکر کیے گئے ہیں، ورنہ ربوا کی سب قسمیں حرام ہیں۔

سود کا حکم:

اگر کوئی آدمی سودی لین دین کرتا ہے اور سود کو حلال بھی سمجھتا ہے تو اس کے کفر کے اندر کوئی شک نہیں ہے۔ تمام ائمہ اربعہ کے نزدیک وہ کافر ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ربوا کو حرام قرار دیا ہے اور اس نے ربوا کو حلال کہا ہے۔ اور اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے قرآن کی ایک آیت کا انکار کرے تو کافر ہے اور سارے قرآن کا انکار کرے تو بھی کافر ہے۔

اگر وہ سود کو حلال نہیں کہتا، لیکن سودی کاروبار کرتا ہے تو یہ فاسق و فاجر ہے، اس پر کفر کا فتویٰ نہیں ہوگا، لیکن فسق و فجور کا فتویٰ ہوگا۔ یہ اتنے بڑے گناہ میں مبتلا ہے کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کو کہہ دو: یہ اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ نہ کریں۔ اس سے خود اندازہ لگالیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول سے مسلمان تو جنگ نہیں کرے گا، بلکہ کافر ہی جنگ کرے گا۔

سود کھانے کا معنی:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ ربوا کھاتے ہیں۔ یہاں لفظ ''یَأْکُلُوْنَ'' استعمال فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض چیزیں کھائی جاتی ہیں اور بعض چیزیں پہنی جاتی ہیں۔ مثلاً: آپ نے مجھے رومال دیا، میں نے پہن لیا۔ یہ تو کسی نہ کسی شکل میں واپس ہوسکتا ہے، لباس بھی پہننے کے بعد واپس ہوسکتا ہے اور مکان بھی رہنے کے بعد واپس ہوسکتا ہے، لیکن آدمی جو چیز کھا جائے وہ واپس نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اللہ نے ''یَأْکُلُوْنَ'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جیسے کھائی ہوئی چیز واپس نہیں ہوسکتی، اسی طرح سود والے کی نیت کسی کا بدلہ یا بھلا کرنا نہیں، بلکہ کھانا مقصود ہوتا ہے کہ ہمیں فائدہ ہو، چاہے پورا معاشرہ برباد ہوجائے۔

سود خور کی سزا:

سود خور نہیں اٹھیں گے قیامت والے دن، مگر ان لوگوں کی طرح جن کو شیاطین نے چھو کر خبطی بنادیا ہو۔

مثلاً: ایک آدمی کو جنون ہے اور ایک آدمی وہ ہے جس کو مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور ایک شخص وہ ہے کہ جس پر جن کا سایہ ہے، اس جن کی وجہ سے وہ خبطی ہوگیا ہے، کبھی پاگلوں والی باتیں کرتا ہے اور کبھی عقل والی باتیں کرتا ہے، کبھی پاگلوں والی حرکات کرتا ہے اور کبھی عقل والوں کی حرکات کرتا ہے۔ عقل اور بے عقلی خلط ملط ہوجاتی ہے۔ اس کو خبط کہتے ہیں۔

سود کھانے والے اس خبط کی حالت میں کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر عمل کی سزا تقریباً جنسِ عمل سے دیتے

ہیں۔ جیسا کہ عالم حق بات نہ کہے تو قیامت والے دن اس کو جہنم کی لگام میں چڑھائی جائیں گی؛ کیونکہ اس نے اس زبان سے حق نہیں کہا تو اس کو لگام دی جائے گی۔

سود کھانے والے کو یہ سزا ملے گی کہ بے عقلی کو عقل کہا، مال حرام کو حلال کہا۔ جیسے اس نے دنیا میں عقل اور بے عقلی کو ملا دیا تھا، قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو قبر سے بھی ایسی حالت میں اٹھائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ مجنون ہوگا؛ کیونکہ مجنون کو تو کوئی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا ہے، ورنہ ان کو جہنم کی سزا دینے کا کیا مطلب ہے!؟ علماء نے فرمایا: اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ کسی پر جن ایسا اثر کر سکتا ہے کہ اس کی عقل کو بے عقلی میں بدل ڈالے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مثال دی ہے۔ اگر اس کی حقیقت نہ ہو تو اس کا کیا مطلب ہوگا؟ اور اس بات کو اطباء اور فلاسفہ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ آدمی جب پاگل ہو جاتے ہیں، اس کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ جنات کے اثرات کی وجہ سے اس کے دماغ پر اثر ہوتا ہے اور وہ مجنون والی کیفیات میں ہوتا ہے۔ جیسے مجنون کو چار چار آدمی پکڑیں، لیکن وہ قابو میں نہیں آتا ہے، اس طرح جب جن کسی پر اثر کر لیتا ہے تو اس کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ اس کو کئی آدمی پکڑیں تب بھی وہ سب کو گرا دے گا۔ کوئی آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ایک بندے میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی ہے؟

سود اتنا بڑا جرم ہے کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ سود کا ادنیٰ سے ادنیٰ جرم اپنی سگی ماں سے ستر بار زنا کرنے کے برابر ہے۔

سود یہودیوں کی عالمی سازش:

یہ ایک ایسی وبا ہے جو پورے عالم کو اپنے لپیٹ میں لے چکی ہے: کیونکہ یہودیت نے پورے عالم پر اپنا کنٹرول کرنے کے لیے فیصلہ کیا کہ ہم اقلیت میں ہیں، ہمارے مقابلہ پر ارب ہا مسلمان ہیں، عیسائی بھی ان کے خیر خواہ نہیں ہیں، اگر چہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے لاکھ دفعہ مل جائیں، لیکن اندر سے ان کے دل بھی آپس میں بٹے ہوئے ہیں؛ کیونکہ یہودی نصرانی کو حق پر نہیں سمجھتے اور نصرانی یہودی کو حق پر نہیں سمجھتے اور ان دونوں کے عقیدوں کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں کہ اگر یہودیوں کو موقع ملا تو انہوں نے عیسائیت سے انتقام لیا اور عیسائیت کو موقع ملا تو انہوں نے یہودیت سے انتقام لیا، لہٰذا وہ آپس میں دشمن ہیں،

اگرچہ کوئی وقتی مصلحت ان کو اکٹھا کر دے۔ یہودیوں کی سوچ تھی کہ جب ہم تھوڑے ہیں تو ہم کیسے دنیا پر حکمرانی کا خواب پورا کر سکتے ہیں؟ انہوں نے اقتصادی ماہرین کو بٹھایا کہ آنے والی صدیوں میں جو کچھ بھی ہوگا اقتصاد کے پیش نظر ہوگا۔ جو ملک اقتصادی طور پر مضبوط ہوں گے وہ کسی کے تابع نہیں ہوں گے، وہ آنکھ اٹھا کر بات کریں گے۔ اس لیے انہوں نے اقتصادی لیور اپنے ہاتھ میں رکھا اور پوری دنیا میں یہودی اسکیموں کا جال پھیلا دیا۔ اس سے ان کو دو فائدے ہوئے: پہلا تو یہ فائدہ ہوا کہ اسکیم کا جو موجد ہے نفع اس کو جائے گا۔ دوسرا فائدہ ان کو یہ ہوا کہ کسی نہ کسی شکل میں مسلمان کے پیٹ میں حرام داخل ہو گیا۔ جب مسلمان کے پیٹ میں حرام داخل ہو جائے تو اس کے دو نتیجے نکلتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی رحمتیں رک جاتی ہیں، دعائیں منظور نہیں ہوتیں اور دنیا میں اس کو ذلت اور رسوائی حاصل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے سود کے ایسے جال پھیلائے گئے ہیں کہ بہت کم بندے ہیں جو اس جال سے باہر نکلتے ہیں۔

آج لوگوں کو یہ دھوکہ دیا جاتا ہے کہ سود کے بغیر کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط اور سفید جھوٹ ہے۔ اس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے؛ کیونکہ میرے آقائے نامدار سرکار مدینہ ﷺ کا زمانہ مبارک خلفائے راشدین کا زمانہ حضرت حسن و حسین، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد بھی اسلامی ذہن والے بادشاہ آتے رہے۔ پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ ہوا۔ ایک طرف اس کی حدیں بحر اوقیانوس سے جا ملیں، دوسری طرف دریائے جیحون تک حدیں تھیں اور ہسپانیہ تک اسلام پہنچ گیا، چین تک اسلام نے جھنڈے گاڑ دیئے۔

لیکن اس زمانہ میں تو کوئی سود نہیں تھا تو پھر انہوں نے کیسے ترقی کی تھی؟ اگر سود کے بغیر کام نہیں چل سکتے تو انہوں نے کیسے حکومت کی تھی؟ یورپ جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور اسلام کا چور ہے انہوں نے ہمارا علم چرایا اور اپنا نام لگا دیا۔ ان کی جتنی ترقیاں ہیں ان کے موجد مسلمان ہیں۔

اس کی تازہ مثال دیکھ لیں کہ دنیا کا بڑا باکسر ٹائی سن مسلمان ہو گیا۔ وہ جہاں مقابلے کے لیے جاتا ہے تو پہلے تو پورا پریس بائیکاٹ کر دے گا اور اس کی خبریں بھی نہیں آنے دے گا۔ اگر پریس مجبور ہو جائے تو اس کا نام مسلمانوں والا عبدالعزیز نہیں لکھیں گے، بلکہ ٹائی سن لکھیں گے، وگرنہ نام پڑھ کر لوگوں کو یہ تاثر ملے گا کہ مسلمان جیت گیا ہے۔ اس کا عالمی مقابلہ ہوا، اس نے رنگ میں آنے سے پہلے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگایا تو پورے پریس نے بائیکاٹ کر دیا کہ یہ آواز ٹی وی پر نہیں آنی چاہیے۔ یہ تو اتنے بڑے غدار ہیں کہ ہمارے ایک کھلاڑی کا نام آگے نہیں آنے دیتے،

ہمارے کسی ایک ذہین آدمی کا نام آگے نہیں آنے دیتے۔

یہ بد بخت اتنی دور کی سوچ کر بیٹھے ہوتے ہیں کہ کہیں ان کو مسلمان کا ابھرتا ہوا ستارہ نظر نہ آئے، ان کو چاہے جس طرح سے کمند ڈالنی پڑے، دولت دے کر کمند ڈالنی پڑے یا لڑکی دے کر کمند ڈالنی پڑے تو یہ کر لیتے ہیں، تاکہ مسلمانوں کا ستارہ عروج پر پہنچ کر ماہِ تاباں نہ بن جائے، شمسِ کامل بن کر دنیا میں اسلام پھیلانے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ ان کی ساری ترقی کو آپ قریب ہو کر دیکھیں تو تمام ہوائی جہازوں کی ایجادات، تمام ایٹمی ایجادات، ان تمام بحریہ کی ایجادات اور تمام چیزوں کے موجد اعلیٰ اور موجد اصلی مسلمان ہیں۔ اسلام نے چودہ سو سال پہلے جو باتیں حضور اکرم ﷺ کی زبان سے بتا دیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اشارۃً ایک واقعہ بتا دیا، اس کو سامنے رکھ کر انہوں نے ایجادات کی ہیں۔

ان کا یہ کہنا ہے کہ سود کے بغیر کوئی ملک نہیں چل سکتا۔ یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ یاد رکھیں! وہ ملک اس لیے نہیں چل سکتا کہ ساری دنیا کو انہوں نے سود میں لگایا ہوا ہے۔ اگر ایک مسلمان ہمت کرے تو ساری دنیا سے لین دین کیسے کرے؟ اب دنیا میں بعض بینک اسلامی اصولوں کے مطابق نظامِ مشارکت پر، نظامِ مضاربت اور نظامِ مرابحت پر کاروبار شروع کر رہے ہیں۔ ان کا باقاعدہ نظام چل رہا ہے اور وہ معترف ہیں کہ جتنا اسلام کے نظام میں بھلائی ہے اتنا سود کے کاروبار میں فائدہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا لوگوں کے دماغ میں وہ یہ بات ڈالتے ہیں: فلاں کافر ملک ہے، وہ ترقی کر گیا ہے؛ کیونکہ وہ سود کھاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ ان کو صنعت سے ترقی ہوئی ہے، جدید ٹیکنالوجی سے ان کی ترقی ہوئی ہے، محنت اور کام سے ترقی ہوئی ہے۔ تم نے محنت چھوڑ دی تو کیسے ترقی ہو سکتی ہے؟

مثال کے طور پر میرے اپنے ملک کے بعض بھائی یہاں ایک کفیل کے پاس آنے کے بعد اٹھارہ گھنٹے بھی ڈیوٹی دیتے ہیں، جنہوں نے کبھی اپنے ماں باپ کی بھی چودہ چودہ گھنٹے ڈیوٹی نہیں دی۔ اگر وہ اتنی محنت سے اپنے ماں باپ کے کام کرتے تو گھر بیٹھے ہوئے سونا چاندی سے کھیل رہے ہوتے، لیکن وہاں خان صاحب ہو جاتے ہیں اور یہاں کہتے ہیں کہ کیا کریں وطن چھوڑ کر آئے ہیں؟ اس لیے سہنا پڑتا ہے۔ اگر اتنا اپنے معاشرے میں محنت کر لیتے تو ذلیل نہ ہوتے۔ اتنی محنت وہاں کرتے تو ترقی کر سکتے تھے۔ جو قومیں محنت کرتی ہیں وہ بامِ عروج پر پہنچ جاتی ہیں اور جو قومیں منشیات و مخدرات میں، بے حیائی میں، عیاشی میں، زنا میں، شراب میں اور فلموں میں پڑتی ہیں تو وہ قومیں

ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاتی ہیں۔ان قوموں کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔

کیا سود بیع کی طرح ہے؟

محدثین نے لکھا ہے کہ سود ایک ایسی لعنت ہے کہ چالیس سال کے اندر اس کے اثرات ہلاکت لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سود خور لوگوں کو قیامت کے دن خبطی بنا کر کھڑا کریں گے؛ کیونکہ یہ لوگوں کو کہتے تھے کہ بیع سود کی طرح تو ہے۔ جب بیع حلال ہے تو سود بھی حلال ہے۔ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ سود بیع کی طرح ہے، بلکہ انہوں نے کہا کہ بیع ربوا کی طرح ہے، یعنی انہوں نے ربوا کو اصل قرار دیا، حالانکہ بیع کو اصل قرار دیتے، بلکہ انہوں نے کہا: بیع وتجارت کے اندر بھی تو یہی ہوتا ہے کہ ایک ریال کی چیز دو ریال کی بیچتے ہو اور سود میں بھی ہم یہی کرتے ہیں ایک ریال کا ڈیڑھ ریال لیتے ہیں۔ دونوں کی ایک جیسی چیزیں ہیں، لہٰذا سود بھی حلال ہے۔اس کے دو جواب ہیں:

1 ...... حاکمانہ جواب:

اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے تو تم کہنے والے کون ہو؟ اس لیے مسلمان کو کسی تحقیق میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

2 ...... حکیمانہ جواب:

احادیث میں تفصیل موجود ہے کہ اگر بیع اور ربوا کی تمہیں ایک شکل نظر آتی ہے کہ تجارت میں نفع ملتا ہے اور سود میں بھی نفع ملتا ہے، لہٰذا سود حلال ہے۔ تو بیوی اور ماں کی شکل بھی ایک ہے، ان میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی عورت ہے اور وہ بھی عورت ہے۔ بیوی اور بہن میں کیا فرق ہے؟ یہ بھی عورت ہے اور وہ بھی عورت ہے۔ جب ایک طرح ہیں تو دونوں حلال ہونی چاہییں۔ کتے اور بکری میں کیا فرق ہے؟ بکری کی بھی چار ٹانگیں ہوتی ہیں اور کتے کی بھی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات دونوں کا قد اور وزن بھی برابر ہوتا ہے، لیکن کتا حرام اور بکری حلال کیوں ہے؟ اسی طرح اگر آپ حلال کرنا شروع کر دیں تو ہر چیز حلال ہو جائے گی۔ حلت وحرمت کے پیمانے تیری عقل کے اندر ہیں یا اللہ کے پاس ہیں!!؟

اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرما دیا ہے: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ﴾ [النساء: ۲۳] تمہارے اوپر

ماں بھی حرام ہے، بہن بھی حرام، اسی طرح وہ بہنیں جن کے ساتھ تم نے دودھ پیا وہ بھی حرام، وہ مائیں جن کا تم نے دودھ پیا وہ بھی حرام ہیں۔ لہٰذا اللہ نے جن چیزوں کو حرام کر دیا مسلمانوں کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ حرام ہیں۔ اور جن چیزوں کو حلال کر دیا ہے اتنا کافی ہے کہ وہ حلال ہیں۔ اس سے زیادہ ہمیں بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

سود اور بیع میں فرق:

علماء نے فرمایا: اگر غور کیا جائے تو سود بیع کی طرح نہیں ہے۔ مثلاً: میں نے ایک گلاس ایک ریال میں خریدا اور میں نے اس کو ڈیڑھ ریال میں بیچا تو ڈیڑھ ریال کے عوض میں آپ کو گلاس ملا یا نہیں ملا؟ اور سود میں تو میں نے سو ریال دیا اور ڈیڑھ سو ریال لیا۔ وہ پچاس ریال کس چیز کا بدلہ ہے؟ صرف وصف کا عوض ہے، ورنہ معاوضہ میں کوئی اور چیز تو نہیں ملی ہے۔

دوسری بات یاد رکھیں! تجارت اپنی مرضی سے ہوتی ہے، لیکن سود کبھی اپنی مرضی سے نہیں ہوتا ہے۔ مجھے ضرورت ہوگی تو میں بیع کروں گا اور اگر ضرورت نہ ہوگی تو میں بیع نہیں کروں گا۔ اور سود تب ہی ہوتا ہے کہ مجھے مجبوری ہے، میں نے قرض دینا ہے، قرض دار میرے دروازے پر بیٹھا ہوا ہے، مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تو میں سود لینے پر جبراً تیار ہو رہا ہوں، اپنی رضامندی سے راضی نہیں ہو رہا ہوں۔ یہاں ظلم ہے، تراضی کی کوئی شکل نہیں ہے۔

ایک بنیادی بات یاد رکھیں! باریک بات ہے، لیکن کاروباری حضرات اس کو سمجھ سکتے ہیں، لیکن میرے جیسے مولویوں کے لیے بڑی مشکل بات ہے۔ اصل چیز سونا چاندی بالذات مقصود نہیں ہوتا، بلکہ یہ چیزیں حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں۔ میرے پاس دس تولہ سونا ہے، مجھے کوئی چیز خریدنے کی ضرورت پڑ گئی، میں نے سونا بیچ دیا۔ میرے گھر میں ایک کلو سونا ہو، آٹا ختم ہو جائے، مجھے بھوک لگے تو کیا میں سونا کھاؤں گا؟ روٹی کو تو کھا سکتا ہوں، دو دن کی بچی ہوئی ہو تب بھی کھا سکتا ہے، لیکن سونا اتنا قیمتی ہونے کے باوجود بے کار ہے، حالانکہ ساری دنیا کا نظام سونے چاندی پر چل رہا ہے۔ اس لیے سونے کو عربی میں ''ذَهَب'' کہتے ہیں، اس کا معنی ہے: ''گیا''۔ ''فِضَّة'' ٹوٹ جانے سے ہے۔ ''ذَهَب'' کو ذہب اس لیے کہتے ہیں کہ آج میرے پاس ہے، کل کو دوسرے کے پاس چلا گیا، پھر تیسرے کے پاس چلا گیا، یہ چلا ہی گیا۔ اس کو آپ کتنا ہی جوڑیں آپ اس کے اوپر سانپ بن کر بیٹھے رہیں گے، آپ مریں گے تو آپ کے وارثوں کے پاس چلا جائے گا۔ اسی طرح یہ رکتا نہیں ہے۔

اب مسئلہ سمجھیں کہ ہم نے ریال دے کر گلاس خریدا تو ہم نے ریال کو وسیلہ بنایا، اصل نہیں بنایا ہے، لیکن جب ہم نے ریال دے کر ریال لیا تو ریال کو ہم نے استعمال کیا، اس کو وسیلہ نہیں سمجھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو وسیلہ بنایا تھا، یہ نہیں فرمایا تھا کہ یہ خود بھی بذات خود کوئی چیز ہے۔ اب سود خور نے اس وسیلہ کو اصل بنالیا اور جو اصل تھا اس کی قیمت ختم ہوگئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔

آپ اقتصادی لوگوں کے پاس بیٹھ کر باریکیاں سمجھا کریں، ہم تو سنی سنائی باتیں کرتے ہیں؛ کیونکہ ہماری وہ فیلڈ نہیں ہے، ہم اس کو اچھا نہیں سمجھتے، لیکن دنیا کے اندر جتنی اسکیمیں چل رہی ہیں، ان کے پیچھے یہودی ذہن بیٹھا کام کر رہا ہے۔ اور ان اسکیموں سے ان یہودیوں کو سالانہ ملین ڈالر بچ جاتے ہیں، جیسا کہ ٹریولر چیک کے بارے میں آپ نے بہت پیچھے، اس کتاب میں پڑھ لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: جس نے میرا قرآن پڑھنے کے بعد توبہ کرلی، اس کے پچھلے گناہ ختم کردیتے ہیں، لیکن اگر قرآن پہنچنے کے بعد بھی تم سود نہیں چھوڑو گے پھر تم ہمیشہ عذاب جہنم میں مبتلا رہو گے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا واقعہ:

پہلے زمانہ میں سود سے اتنا ڈر ہوتا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ایک دوست سے قرضہ لینا تھا۔ اس کے پاس جب گئے تو گرمی کا وقت تھا، کنڈی کھٹکھٹا کر سڑک پر کھڑے ہوگئے۔ جب گھر والا نکلا تو وہ دوڑ کر آیا اور کہا: کم از کم سائبان کے نیچے کھڑے ہوجاتے، دھوپ میں کیوں کھڑے ہوگئے؟ امام صاحب نے فرمایا: میں نے تم سے قرضہ لینا تھا، تمہارے گھر کی دیوار کے سائے کے نیچے کھڑے ہوکر یہ فائدہ اٹھانا قیامت میں سود نہ بن جائے۔ اس لیے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ وہ بلڈنگ اور وہ عمارت جن میں سودی کاروبار ہوتا ہے آدمی ان کے سائے سے بھی بچنے کی کوشش کرے۔

آخرت کا عذاب:

اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ربوا کھانے والا، کھلانے والا، لکھنے والا اور گواہی دینے والا سب پر اللہ کی لعنت ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں ان پاک لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اور جو زکوٰۃ نکالنے والے ہیں، جو بھلائی اور صدقات کے کام کرتے ہیں، محتاجوں پر،

رشتہ داروں پر اور مسکینوں پر احسان کرتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال کو حرام کرتے ہیں، ظلم کرتے ہیں اور مختلف قسم کے شبہات نکال کر اللہ کے دین میں تشکیک پیدا کرتے ہیں۔ ان کا حشر بری حالت میں اس وقت ہوگا جب قیامت کے دن قبروں سے اٹھیں گے۔

ایک عالمِ ارواح تھا، جس میں اللہ تعالیٰ نے ساری روحوں کو جمع فرمایا۔ اس کے بعد عالمِ دنیا ہے، جس میں ہم سب زندگی کے ایام بسر کر رہے ہیں۔ اس کے بعد عالمِ برزخ آئے گا، یعنی مرنے کے بعد اور اٹھنے سے پہلے۔ اور اس کے بعد عالمِ آخرت ہے، جس کو قیامت بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں ایک بنیادی چیز ہے۔ اگر آپ دماغ میں رکھ لیں تو بہت سارے شبہات سے آدمی محفوظ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نظام بنایا ہے، یہ دنیا دار الامتحان ہے، دار العمل ہے، اس دنیا میں ہر آدمی اچھائی کرے گا تو صالحین، ابرار میں ہوگا اور اگر برائی کرے گا تو فجار میں ہوگا۔ تو اس کی جزا اور سزا دار الآخرت میں ہے، وہاں جانے کے بعد احکم الحاکمین عدل فرمائیں گے کہ اصحاب الیمین ایک طرف ہوں گے اور اصحاب الشمال ایک طرف ہوں گے۔ یہی ایک بات دماغ کے اندر رکھ لیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں کہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزا ہے، ورنہ لوگوں کے دماغ میں یہ شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ دیکھیں! کافر جو اللہ تعالیٰ کو بھی نہیں مانتے اور اللہ کے رسول کو بھی نہیں مانتے، ان کے پاس دولت، اولاد اور قوت ہے، جدید قسم کے آلات و ہتھیار ہیں، پوری دنیا ان کی محتاج ہے اور مسلمان پیچھے کیوں ہیں؟ تو یہ شبہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا دار الجزا ہے، جبکہ یہ دار الجزا نہیں ہے، بلکہ دار العمل ہے۔ آخرت والے دن فیصلہ ہوگا کہ کون عزت والے ہیں اور کون ذلت والے ہیں؟ اس لیے سب سے پہلے سورۃ الفاتحہ کے اندر جہاں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ الوہیت، صفتِ ربوبیت، صفتِ رحمانیت کا ذکر ہے، وہاں ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' بھی صفت آئی ہے کہ وہ جزاء کے دن کا مالک ہے اور وہ قیامت ہے۔ باقی دنیا میں کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اچھوں کو بھی بدلہ دے کر ان پر اپنی رحمت کا نظارہ دکھا دیتے ہیں اور کبھی برے کو سزا دے کر اپنی سزا کا نظارہ دکھا دیتے ہیں۔ یہ تو کچھ جھلکیاں ہیں، ورنہ اصل فیصلہ آخرت میں ہوگا۔ جس آدمی کا آخرت پر یقین ہے وہ ان شبہات میں نہیں پڑتا اور اس کو یقین ہے کہ دنیا دار العمل ہے۔ جو عمل کرے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو غافل رہے گا وہ اتنا پیچھے رہ جائے گا۔ مثلاً: ایک بھائی زمین پر محنت کرتا ہے، اس کی فصل اچھی ہوتی ہے اور دوسرا بھائی محنت نہیں کرتا، اس کی فصل اچھی نہیں ہوتی۔

کیا خیرات سے مال کم اور سود سے بڑھتا ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں: یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: خیرات کرنے سے مال بڑھ جاتا ہے اور سود سے کم ہو جاتا ہے!! حالانکہ خیرات سے تو مال کم ہو رہا ہے اور سود سے تو بڑھ رہا ہے۔ جس کا ایمان ہے وہ کہتا ہے: یہ عالمِ آخرت کے اعتبار سے ہے، عالمِ دنیا کے اعتبار سے نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی دکھاتے ہیں کہ خیرات کرنے والے کے مال کو بڑھا دیتے ہیں اور سود کھانے والے پر عذاب نازل فرما دیتے ہیں، ورنہ اصل فیصلے آخرت میں ہوں گے۔

اسلام میں گورے کالے کا کوئی فرق نہیں:

ایک سفر میں ایک غیر مسلم نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ اسلام میں ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ اسلام میں گورے کالے کا کوئی مسئلہ نہیں، لیکن آپ کا قرآن خود کہتا ہے: ﴿يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ﴾[البقرة:106] کہ بعض لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی اور جن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوگا ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ میں نے کہا: میرے بھائی! اس آیت کا ترجمہ بھی آتا ہے؟ کہنے لگے: جو لکھ کر مجھے دیا تھا اتنا آتا ہے۔ میں نے ان سے کہا: ''یَوْمَ'' سے کیا مراد ہے؟ کہنے لگا: اس سے دن مراد ہوتا ہے۔ میں نے کہا: کون سا دن مراد ہے؟ آج کل گزشتہ یا کل آنے والا مراد ہے؟ کہا یہ تو مراد نہیں ہے۔ میں نے کہا: قرآن کی لغت میں اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ کہنے لگا: ٹھیک ہے۔ میں نے کہا: دنیا میں تو ہمارے نزدیک گورے کالے کا کوئی فرق نہیں ہے، وہ تو عالمِ آخرت کا مسئلہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے عمل سے دیکھ لو کہ کبھی میرے پاک نبی ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو یہ نہیں فرمایا کہ تم کالے ہو، پیچھے ہو جاؤ۔ کبھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو حکم نہیں دیا کہ تم غلام ہو، پیچھے ہو جاؤ۔ عالمِ آخرت پر یقین نہ ہونے کی وجہ سے یہ اشکال پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول مبارک ہے کہ قیامت والے دن جب سود خوروں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائیں گے: ان کو کہو کہ میں نے جو کہا تھا: اللہ سے لڑائی نہ کرو، اب ہتھیار اٹھاؤ اور خدا سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

سود خوروں کے لیے آخرت میں عذاب:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ کو معراج پر لے جایا گیا تو آپ ﷺ فرماتے ہیں: مجھے دکھایا گیا ایسے لوگ تھے جن کے پیٹ ایسے بڑھ رہے تھے جیسے کمرے ہوتے ہیں۔ میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں جن کے اتنے پیٹ بڑھ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھانے والے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس رات مجھے معراج پر لے جایا گیا، میں ایسی قوم پر پہنچا جس کے پیٹ ایسے تھے جیسے بڑے بڑے کمرے ہوتے ہیں، ان کے اندر سانپ بھرے ہوئے ہیں، باہر نکل رہے ہیں اور باہر بھی سانپ ہیں۔ میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں سود کھاتے تھے۔

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے حدیث روایت فرمائی جو اس خواب کے بارے میں ہے کہ ہم ایک نہر کے کنارے پر آئے، اس نہر کا پانی ایسے ہے جیسے سرخ خون ہوتا ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے۔ کنارے پر ایک آدمی کھڑا ہے، اس کے ہاتھ میں پتھر ہیں۔ وہ جب کنارے پر پہنچتا ہے، منہ کھولتا ہے تو وہ آدمی اس کے منہ میں پتھر ڈالتا ہے۔ وہ نہر کے پرلے کنارے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح وہ دوبارہ آتا ہے تو اس کے منہ میں پتھر ڈال دیتا ہے۔ پوچھا گیا: اس کو کس لیے یہ عذاب دیا جارہا ہے؟ بتایا گیا: یہ وہ آدمی ہے جو دنیا میں سود کھاتا تھا۔ جیسے سود سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا تھا، آج جہنم کے انگارے اور پتھر اس کے منہ میں ڈالے جارہے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مشرکین نے جو کہا کہ بیع سود کی طرح ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر اعتراض ہے۔ مثال تو وہ دے جو بیع کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حلال سمجھتا ہو۔ جب ان کے نزدیک بیع میں اپنی مرضی ہے تو ان کا یہ قیاس کرنا فاسد ہے۔ اگر قیاس کرنے تو یوں کہے کہ سود اسی طرح ہے جیسے بیع ہے، لیکن انہوں نے کہا بیع سود کی طرح ہے۔ تو ان کا مقصد صرف اعتراض کرنا تھا۔

ربوا کا مسئلہ بہت مشکل ہے!!

ربوا کا مسئلہ باریک مسئلہ ہے، حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: سب سے آخری آیات سود کے حکم کے

بارے میں تھیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تمنا تھی، آپ نے فرمایا کہ کاش! حضور پاک ﷺ کی عمر مبارک طویل ہوتی اور آپ ہمیں اس کے بارے میں مزید تفصیل بیان فرماتے تو اچھی بات تھی، لیکن حضور پاک ﷺ فوت ہو گئے۔

اعتراض:

اس قول کو سامنے رکھ کر وہ لوگ جو جدید تعلیم کا شکار ہیں کہتے ہیں کہ دیکھو! حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی اس بارے میں پریشان تھے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس کے بارے میں خاص وضاحت نہیں فرمائی، لہٰذا ربوا کا مسئلہ تو مشکوک ہے۔ اس کے بعد تو اجتہاد کا دروازہ ہے، ہر آدمی اجتہاد کرے گا کہ کونسی شکل ٹھیک ہے اور کونسی شکل غلط ہے۔

جواب:

انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا پورا قول نقل نہیں کیا۔ آج کل مشکل یہ ہوگئی ہے کہ جس آدمی کو جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی عبارت نقل کرتا ہے، اس سے زیادہ عبارت نہ ہی پڑھتا ہے اور نہ ہی نقل کرتا ہے۔ دوسری بات کہ یہ کہنا ربوا کا مسئلہ مبہم رہ گیا، یہ اللہ کے قرآن پر بھی جھوٹ ہے اور حضور اکرم ﷺ کی حدیث پر بھی جھوٹ ہے۔ ربوا کی حرمت قرآن کی سات آیات سے ثابت ہے اور چالیس احادیث سے بھی اس کی حرمت ثابت ہے۔ اس کے بعد بھی اگر بات واضح نہیں تو پتہ نہیں کب واضح ہوگی؟

یاد رکھیں! جب ہم نے حضور اکرم ﷺ کا کلمہ پڑھ لیا، جب آپ کسی چیز کے بارے میں فرما دیں یہ حرام ہے تو اتنا کافی ہے، لیکن قرآن کی سات آیات اور حضور اکرم ﷺ کی چالیس احادیث کے بعد بھی کوئی یہ کہے کہ ہمیں مسئلہ سمجھ نہیں آیا اور یہ مسئلہ مشکوک ہے تو یہ بہت بڑی غلط فہمی اور لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے والی بات ہے۔ ''ربوا'' عربی کا لفظ ہے۔ یہ لغتِ عربی میں نازل ہوا اور جس رسول پاک ﷺ پر نازل ہوا وہ بھی عربی تھے اور جو مخاطبین تھے وہ بھی عربی تھے۔ تو یاد رکھیں! جب قرآن نازل ہوا اور حضور اکرم ﷺ نے حرمتِ ربوا کا اعلان کیا تو کسی ایک صحابی کو شبہ نہیں ہوا کہ اس نے پوچھا ہو کہ حضور! ہمیں بتائیں کہ ''ربوا'' کا معنیٰ کیا ہے؟ جبکہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ سے چاند گھٹنے بڑھنے اور حرمت والے مہینوں کے بارے میں سوال کیا، حتیٰ کہ عورت کے حیض میں ملنے کے بارے میں پوچھ لیا۔ یعنی جو مسئلہ تھوڑا سا بھی سمجھ میں نہ آتا تھا اس کو پوچھ لیتے تھے، لیکن کسی صحابی نے بھی ربوا

کے بارے میں حضور اکرم ﷺ سے نہیں پوچھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایسی کھلی ہوئی بات تھی کہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ آج پڑھی لکھی دنیا یہ کہتی ہے کہ جب تک آپ ہمیں اس کا متبادل نظام نہ دیں گے اس وقت تک ہم سود کو کیسے چھوڑ دیں؟ جبکہ حرام تو حرام ہے، بات ختم تھی۔ جب تم سود کو چھوڑ دو گے تو خود بخود اس کا متبادل آئے گا۔ مسلمان سود چھوڑ دے، دنیا پاگل ہو جائے گی اس کا متبادل ڈھونڈنے کے لیے۔ اس کا متبادل قرآن پاک میں موجود ہے، حدیث اور فقہاء کی کتابوں میں موجود ہے، لیکن جب تک ہم سود کو نہیں چھوڑیں گے تو متبادل نظام نہیں آسکتا ہے۔

جس دن ربوا کا حکم آیا سب نے سمجھ لیا کہ ربوا اس کو کہتے ہیں: "كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًوا، اَلرِّبٰوا مِنَ الرَّبْوَةِ يَعْنِي الزِّيَادَةِ" کہ ہر وہ قرض جو بغیر عوض کے نفع کو کھینچے وہ سود ہوتا ہے، یعنی جو پیسہ ہم نے ادھار لیا اس سے زیادہ دیا تو یہ کھلی سی بات تھی جو سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھ آگئی۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں بھی سود کا یہی رواج تھا کہ ادھار لے کر پیسہ زیادہ لینا۔ مثلاً: مجھ سے ہزار ریال لے لو، میں دو ماہ بعد تجھ سے گیارہ سو ریال لوں گا۔ دو ماہ بعد وہ آدمی آیا اور کہا: مجھ سے پیسے نہیں ہو سکے تو کہا: میں تجھے دو ماہ کی میعاد اور دیتا ہوں، اب سود گیارہ سو روپے پر لگے گا۔ اس طرح پیسے بڑھتے گئے۔ جب اس کی حرمت آگئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو حرام سمجھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اس سے پہلے جو ہم لین دین کر چکے ہیں ان کا کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ معاف ہے اور جو اصل پیسہ ہے وہ تم لے سکتے ہو۔

جب سود حرام ہوا تو مشرکین نے کہا: ہم نے مسلمانوں سے جو سود کے پیسے لینے تھے وہ ہمارے ڈوب گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار! صرف تمہارا نہیں ڈوبا، بلکہ سب سے زیادہ ربوا میرے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔ میں اپنے چچا کے ربوا کو بھی ختم کرتا ہوں۔ آج سارے مسلمان ملکوں کو اللہ غیرت دے اور وہ فیصلہ کرلیں کہ ہم سود نہیں دیتے اور اپنا اصل لے لو؛ کیونکہ سود حرام ہے۔

ربوا نسیہ کے اندر تو کوئی شبہ نہیں تھا، یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ حرام ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے کچھ ربوا بیان کیے جو بیع کے اندر تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے چھ چیزیں بیان کیں اور فرمایا: اگر تم ان کا دست بدست سودا کرو تو ٹھیک ہے اور اگر دست بدست نہ کرو تو سود ہو جائے گا۔ اور وہ چھ چیزیں یہ ہیں: 1 سونا 2 چاندی 3 گیہوں (گندم) 4 جو 5 انگور اور 6 کھجور۔ ایک آدمی کہے کہ میری کھجور اعلیٰ ہے۔ تم مجھے دو کلو کھجور دو گے تو میں تجھے

ایک کلو کھجور دوں گا۔ تو یہ حرام ہے اور ناجائز ہے۔ اسی طرح کہے کہ میرا انگور اعلیٰ ہے۔ تم ڈیڑھ کلو دو تب ایک کلو دوں گا۔ یہ بھی ناجائز ہے۔ اسی طرح کہے: مجھے دس تولہ سونا ادھار دے دو تو آپ مجھے سوا دس تولہ سونا ہی دیں گے۔

اس لیے اسلام نے کہا ہے کہ تم اپنے اکثر معاملات سونے اور چاندی کے عوض کرو۔ مثال کے طور پر عورت سے نکاح کرتے ہو تو اسلام کی رو سے تم حق المہر سونے میں مقرر کرو کہ میں پانچ تولہ سونا دوں گا یا کہا: پچاس تولہ چاندی دوں گا۔ اور اگر تم نے کہا: میں بیوی کو دس ہزار روپے حق المہر دوں گا اور تمہارا نکاح چالیس سال پہلے ہوا تھا۔ چالیس سال کے بعد ان دس ہزار کی کتنی ویلیو ہوگی؟ ان کی ویلیو ختم ہوگئی، لیکن اگر سونا ہوتا تو کسی کا نقصان نہ ہوتا؛ کیونکہ اس کی اصل چیز محفوظ تھی، اس کی قیمت میں اضافہ تو ممکن تھا، ورنہ اصل قیمت تو نہ ڈوبتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کا مطلب:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کو تو بیان فرما دیا، لیکن ان کے علاوہ آم، انار اور دوسری چیزیں بھی تھیں، ان کو بیان نہیں فرمایا۔ تو اب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پریشان ہوئے کہ ان چیزوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا اور ان کے علاوہ جو دوسری چیزیں ہیں کاش! ان کے بارے میں ہمیں بتا دیتے۔ وہ ربوا کے مسئلے میں پریشان نہ تھے اور نہ ان کو ربوا کی حرمت میں کوئی شبہ تھا۔ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جو مسئلہ منصوص ہو جائے، اس میں اختلاف نہیں ہوتا، مثلاً: مغرب کی تین رکعات ہیں، تو سب کے نزدیک یہی تین رکعتیں ہیں؛ کیونکہ یہ منصوص مسئلہ ہے، اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ جھگڑا اس مسئلہ میں ہوتا ہے جو بیان نہ ہوا ہو اور وہ پیش آ گیا تو مجتہدین نے اجتہاد کیا۔ ظاہر بات ہے کہ ہر کسی کی سوچ میں فرق ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس لیے روتے تھے کہ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جن کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نام نہیں لیا، اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور لمبی ہوتی تو یہ ساری چیزیں بھی آپ کے سامنے آ جاتیں، آپ اپنی زبان مبارک سے ان کا حکم بیان فرما دیتے تو کوئی اشتباہ نہ رہتا۔ آپ نے آگے فرمایا: ''إِنَّمَا الرِّبٰوا الرِّبٰوا'' خبردار! ربوا خود ربوا ہے۔ جس چیز میں شبہ ہے اس کو بھی چھوڑ دینا۔

بیع مزابنہ:

زمانہ جاہلیت کے اندر بیع مزابنہ اور بیع محاقلہ ہوتی تھی۔ بیع مزابنہ یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی کہتا ہے: آپ کے باغ پر جو ثمر لگا ہوا ہے (مثلاً: کھجور کا باغ ہے) اس کے بدلہ میں دس من کھجوریں لے لیں اور یہ باغ کا پھل مجھے

دے دو۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار یہ حرام ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کھجوریں زیادہ نکل آئیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کم نکلیں۔ اس میں ربوا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: یا تو کھجوریں اتار کر ان کا وزن کرو اور اس کے بعد برابر دے دو اور اگر اس طرح نہیں کرتے تو پہلے اپنی کھجوریں جا کر بیچو اور پھر ان کو خرید لو۔

آپ لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ بات تو ایک ہو گئی کہ کان کو اس ہاتھ سے پکڑ لو یا دوسرے ہاتھ سے پکڑ لو۔ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اب مسئلہ بدل گیا ہے؛ کیونکہ جب میں نے باہر جا کر کھجوریں بیچیں تو میں بائع بن گیا اور دوسرا آدمی مشتری بن گیا۔ اب میں پیسے کا مالک بن گیا۔ ان سے میں نے جا کر پانچ کلو پھل خرید لیا تو جائز ہے؛ کیونکہ اب میں نے اس کو جنس کے بدلہ میں نہیں لیا، بلکہ اس کو پیسوں کے بدلہ میں لیا ہے۔ پیسوں سے دوسری اشیاء کی بیع و شرا حلال ہوتی ہے، حرام نہیں ہوتی۔

بیع محاقلہ:

محاقلہ حقل سے ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ میری زمین میں آئے اور دیکھا کہ ایک مربع گندم لگی ہوئی ہے۔ آپ نے مجھے کہا: پانچ سو من صاف گندم لے لو اور مجھے یہ کھیت والی گندم دے دو۔ تو اسلام کہتا ہے: یہ بھی حرام ہے؛ اس لیے کہ اس کے اندر بھی کمی بیشی آسکتی ہے اور دوسرا جنس بھی ایک ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے بیع مزابنہ، بیع محاقلہ اور چھ چیزوں کا نام لے کر بھی بتا دیا کہ ان میں سود بنتا ہے۔ ان کے علاوہ جو دوسری چیزیں ہیں ہم ان کو ان چیزوں پر قیاس کریں گے۔

شراب نوشی کی حد:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مسئلہ پیش آیا کہ شراب پینے والے کی حد (سزا) کتنی ہے؟ انہوں نے کہا: چالیس بید ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں یہی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب لوگ جرات زیادہ کر رہے ہیں، شراب زیادہ پی رہے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ سزا بڑھا دی جائے۔ اور وہ کتنی بڑھائی جائے؟ کیونکہ حد لوگوں کو جرم سے روکنے کے لیے ہوتی ہے۔ اگر وہ حد لوگوں کو جرم سے نہ روکے تو کیا فائدا ہوا؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشورہ دیا۔ کسی نے پچاس بید اور کسی نے کہا: ساٹھ بید اور کسی نے کہا: ستر

بید مارے جائیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسی بید مارو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ نے اسی بید جو فرمائے ہیں آپ کے ذہن میں کوئی دلیل تو ہوگی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شراب پیئے گا اس کو نشہ ہوگا۔ جب نشہ ہوگا تو وہ بکواس کرے گا اور کسی نہ کسی پر تہمت لگائے گا۔ اور قرآن نے تہمت لگانے والے کی سزا اسی کوڑے رکھی ہے، اس لیے اس کی سزا اسی کوڑے رکھو۔

اس کو قیاس کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ کو دوسرے مسئلہ پر منطبق کرنے کے بعد فیصلہ کیا۔ اس کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے قبول کرلیا اجماع ہوگیا۔ جب سب صحابہ رضی اللہ عنہم ایک مسئلے پر اجماع کرلیں تو اس کا درجہ وہ بن جاتا ہے جو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ ہے۔

اس لیے یاد رکھیں! ربوا کی حرمت میں نہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو شک تھا اور نہ خلفائے راشدین کو شک تھا۔ ربوا حرام تھا اور ہے اور قیامت تک حرام رہے گا، لیکن ربوا تو قرض یعنی وقت کے بدلہ میں پیسہ لے رہا ہے، مال نہیں ہے۔ اور دوسرا ربو لین دین میں ہوتا ہے، مثلاً: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں کو بیان فرمایا، ان کے علاوہ باقی چیزیں ہم ان کو ان پر قیاس کرتے جائیں گے۔

سود کا فائدہ بڑا محدود ہے، مثلاً: بارہ کروڑ کی آبادی کو لوٹ کر صرف بارہ ہزار آدمی کے منافعات بڑھیں تو یہ کون سا فائدہ ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ کثرت نقصان کو سامنے رکھ کر حکم دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے اندر حکمتیں ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جتنے سودی ادارے ہیں وہ ان کو سود دیں گے جو پہلے بھی سرمایہ دار ہوگا، غریب کو نہیں دیں گے۔ کہیں گے: پہلے بیس کروڑ، پھر پچاس کروڑ قرض لیں۔ اب قرض وہی لے سکتا ہے جس کے پاس پہلے مثلاً: بیس کروڑ ہوں گے۔ یہ ساری شرط رکھتے ہیں کہ امیر امیر ہوتا جائے اور غریب غریب ہوتا جائے۔ اگر بینک دیوالیہ ہوجائے اور اس میں لاکھوں آدمیوں کے اکاؤنٹ تھے تو ساروں کا پیسہ ڈوب گیا، یعنی جب تک نفع ملے تو وہ سود خور کو ملے اور جب نقصان آگیا تو سب کو نقصان ہوگیا۔

سودی نظام کے مقابلہ میں اسلام کا نظام:

اس کے مقابلہ پر اگر تم اسلام کے نظامِ مضاربہ کو آزماتے، نظامِ مشارکت کو آزماتے، نظامِ مرابحہ کو آزماتے، مثلاً: تیرے پاس ایک ہزار ریال ہے اور کام لاکھ سے ہوتا ہے تو اسلام کہتا ہے کہ سو آدمیوں کو حصہ دار بنا دو، اس

سے کاروبار شروع کردو۔ اور جب نفع نقصان کا وقت آئے تو سب کو نفع نقصان کے اعتبار سے دو۔ اس میں ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جب تم کاروبار میں سو آدمیوں کو شریک کروگے تو سو آدمیوں کو برکت پہنچے گی، سو گھرانوں کی دعائیں تیرے ساتھ ہوں گی کہ اے اللہ! اس کو برکت دے، کہیں ہم ڈوب نہ جائیں۔ جب تم سال کے بعد سو گھرانے میں نفع نقصان تقسیم کروگے تو سو گھرانوں کی خوشیاں اور دعائیں تمہیں ملیں گی، ورنہ سود لینے والا اور دینے والا بھی لعنت کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حرام کیا ہے اس کے اندر گھس کر دیکھو گے تو تمہیں اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اتنا مہربان ہے اتنی ماں اپنے بچے پر مہربان نہیں ہوتی۔

(حدیث) حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ جنگ ختم ہوگئی۔ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہیں۔ ایک عورت دیوانہ وار میدانِ جنگ میں بھاگ رہی ہے، جس کسی چھوٹی عمر کے لڑکے کو دیکھتی ہے اپنے ساتھ چمٹا لیتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر اس بے تاب ماں کو اس کا بچہ ابھی مل جائے تو کیا یہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو آگ میں ڈال دے گی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے، اس نے فرما دیا کہ یہ چیز حرام ہے تو اس کے اندر کوئی نہ کوئی حکمت ہوگی، ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ خواہ مخواہ حرام فرما دے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس کو سود کے حرام ہونے کی وحی پہنچ گئی اور وہ رک گیا تو اس سے پہلے جو وہ سود کھا چکا ہے وہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیں گے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ارشاد فرمایا کہ میں نے سود کو اپنے پاؤں کے نیچے روند ڈالا ہے۔ میرے چچا عباس رضی اللہ عنہ نے جو سود لینا ہے وہ بھی ختم ہے، کوئی ان کو واپس نہ کرے۔

یہاں ایک مسئلہ سمجھ لو کہ حضور اکرم ﷺ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ جو تم سود لے چکے وہ واپس کرو۔ یہ اس وقت تھا جب لوگوں کو اس کے حرام ہونے کا پتہ نہیں تھا۔ اگر آج کوئی کہے کہ میں بیس سال کھا تا رہا ہوں، مجھے پتہ نہیں تھا، اب مجھ سے بھی واپس نہ لو! کیونکہ میں نے آج توبہ کی ہے، حالانکہ اس کے لیے لینا ہی حرام ہے۔ اگر لیا ہے تو اس کو واپس کرنا ضروری ہے۔ تب ہماری توبہ قبول ہوگی؛ کیونکہ توبہ کے اندر حقوق اللہ کی ادائیگی شرط ہے۔ ہاں اگر کافر تھا اور حالتِ کفر میں سود لیا دیا ہے تو اسلام لانے کی وجہ سے اس کا گناہ معاف ہے، مگر اس کی تلافی ضروری ہے۔

سودی نظام کی برائی وغیرہ:

(حدیث) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ام محبت نے آکر عرض کیا: اے ام المومنین! کیا آپ زید بن ارقم

کو جانتی ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جانتی ہوں۔ اس عورت نے کہا: میں نے ایک عبد کو آٹھ سو درہم میں فروخت کیا اس شرط پر کہ جب اس کے پاس پیسے آئیں گے وہ مجھے اس کی قیمت دیں گے۔ اب زید بن ارقم کو پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تو میں نے اس کو کہا: اگر تم مجھے وہی عبد چھ سو میں بیچ دو تو میں تیار ہوں تو کیا یہ ٹھیک ہے؟ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سنا تو بہت ناراض ہو گئیں، فرمایا: تم نے بڑا برا سودا کیا، تم نے بڑا برا سودا کیا۔ زید بن ارقم کو جا کر بتا دو کہ اگر تم نے توبہ نہ کی اور یہ معاملہ کینسل نہ کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نیکیاں کرتا رہے، جہاد کرتے رہے، وہ سب اس سود کھانے کی وجہ سے باطل ہو جائیں گے۔ اس عورت نے کہا: اگر میں اس سے اپنا وہی چھ سو ہی لے لوں اور دو سو چھوڑ دوں تو پھر میں اس گناہ سے بچ سکتی ہوں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: پھر ٹھیک ہے۔

آج کل اس قسم کا کاروبار عام ہو چکا ہے۔ آج کل لوگ قسطوں پر گاڑیاں لیتے ہیں، مثلاً: ایک گاڑی ایک لاکھ ریال کی خرید لیتے ہیں۔ اگر وہی گاڑی نقد میں خریدیں تو اسی ہزار ریال کی ہے۔ تو پہلا نقصان ان قسطوں کی وجہ سے یہ ہو رہا ہے کہ بیس ہزار ریال زیادہ دینے پڑ رہے ہیں۔ اس گاڑی کو ایک لاکھ میں خریدنے کے بعد اسی ہزار ریال میں بیچ دیتے ہیں۔ بعض اوقات ستر ہزار ریال میں بیچ دیتے ہیں؛ کیونکہ خریدنے والا کہتا ہے: اگر میں نے اسی ہزار میں خریدنی ہے تو کمپنی سے کیوں نہ خرید لوں؟ کیونکہ تمہاری قسطیں ادا ہوں گی تو گاڑی نام ہوگی۔ بعض علماء یہاں گنجائش رکھتے ہیں کہ یہ تو مالک ہو گیا ہے اور اس نے اپنی مملوکہ چیز گھاٹے میں بیچ دی ہے، اس لیے حرام نہیں ہے۔ اور بعض علماء فرق کرتے ہیں کہ جس آدمی اور جس کمپنی نے اس کو گاڑی بیچی ہے اگر وہ خرید لے تو ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں دوسرا کوئی خریدتا ہے تو ٹھیک ہے۔

بہر حال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان سونے سے لکھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ربوا ریبۃ (شک) ہے، جس چیز میں ربوا کا شبہ ہو جائے اس کو چھوڑ دو، اس کے اندر بہتری ہے، بجائے اس کے کہ تم حرام میں مبتلا ہو جاؤ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک واضح فرمان مبارک ہے: ''اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَ الْحَرَامُ بَيِّنٌ، وَمَا بَيْنَهُمَا أُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ'' حلال بھی کھلا ہے، حرام بھی کھلا ہے۔ ان کے درمیان میں مشتبہات ہیں (مشتبہ کا معنی یہ ہے کہ اس کے کچھ دلائل حلال ہونے کی طرف جاتے ہیں اور کچھ دلائل اس کے حرام ہونے کی طرف جاتے ہیں)۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان مشتبہات کو بھی چھوڑ دو۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مثال بیان فرمائی کہ ایک آدمی نے

گھاس اگایا ہے اور اس کے اردگرد باڑ لگائی ہوئی ہے کہ اگر تم اس کی باڑ کے قریب جانور لے جاؤ گے تو خطرہ ہے کہ کبھی وہ باڑ پھلانگ کر اندر چلے جائیں، لیکن اگر تم اس باڑ سے ہی دور رہو گے تو محفوظ ہو گے، اس لیے جہاں بھی تھوڑا سا شبہ ہو جائے اس سے احتیاط کریں۔

اسلام نے جب سود کی حرمت کا حکم دیا تو فرمایا کہ اس آیت (حکم) کے اترنے سے پہلے جو معاملات ہو چکے ہیں اس سے توبہ کرو اور آئندہ کے لیے عہد کرلو کہ ہم سود کو چھوڑ دیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے سابقہ گناہ معاف کر دیں گے، یعنی جو پہلے سود لے چکے اس کو لوٹانا ضروری نہیں تھا، لیکن حکم اس وقت تھا جب سود حرام نہیں تھا، لیکن جب سود حرام ہو گیا، اب مثلاً: کسی آدمی کو سود کھاتے کھاتے دس سال ہو گئے، اب وہ یہ کہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور لوگوں کو پیسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے ذمہ ہے جس سے زیادہ لیا ہے اس کو واپس کرنا ضروری ہوگا؛ کیونکہ زیادتی حرام ہے اور وہ اپنا اصل قرضہ واپس لے سکتا ہے اس سے زیادہ لینے کا وہ حق دار نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی احتیاط:

پہلے زمانہ میں لوگ بڑی احتیاط کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو پتہ چلا کہ ایک آدمی کی کچھ بکریاں چوری ہو گئی تھیں۔ امام صاحب نے اس وقت لوگوں کو بلایا اور کہا کہ عام طور پر بکری کی عمر کیا ہوتی ہے؟ کسی نے کہا: اتنے سال اور کسی نے کہا: اتنے سال۔ امام صاحب نے فرمایا: خدانخواستہ اگر کسی کی بکریاں چوری ہو جائیں تو عام طور قصائیوں کو بیچ دیتے ہیں اور بعض لوگ دوسری جگہ بیچ دیتے ہیں اور امام صاحب نے اپنے ملازم سے فرمایا کہ اتنے عرصہ تک اس شہر سے بکری کا گوشت مت خریدنا۔ پتہ نہیں کہ وہی چوری کا مال آکر ذبح ہو جائے، اگرچہ ہم نے خریدا ہوگا، لیکن وہ پھر بھی چوری کا ہوگا، جس کے اندر تھوڑا سا شبہ ہو جائے، ہم اس چیز کو کیوں استعمال کریں؟

پھلوں والے باغات کی بیع:

آج کل ایک بہت بڑی مصیبت ہے جس میں عامۃ المسلمین مبتلا ہیں اور کوئی توجہ نہیں کرتا ہے؛ کیونکہ اللہ کے نبی نے فرمایا کہ کوئی باغ کا پھل اس وقت تک بیچنا حرام ہے جب تک پھل ظاہر نہ ہو جائے۔ اب اگر کوئی اس طرح خریدے گا تو وہ بیع حرام ہے۔ ہمارے ہاں تو ایک مصیبت عام بن گئی ہے کہ لوگ پانچ پانچ سال کے لیے باغ خرید لیتے ہیں اور دس دس سال کے لیے بھی خریدا ہوا ہے، حالانکہ ان کو پتہ بھی نہیں کہ کل کو پھل لگے گا یا نہیں لگے گا؟

یا پھل لگے گا اندھیریاں آئیں گی پھل گر جائے گا یا کوئی وائرس پڑے گی اور پھل ختم ہو جائے گا؟ یا پھل میں کیڑا پڑ گیا اور پھل ختم ہو گیا۔ اس کے باوجود کوئی سالوں تک پیشگی سودے کر لیتے ہیں یہ حرام ہے اور کسی امام کے نزدیک اس کے اندر گنجائش نہیں ہے۔

اندازہ کر کے فصل بیچنا خریدنا:

اسی طرح ہمارے ہاں کپاس کی فصل لگی ہوتی ہے۔ لوگ آ کر اندازہ کر کے خرید لیتے ہیں۔ یہ بھی حرام اور شریعت میں ناجائز ہے؛ کیونکہ کوئی پتہ نہیں اتنی فصل اترے گی یا نہیں اترے گی؟ اسلام کسی کو نقصان دے کر نہیں مارنا چاہتا۔ اسلام کہتا ہے: وزن کرو اور لے لو۔

امام ابوحنیفہ ؒ کی کپڑے کی تجارت میں احتیاط:

امام ابوحنیفہ ؒ کی کپڑے کی بہت بڑی تجارت تھی۔ آپ نے ملازم سے کہا کہ فلاں کپڑے پر فلاں جگہ یہ عیب ہے۔ جب کپڑا بیچنا ہو تو خریدار کو دکھا دینا کہ یہ عیب ہے، اس کی کم قیمت ہے۔ تم لینا چاہتے ہو تو لے لو۔ امام صاحب نے اس ملازم سے پوچھا: میں نے تم کو کپڑے کے بارے میں بتایا تھا تو تم نے آگے اس کا عیب بتایا تھا؟ اس نے کہا: اصل میں کچھ لوگ آئے تو انہوں نے بند تھان خرید لیے اور مجھے بات یاد نہیں رہی، میں نے بھول کر اس کو ایسے ہی بیچ دیا تھا۔ آپ نے فرمایا: جتنی بکری ہوئی ہے سب خیرات کر دو۔ میرے گھر میں ایسا پیسہ مت لے آؤ جس میں حرام مل گیا ہے۔

حاجی امداد اللہ صاحب ؒ کا واقعہ:

حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ مکہ سے مدینہ کے سفر میں اونٹوں پر جا رہے تھے۔ ایک دوست نے آ کر عرض کیا: میرا یہ خط مدینہ شریف میں فلاں آدمی کو پہنچانا ہے۔ اگر آپ لے جائیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ حاجی صاحب نے فرمایا: جی مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن تم مہربانی کرو اور یہاں تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ اونٹ والا مالک آ جائے، اس سے بات کر لیتے ہیں، پھر میں آپ کا یہ خط لے جاؤں گا۔ اس آدمی نے کہا: حضرت! اونٹ والے کے ساتھ میرے خط کا کیا تعلق ہے؟ فرمایا: جب میں نے اونٹ والے کے ساتھ کرایہ طے کیا تھا اور اپنا سامان اس کو دکھایا تھا اس میں تمہارا خط شامل نہیں تھا۔ اب اگر اس کے اونٹ پر اتنا وزن بڑھ گیا تو قیامت میں کون

جواب دے گا؟

یہ احتیاط ہوتی تھی اور ہماری تو اس میں بہادری ہوتی ہے کہ بیس کلو کی بجائے چالیس کلو لے جائیں۔

مالِ غنیمت میں احتیاط:

ایک آدمی حضور اکرم ﷺ کے ساتھ میدانِ جہاد میں شریک تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب اس کی بہادری کو دیکھا تو سب نے کہا کہ اس نے آج کمال کر دیا ہے۔ اتنا بے جگری سے لڑا ہے کہ اس کے لیے جنت کے دروازے کھل گئے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ غصہ میں آگئے اور فرمایا: میں نے دیکھا ہے کہ اس کے سر پر آگ جل رہی ہے۔ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم خاموش ہو گئے۔ جب جنگ ختم ہوگئی تو معلوم ہوا اس نے مالِ غنیمت کی ایک لحاف چرائی تھی، اس کی وجہ سے عذاب میں آگیا۔

اس سے اندازہ کریں کہ ہماری ہر چیز حلال ہے یا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ پیر اور مولوی کی اولاد اکثر بگڑ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم لوگوں کا پیسے کا معاملہ مشتبہ ہوتا ہے۔ مثلاً: آپ نے مجھے پیسے دیئے اور کہا: ہدیہ ہے۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ کبھی آپ نے مجھے پیسے دیئے اور کہا: مہربانی کر کے میری طرف سے خیرات کر دیں، میں خیرات کرتا رہا اور کچھ پیسے میرے پاس رہ گئے اور بھول گئے یا ذاتی معاملات میں خرچ ہو گئے تو زکوۃ خیرات ہمارے پیٹ میں آگئی، جبکہ ہم اس کے مستحق نہیں تھے۔ جب اس مالِ مشتبہ سے ہمارے بچے جوان ہوتے ہیں تو صاف بات ہے ان کی اصلاح بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور اپنے خزانہ غیب سے جن کے ہم نے حقوق ادا کرنے ہیں عطا فرما دیں اور ہمیں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس بندہ پر قرضہ ہو پہلے دینے کی نیت کرے۔ جب تک قرضہ ادا کرنے کی نیت نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں آتی ہے۔ جب نیت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے قرضہ کی ادائیگی کے اسباب پیدا فرما دیں گے۔

سود کی ہولناکی:

ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اَلرِّبَا ثَلَاثَةٌ وَ سَبْعُوْنَ بَابًا'' سود کے تہتر دروازے ہیں، یعنی ربوا اتنی بری چیز ہے۔ [المستدرک للحاکم، التفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱۰]

دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ''اَلرِّبٰوا سَبْعُوْنَ جُزْءًا أَيْسَرُهَا أَنْ يَّنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهٗ'' کہ سود کے ستر جزء (باب) ہیں گناہوں کے اعتبار سے اور سب سے کم درجہ کا گناہ یہ ہے کہ جیسے کوئی آدمی اپنی ماں سے زنا کرے۔

[مشکوۃ المصابیح: رقم: ۲۸۲۶]

فقہ حنفی پر تہمت اور اس کی حقیقت:

بعض لوگ غلط فہمی کی بنا پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ایک مسئلے کو بڑا اچھالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ کہتے ہیں: ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جس شخص نے اپنی ماں سے زنا کیا اس پر حد نہیں ہے۔ حالانکہ یہ اعتراض کرنے والوں کی جہالت ہے؛ کیونکہ عورت سے زنا کرنے کی حد ہے، لیکن جب معاملہ ماں کے ساتھ آجائے تو وہ قتل کیا جائے گا، اس کو حد یعنی سو بید نہیں لگیں گے، بلکہ ایسا بد بخت زندیق اور کافر ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب آگ پیدا کی تو مثلاً: اس کی شدتِ حرارت سو ڈگری تھی: ننانوے ڈگری جہنم میں محفوظ ہے، صرف ایک جز دنیا میں آیا ہے، جس سے یہ ساری آگ روشن ہے۔ جب جہنم میں آگ سو ڈگری پر ہوگی تو اس آگ کی شدت کیا ہوگی؟ اب سمجھیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود کی سزا کے تہتر دروازے ہیں اور کم سے کم گناہ ایسا ہے جیسے کسی شخص نے اپنی ماں کے ساتھ زنا کیا ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہر مسلمان کو سود کی جمیع اقسام سے اپنی رحمت سے حفاظت فرمائیں۔ آدمی اگر نیت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بچا لیتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَأْكُلُوْنَ فِيْهِ الرِّبٰوا'' لوگوں پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ ربوا کھائیں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا سب کے سب لوگ ربوا کھائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب کے سب کھائیں گے، لیکن جو ربوا نہیں کھائے گا، کم از کم اس کے ناک میں اس کے دماغ میں ربوا کا دھواں تو ضرور پہنچ جائے گا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱۰]

اسی سے علماء نے لکھا ہے کہ جو چیزیں تمہیں حرام تک لے جانے والی ہیں وہ بھی حرام ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر لوگوں کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: سود حرام ہے، خمر حرام ہے اور خمر کی تجارت بھی حرام ہے؛ کیونکہ ''ثَمَنُ الْحَرَامِ حَرَامٌ'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت کرے! جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی کھانا حرام

کر دیا تو وہ چربی نہیں کھاتے تھے، اس کا گھی بنا کر اس کو بیچ کر پیسے کھا جاتے تھے۔

جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا ہے، لیکن اگر وہ دوبارہ شادی کرنا چاہے تو اسلام کہتا ہے کہ حلالہ کرائے۔

اب بعض لوگ کسی کے پاس آجاتے ہیں کہ ایک ہزار روپے لے لو اور میری بیوی کے ساتھ نکاح کر لو اور صبح اس کو طلاق دے دینا۔ تو فرمایا: لینے والے پر بھی لعنت ہے اور دینے والے بھی لعنت ہے؛ کیونکہ اسلام نے بندے کو سانڈھ نہیں بنایا کہ کرایہ پر چلتا رہے، بلکہ عورت اپنی منشاء سے دوسری جگہ شادی کرے، پھر اگر خدانخواستہ دوسرا شوہر بھی طلاق دے دے تو پھر عدت گزار کر پہلے خاوند کے گھر آسکتی ہے۔ یہ نہیں کہ آدمی ڈھونڈ کر اور ایک رات کے لیے نکاح کرا دیا۔ (اگرچہ اس طرح بھی نفس حلت حاصل ہو جائے گی؛ کیونکہ قرآن پاک کے ظاہر مقتضی پر عمل ہوا ہے)۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سود کھانے والے پر بھی لعنت کی ہے، اس کے لینے والے پر بھی لعنت کی ہے، ربوا کے معاملے میں جو گواہی دے اس پر بھی لعنت کی ہے اور ربوا کے معاملات میں جو کتابت کرے اس پر بھی لعنت ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کوئی ہمارے پاس آیا کہ ہمارا یہ کنٹریکٹ لکھ دو تو ہم ظاہر کو دیکھیں گے، ہمیں باطن کا کیا پتہ ہے؟ اور اگر ہمیں پتہ لگ جائے تو یہ ربوا کا کاروبار ہے۔ تو پھر لکھنے والے پر بھی لعنت آجائے گی۔

اللہ تعالیٰ تمہارے اموال اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ تم نے یہ عمل کتنی صحیح نیت سے کیا ہے۔

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۷۶،۲۷۷]

''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ کسی ناشکر گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے۔ اور ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔''

سود کی مذمت:

سورۃ البقرۃ، سورۃ آلِ عمران اور سورۃ النساء میں تقریباً دس آیات ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے سود کی حرمت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ اور حضور اکرم ﷺ کی چالیس احادیث مبارکہ ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زبان مبارک سے سود کی حرمت اور اس کے گناہ اور سود پر عذاب دینا اور عذابِ آخرت کا ذکر فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم سود کو مٹا دیتے ہیں، یعنی یا تو بالکل سود خور کا سب کچھ برباد ہو جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ اس کے مال سے برکت اٹھا لیتے ہیں، اب وہ اپنے اس مال سے نفع نہیں اٹھا سکتا۔ جیسا کہ بعض بڑے آدمی ہوتے ہیں، ان کو کوئی مرض لگ گیا، کسی کو شوگر لگ گیا، کسی کو کینسر لگ گیا اور کسی کو بلڈ پریشر لگ گیا، اس کے پاس ساری نعمتیں ہیں، لیکن ان سے نفع نہیں اٹھا سکتا، ان کو کھا نہیں سکتا ہے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو دنیا میں بھی مٹا دیتے ہیں اور آخرت میں زیادہ عذاب دیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کبھی پلید اور پاکیزہ چیزیں برابر نہیں ہوسکتیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کو ایسی سزا دیں گے کہ ایک کو دوسرے پر رکھ کر جہنم میں ڈال دیں گے، چونکہ اصل سزا کا مقام دارِ آخرت ہے، دنیا تو دار العمل ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جیسا کہ تم نے لوگوں کو ربوا کے لیے مال دیا کہ میرا مال بڑھ رہا ہے اور اصل بھی محفوظ ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لوگوں کے ہاں بڑھ رہا ہے، میرے ہاں نہیں بڑھ رہا ہے، بلکہ میرے ہاں تو برباد ہو رہا ہے۔

قرآن نے دوسرے مقام پر فرمایا کہ کبھی تمہیں حرام چیز بہت زیادہ نظر آتی ہے، چاہے وہ عدد کے اعتبار سے زیادہ ہو، لیکن حقیقت کے اعتبار سے کم ہوگی۔

سود کا انجام ہلاکت اور قلتِ مال ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سود چاہے تمہیں جتنا بڑھتا نظر آئے اس کا انجام ہلاکت ہے۔

[مسند احمد: ۱/۳۹۵]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سود کا معاملہ چاہے تمہیں کتنا بڑھتا ہوا نظر آئے، لیکن اس کا انجام قلت اور خرابی ہے۔ [ابن ماجہ: رقم: ۲۲۷۹]

غلہ کی ذخیرہ اندوزی کا حکم:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں باہر نکلے تو دیکھا کہ باہر غلہ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا: بعض تاجر مسلمانوں کے پاس غلہ بیچنے کے لیے لائے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ ان کے مال اور رزق میں برکت دے کہ مسلمانوں کے لیے ایسی چیزیں دوسرے ملکوں سے خرید کر لاتے ہیں، تاکہ مسلمان فائدہ اٹھائیں۔ ایک آدمی نے کہا: اے امیر المومنین! یہ تو احتکار ہے۔

(احتکار کہتے: مثلاً: گندم اترنے کا وقت آگیا، لازمی بات ہے۔ اس وقت گندم سستی ہوتی ہے؛ کیونکہ ہر جگہ گندم موجود ہے تو بعض بدنیت تاجر گندم خریدنے کے بعد ذخیرہ کر لیتے ہیں اور جب لوگوں کو ضرورت پڑی اور گندم ختم ہوگئی، ان تاجران نے کہا: اب گندم مارکیٹ میں لے آؤ اور اس کو مہنگا کر کے بیچو۔ اس احتکار کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے)۔

آپ نے فرمایا: کیا مطلب؟ انہوں نے خرید کر روکی ہوئی تھی کہ جب لوگوں کو مجبوری پڑے گی ہم میدان میں لے آئیں گے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تاجران کون ہیں؟ لوگوں نے کہا: ایک آپ کا ملازم ہے اور ایک حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ملازم ہے۔ آپ نے ان دونوں کو بلوایا اور ان سے پوچھا: یہ تم نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے کہا: آپ ہمیں کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟ ہم نے اپنے پیسے سے یہ چیز خریدی ہے اور اب بیچ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تمہیں یہ حدیث نہیں پہنچی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو بندہ احتکار کرے مسلمانوں کا رزق خرید کر کے روک لے، تاکہ مہنگا بیچوں اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں دو عذاب دیتے ہیں: 1 ...... ایک اس کو بھوکا کر دیں گے اور 2 ...... دوسرا اس کو کوڑھ کی بیماری ڈال دیں گے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے غلام نے کہا: آپ گواہ ہو جائیں اور امین۔ اللہ تعالیٰ کو بھی گواہ بناتا ہوں کہ میں قیامت تک یہ کام نہیں کروں گا، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے غلام نے کہا: میں نے اپنے پیسوں سے یہ چیز خریدی ہے اور اس کو بیچ رہا ہوں۔ اس میں کیا احتکار ہے؟ اس طرح وہ بہانہ بنا گیا۔

راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ غریب ہو گیا اور کوڑھ کی بیماری اس کے بدن پر آگئی کہ اس نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تو اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آگیا۔

آج تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بیماری اس لیے لگ گئی کہ پانی صاف نہیں تھا، یہ موٹروں کے دھوئیں نے آلودگی پھیلا دی ہے اور اوزون میں سوراخ ہو گیا ہے، درجہ حرارت بڑھ گیا ہے۔ یہ عام لوگوں کی نظر ہے، جو اسباب پر جاتی ہے۔ اور مومن کی نظر مسبب الاسباب تک جاتی ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کبھی اللہ نے کوئی عذاب نازل نہیں کیا، مگر تمہارے گناہ کی وجہ سے۔ اور وہ بلا نہیں ٹلے گی مگر توبہ کے ساتھ۔ آج ہم اشتہار بنا کر توبہ کرتے ہیں، جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور مزید اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے۔

ہر قسم کے صدقات اور ان کا ثواب:

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل فرمائی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ وَلَا يَقْبَلُ اللهُ إِلَّا الطَّيِّبَ، فَإِنَّ اللهَ يَتَقَبَّلُهَا بِيَمِيْنِهِ ثُمَّ يُرَبِّيْهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا يُرَبِّيْ أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ حَتّٰى يَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ'' جس آدمی نے ایک کھجور کے برابر صدقہ کیا، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ کھجور حلال کی تھی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ صدقہ قبول نہیں فرماتے جب تک کہ وہ پاکیزہ نہ ہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاکیزہ ہے اور وہ پاکیزہ چیزوں کو قبول فرماتے ہیں۔ جب آدمی ایک کھجور کا صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے داہنے ہاتھ سے جیسے اس کی شان کو زیبا ہے قبول فرماتے ہیں، پھر اس کو بڑھاتے ہیں جیسے تم اپنے کسی جانور کے بچے کو پالتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو پہاڑ کے برابر بڑھا دیتے ہیں۔ [صحیح البخاری: رقم: ۱۴۱۰، ۷۴۳]

اس لیے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جب بھی خیرات کریں تو خالص حلال سے کریں ایک کھجور کا دانہ بھی۔ اگر اتنی توفیق بھی نہیں ہے تو ایک گلاس پانی کا بھر کر کسی کو پلا دیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی کو اتنی توفیق بھی نہیں ہے تو اپنے مسلمان بھائی کو مسکرا کر مل لے یہ بھی صدقہ ہے۔

اس لیے شریعت کے اندر حکم ہے کہ آدمی جس کو جانتا ہو اور جس کو نہ جانتا ہو اس کو سلام کہے، خاص طور پر جو لوگ غریب ہیں، فقیر اور معذور ہیں، جن پر کوئی سلام کرنا بھی نہیں چاہتا، ایسے لوگوں پر بھی سلام کہو۔

زکوٰۃ و صدقات یہ خالص مالی عبادت ہے، حج مشترک ہے: اس میں مال بھی خرچ ہوتا ہے اور بندے کا بدن بھی خرچ ہوتا ہے۔ اور نماز میں بدن خرچ ہوتا ہے۔

ایصالِ ثواب:

جتنی عباداتِ مالیہ ہیں والدین، رشتہ داروں اور اپنے اساتذہ کے لیے خیرات کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب کے نزدیک ثواب اور اجر ہے۔ اسی طرح اولاد کا والدین کے مرنے کے بعد ان کے لیے دعا کرنا اس میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ اولاد کو چاہیے کہ اگر والدین فوت ہو گئے ہیں تو ان کے لیے دعا کریں۔ اگر تھوڑا سا اختلاف ہے تو وہ قراءتِ قرآن میں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے ثواب کے قائل نہیں ہیں، لیکن احناف اس کے بھی قائل ہیں۔

سوال و جواب:

بہر حال جب خیرات کرنے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے تو قل خوانی کے بارے میں کہتے ہیں کہ نہ کرو تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے جو تیسرے دن قل خوانی اور سات جمعراتیں متعین کر دی ہیں، حالانکہ ہمیں تعین کا اختیار نہیں تھا۔ یہ بدعت ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر حلال اور طیب مال نہ ہو تو اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتے۔ اب بندہ مر گیا، اس کے مرنے کے بعد جائیداد وارثوں کی ہے۔ ابھی جائیداد وارثوں میں تقسیم نہیں ہوئی اور ان وارثوں میں ابھی بعض بچے نابالغ ہیں، وہ جب تک بالغ نہ ہوں ان کے مال سے خیرات کرنے کے بارے میں آپ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ آدمی کے مرنے کے بعد جو خیرات کر رہے ہیں، یہ اگر میراث سے ہے تو کیا سارے وارث راضی ہو کر خرچ کر رہے ہیں؟ اگر ایک آدمی بھی راضی نہیں تب بھی حرام ہے۔ اس لیے علماء نے منع فرمادیا کہ ثواب بھی نہ ہو اور ہزاروں روپے خرچ کر دو ٹھیک نہیں ہے۔ جب ثواب نہ ہو تو گویا ہم نے مال کو ضائع کر دیا، اس طرح ہم اور گناہ کے مرتکب ہو گئے۔ اس لیے منع فرمادیا اور کہا: اگر تم نے خیرات کرنی ہے تو ہر وارث اپنے حصہ میں سے جب چاہے جتنا چاہے خیرات کر دے، یا جب جائیداد تقسیم ہو جائے تو مشترکہ طور پر اپنے والدین کو ثواب پہنچانے کے لیے کوئی ٹھوس چیز بنا دیں، جو ہمیشہ قائم رہے، کوئی مدرسہ بنا دیں، کوئی پانی وغیرہ کا انتظام کر دیں، تاکہ وہ ان کے لیے صدقہ جاریہ رہے۔ اس کے اندر کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔

صدقہ کرنے کی فضیلت:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقْبَلُ الصَّدَقَةَ وَ يَأْخُذُهَا بِيَمِينِهِ فَيُرَبِّيهَا لِأَحَدِكُمْ كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ مُهْرَهُ أَوْ فَلُوَّهُ حَتَّى إِنَّ اللُّقْمَةَ لَتَصِيرُ مِثْلَ أُحُدٍ'' کہ بندہ صدقہ کرتا ہے تو اللہ پاک اس کو قبول فرماتے ہیں اور دائیں ہاتھ میں لیتے ہیں اور اس کو پالتے ہیں، جیسے تم میں سے کوئی اپنے کسی بچھڑے کو پالتا ہے۔ دوسری روایت میں ہے: اگر کوئی آدمی ایک لقمہ بھی خیرات کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جیسا کہ اس کی شان کو زیبا ہے، اللہ کے ہاتھ میں وہ لقمہ اتنا بڑا ہوجاتا ہے، حتیٰ کہ احد پہاڑ کے برابر ہوجاتا ہے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرماتے ہیں۔ پس تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات کیا کرو۔

[السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴/۱۷۶]

سود کا انجام اور مومنین کی تعریف:

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ [البقرۃ:۲۷۶] اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند نہیں فرماتے جو دل کا بھی ناشکرا ہو اور زبان بھی گناہگار ہو۔ مفسر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ اس آیت کو ان الفاظ ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ پر ختم کیا، چونکہ سود کا کام کرنے والا اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی نہیں ہوتا۔ اگر وہ راضی ہوتا تو وہ حرام کے طریقے اختیار نہ کرتا، لوگوں کے مال دھوکے سے نہ کھاتا۔ جس میں سب سے برا اور خبیث ربوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار ہے اور ایسا آدمی بہت بڑا ظالم ہے اور اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدح بیان فرماتے ہیں جو ایمان والے ہیں، اپنے رب کے احکامات پر عمل کرنے والے، اپنے رب کی نعمتوں کا شکر کرنے والے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر صدقات و خیرات سے احسان کرنے والے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خبر دی ہے کہ ہم نے تمہارے لیے کیا کیا انتظامات کر رکھے ہیں کہ قیامت کے دن جو پریشانیاں ہوں گی وہ اس سے بے غم ہوں گے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرۃ:۲۷۷] جو لوگ ایمان لائے اور ایمان لانے کے بعد اچھے عمل بھی کیے: نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کی، ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، وہ غمگین نہ ہوں گے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۖ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝﴾

[البقرة:۲۷۸تا۲۸۱]

’’اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ (سود کا) بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ اگر تم (ایسا) نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان ہے سن لو۔ اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تمہیں تمہارے اصل اموال مل جائیں گے، نہ تم زیادتی کرو اور نہ زیادتی کیے جاؤ۔ اور اگر کوئی تنگ دست ہو تو آسودگی تک مہلت دینے کا حکم ہے اور یہ کہ معاف کر دو تو یہ تمہارے بہتر ہے اگر تم کو خبر ہو۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کے سامنے پیش کیے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کے عمل (خیر و شر) کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔‘‘

تقویٰ کا حکم:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پھر تنبیہ فرمائی کہ ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ سنت اللہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کسی کام سے منع کرتے ہیں تو ان کو تقویٰ کا حکم دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جب اللہ تعالیٰ سے ڈر دل میں پیدا ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلنا مشکل نہیں ہوتا اور جب اللہ تعالیٰ کا ڈر دل میں نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کے احکامات پر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ پورے قرآن میں غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کو چلانے کے لیے اہم چیز تقویٰ کا حکم فرمایا ہے۔

اطاعت کے لیے دو چیزیں شرط ہیں:

ہمیشہ یاد رکھیں! آپ دنیا میں کوئی قانون بنا دو، اس قانون پر چلنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے:
1 ...... ایک تو جس نے قانون بنایا ہو اس آدمی سے محبت ہو 2 ...... اور دوسرا دل میں اس کی عظمت ہو۔ یہ دو چیزیں آ جائیں تو پھر کسی پہرہ دار کی اور کسی پولیس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بیعت کی اقسام:

اس لیے علماء نے بیعت کا سلسلہ رکھا ہے، ورنہ بیعت ہونا کوئی فرض نہیں ہے، صرف درجہ استحباب کے اندر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی آدمی کا اللہ والے سے تعلق جڑ جائے اور وہ اس کی بات کو مانے، ورنہ اگر کسی نے بیعت نہیں کی تو کوئی بات نہیں۔

- ......حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں ایک بیعت علی الاسلام تھی کہ کفر سے نکل کر اسلام میں آ جاؤ۔
- ......اور ایک بیعت علی الجہاد تھی کہ حضور پاک ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ میرے ہاتھ پر آ کر بیعت کرو، ہم کفر کا مقابلہ کرتے ہیں۔
- ......اسی طرح ایک بیعت ہے علی السمع والطاعۃ کہ ہم ہر لحاظ سے آپ کی بات سنیں گے اور فرمانبرداری کریں گے، چاہے لاکھ دکھ سکھ ہو۔

انہی ساری بیعتوں کو سامنے رکھ کر بزرگوں نے ایک راستہ نکالا کہ جب بندے کا کسی سے استاد شاگردی کا تعلق بن جاتا ہے یا پیری مریدی کا تعلق بن جاتا ہے تو اس سے آدمی کو دل میں محبت ہوتی ہے اور عظمت بھی ہوتی ہے۔ اس کی بات کو سنتا بھی ہے اور مانتا بھی ہے۔

جیسے ڈاکٹر امراضِ جسمانی کا علاج بتاتے ہیں کہ آپ یہ گولی کھایا کریں، یہ انجکشن لگوایا کریں۔ اسی طرح ہمارے امراضِ روحانی کے لیے ایک راستہ نکالا ہے؛ کیونکہ جب آدمی کا کوئی استاد ہو تو لازمی بات ہے دل میں اس کی عظمت بھی ہوگی اور ان سے محبت بھی ہوگی۔ اسی طرح اپنے مرشد سے، پیر سے اور شیخ سے محبت ہوتی ہے، لیکن اب تو رواج بن گیا ہے کہ پیر کا بیٹا پیر ہے، چاہے نماز بھی نہ پڑھے۔ کسب معاش کا طریقہ بن گیا ہے کہ جتنے بزرگانِ دین فوت ہو گئے ان کے بعد جو لوگ آئے وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور کہا کہ ہم بھی مرشد کے بیٹے ہیں، چاہے وہ خود اللہ کے بھی نافرمان ہوں اور اپنے باپ دادا کے بھی نافرمان ہوں، جبکہ اللہ کے ہاں نبی کے بیٹے کو نہیں پوچھا اگر عمل اچھے نہ ہوں۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا نبی کا بیٹا ہے، جہنم میں چلا گیا۔

سود کی حرمت کا اعتقاد رکھنے کا حکم:

علماء نے فرمایا ہے: اگر کوئی آدمی اعتقاد سے سود لینے کو حرام نہیں سمجھتا ہو وہ بالاتفاق کافر ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

سود کو حرام کیا اور وہ کہتا ہے: حلال ہے۔ تو وہ منکرِ قرآن ہے اور خدا کے حرام کو حلال کہہ رہا ہے، اس لیے اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک آدمی سود کو حرام کہتا ہے اور اس کو بہت بڑا گناہ سمجھتا ہے، لیکن پھر بھی سود لیتا دیتا ہے۔ اب یہ آدمی فاسق تو کہلائے گا اور بار بار اس جرم کو کرنے کی وجہ سے فاجر بھی بن جائے گا، لیکن کافر نہیں بنے گا؛ کیونکہ وہ کہتا ہے: حرام تو ہے۔

اسی طرح بعض مسلمان ایسے ملکوں میں ہیں کہ اس ملک کا سارا اقتدار کافروں کے ہاتھ میں ہے۔ مثلاً: کوئی یورپ میں رہتا ہو، انڈیا میں رہتا ہو، اب وہاں اگر انہوں نے کوئی ایسا قانون نافذ کر دیا کہ آپ گاڑی خرید نہیں سکتے، جب تک کہ انشورنس نہ کروائیں، اب وہ مجبور ہے۔ تو یہ اضطراری حالت ہے۔

اسی طرح وہ بینک میں پیسے رکھتا ہے کہ گھر میں چوری ہو جائیں گے۔ وہاں کرنٹ اکاؤنٹ ہوتا ہے یا سیونگ اکاؤنٹ ہوتا ہے۔ کرنٹ اکاؤنٹ یہ ہے کہ آپ لاکھوں روپے رکھ لیں، سود نہیں ملے گا۔ جتنے پیسے آپ نے رکھے ہیں اتنے پیسے آپ کو ملیں گے۔ یہ رکھنا بالاتفاق جائز ہے؛ کیونکہ گھر میں حفاظت کا انتظام نہیں ہو سکتا، ہم مجبور ہیں اور ہمارے ملکوں میں اسلامی قانون نہیں ہے تو بغیر کسی اختلاف کے پیسے رکھ سکتے ہیں۔

بعض ملک ایسے ہیں کہ وہاں جتنا پیسہ رکھو، چاہے کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھو تب بھی سود ملتا ہے، چاہے کم ملتا ہے۔ تو وہاں علماء نے فرمایا کہ سود کی رقم بینک والوں سے لے لو؛ کیونکہ اگر ان کو چھوڑ دو گے تو تم گویا ان کی مدد کر رہے ہو، گناہ گار بنو گے، بلکہ ان سے پیسے لینے کے بعد بغیر ثواب کی نیت کے غریبوں پر خرچ کر دو۔

آیات مبارکہ کا شان نزول:

ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ دو قبیلے تھے: بنی عمرو بن عمیر، یہ بنو ثقیف کہلاتے تھے۔ اور ایک بنو مغیرہ قبیلہ تھا، جو بنو مخزوم کہلاتے تھے۔ یہ دونوں بڑے معروف قبیلے گزرے ہیں۔ ادب کے اعتبار سے بھی یہ بڑے قبیلے تھے اور بہادری کے اعتبار سے بھی یہ بڑے مشہور تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ سود کا کاروبار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور یہ اسلام میں داخل ہو گئے تو بنو ثقیف کا جو سود بنتا تھا انہوں نے دوسرے قبیلے سے کہا: ہمیں وہ سود دے دو۔ دوسرے قبیلے والوں نے کہا: اب ہم سود کیسے دیں؟ ہم تو اسلام میں داخل ہو گئے۔ اسلام کی حالت میں جو ہم نے پیسہ کمایا ہے وہ ہم کفر والے زمانے کا سود کیوں ادا کریں؟ (ان کو یہ پتہ نہیں تھا کہ سود حرام ہے، وہ

اپنے دماغ میں سوچ رہے تھے) تو ان دونوں قبیلے والوں نے حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: جو اس وقت حضور اکرم ﷺ کی طرف سے مکہ میں نائب تھے، انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں خط لکھا کہ آپ ﷺ حکم فرمائیں کہ میں کیا فیصلہ کروں؟ حضور اکرم ﷺ نے یہی آیت مبارکہ لکھ کر بھیجی کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اگر ایمان والے ہو تو سود چھوڑ دو۔ جب یہ آیت مبارک ان کو سنائی گئی تو وہ کہنے لگے: ''نَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ'' ہم توبہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہمارا جتنا سود بنتا ہے آج کے بعد سب ختم ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت سے اور بڑی تہدید اور وعید کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اگر تم سود کو نہیں چھوڑتے ہو تو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ کون کر سکتا ہے؟ مسلمان تو اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ جنگ لڑے گا۔ تو وہ جو کافر ہے، جو قومیں اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں ان کا انجام بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

روس کا باطل نظام کمیونزم:

اب دیکھیں کہ روس میں کمیونزم نے کس طرح دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا؟ یہ قاعدہ وضابطہ ہے کہ باطل فرقہ اور باطل نظریہ جب اٹھتا ہے تو دنیا پر چھا جاتا ہے۔ اسی طرح روس نے آدھی دنیا سے زیادہ کو کمیونسٹ بنا دیا کہ قرآن کے منکر، نبی کے منکر، رسالت کے منکر اور شریعت کے منکر ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنا نیا نظام برپا کر دیا کہ ہم تو غریبوں کی بہبود کے لیے کام کرتے ہیں کہ کوئی آدمی بڑا نہیں، کوئی جاگیردار نہیں، سب سے چھین کر سب کو دے دو۔ سب کماؤ اور سب کھاؤ اور برابر رہو۔ اس کا انجام یہ نکلا کہ وہ روس ستر سال کے بعد ختم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور ستر سال کے بعد ان کو خود کہنا پڑا کہ ہماری بات غلط تھی۔

اسلام نے چودہ سو سال پہلے سے جو احکام جاری کیے ہیں مجال ہے کہ ذرہ برابر بھی ان میں تبدیلی آئی ہو۔ ساری دنیا لوٹ کر پھر اسلام کو مان رہی ہے؛ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کبھی بدلا نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہمیشہ قائم دائم ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

سودی نظام کی خرابیاں:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ﴾ اگر تم مومن بن کر میرے حکم پر نہیں چلتے ہو، سود نہیں چھوڑتے ہو، میں تو غنی ہوں، اگر تم سود نہیں چھوڑو گے تو ہم تمہیں اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ کی خبر دیتے ہیں۔

یہ جو بینکوں والے کہتے ہیں کہ یہ حکم بڑا مشکل لگتا ہے، ہم سود کو کیسے چھوڑ دیں؟ ہم نے لاکھوں لوگوں سے پیسہ لینا ہے۔ اگر ہم ان لوگوں کو چھوڑ دیں تو ہمارے بینک برباد ہو جائیں گے، ہمارا تو دیوالیہ نکل جائے گا، حالانکہ یہ سب سے بڑے مکار ہیں، جھوٹ بولتے ہیں۔ یاد رکھیں! جتنے بڑے بڑے بینکر ہیں، یہ تمہارے خون سے ہولی کھیلتے ہیں۔ جب یہ بینک کھولتے ہیں مثلاً: انہوں نے بیس کروڑ ڈالا ہے تو ایک مہینہ کے اندر اپنا پیسہ نکال لیتے ہیں، پھر تمہارا پیسہ ہوتا ہے، جس سے ہولی کھیلی جا رہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سود اس لیے حرام کیا ہے کہ سینکڑوں لوگ کروڑوں کا خون چوس لیں گے، باقی دنیا عذاب میں ہوگی۔ اس لیے آج دیکھ لیں کہ یہودیوں کے ہاتھ میں لیور آف اکانومی ہے۔ وہ جس ملک کو چاہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو سود حرام کیا ہے، اس کے اندر اس کی حکمتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے خنزیر حرام کیا ہے، اس کے اندر حکمت رکھی ہے کہ خنزیر کھانے سے میرے بندے کے اندر بے غیرتی آئے گی، انسانیت ختم ہو جائے گی، اس سے میرے بندے کو کینسر ہوگا، خنزیر کھانے سے میرے بندے کو باطنی امراض ہوں گے اور خنزیر والی عادات آئیں گی۔ آج چودہ سو سال بعد یورپ نے تسلیم کیا ہے کہ خنزیر کھانے کے اندر یہ اور یہ نقصانات ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم سود نہیں چھوڑو گے تو تمہارا اللہ اور اللہ کے رسول سے اعلانِ جنگ ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ کوئی بندہ اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ تو نہیں جیت سکتا۔ آپ دیکھ لیں کہ جو آدمی ظاہری طور پر بڑے فیشن کرتا ہے ان کے اندر کچھ نہیں ہوتا، اس کے اوپر قرضہ ہی قرضہ اور لعنت ہی لعنت ہوتی ہے۔

اس کا علاج بتا دیا: ﴿وَاِنْ تُبْتُمْ﴾ کہ تم توبہ کر لو۔ ایک ہم توبہ کرتے ہیں جو زبان سے ہوتی ہے۔ یہ توبہ توبہ نہیں، یہ مذاق ہے۔ توبہ کا معنی ہے کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور اس پر نادم ہو جاؤ اور آئندہ نہ کرنے کا وعدہ کرو کہ پھر کبھی یہ گناہ نہیں کریں گے۔ اور جب ان تین باتوں میں سے ایک بھی نہ ہو تو وہ توبہ نہیں ہوتی۔

﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کے تفسیری اقوال:

﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ''فَاْذَنُوْا'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ یقین کر لو کہ تم اللہ تعالیٰ کے دشمن ہو۔ جو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی مول لے رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن سود خوروں کو حکم دیں گے: اٹھاؤ اپنے ہتھیار اور میرے ساتھ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ سے کون لڑ سکتا ہے؟

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کوئی مسلمان اسلامی حکومت کے اندر سود کھانے پر جما ہوا ہے تو امیر المومنین کو حق حاصل ہے کہ اس کو بلا کر کہیں کہ سود سے توبہ کرو۔ اگر وہ توبہ کرے تو ٹھیک ہے اور اگر توبہ نہ کرے تو اس کو قتل کر دے؛ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے جنگ لڑ رہا ہے۔

حضرت ہشام بن حسان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن اور حضرت ابن سیرین رحمہما اللہ فرماتے تھے کہ یہ جو پیسے کی تبدیلی والے لوگ ہیں یہ بھی سود کے اندر مبتلا ہیں۔ کاش! مسلمانوں کے اوپر کسی عادل بادشاہ کی حکومت ہوتی تو اس کا فریضہ تھا کہ ان کو بلا کر توبہ کرائے۔ اگر یہ توبہ نہ کریں تو ان کے خلاف جنگ لڑے اور ان کو سزا دے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وعید بیان فرمائی ہے کہ ان کی سزا قتل ہے۔ مسلمانو! خبردار! خیال رکھنا! کسی سودی معاملہ کے اندر نہ پڑنا۔ اللہ تعالیٰ نے حلال کے طریقے بڑے وسیع فرما دیئے ہیں۔ اگر تمہیں کبھی غریبی پیش آجائے تو حرام کے اندر نہ پڑ جانا۔ اب بھی دنیا کے اندر دیکھ لیں کہ اگر دنیا میں سود کھانے والے ہیں تو ایسے بھی ہیں ایمان والے ہیں، جو سود نہیں کھاتے۔ ان کے بھی تو معاملات چل رہے ہیں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ سود کے بغیر ہمارا معاملہ نہیں چل سکتا اور سود کے بغیر ہمارا کاروبار نہیں ہوسکتا۔ یہ سب جھوٹی باتیں اور شیطانی وساوس ہیں۔

سود سے بچنے پر رزق میں کشادگی کا واقعہ:

میرے ایک دوست مجھ سے مشورہ لینے کے لیے آئے اور کہا کہ بینک نے یہ اسکیم جاری کی ہے اور کہتے ہیں کہ اس میں سود نہیں ہے۔ میں نے ان سے کہا: آپ مجھے یہ موٹی بات بتا دیں کہ انہوں نے جو منافع رکھا ہے وہ کیا فکس کیا ہے یا کم زیادہ ہوتا ہے؟ اگر اس میں نقصان ہو جائے تو کیا فارم کے اندر یہ موجود ہے کہ اس نقصان کے تم بھی حصہ دار ہو؟ اس نے کہا: ہم کبھی نقصان کے اندر حصہ دار نہیں ہیں۔ دوسری بات بارہ فیصد نفع ہے جو ہمیں ملے گا۔ تو میں نے ان سے کہا: یہ سود ہے، اس سے بچ جاؤ۔ اس نے کہا: میں اتنی بڑی محنت ومشقت اور مزدوری کر کے حلال کے پیسے کمائے ہیں، تین چار لاکھ روپے میرے پاس ہیں، اب میں ان کا کیا کروں؟ میرے بچے چھوٹے ہیں، وہ کل کو جوان ہوں گے، ان کی ضروریات ہوں گی۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ تم ان مصیبتوں میں نہ پڑو کہ حلال کما کر پھر حرام میں ڈال دو، تم اللہ پر توکل کرتے ہوئے جس شہر میں تمہارا گھر ہے وہاں کوئی پلاٹ لے لو۔ اللہ تعالیٰ اس

میں برکت عطا فرمائیں گے۔ اس نے دو سال بعد یا تین سال بعد خط لکھا کہ میں نے آپ کے مشورے پر چار لاکھ کا پلاٹ لیا تھا، اب وہ میرا پلاٹ پندرہ لاکھ میں بک گیا ہے۔

اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ اتنا بڑا نفع اس کو دنیا میں کہیں سے مل سکتا تھا!؟ اور وہ حرام سے بھی بچ گیا۔ جب بندہ دل میں نیت کر لیتا ہے کہ اے اللہ! میں حرام سے بچنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے حلال کا رزق وسیع فرما۔

فقر و فاقہ سے نجات کے وظائف:

بعض روایات میں آتا ہے کہ جب کعبۃ اللہ پر نظر پڑے تو جہاں یہ دعائیں منقول ہیں کہ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُمَّ! زِدْ بَيْتَكَ هٰذَا تَشْرِيفًا وَتَكْرِيمًا وَتَعْظِيمًا وَمَهَابَةً وَبِرًّا وَ تَقْوٰى'' اگر آپ کو یہ نہ آئے تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں: یا اللہ! اپنے گھر کی عزت و عظمت کو دوبالا فرما۔ اس کے ساتھ یہ بھی دعا آئی ہے: ''اَللّٰهُمَّ! اجْعَلْ فِيهَا قَرَارًا وَّارْزُقْنَا فِيهَا رِزْقًا حَلَالًا'' یا اللہ! ہمیں اپنے گھر کے اندر قرار نصیب فرما اور ہمیں رزق حلال نصیب فرما۔

جو لوگ کام کرتے ہیں، لیکن ان کی غربت نہیں ٹلتی، اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ روزانہ رات کو سورۂ واقعہ پڑھیں۔ ایک دفعہ پڑھ لیں، دو دفعہ پڑھ لیں۔ اور روزانہ ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ! أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ!'' اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے پڑھتے رہیں۔ چند دنوں میں اللہ تعالیٰ رزق میں اتنی برکت دے دیں گے کہ بندہ سوچ بھی نہیں سکے گا۔

مکی صاحب کے والد گرامی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا واقعہ:

میں ایک دفعہ والد صاحب کے پاس آیا، وہ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ میں نے سوچا اکیلے بیٹھ کر ہنس رہے ہیں، پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نے آکر پوچھا تو کہنے لگے: عجیب بات ہے! اللہ میاں ہمارے تماشے دیکھتے ہیں۔ کئی دن گزر گئے، میرے پاس ایک ریال بھی نہیں تھا۔ میں نے کسی پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ میرے پاس نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے جو طالب کھانا بھیجتا تھا وہ بھی کہیں چلا گیا، اس کے گھر والوں کو میرے ٹھکانے کا پتہ نہیں، وہ کہاں بھیجتے؟ لہٰذا دو تین دن سے کھانا بھی نہیں کھایا تو میں حرم سے پڑھا کر جب نکلا تو روٹی لے کر زمزم کے پانی کے ساتھ کھا لی۔ تین دن اسی طرح گزر گئے۔ (میں بھی مدینہ منورہ گیا ہوا تھا، مجھے بھی پتہ نہیں تھا کہ والد صاحب پر اس طرح کی کیفیت ہے) اور آج ایک آدمی نے آکر اتنی قسم کے کھانے دیئے، میں سوچ رہا ہوں کہ میں اکیلا آدمی کیسے کھاؤں؟ تین دن بھوکا رکھا اور اتنی انواع و اقسام کے کھانے بھجوا دیئے۔ وہ آدمی ایک لفافہ دے گیا، اس میں

ایک ہزار ریال بھی تھے۔

اللہ کے کعبہ کے اندر بیٹھ کر میں کہہ رہا ہوں کہ جتنے ہمارے سر کے بال ہیں، اگر ہمیں اللہ تعالیٰ اتنی زبانیں دیتے تب بھی ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتے تھے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقین رکھو، اس کے اندر کسی قسم کا تزلزل نہ ہو۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر دعا مانگتے وقت دل کے اندر یہ ہو کہ پتہ نہیں کہ دعا منظور ہوگی یا نہیں ہوگی۔ میں بڑا گناہگار ہوں، پتہ نہیں اللہ میری دعا سنتا ہے یا نہیں۔ فرمایا: جب یہ شک آ جائے تو سمجھو دعا منظور نہیں ہوئی۔ ہم جتنے بڑے گناہگار ہیں، لیکن وہ تو ارحم الراحمین ہے۔ ہم سارے بندوں کے گناہ اس کی رحمت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ کا تو وعدہ ہے کہ جب گناہگار بندہ اپنے گناہوں سے لوٹ کر میرے دروازے پر آتا ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ اس لیے جب بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو تو یقین سے مانگو کہ اے اللہ! تیرے دروازے پر آیا ہوں اور اب لے کر جانا ہے۔ تیرے دروازے کے بغیر دروازہ نہیں، غیروں سے مانگوں تو کافر بنوں گا اور اگر تو بھی نہ دے تو کدھر جاؤں گا!!؟

لہٰذا اگر کسی پر قرضہ ہو تو کثرت سے استغفار، روزانہ رات کو سورہ واقعہ پڑھو، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے سب فقر و فاقے ٹل جائیں گے۔

﴿وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۷۹] اگر تم پکی توبہ کرلو، پھر اصل راس المال جو تم نے قرضہ دیا تھا وہ لے لو، ہم تمہارا حق نہیں مارنا چاہتے۔ ﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ نہ تو تم پر ظلم ہوگا کہ تمہارا راس المال بھی ڈوب جائے اور نہ تم ظلم کرو کہ راس المال کے علاوہ سود وصول کرنا چاہو۔

حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان:

حضور اکرم ﷺ نے جب حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیا تو ارشاد فرمایا: ”أَلَا! إِنَّ كُلَّ رِبًا كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ عَنْكُمْ كُلُّهُ، لَكُمْ رُؤُوْسُ أَمْوَالِكُمْ، لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ، وَأَوَّلُ رِبًا مَوْضُوْعٌ رِبَا الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ كُلُّهُ“ لوگو! خبردار! سود حرام ہو چکا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں جتنی سود کی قسمیں تھیں وہ سب کی سب میں نے پاؤں کے نیچے روند ڈالی ہیں۔ میرے اپنے چچا حضرت عباس کا ربا جو لوگوں کے پاس ہے وہ بھی ختم ہے۔ اب آج

کے بعد سود کا لین دین نہیں ہوگا، صرف رأس المال واپس لیا جائے گا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱۳]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری امت پر ایک وقت آئے گا کہ لوگ شرابیں پئیں گے، شرابوں کے مختلف نام رکھ کر کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تو خمر کو حرام کیا ہے، وسکی تو حرام نہیں کی ہے۔

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ﴾ اگر تم نے ایک آدمی کو قرضہ دیا ہے، اس کو تم نے دو مہینے کی مہلت دی۔ دو ماہ بعد تم نے اس سے قرضہ مانگا، اس نے کہا: میرے پاس تو نہیں ہے اور وہ حقیقت میں سچا بھی ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت دے دو جب تک اس کی تنگی دور ہو جائے۔ یہ نہیں کہ اس پر سود بڑھا دو یا اور سود دے دو۔

﴿وَأَنْ تَصَدَّقُوا﴾ اگر تمہیں یہ یقین ہو کہ یہ بالکل غریب ہے، مہلت ملنے کے بعد یہ نہیں دے سکتا تو اس کو معاف کر دو۔

اس میں دو اشارے کر دیئے کہ جب سود نہیں ہوگا تو کاروبار چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو قرضہ دو۔ اگر غریب بے چارے کو تنگی آ جائے تو مہلت دو اور اگر تمہیں اللہ تعالیٰ نے زیادہ دیا ہوا ہے اور اس غریب بے چارے کو اتنی تنگی ہے کہ بالکل نہیں دے سکتا تو وہ اس پر صدقہ وخیرات کر دو۔ اور ساتھ فرما دیا کہ اگر تم نے کسی کو ایک ہزار ریال قرضہ دیا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے لیے روزانہ ایک ہزار ریال کا صدقہ لکھتے رہو۔ اب دو سال گزر گئے، وہ قرضہ نہیں ملا، تم نے پھر کہا کہ ایک سال اور مہلت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے فرشتو! اب اس کا ڈبل صدقہ لکھتے رہو؛ کیونکہ اس نے اپنے وعدے کے علاوہ بھی مہلت عطا فرما دی، اس نے میرے بندے پر رحم کیا ہے تو ہم بھی اس پر رحم کرتے ہیں۔ اب دیکھیں وہ قرضہ ہے، لیکن صدقہ بھی لکھا جا رہا ہے۔

مسئلہ:

اگر تم نے کسی کو قرض دیا اور وعدہ گزر گیا ہے۔ مقروض کہتا ہے: میں غریب ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اپنے اس بھائی کو مہلت دو۔ اگر تم چاہو تو اس کو معاف کر دو، یہ تمہارے لیے سب سے زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا نہ کرو جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے اندر لوگ کسی کو قرضہ دیتے ہیں۔ جب وعدہ کے اوپر قرض خواہ قرض مانگتا اور مقروض کہتا: میں قرضہ ادا نہیں کر سکتا تو قرض خواہ اس کو کہتا کہ اس پر سود لگ جائے گا۔ اگر اس کو قبول کر لو تو ہم تمہیں اور دو مہینے کی مہلت دے دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! ایسا نہ کرو۔ اگر مقروض واقعی تنگ ہے تو اس

کو مہلت دو اور اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں طاقت دی ہے تو اس پر قرضہ خیرات کر دو۔

مفسر فرماتے ہیں: اس بارے میں آقا ﷺ کی بہت سی احادیث مبارکہ ہیں۔

صدقات کی فضیلت پر احادیث:

❁......حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُظِلَّهُ اللّٰهُ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ فَلْيُيَسِّرْ عَلٰى مُعْسِرٍ أَوْ لِيَضَعْ عَنْهُ'' جس آدمی کی یہ تمنا ہے کہ قیامت والے دن جب کوئی سایہ نہیں ہوگا اور کوئی آرام کی جگہ نہیں ملے گی تو اس کو یہ کرنا چاہیے کہ اگر اس کا کوئی مقروض تنگ ہو جائے تو اس کو مہلت دے دے یا مقروض کو بالکل قرضہ معاف کر دے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے آدمی کو قیامت والے دن اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیں گے۔ [مجمع الزوائد: ۴/۱۳۴، المعجم الکبیر: ۱/۳۰۴]

❁......(حدیث) فرمایا: ''مَنْ رَحِمَ رُحِمَ'' جو زمین والوں پر رحم کرتا ہے آسمان والا اس پر رحم کرتا ہے۔

❁......(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ'' لوگو! اگر اللہ تعالیٰ تمہیں طاقت دے تو زمین والوں پر رحم کرو، غریبوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

[سنن کبریٰ للبیہقی: ۹/۴۱، کشف الخفاء: ۱/۱۱۹]

❁......(حدیث): حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلِهِ صَدَقَةٌ''[1] جو بندہ کسی بندے کو قرضہ دیتا ہے۔ اگر اس نے اس بندے کو ایک مہلت دی تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے اس بندے کا روزانہ صدقہ کا اتنا ہی ثواب لکھتے رہو جتنا اس نے قرضہ دیا ہوا ہے۔ صحابی نے عرض کیا: میں نے آپ سے ایک دفعہ سنا تھا کہ جتنا قرضہ دیا اتنا صدقہ کا ثواب لکھا جاتا ہے اور دوسری دفعہ میں نے آپ سے سنا کہ اس کا دگنا صدقہ لکھا جاتا ہے، مجھے یہ سمجھ نہیں آئی؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم نے ایک مہینہ تک کے لیے قرضہ دیا تھا تو ایک مہینے تک تیرے کھاتے میں ایک ہزار کا ثواب لکھا جائے گا۔ اب ایک مہینہ کے بعد اس بندے سے قرضہ ادا نہیں ہوا، تم نے اس کو ایک مہینہ اور مہلت دے دی تو اب تمہیں ڈبل ثواب لکھا جائے گا۔

❁......حضرت محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ نے روایت کی ہے، حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی سے قرضہ لینا تھا۔ وہ

[1] [مسند احمد بن حنبل: ۵/۳۶۰، مجمع الزوائد: ۴/۱۳۵]

اس آدمی سے قرضہ مانگتے، لیکن وہ آدمی چھپ جاتا تھا۔ ایک دن آپ رضی اللہ عنہ قرضہ لینے کے لیے اس کے دروازے پر تشریف لے آئے۔ جب آواز دی تو ایک بچہ نکلا، انہوں نے اس بچہ سے پوچھا کہ کیا وہ آدمی گھر پر ہے؟ اس بچے نے کہا: ہاں وہ گھر پر ہیں اور حلوہ کھا رہے ہیں۔ آپ نے باہر سے آواز دی: اے فلاں! باہر نکلو۔ مجھے پتہ لگ گیا ہے کہ تم گھر میں موجود ہو، لیکن تم نکلتے نہیں ہو۔ جب اس نے آواز دی تو باہر آ گئے تو حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ تم خوامخواہ مجھ سے کیوں چھپتے ہو؟ اس نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ میں بڑا تنگ دست ہوں، میرے پاس کوئی پیسے نہیں ہیں اور میں نے آپ کا قرضہ دینا ہے تو میں آپ کے سامنے کیسے آؤں؟ شرمندگی ہوتی ہے، چھپ جاتا ہوں۔ جب آپ نے یہ سنا تو فرمایا: ''اللہ اکبر!'' مجھے تو پتہ نہیں تھا کہ آپ تنگ دست ہیں، کیا آپ واقعی تنگ دست ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں میں بہت تنگ دست ہو گیا ہوں۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ خود رو پڑے اور کہا: میں نے حضور پاک سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: ''مَنْ نَفَّسَ عَنْ غَرِيمِهِ أَوْ مَحَا عَنْهُ كَانَ فِي ظِلِّ الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' جس نے اپنے مقروض سے رعایت کی یا بالکل سارا قرضہ ہی معاف کر دیا تو ایسا آدمی قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کے نیچے ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جب آپ نے یہ حدیث سنائی تو آپ (یعنی خود حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ) رعایت دیئے گئے۔ [مسند احمد حنبل: ۵/ ۳۰۰، ۳۰۸، کنز العمال: رقم: ۱۵۳۷۹]

قرض معاف کرنے کے بدلہ میں جنت:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أُتِيَ اللهُ بِعَبْدٍ مِنْ عَبِيدِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، قَالَ: مَاذَا عَمِلْتَ لِي فِي الدُّنْيَا؟ فَقَالَ: مَا عَمِلْتُ لَكَ يَا رَبِّ! مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي الدُّنْيَا أَرْجُوكَ بِهَا، قَالَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، قَالَ الْعَبْدُ عِنْدَ آخِرِهَا: يَا رَبِّ! إِنَّكَ أَعْطَيْتَنِي فَضْلَ مَالٍ، وَكُنْتُ رَجُلًا أُبَايِعُ النَّاسَ وَكَانَ مِنْ خُلُقِي الْجَوَازُ، فَكُنْتُ أُيَسِّرُ عَلَى الْمُوسِرِ، وَأُنْظِرُ الْمُعْسِرَ. قَالَ: فَيَقُولُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: أَنَا أَحَقُّ مَنْ يُيَسِّرُ، ادْخُلِ الْجَنَّةَ)) [مسند احمد بن حنبل: ۳/ ۴۸۷]

بندہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے (یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس کے بارے میں خبر دی ہے کہ ایسا ہوگا اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی خبر کبھی غلط نہیں ہوتی اس لیے ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں کہ گویا قیامت ہوگئی، وہ بندہ پیش ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم جاری فرما دیا) قیامت کے دن اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو پیش کیا

جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم نے میرے لیے دنیا میں کیا کیا؟ بندہ عرض کرے گا: میرے اللہ! میں نے تو ذرہ برابر بھی ایسا کام نہیں کیا جس سے میں تیری رحمت کی امید کرسکوں اور میں نے تو کوئی ذرے کے برابر ایسا عمل نہیں کیا جس سے تیری رحمت کی امید کرسکوں۔ اللہ تعالیٰ اس سے تین دفعہ فرمائیں گے اور وہ تینوں دفعہ یہی جواب دے گا۔ آخر میں کہے گا: اللہ! میں میری ایک عرض ہے۔ اے اللہ! تو نے مجھے بڑا مال دیا تھا اور میں تاجر تھا۔ میرے اللہ! یہ میری عادت تھی کہ میں درگزر کرنے والا آدمی تھا کہ اگر کوئی امیر بھی آ گیا تو میں نرمی کرتا تھا اور اگر کوئی تنگ دست غریب آ گیا تو میں اس کی بھی مدد کردیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے میرے بندے! سب سے زیادہ تو میری شان ہے کہ میں نرمی کروں۔ تو بندہ بن کر بندوں پر نرمی کرتا رہا اور میں تو رب العالمین ہوں، ارحم الراحمین ہوں جاؤ! جنت میں داخل ہو جاؤ۔ تم نے میرے بندوں سے آسانی کی تھی اور آج میں تمہارے ساتھ آسانی کردیتا ہوں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک سند کے ساتھ یہ حدیث مبارک بھی بیان فرمائی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''كَانَ تَاجِرٌ يُدَايِنُ النَّاسَ، فَإِذَا رَأَى مُعْسِرًا قَالَ لِفِتْيَانِهِ: تَجَاوَزُوا عَنْهُ، لَعَلَّ اللهَ أَنْ يَتَجَاوَزَ عَنَّا، فَتَجَاوَزَ اللهُ عَنْهُ '' ایک تاجر تھا جو لوگوں کو قرضہ دیتا تھا۔ جب دیکھتا کہ مقروض آدمی تنگ ہے، اس کے حالات خراب ہیں اور اس کے پاس پیسہ نہیں ہے تو اپنے ملازموں سے کہتا: اس کو مہلت دے دو، اس سے درگزر کرو، اس کو تنگ نہ کرو، یہ بے چارہ پریشان ہے۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سے تجاوز کرکے مہربانی فرمائیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی جنت میں داخل فرمادیا۔ [صحیح البخاری: رقم: ۲۰۷۸، باب: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا]

مقروض کی مدد کرنے والا عرش کے سایہ میں ہوگا:

حضرت سہیل فرماتے ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ أَعَانَ مُجَاهِدًا فِي سَبِيلِ اللهِ، أَوْ غَازِيًا، أَوْ غَارِمًا فِي عُسْرَتِهِ، أَوْ مُكَاتَبًا فِي رَقَبَتِهِ، أَظَلَّهُ اللهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ)) [المستدرک للحاکم: ۲/۲۱۷]

جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والوں کی مدد کرے یا غازی کی مدد کرے یا کسی مقروض کی مدد کرے یا کوئی عبد مکاتب ہو (کسی کا غلام ہے، مالک اس سے کہتا ہے: مجھے ایک لاکھ ریال دے دو تو میں تمہیں آزاد کردوں

گا) اگر کوئی اس کی گردن چھڑانے میں اس کی مدد کرے، اس کو پیسے دے دے، تا کہ وہ آزاد ہو جائے اللہ تبارک و تعالیٰ ایسے آدمی کو (قیامت کے دن) اپنے سائے کے نیچے رکھیں گے جس دن کسی کو پناہ نہیں ملے گی، بس اللہ کے سایہ میں رحمت میں پناہ ملے گی۔

(حدیث) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ أَرَادَ أَنْ تُسْتَجَابَ دَعْوَتُهُ، وَأَنْ تُكْشَفَ كُرْبَتُهُ، فَلْيُفَرِّجْ عَنْ مُعْسِرٍ'' جو بندہ یہ چاہے کہ میری دعا منظور ہو جائے اور مستجاب الدعوات بن جاؤں کہ اللہ تعالیٰ میری دعا قبول فرمالیا کریں تو اس کو چاہیے کہ کسی قرض والے کی، کسی مصیبت والے کی مصیبت ہٹانے میں مدد کرے۔ اگر کوئی اس کا مقروض ہے، اگر اس کا قرض معاف کر دے اور جب بندہ کسی مظلوم پر رحم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ رحمت فرما کر اس کی دعائیں منظور فرمالیتے ہیں۔

[الترغیب والترهیب: ۲/۳۶، مسند احمد: ۲/۲۳]

لہٰذا غریبوں کی اور قرض خواہوں کی مدد کرنا یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں بندے کو مستجاب الدعوات بنا دیتا ہے۔ پھر بندہ جو بھی مانگتا ہے دعا منظور ہو جاتی ہے۔

(حدیث) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ كَانَ لَهُ عَلَى رَجُلٍ حَقٌّ فَأَخَّرَهُ كَانَ لَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ'' اگر تم نے کسی سے قرض لینا تھا اور وہ تم کو وقت پر نہ دے سکا تو آپ نے اس کو مہلت دے دی تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں میرے بندے نے جب تک مہلت دی ہے اس وقت تک اس کے لیے صدقہ کا ثواب لکھتے رہو۔

[مسند احمد بن حنبل: ۴/۴۴۳، کنز العمال: ۱۵۳۲۱]

(حدیث) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا أَوْ وَضَعَ عَنْهُ أَظَلَّهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ'' جس بندے نے کسی تنگ دست کو مہلت دے دی یا بالکل قرضہ معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اپنے عرش کے سائے میں رکھیں گے جس دن اور کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

[المستدرک للحاکم: ۲/۲۹، طبرانی فی الکبیر: ۱۹/۱۶۶]

صحابی رسول کا قرض معاف کرنے کا واقعہ:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اور میرا باپ علم حاصل کرنے کے لیے انصار کے قبیلہ کے پاس گئے، قبل اس کے کہ وہ فوت ہو جائیں سب سے پہلی ہماری جس سے ملاقات ہوئی وہ صحابی رسول حضرت

ابوالیسر رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے ساتھ ایک غلام تھا، اس کے پاس کتابوں کی گٹھڑی تھی۔ اس سے پوچھا: کیا وجہ ہے تم ناراض جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا: میں ایک آدمی کے پاس جاتا تھا، اس پر میرا قرض تھا۔ میں اس کے گھر آیا تو گھر والوں نے کہا: نہیں ہے۔ مجھے اس وجہ سے غصہ آیا کہ جھوٹ بول رہے ہیں؛ کیونکہ اس کے گھر سے بچہ نکلا، میں نے اس سے پوچھا: تمہارا باپ ہے؟ اس نے کہا: ہاں ہے۔ میں نے اس کو کہا: ہاں مجھے پتہ ہے تم اندر ہو اور تم میری بات سن رہے ہو، تم باہر نکلو۔ جب وہ باہر آ گئے تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم مجھ سے کیوں چھپ گئے؟ اس نے کہا: خدا کی قسم ہے! میں اس لیے چھپ گیا کہ میں اگر باہر نکل کر تم سے کوئی جھوٹ بولوں یا میں وعدہ کروں کہ تمہارا قرض ہفتہ کے بعد دوں گا، لیکن میں نہ دے سکوں تو وعدہ بھی جھوٹا کروں۔ اس لیے بہتر تھا کہ میں چھپ جاؤں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تنگ دست ہوں اور غربت کی وجہ سے میں چھپ گیا۔ میں نے اس کو اللہ کی قسم دے کر کہا: کیا واقعی تم تنگ دست ہو؟ اس نے کہا: میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں تنگ دست ہوں۔ میں نے اس سے کہا: میری ان آنکھوں نے دیکھا ہے، میرے ان کانوں نے سنا ہے، میرے دل نے سمجھا ہے اور میں نے اس کو محفوظ رکھا ہے جو میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو کسی تنگ دست کی مدد کرے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اپنے عرش کے سایہ کے نیچے رکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے غلام سے کہا: وہ دفتر (رجسٹر) لے آؤ، جس میں ان کا قرض لکھا ہوا ہے۔ اس کو مٹا دیا اور کہا: میں نے تمہارا قرضہ مٹا دیا ہے۔ اگر تمہارے پاس آ جائیں تو دے دینا، نہیں تو میں نے تمہیں معاف کیا ہے۔ [صحیح مسلم: رقم: ۳۰۶۵]

قرض معاف کرنے کا ایک اور واقعہ:

ہمارے والد صاحب کے بڑے عزیز شاگرد تھے۔ ان کا نام حاجی عبداللہ تھا۔ بڑے تاجر تھے ان کا ایک نوجوان بیٹا تھا، وہ بھی تاجر اور بڑا شریف آدمی تھا۔ وہ جوانی میں فوت ہو گیا۔ ان کے بیٹے نے لوگوں سے لاکھوں روپے کا قرض لینا تھا تو جس دن اس نوجوان کا جنازہ ہوا۔ جنازہ پڑھنے کے بعد ان کے والد صاحب نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میرے بیٹے نے جن جن لوگوں سے قرضہ لینا تھا میں نے وہ سب کو معاف کیا اور جس نے میرے بیٹے سے قرضہ لینا ہو وہ ابھی مجھ سے لے لے، تاکہ میرے بیٹے کے ذمہ کسی کا حساب باقی نہ رہے۔ جن لوگوں نے کہا ہم نے لینا ہے تو ان کو ادا کر دیا۔

کسی مظلوم کی مدد کرنا اتنی بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آجاتی ہے۔اس لیے غریبوں و یتیموں کی مدد کیا کرو اور جو مصیبتوں میں اور ناحق قید ہیں ان کی مدد کیا کرو۔

(حدیث) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ایک دن حضور پاک ﷺ مسجد کی طرف تشریف لے گئے اور آپ ﷺ اپنے ہاتھ سے زمین کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔اور فرمایا:

((مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا، أَوْ وَضَعَ لَهُ، وَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ، أَلَا! إِنَّ عَمَلَ الْجَنَّةِ حَزْنٌ بِرَبْوَةٍ -ثَلَاثًا- أَلَا! إِنَّ عَمَلَ النَّارِ سَهْلٌ بِسَهْوَةٍ ، وَالسَّعِيدُ مَنْ وُقِيَ الْفِتَنَ، وَمَا مِنْ جَرْعَةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ جَرْعَةِ غَيْظٍ يَكْظِمُهَا عَبْدٌ، مَا كَظَمَهَا عَبْدٌ لِلّٰهِ إِلَّا مَلَأَ اللّٰهُ جَوْفَهُ إِيمَانًا)) [مسند احمد بن حنبل:۱/۳۲۸]

جو آدمی کسی تنگ دست کو مہلت دے دے یا اس کا قرضہ اتار دے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی لو سے بچائیں گے۔ جنت کا عمل کرنا بڑا حزن والا ہے۔جیسا کہ اونچی جگہ پر چڑھنا مشقت والا کام ہے اسی طرح جنت والے اعمال کرنا آسان نہیں ہوتے۔البتہ جہنم میں لے جانے والے اعمال بڑے آسان ہوتے ہیں۔سعید وہ آدمی ہے جو فتنوں سے بچ گیا۔اور اللہ کے نزدیک سب سے محبوب گھونٹ وہ ہے جب بندہ اپنے غصہ کو ضبط کر کے پی جائے۔اور جس نے ایسا کر لیا اللہ تعالیٰ اس کے سینے کو ایمان سے بھر دیتے ہیں۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا إِلَى مَيْسَرَتِهِ أَنْظَرَهُ اللّٰهُ بِذَنْبِهِ إِلَى تَوْبَتِهِ'' جو بندہ کسی قرض دار کو مہلت دیتا ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ تجھے ادائیگی کی توفیق دے دے قرضہ دے دینا، اسی طرح بندہ بھی اگر کوئی گناہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو توبہ تک مہلت دے دیتے ہیں۔

[الترغیب والترہیب:۲/۳۶،مجمع الزوائد:۴/۱۳۴]

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے ڈارتے ہیں: ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ﴾ [البقرۃ:۲۸۱] آخر میں پھر فرمادیا کہ اے ایمان والو! اس دن سے ڈرو جس دن تم سب اللہ تعالیٰ کے پاس لوٹ کر آؤ گے، جس دن پورا پورا ملے گا۔تم نے حرام کھایا ہے تو ہم تمہیں پوری پوری سزا دیں گے۔ہم عدل کریں گے، ہمارے انصاف میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا، کسی دوسرے کے گناہ بلا وجہ تیرے اوپر رکھ دیں ایسے نہیں ہوگا یا تیری نیکی کو کچھ کم کر کے کچھ ثواب گھٹا دیں ایسا بھی نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ بالکل عدل فرمائیں گے، ان کا فیصلہ عدل پر ہوگا، ان کا فیصلہ عدل اور صدق پر

ہوگا، اس میں ذرہ برابر بھی کسی پر زیادتی یا ظلم نہیں ہوگا۔

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ کہ اس دن سے ڈرو جب تم سب نے لوٹ کر آنا ہے اور اس دن تمہیں پورا پورا بدلہ ملے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں: یہ آخری آیت ہے جو حضور پاک ﷺ پر اتری ہے۔ اس کے اکیس دن کے بعد حضور اکرم ﷺ کی وفات ہوگئی۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اس آیت کے اترنے کے بعد حضور پاک ﷺ نو راتیں زندہ رہے۔ اور ایک روایت میں ہے: اس آیت کے نزول کے اکتیس دن کے بعد حضور پاک ﷺ کی وفات ہوئی۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْـــًٔـا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْھَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِھٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ [البقرة: ۲۸۳]

''اے ایمان والو! جب ادھار کا معاملہ کرنے لگو ایک میعاد معین تک تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور یہ ضروری ہے کہ تمہارے آپس میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا انکار نہ کرے، جیسا کہ اللہ نے اس کو سکھلا دیا اس کو چاہیے کہ لکھ دے۔ اور وہ شخص لکھوائے جس کے ذمہ قرض واجب ہو اور اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے (املاء میں) ڈرے اور اس (حق) میں کچھ کم نہ کرے۔ پھر جس شخص کے ذمہ قرض ہے اگر وہ بے عقل ہو یا ضعیف ہو یا خود نہیں لکھوا سکتا تو اس کا کارکن (والد، وصی، نگران یا مترجم) انصاف سے لکھوا دے۔ اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ کرلیا کرو، پھر اگر وہ دو مرد گواہ نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ ان دو عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جائے تو ان میں ایک دوسری کو یاد دلا دے۔ اور گواہ بھی انکار نہ کریں جب بلائے جائیں۔ اور تم اس (معاملہ) کے لکھنے سے اکتایا مت کرو، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی میعاد تک۔ یہ (لکھ لینا) اللہ کے نزدیک پورا انصاف اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ تم کسی شبہ میں نہ پڑو، مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو، جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور خرید و فروخت کے وقت گواہ کرلیا کرو اور کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو اور اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تمہیں گناہ ہوگا۔ اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اللہ سب چیزوں کو جاننے والا ہے۔ اور اگر تم کہیں سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ پاؤ تو رہن قبضہ میں رکھنی چاہیے اور اگر دوسرے کا اعتبار کرتا ہو تو اعتبار کیے گئے شخص کو چاہیے کہ وہ اعتبار کرنے والے کی امانت کو پورا ادا کرے۔ اور اللہ جو اس کا پروردگار ہے اس سے ڈرے اور گواہی کو مت چھپاؤ اور جو بھی اس کو چھپائے گا اس کا دل گناہگار ہوگا۔ اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔''

ربطِ آیات:

ان آیات میں قرض کے احکام اور اس کے معاملات ذکر فرمائے ہیں۔

ایک مطلقاً خیرات کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دے اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات کرے۔ پھر صدقات کی چند قسمیں کی ہیں: ایک قسم صدقات واجبہ کی ہے، جیسے: زکوٰۃ اور فطرانہ۔ اور دوسری قسم صدقات نافلہ کی ہے کہ جتنا اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دے تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو۔

دوسری قسم ربوا ہے اور تیسری قسم دَین (قرض) ہے۔ صدقات وخیرات سراپا رحمت ہی رحمت ہیں، اللہ تعالیٰ کے غضب کو صدقہ بجھا دیتا ہے، آنے والی مصیبتوں کو ٹال دیتا ہے، آدمی کے گناہوں کو صدقہ مٹا دیتا ہے، صدقہ سے تمہارے رزق میں، تمہاری اولاد میں اور تمہارے مال میں اللہ تعالیٰ برکتیں عطا فرما دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے آسمانوں سے اترتے ہیں، جن کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ روزانہ صبح سے شام تک یہ دعا کرتے رہیں: ''اَللّٰهُمَّ! أَعْطِ لِكُلِّ مُنْفِقٍ خَلَفًا'' اے اللہ! جو تیرے راستے میں دے رہا ہے اس کو اپنے خزانہ سے عطا فرما اور جو تیرے راستے میں دینے سے بخل کر رہا ہے اس کے مال میں تباہی وہلاکت پیدا کر۔

یاد رکھیں! صدقات خالص حلال مال سے دیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور پاک مال ہی قبول کرتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی رشوت لے کر خیرات کرتا ہے، ڈاکہ مار کر خیرات کرتا ہے، چوری کے مال سے خیرات کرتا ہے یا ظلم سے لیے ہوئے مال سے خیرات کرتا ہے تو اس کو ایک پیسہ کا بھی ثواب نہیں ملتا۔ اگر وہ ثواب کی امید رکھے تو کفر کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے؛ کیونکہ ثواب حلال پر ملتا ہے، حرام پر نہیں ملتا۔

آخرت میں سودی لین دَین والے کی سزا:

ربوا سراپا ظلم وعذاب ہے۔ سود کی جتنی قسمیں ہیں، چاہے قرض پر سود لو، بیع وشراء پر لو، چاہے ان چھ چیزوں میں جو میرے آقا ﷺ نے بیان فرمادی ہیں: سونا، چاندی، گندم، جو، انگور اور کھجور، ان کے لین دین میں کمی بیشی کرو، یہ سب سود ہے۔ سود دنیا میں بھی باعثِ عذاب، قبر میں بھی باعثِ عذاب اور حشر میں بھی باعثِ عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے! دنیا میں بھی سودی آدمی کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ وہ ہر وقت اسی دولت کے چکر میں ہوتا ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں ذلیل کر دیتے ہیں کہ سٹے میں آ کر ایک دن میں جو کروڑ پتی تھا شام کو فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوتا ہے اور آخرت کے عذاب کا یہ عالم ہے۔ میرے آقا ﷺ نے فرمایا: جب مجھے بیت المقدس سے معراج کی طرف لے جایا جا رہا تھا، مجھے ایک نہر دکھائی گئی، جو خون کی بھری ہوئی تھی۔ اس کے اندر ایک آدمی بڑی محنت سے تیر کر جب کنارے کے قریب آتا ہے تو ایک بندہ کنارے پر کھڑا ہے، جو اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے تو وہ تیرنے والا آدمی واپس نہر میں چلا جاتا ہے۔ پھر تیر کر کوشش کرتا ہے کہ کنارے پر پہنچ جاؤں۔ جب کنارے پر آتا ہے تو اس کو دوبارہ پتھر مارا جاتا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون شخص ہے؟ انہوں

نے فرمایا: یہ وہ ہے جو دنیا میں سود کھاتا تھا۔

﴿اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪﴾ [البقرة:٢٨٢]

دَین کا معنی ہے قرض پر لین دین کرنا۔ یہ سراپا عدل ہے کہ اس میں عینِ انصاف اور عدل ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: اے ایمان والو! اگر تم کسی کو قرض دیتے ہو ایک وقت مقرر تک تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تم لکھ لیا کرو۔ اس کی چار قسمیں ہیں: پھر ہر قسم کے تابع سینکڑوں قسمیں ہیں، جو فقہاء نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں، وہ کتابوں کے اندر محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر کروڑوں رحمتیں فرمائے جنہوں نے ہمارے لیے دین کو اتنا آسان کر دیا کہ ہر قسم کی کتابیں لکھ کر ہر قسم کی اقسام کو مرتب کر دیا ہے۔ اس میں آپ کو موٹی موٹی قسمیں بتا دیتا ہوں، تاکہ آپ کو سمجھ آ جائے۔

قرض کی اقسام:

(۱)......ایک قسم ہے: ''اَلدَّيْنُ بِالدَّيْنِ'' قرض کے بدلے میں قرض، یعنی سامان بھی موجود نہ ہو اور پیسے بھی ادھار ہوں۔ میرے پاس مثلاً: عینک موجود نہیں ہے اور میں آپ کو کہتا ہوں کہ میں نے آپ کو ایک عینک فروخت کی ہے جو میرے پاس ابھی نہیں ہے اور اتنے پیسوں میں بیچتا ہوں جو تم بھی مجھے سال بعد دو گے۔ یا کہا: میں آپ کو گندم بیچتا ہوں جب اترے گی۔ اب مبیع بھی ادھار اور اس پر جو پیسے لینے ہیں وہ بھی ادھار۔ یہ قسم بالاتفاق حرام ہے کہ جب ایک چیز موجود نہیں تو اس کو بیچنے کا کیا معنی ہے؟ اسلام یہ کہتا ہے: جو چیز ہم بیچ رہے ہیں وہ موجود بھی ہو اور ہمارے قبضہ اور تصرف میں بھی ہو، پھر ہم اس کو بیچیں۔

پھر جب بیچ رہے ہیں تو اس کو اچھی طرح دکھا بھی دیں کہ ہم کیا بیچ رہے ہیں؟ اگر اس کے اندر کوئی نقص ہے تو اس کو بھی بیان کر دیں۔ البتہ متاخرین نے تمام فقہی روایات کو سامنے رکھ کر کچھ ایسے راستے پیدا کیے ہیں کہ مثلاً: جہاز کے اندر کوئی مال آ رہا ہے، اس کا سودا ہو گیا ہے، اس کے ڈاکومینٹ میرے قبضے میں آ گئے ہیں، میری بیع تام ہو چکی ہے اور میں نے پارٹی کو پیمنٹ کر دی ہے تو علماء فرماتے ہیں: ان کاغذات کا قبضہ میں آنا مال کا قبضہ میں سمجھا جائے گا، ورنہ تو تمام ممالک میں جو بیع شراء ہو رہی ہے، ساری کی ساری حرام ہو جائے؛ کیونکہ آج کل ساری بیع شراء اسی طرح ہوتی ہے کہ ابھی مال دوسرے ملک سے چلتا ہے اور یہاں بک جاتا ہے۔

2 ......دوسری قسم ''اَلْعَیْنُ بِالدَّیْنِ'' کہ مبیع سامان تو موجود ہے، لیکن پیسے ادھار ہیں۔ یہ بالاتفاق جائز ہے، اس کے اندر کوئی منع نہیں ہے؛ کیونکہ جو چیز بکنے والی ہے وہ موجود ہے۔

3 ......تیری قسم: ''اَلدَّیْنُ بِالْعَیْنِ'' ہے۔ آپ نے کہا: میں فلاں چیز دوں گا، لیکن آپ مجھے پیسے ابھی دے دیں کہ بیچنے والی چیز موجود نہیں، لیکن پیسہ موجود ہے۔ اس کو اصطلاح میں ''بیع سلم'' کہتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس چیز کو متعین کر لیا جائے کہ فلاں کمپنی کی ہوگی، فلاں ملک کی بنی ہوئی ہوگی، فلاں ماڈل ہوگا، فلاں مارکہ ہوگا، اس کا رنگ فلاں ہوگا، یعنی چیز معین کر لی جائے، جیسا کہ یہ تجارت آج کل بڑی عام ہوتی ہے کہ آپ ایک کمپنی کو گھڑی کا آرڈر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: ٹھیک ہے، لیکن ہم ابھی مصروف ہیں، ابھی آپ کو نہیں دے سکتے، آپ پہلے پیسے جمع کرائیں۔ اور چیز صفات کے ساتھ طے ہو جاتی ہے۔ یہ بھی بیع وشراء کے ساتھ جائز ہے۔

4 ......چھوتھی قسم: ''اَلْعَیْنُ بِالْعَیْنِ'' چیزیں نقد اور پیسے بھی نقد۔ یہ بھی بالاتفاق صحیح ہے، جیسا کہ آج کل عام ہے۔

قرض کا معاملہ لکھنے کا حکم:

اسلام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب تم کسی کو قرض دیتے ہو تو اس کی ایک شرط تو یہ ہے کہ پہلے وقت متعین کر لو کہ کتنی مدت تک کے لیے قرضہ دے رہے ہو؟ دوسرا یہ حکم دیا ہے کہ جب تم اس قسم کا لین دین کر لو تو ﴿وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪﴾ اس کا خیال رکھو کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل کے ساتھ لکھے؛ کیونکہ کل کو کوئی پتہ نہیں قرضہ دینے والا مر جائے، کوئی پتہ نہیں قرض لینے والا مر جائے، اب ورثا کو پتہ نہ ہو تو وہ بے چارہ قبر میں عذاب بھگتتا رہے گا، اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ اس قرض کو لکھ لو۔

اب جب لکھنے کا حکم آ گیا تو اب یہ ضروری تو نہیں کہ ہر آدمی پڑھا لکھا ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک جامع قانون بیان فرما دیا: ﴿وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ﴾ کہ جو لکھنے والا ہے اس کو چاہیے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو لکھنے پڑھنے کا علم عطا فرمایا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر اس طرح ادا کرے کہ وہ لکھے اور انکار نہ کرے۔

یہ کون لکھوائے گا؟ تو اس کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ﴾ [البقرۃ: ۲۸۲] کہ جس نے قرضہ دینا ہے وہ دستاویز پر لکھ کر دے گا کہ میں فلان بن فلاں باہوش وحواس خمسہ............لکھ کر دے رہا ہوں یا لکھنے والے کو املا کروائے کہ آپ میری طرف سے لکھیں، لیکن اس

صورت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لکھنے والا اللہ تعالیٰ سے ڈرے ایسا نہ ہو کہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دے۔

اس سے اندازہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ چودہ سو سال پہلے جو احکام دے رہے ہیں وہ کتنے جامع اور مانع ہیں؛ کیونکہ وہ ایسا دور تھا کہ لوگ جھوٹ بولنا اتنا بڑا عیب سمجھتے تھے کہ اتنا کافر بھی اس زمانہ میں جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ اسلام نے حکم دیا: اپنے رب سے ڈرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کہے: لکھو! میں نے ایک لاکھ کا قرض لیا ہے اور لکھنے والا اس سے پہلے کہہ دے کہ اس علاقے میں لکھنے والا منشی میں ہوں، دوسرا بندہ کوئی نہیں، وہ مجھے لکھوانے کے لیے بلائیں گے، تم قرض دار اگر مجھے دس ہزار دے دو اور اسی ہزار تم کو بچ جائیں گے۔ اب جو بے چارہ قرضہ دے رہا ہے وہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! کاتب کو چاہیے کہ وہ عدل کرے، وہ کبھی کسی چیز کو نہ بڑھائے اور نہ گھٹائے۔ جو الفاظ اس کو کہے جائیں، ان کو امانت و دیانت کے ساتھ لکھ دے۔

﴿فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ﴾ اگر وہ آدمی جو قرضہ دینے والا ہے وہ بے وقوف ہے، اس کے اندر عقل زیادہ نہیں یا اتنا کمزور ہے کہ وہ لکھ نہیں سکتا اور لکھوا بھی نہیں سکتا یا نابالغ بچہ ہے تو اس کا جو شرعاً ولی ہے یا اس کا مختار ہے یا وکیل ہے، اس کو چاہیے کہ وہ لکھوائے۔ اور اس کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ وہ ٹھیک املاء کرے، اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہ کرے۔

گواہی کا حکم:

﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ ۖ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ﴾
جب یہ تحریر ہو رہی ہو تو تمہارے دو مرد مسلمان گواہ ہوں اور وہ ایسے گواہ ہوں جو امانت والے ہوں۔

اس سے فقہاء نے مسئلہ نکالا ہے کہ اگر ایک آدمی کے پاس تحریر ہے، لیکن گواہ نہیں ہیں تو قاضی اس کا اعتبار نہیں کرے گا؛ کیونکہ وہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ دو گواہ ہوں۔

﴿فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ......﴾ اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لیں۔

مرد کے مقابلے میں عورت کی گواہی آدھی کیوں؟

آج جو نئی تہذیب کے لوگ ہیں، جو حقوقِ نسوانیت کا اپنے آپ کو علمبردار کہتے ہیں، وہ یہی اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھو! دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہوں۔ یہ تو بڑی ناانصافی ہے۔ عورتیں پڑھی لکھی اور سمجھدار ہوتی ہیں اور

عورتیں بڑی ذہین ہوتی ہیں، لیکن عورت کا حصہ گواہی میں بھی آدھا کر دیا گیا اور میراث میں بھی آدھا کر دیا گیا۔

یاد رکھیں اس میں اسلام کا عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک وجہ تو خود قرآن میں بیان کر دی ہے۔ جو وجہ اللہ تعالیٰ نے بیان کر دی اس پر کوئی کافر تو اعتراض کر سکتا ہے، مسلمان اعتراض نہیں کر سکتا۔ فرمایا: ﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ کہ ہم نے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر اس لیے رکھا؛ کیونکہ عورت ناقص العقل ہے اور ناقص الدین ہے۔ اگر ایک عورت کو بات بھول جائے تو دوسری عورت اس کو بات یاد دلا سکے۔ اب تو خیر یورپ نے بھی مان لیا ہے کہ عورت کے دماغوں کا وزن کیا گیا اور اس کے دل کا وزن کیا گیا اور اس کے اعضاء رئیسہ کا وزن کیا گیا تو خدا کی قدرت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت میں طبعی و خلقی طور پر بھی فرق رکھا ہے۔

اسی طرح دین میں بھی فرق ہے کہ مرد رمضان میں تیس روزے رکھے گا، لیکن عورت تیس روزے نہیں رکھ سکتی؛ کیونکہ اس کے آٹھ دن حیض میں چلے جائیں گے۔

مرد کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بغیر محرم کے حج کا سفر نہ کرے، لیکن عورت بغیر محرم کے حج نہیں کر سکتی۔ حیض و نفاس کی حالت میں عبادت بھی نہیں کر سکتی، روزہ بھی نہیں رکھ سکتی اور نمازیں بھی نہیں پڑھ سکتی تو صاف ظاہر ہے کہ مرد کو نماز کا ثواب زیادہ ہوگا۔

حضور پاک ﷺ سے ایک صحابی نے عرض کیا کہ عورتیں تو بڑی سمجھدار ہوتی ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ عقل تھوڑی ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ناقصات العقل کا معنی یہ ہے کہ ساری زندگی تم عورت کے لیے بھلائی کرو، ساری زندگی اچھا لباس اچھا کپڑا دو، اس کی وجہ سے تم باپ کو چھوڑ دو، ماں کو چھوڑ دو۔ جس دن عورت کو غصہ آئے گا، وہ کہہ دے گی: تم نے میرے لیے کیا کیا ہے؟ اس طرح وہ فوراً تیری ساری محنت کا انکار کر دے گی؛ کیونکہ یہ عورت کی فطرت اور عورت کی نیچر ہے کہ سارے احسانات کو ایک منٹ میں بھلا دے گی۔

اگر لاکھوں عورتوں میں سے چند عورتیں سمجھدار نکل آئیں تو بڑی بات نہیں۔ ان کا تقابل پورے عالم کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی نظر اپنی ساری مخلوق پر ہے۔

عورت کو میراث میں آدھا حصہ ملتا ہے۔ اس کے اندر بھی اسلام کا عدل ہے کہ وہ باپ کی میراث سے بھی حقدار ہے اور خاوند کی میراث سے بھی حقدار ہے۔ اور جب تک اس کی شادی نہ ہو اس وقت تک اس کا خرچہ باپ کے

ذمہ ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد خرچہ شوہر کے ذمہ ہے۔ اس لیے اسلام نے تو عدل کیا ہے کہ عورت کا کوئی حق نہیں مارا، مرد کے لیے کسی کی ذمہ داری نہیں۔ آپ خود سوچیں کہ عورت جس گھر میں پیدا ہوتی ہے، اٹھارہ بیس سال زندگی گزارتی ہے، وہ اس کو کبھی اپنا گھر نہیں کہتی۔ اور جب شادی ہو جائے تو اس سے پوچھو: کہاں جا رہی ہو؟ تو کہے گی: اپنے گھر جا رہی ہوں۔ یعنی شوہر کا گھر اس کا اپنا گھر ہے اور ماں باپ، جن کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے وہ ماں باپ کا گھر ہے، حالانکہ یہ کونسی عقل ہے؟ اگر خدانخواستہ خاوند اس کو طلاق دے دے تو وہ گھر کہاں جائے گا؟ صاف ظاہر ہے، پھر انہی والدین کے دروازے پر آئے گی۔ اس لیے یاد رکھیں! عورت ناقصۃ العقل ہے۔

دوسری بات یہ یاد رکھیں کہ اسلام نے حدود و قصاص میں عورت کی شہادت نہیں رکھی، اس کے اندر بھی عورت کی عزت ہے؛ کیونکہ جب حدود کا معاملہ آئے گا تو لازماً مدعی کا وکیل آ کر ایسے سوال کرے گا کہ اس کی عزت ہی مٹ جائے گی کہ تم نے کیا دیکھا؟ کیسے دیکھا؟ کیسے ہو رہا تھا؟ اس لیے اسلام نے کہا: عورت کی عزت کو محفوظ رکھو، اس کو مقدمات کے اندر نہ گھسیٹو۔ اور دوسرا لین دین کے معاملہ کے اندر دو عورتوں کی گواہی کو رکھا؛ کیونکہ ایک عورت کورٹ میں آنے کے بعد گواہی دے کہ فلاں نے ایک لاکھ دینا ہے تو وکیل کہہ دے گا کہ اس عورت کے مدعی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہوں گے۔ جب دوسری عورت بھی گواہی میں شریک ہوگی تو یہ الزام نہیں لگ سکتا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو محفوظ کیا ہے۔ عورت ایسی عزت دار چیز ہے کہ اس کی عزت کو پردہ دو اور اس کی عزت کی حفاظت کرو۔ یہ محفوظ رکھنے والی اور گھروں کے اندر رہنے والی چیز ہے۔ یہ اوپن تھیٹر نہیں کہ سگریٹ بیچنے کے لیے اس کے ننگے فوٹو ڈبیوں پر لگا دیئے جائیں۔ عورت کی سب سے زیادہ توہین کرنے والے ایسے ہی لوگ ہیں، جبکہ اسلام نے تو عورت کو عزت دی ہے کہ گھر کی ملکہ بنایا ہے اور عورت کو ماں کا درجہ دیا ہے، بیٹی کا درجہ دیا ہے، بہن کا درجہ دیا ہے اور بیوی کا درجہ دیا ہے۔ جہاں بیوی کا ذکر آیا وہاں فرعون کے گھر میں بی بی آسیہ کا بھی بتایا کہ فرعون کے گھر میں ہے، ایمان والی ہے، ہم اس کو قیامت کے دن محمد مصطفیٰ ﷺ کی بیوی بنائیں گے۔

لین دین لکھنے کے فوائد:

﴿وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْـَٔمُوٓا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰٓ أَجَلِهِۦ ۚ﴾ جب گواہوں کو بلایا جائے تو انکار نہ کریں۔ اور یہ بھی نہ کہا کرو کہ چھوٹے چھوٹے قرضے کہ کیا لکھیں؟ یاد رکھو! تمہارے لیے تو سو روپیہ

معمولی بات ہے، قبر میں اس سو روپے کے پیچھے جہنم میں پڑا رہے گا۔ اس لیے فرمایا: قرض چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ہو اس سب کو لکھو۔

﴿ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ﴾ یہ سب سے زیادہ انصاف ہے اور سب سے زیادہ انصاف کو قائم کرنے والی بات ہے؛ کیونکہ اگر لکھا ہوا ہوگا تو اس میں کوئی غلطی نہیں ہوگی اور کسی شک میں نہیں پڑے گا۔

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں تمہارے بعض معاملات ایسے ہیں، جیسے اگر تمہاری نقد بیع وشراء ہے تو اس کو لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ لینے والا بھی دیکھ رہا ہے اور دینے والا بھی دیکھ رہا ہے۔ لکھا وہاں جاتا ہے جہاں درمیان میں کچھ وقت آئے۔

﴿وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪﴾ اگر ہو سکے تو تجارت کے لین دین میں گواہ بنالیا کرو تو اچھی بات ہے۔ وہ بھی اگر بنا لو، ورنہ ہر وقت آدمی دکان پر جب سودا بیچتا ہے تو گواہ تو نہیں رکھ سکتا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ نقد لین دین ہے، لیکن بعض اوقات چیز بڑی قیمتی ہوتی ہے تو وہاں گواہ بنالینا چاہیے، تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو، اس لیے اسلام نے ہمیں ایسا قانون دیا ہے، تاکہ جھگڑا پیدا نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں دنیا کے قانون کہتے ہیں کہ پہلے جرم ہو جانے دو، پھر ہم ڈنڈا لے کر آجائیں گے۔

﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ﴾ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم لکھنے والے کو اور گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ آج دیکھ لیں کہ گواہی کیوں نہیں ملتی ہے؟ کیونکہ اگر شریف آدمی گواہی میں اپنا نام لکھوا لے، ......ان شاء اللہ...... ایک سال کے اندر اندر دس دفعہ تو اس کو تھانے والے بلائیں گے اور جب کورٹ میں جائے گا تو کبھی وکیل نہیں، کبھی جج نہیں اور آج قاتل نہیں۔ اس لیے آج کوئی شریف آدمی گواہی کے قریب نہیں آتا، اگرچہ اس نے وہ واقعہ دیکھا بھی ہو۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر گواہ کہتا ہے: مجھے کرایہ چاہیے تو آپ اس کو کرایہ دیں۔

حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے فرمایا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قرآن پاک سے تازہ آنے والی چیز یہی آیت دَین ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے قرض کے احکام بیان فرمائے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی حضرت داوٗد علیہ السلام کو اپنی کچھ عمر دینے کی روایت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: جب آیت دَین نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّ أَوَّلَ

مَنْ جَحَدَ آدَمُ، إِنَّ اللهَ لَمَّا خَلَقَ آدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَأَخْرَجَ مِنْهُ مَا هُوَ ذِرَائِيُّ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ...... ''کہ سب سے پہلا انکار حضرت آدم علیہ السلام نے کیا؛ کیونکہ ان کی پشت سے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک جتنی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہونی تھی ان کی ارواح کو نکالا اور پھر عالمِ مثال کے اندر ان کو دکھایا کہ یہ تیری اولاد ہے۔
[مسند احمد بن حنبل: ۱/ ۲۵۱، ۳۰۷۱، السنن الکبریٰ: ۱۰/ ۱۴۶]

اب اس میں علماء کے دو قول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس انسان کو جس شکل میں پیدا کرنا تھا وہ صورت دکھا دی گئی یا فقط روح دکھائی گئی، لیکن زیادہ راجح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح کے اندر شکل کا پرتَو بھی دکھا دیا؛ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب اپنے بیٹوں کو دیکھا تو ان میں سے ایک ایسے تھے جیسے وہ چمک رہے ہوں تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ میرا بیٹا کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تمہارا بیٹا داؤد ہے، یہ اللہ کا نبی ہوگا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا: میرے اس بیٹے کی عمر کتنی ہے؟ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا کہ ساٹھ سال ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے درخواست کی کہ آپ مہربانی فرمائیں اور اس کی عمر سو سال کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ہوسکتا ہے کہ ہم تمہارے اس بیٹے کی عمر سو سال کر دیتے ہیں، لیکن تمہاری عمر سے پھر چالیس سال کاٹ لیے جائیں گے۔ آدم علیہ السلام کی عمر ایک ہزار سال تھی تو حکم یہ ہوا کہ نو سو ساٹھ سال پھر تمہاری عمر ہو جائے گی، چالیس سال تمہارے کاٹ کر تمہارے بیٹے کو دے دیئے جائیں گے۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا: مجھے قبول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو لکھ لو، اس پر گواہی بھی ڈالو اور حضرت آدم علیہ السلام سے دستخط اور تحریر بھی لے لو۔ اب جب سب کچھ مکمل ہو گیا، وقت گزر گیا۔ آدم علیہ السلام پر جب موت کی گھڑی آئی تو فرشتے روح قبض کرنے کے لیے آئے تو آدم علیہ السلام نے ان سے کہا: تم کیسے روح قبض کرنے کے لیے آگئے؟ میری تو ابھی چالیس سال کی عمر باقی ہے۔ فرشتوں نے کہا: آپ نے تو چالیس سال اپنے بیٹے حضرت داؤد کو دیئے تھے، لہٰذا آپ کی عمر پوری ہوگئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: میں نے اپنی عمر نہیں دی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے گویا کہ پہلا انکار کیا اور آپ اس معاہدے پر قائم نہ رہے، اسی طرح پھر آپ کی اولاد میں بھی انکار آگیا...... صحیح حدیث میں آتا ہے حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نَسِيَ آدَمُ فَنَسِيَ ذُرِّيَّتُهُ'' [ ] آدم علیہ السلام بھول گئے تو اولاد میں بھی بھولنا آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا اس درخت کے قریب نہ جاؤ، لیکن حضرت آدم علیہ السلام بھول کر چلے گئے۔ جب ابا بھولے تو اس کا اثر اولاد میں بھی آگیا...... جب یہ بات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آدم علیہ السلام کی عمر ہزار پوری کر دو اور داؤد کو بھی چالیس سال دے دو۔

ایک بات یاد رکھیں کہ یہ حدیث سند کے لحاظ سے بالکل غریب ہے، یعنی اس کے اندر بہت بڑی غرابت ہے۔ دوسرا اس کے اندر ایک راوی ہے زید بن جدعان، وہ اس قسم کی منکر روایتیں اکثر بناتا بھی ہے، لہٰذا اس روایت کے اندر سو فیصد قابل اعتماد بات نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ بات فرمادی ہے: ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ﴾ [لقمان: ۳۴] یہ خاص علم ہیں، جن کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو نہیں دیا کہ کل کیا ہوگا؟ اور کہاں تمہاری موت آئے گی؟ تو پھر آدم علیہ السلام کو پیشگی موت کا پتہ ہونا کہ ابھی چالیس سال باقی ہیں، یہ ساری چیزیں ان نصوص سے ٹکراتی ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی نصوص سے ٹکراتی ہے کہ حضرت داؤد کا آواز کے اندر جو حسن و جمال ہے وہ مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی آواز عطا فرمائی تھی۔ اور آواز اتنی سریلی اور میٹھی تھی کہ انسان تو انسان اگر کبھی جانور بھی سن لیتے تو ٹھہر جاتے تھے اور پرندے اڑتے اڑتے رک جاتے تھے۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حسین تلاوت:

اور یہ بات بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ایک دفعہ میرے آقا ﷺ تشریف لے جا رہے تھے کہ آپ ﷺ کے صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ قرآن پڑھ رہے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کھڑے ہو گئے اور قرآن مبارک سنتے رہے۔ صبح کو جب حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مَا شَاءَ اللّٰهُ! لَقَدْ أُوتِيتَ مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ'' کہ میرے صحابی تمہیں بھی اللہ تعالیٰ نے وہ صوت، آواز دی ہے جو حضرت داؤد کو دی تھی۔ ماشاء اللہ! رات کو تم اتنے اچھے لہجے میں قرآن پڑھ رہے تھے!! انہوں نے کہا: حضور! کاش! مجھے پتہ ہوتا کہ آج میرے آقا ﷺ خود سن رہے ہیں پھر میں بنا بنا کر قرآن پڑھتا، میں تو ایسے اپنے خیال میں پڑھ رہا تھا۔ [المسند المستخرج علی صحیح مسلم: ۲/۳۸۴]

اس لیے یہ بھی حکم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اچھی آواز دی ہے تو قرآن کو سنوار سنوار کر پڑھا جائے۔ سنوارنے کا مطلب یہ ہے کہ ادائیگی حروف کا پورا پورا خیال کیا جائے، یہ نہ ہو کہ حروف آواز کے تابع ہو جائیں۔ جیسے بعض جاہل لوگوں کی آواز بڑی اچھی ہوئی ہے، لیکن اپنی آواز کی رعایت کرتے ہیں، قرآن کے وقف وصل وغیرہ کا خیال نہیں کرتے۔ ایسا پڑھنا ناجائز ہے۔ ترتیل کا معنی ہی یہی ہے کہ حروف کی ادائیگی مخارج کی ادائیگی کا پورا پورا خیال ہو،

پھر قرآن کو سنوار سنوار کر پڑھا جائے، تا کہ وہ لوگوں کے دلوں پر زیادہ زیادہ اثر کرنے والا ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بھولنے سے مسلمانوں کے فوائد:

دوسرا اس وجہ سے بھی یہ روایت منکر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، درخت کے قریب نہ جانے کا حکم تھا، لیکن حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے اور چلے گئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمادیا: حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے اور ان کی اولاد میں بھی بھول آگئی۔ انبیاء علیہم السلام سے اگر بھول ہو بھی جائے تو پوری امت پر رحمت ہو جاتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے، بندوں سے آگے کوئی بھول کر غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دی، اسی طرح ساری امت کو قیامت تک حضرت آدم علیہ السلام کے بھولنے کا فائدہ ہو گیا۔

اگر کوئی آدمی رمضان شریف میں بھول کر پانی پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح باقی ائمہ کا اب بھی اس پر فتویٰ ہے کہ اگر ایک آدمی نے احرام میں، عمرہ میں، حج میں بھول کر غلطی کی ہے تو اس پر دم نہیں ہے، معافی ہے۔ دم تب واجب ہوتا ہے جب وہ جان بوجھ کر غلطی کرے، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حج و عمرہ کے احکام میں غلطی کرے، دم آئے گا؛ کیونکہ چودہ سو سال گزر گئے، اب بھی دین نہیں سیکھیں گے تو کب سیکھیں گے؟ ہر مسلمان مرد و عورت پر علم حاصل کرنا اللہ کے نبی نے فرض قرار دیا ہے، لہٰذا ہر بندے کے ذمہ داری ہے کہ وہ علم سیکھے۔ امام صاحب فرماتے ہیں: نسیان کا معنی یہ ہوتا ہے کہ پہلا روزہ تھا، گھر میں گلاس کے اندر پانی رکھا تھا، بھول کر پی لیا تو معاف ہے، لیکن یہ کیسا نسیان ہے عمرہ کر رہا ہے اور سینکڑوں آدمی بھی کر رہے ہیں اور یہ کہے کہ میں بھول گیا، یہ کیسی بھول ہے؟

جب معاملہ لکھا ہوا ہو تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ آج کل ہمارے نوے فیصد جھگڑے اسی قرآن کو چھوڑنے پر ہیں کہ جب ہم معاملہ کرتے ہیں، اس وقت بڑا تعلق ہوتا ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ دوست ہے، اس کے ساتھ اکٹھے رہتے ہیں۔ اگر اس کو لکھنے کا کہیں تو یہ کہے گا کہ یہ اعتبار نہیں کرتا، حالانکہ یہ اعتبار نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اسی لیے وہی دوست بعد میں دشمن بن جاتا ہے اور انکار کر دیتا ہے۔

آج کل سب سے بڑے چالاک لوگ یہ ہیں کہ جن سے آپ نے کبھی پیسے لینے ہوں، آپ اگر دعویٰ بھی کر دیں تو وہ کورٹ کے اندر کہتے ہیں: ان کے ساتھ تو ہمارا لین دین ہے، یہ ہمارے ساتھ حساب کرے۔ لوگ بھی سچے

آدمی کو جھوٹا سمجھتے ہیں کہ جب مدعیٰ علیہ کہہ رہا ہے کہ حساب کرو تو پھر حساب کیوں نہیں کرتے ہو؟ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جب ایک نے نقد پیسے لیے ہیں کہ فلاں تاریخ کو واپس کردوں گا تو اس میں حساب کا کیا مطلب ہے؟

ایک مولوی صاحب لطیفہ سنا رہے تھے کہ ایک آدمی دریا کے کنارے نہانے لگا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو تین سو روپے دے دیئے اور کپڑے دیئے کہ ان کا خیال رکھو، میں نہالوں۔ جس کو سامان دیا وہ بڑا چالاک آدمی تھا، اس کی نیت خراب ہوگئی۔ جب آدمی نہانے کے بعد باہر آیا اور دوبارہ غوطہ لگایا اور پھر تیسرا غوطہ لگایا۔ نہا دھو کر کپڑے پہن کر پیسے مانگے تو اس کے ساتھی نے کہا: کس بات کے پیسے دوں؟ آدمی نے کہا: میں نے جو تجھے دیئے تھے۔ اس نے کہا: حساب کرلو۔ آدمی نے کہا: خدا کے بندے! تمہارا اور میرا کون سا لین دین ہے کہ میں حساب کروں؟ لیکن اس نے کہا: حساب کرو۔ اس طرح جھگڑا شروع ہوگیا۔ دو چار آدمی گزرے تو انہوں نے کہا: جب وہ کہتا ہے: حساب کرو تو ٹھیک بات ہے، تم حساب کرو۔ آدمی نے کہا: اللہ کے بندے! میں نہانے لگا، میں نے اس کو پیسے بطور امانت کے دیئے تھے۔ جب میں غسل کرکے باہر نکلا ہوں تو یہ مجھے اب میرے پیسے واپس نہیں کررہا۔ لوگوں نے کہا: جب یہ حساب کہتا ہے تو اس سے حساب کرو۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ تو مدعیٰ علیہ نے کہا کہ جب آپ نے پہلا غوطہ لگایا، دیر ہوگئی تو میں سمجھا آپ مرگئے۔ ایک آدمی جارہا تھا، میں نے اس کو سو روپے دے دیئے کہ بستی والوں سے کہے کہ چارپائی لے آئیں، بندے لے آئے، تاکہ لاش نکالیں۔ کچھ دیر کے بعد تم نکل آئے تو میں نے اور بندے کو سو روپے دیئے کہ بستی والے خوامخواہ روتے پیٹتے آئیں گے ان کو کہو کہ آدمی نہیں مرا، زندہ ہے۔ میں واپس آیا تو پھر ڈوب گئے۔ میں نے سمجھا کہ مرگیا تو پھر میں نے تیسرے آدمی کو سو روپے دے دیئے۔ اب بتاؤ! اس میں میرا کیا قصور ہے؟

لین دین نہ لکھنے پر نقصان کا واقعہ:

پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ مولوی صاحبان خود لطیفے بناتے ہیں، حقیقتاً واقعہ نہیں ہوسکتا، لیکن اتفاق کی بات ہے کہ مجھے خود واسطہ پڑا۔ میں نے اپنے ایک دوست کو پیسے دیئے۔ اس نے ورکشاپ بنائی ہوئی تھی، اس کے پاس چار پانچ دکانیں تھیں، اس مارکیٹ کا پچاس ہزار روپے کرایہ تھا اور اس کو باقی دکانوں سے ہی پچاس ہزار روپے کرایہ مل جاتا تھا، گویا اس کی ورکشاپ مفت ہوگئی۔ اس نے ورکشاپ ڈیڑھ لاکھ روپے ٹھیکے پر دے دی۔ اس طرح کرایہ کرائے میں چلا گیا اور ڈیڑھ لاکھ روپے نفع ہوگیا۔ جب میں نے چار سال کے بعد اس سے پیسے مانگے، اس نے

کہا: حساب کریں۔ میں نے اس سے کہا: کس بات کا حساب کروں؟ جب دکان کا کرایہ پچاس ہزار آرہا ہے اور تم نے بھی پچاس ہزار کرایہ دینا تھا کہ کرایہ کرائے کے ساتھ برابر ہوگیا، باقی ڈیڑھ لاکھ تم نے ٹھیکے پر دی ہوئی ہے تو حساب کس بات کا کروں؟ اس نے آج تک نہ حساب کیا اور نہ پیسے دیئے۔ ہم نے بھی "انا للہ" پڑھ لی کہ چلو آخرت میں لے لیں گے۔ اب اگر اس کو کوئی گلہ دیتا ہے تو تم نے استاد کے ساتھ اچھا نہیں کیا تو وہ کہتا ہے کہ استاد صاحب حساب ہی نہیں کرتے تو میں کیا کروں؟ اب معلوم ہوا کہ ایسی باتیں لطیفہ نہیں، بلکہ حقیقت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے حرم میں رہتے ہوئے ایک شاگرد ایسے کرسکتا ہے تو باہر والوں کا کیا حال ہوگا؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ جب حضور سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے اور وہ لوگ پیسے لے لیتے تھے کہ تم مجھے ایک سال میں اتنا پھل دو گے، دوسرے سال اتنا پھل دو گے اور تیسرے سال اتنا پھل دو گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں کر سکتے ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ ایک تو وقت معلوم ہو کہ کب دو گے؟ دوسرا کیل معلوم ہو کہ وزن ہے تو معلوم ہو اور صفت معین کرو تو جائز ہے، پھر کوئی حرج نہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں: لیکن دین کے اندر کتابت اچھی بات ہے۔ اگر کسی نے نہ لکھا تو گناہگار نہیں ہوگا؛ کیونکہ اس نے استحباب پر عمل نہیں کیا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں: یہاں کتابت کا امر وجوب کے لیے ہے، جبکہ جمہور کے نزدیک امر استحباب کے لیے ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ابوسلمان المراغشی رحمۃ اللہ علیہ (یہ وہ تابعی ہیں جنہوں نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے بھی ملاقات کی ہے، یعنی وہ اتنے شان والے آدمی تھے۔ انہوں) نے فرمایا: کیا تمہیں پتہ ہے ایک مظلوم ایسا ہے جو اپنے اللہ سے دعا مانگتا ہے اور اس کی دعا منظور نہیں ہوتی؟ حالانکہ مظلوم کی دعا کا تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ میں ضرور منظور کروں گا۔ ساتھیوں نے عرض کیا: وہ کون سا مظلوم ہے؟ فرمایا: کسی نے کسی کو قرضہ دیا، لیکن تحریر نہیں کی۔ جب میعاد ختم ہوگئی تو اس کے قرض دار نے انکار کر دیا کہ میں نے تو تمہارا کوئی قرضہ نہیں دینا ہے۔ اب اس کے پاس تحریر تھی نہیں، وہ اب مظلوم تو ہے کہ اس کا پیسہ مارا گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول نہیں کی؛ کیونکہ تو نے تو میری نافرمانی کی ہے، میں نے تو کہا تھا کہ لکھ لیا کرو تو تم نے کیوں نہیں لکھا تھا؟

اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر قرض لینے کا واقعہ:

بنی اسرائیل کے زمانہ میں ایک آدمی نے دوسرے آدمی سے ایک ہزار قرض طلب کیا تو اس نے کہا: میں قرض

دیتا ہوں، لیکن گواہ لے آؤ۔ اس نے کہا: ''وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا'' اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔ آدمی نے کہا: کوئی ضامن لے آؤ، جو تمہاری ضمانت دے کہ تم پیسے واپس دے دو گے۔ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ میرا ضامن ہے۔ آدمی نے کہا: ٹھیک کہتے ہو۔ اس کے بعد اس نے قرضہ دے دیا۔ اب جب قرضہ واپس کرنے کا وقت مقرر آ گیا تو جس نے قرضہ لیا تھا وہ واپس کرنے کے لیے آیا۔ درمیان میں دریا تھا، اس نے کشتی تلاش کی، لیکن وہ اس کو نہ ملی۔ ایک لکڑی ملی، اس کے اندر سوراخ کیا اور اس میں پیسے رکھ کر اچھی طرح بند کر دیا اور اس کے بعد کہا: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے فلاں بندے کا قرضہ دینا ہے اور میں نے تیری ذات کو ضامن بنایا تھا اور میں نے تمہیں گواہ بنایا تھا۔ اب مجھے سواری نہیں ملی، وعدہ کا وقت گزر جائے گا، میں نہیں پہنچ سکوں گا۔ اس کے بعد لکڑی کو دریا میں ڈال کر کہا: اے اللہ میاں! تو جان اور تیرا کام جانے۔ خدا کی قدرت یہ ہے کہ جس نے قرضہ لینا تھا وہ بھی دریا کے کنارے آیا ہوا تھا کہ وہ آدمی کشتی پر آئے گا تو میں اس سے پیسے لے لوں گا، لیکن کوئی کشتی نہ آئی۔ اتفاق سے اس نے دیکھا کہ ایک لکڑی تیرتے تیرتے دریا کے کنارے آ گئی تو اس نے کہا: فارغ جا رہا ہوں، یہی لکڑی گھر اٹھا کر لے جاتا ہوں، کام آ جائے گی۔ جب وہ لکڑی اٹھا کر لایا، اس کو توڑا تو اندر سے ایک ہزار دینار ملے اور ایک خط بھی ہے کہ اے اللہ! میں نے تجھے ضامن بنایا تھا، تجھے گواہ بنایا تھا، میں یہ پیسے دے رہا ہوں۔ اس آدمی نے پیسے رکھ لیے۔ کچھ عرصے کے بعد قرض دار ایک ہزار دینار لے کر پھر آ گیا کہ پتہ نہیں قرض خواہ کو لکڑی ملی تھی یا نہیں ملی تھی؟ وہ قرض دار کے پاس آیا اور کہا: میں تو نہیں آ سکا۔ قرض دار نے کہا: جب تم نے بھی نہیں بھیجے تو اللہ تعالیٰ کو جو تم نے کفیل بنایا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیج دیئے ہیں۔ یہ دیکھو! تمہارا خط ہے، مجھے پیسے مل گئے۔ اس لیے اب تم پیسے واپس لے جاؤ۔ جب مجھے میرا حق مل چکا ہے تو میں دوبارہ کیوں وصول کروں؟ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱۶]

(فائدہ) جو آدمی دیانت داری سے اللہ تعالیٰ کو کفیل بنائے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتے ہیں۔

لکھنے سے انکار کرنے پر وعیدات:

جیسے زبان سے اچھی بات کرنا صدقہ ہے، اسی طرح اگر تم لکھنا پڑھنا جانتے ہو اور دوسرا بھائی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا، اگر اس کو لکھ کر دے دو تو یہ تمہارے قلم کا صدقہ ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ''إِنَّ مِنَ الصَّدَقَةِ أَنْ تُعِيْنَ صَانِعًا وَ تَصْنَعُ لِأُخْرَقَ'' کہ یہ بھی تمہارا صدقہ ہے کہ تم کسی کاریگر کی مدد کرو، اسی طرح اگر کسی کی کوئی چیز پھٹ گئی

تو اس کے بنانے میں مدد کر دو، یہ بھی تمہارے صدقے کا ثواب شمار ہو جائے گا۔ [صحیح البخاری: رقم: ۲۵۱۸]

حدیث میں آیا ہے: ''مَنْ كَتَمَ عِلْمًا يَعْلَمُهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنَ النَّارِ ''اگر کسی کو علم ہے، لیکن اس نے اپنا علم چھپا دیا، مثلاً: لکھنے کا علم ہے، لیکن نہیں لکھتا، مسئلے کا علم ہے، لیکن مسئلہ صحیح نہیں بتایا، اپنے وقت کی بچت کرتا ہے تو ''أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنَ النَّارِ '' قیامت کے دن اس کو جہنم کی لگاموں میں سے ایک لگام چڑھائی جائے گی۔ [مسند احمد: ۲/ ۳۰۴، طبرانی فی الکبیر: ۵/ ۱۱]

حضرت عطاء رحمہ اللہ اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کاتب کے ذمہ یہ امر ہے کہ جب اس سے کوئی لکھنے کا کہے تو وہ لازماً لکھے۔

بہر حال فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی کاتب لکھنے کا عمل کرتا ہے اور اگر وہ اس لکھنے پر کوئی اجرت لے تو کوئی حرج نہیں، جیسا کہ متاخرین کا فتویٰ ہے کہ اگر کوئی مدرس ہے، قرآن پڑھاتا ہے اور اس پر تنخواہ لیتا ہے تو جائز ہے، اسی طرح جیسے مؤذن اذان کی تنخواہ لیتے ہیں یا امام اپنی امامت کی تنخواہ لیتے ہیں تو علماء متاخرین نے جواز کا فتویٰ دیا ہے؛ کیونکہ پہلے زمانہ میں اسلامی حکومت میں بیت المال ہوتے تھے، وہ بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیتے تھے، لہٰذا مدرس، امام، مؤذن اور کاتب کو کسی دوسرے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، لیکن اب بیت المال تو اسلامی نہیں ہے اور ان لوگوں کی ضروریات ہیں، لہٰذا اگر وہ جائز اجرت لے لیں تو جائز ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ کاتب دھوکہ نہ کرے۔

معاملہ لکھنے والا زیادتی کرے گا تو مجرم ہوگا:

ہمارے ملکوں میں...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... بڑے دھوکے ہوتے ہیں۔ لوگ پہلے جا کر عرض نویس سے پہلے بات کر لیتے ہیں کہ میں فلاں ایک آدمی کو لے کر آؤں گا، ہمارا معاہدہ تو یہ ہوگا، لیکن تم نے لکھنا یہ ہے۔ اب وہ دوسرا بے چارہ پڑھا ہوا نہیں ہوتا اور عرض نویس نے زبانی کلامی سنا دیا۔ اب جب بعد میں بات کھلی کہ اس نے اس میں وہ بات لکھی ہوئی ہے جو اس نے کہی ہی نہیں تھی۔

اسی طرح ہمارے ملک میں ایک اور بڑا ظلم ہے۔ میاں بیوی میں جھگڑا ہوا، طلاق ہوگئی۔ وہ کہتے ہیں: ہمیں طلاق باقاعدہ لکھ کر دو تو وہ عدالت میں جا کر اسٹام خریدتے ہیں اور اقرار نامہ لے کر عرض نویس کے پاس جاتے ہیں کہ اس نے طلاق دی ہے اور طلاق نامہ لکھنا ہے۔ اب عرض نویس نے چونکہ پچاس یا سو روپے اپنا معاوضہ لینا ہے، وہ اللہ کا بندہ لازماً تین طلاق لکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے: میں نے چونکہ پیسے لیے ہیں، اس لیے کام پکا کروں گا،

حالانکہ یہ ناجائز ہے؛ کیونکہ اگر طلاق دینے والے نے ایک طلاق دی ہے تو یہ کیوں تین لکھ رہا ہے؟ اور اگر اس نے دو طلاقیں دی ہیں تو یہ تین کیوں لکھ رہا ہے؟ حالانکہ اس کو وہ بات لکھنی چاہیے جو اس نے کی ہے، لیکن اپنی طرف سے تین دفعہ لکھے گا کہ نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس لیے ایسی زیادتی کاتب نہ کرے، بلکہ سمجھائے کہ تم نے اگر بیوی کو طلاق دینی ہے تو ایک طلاق سے تمہارا مسئلہ حل ہوسکتا ہے، اس لیے تین طلاقیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن آج ہر آدمی فیس کو تو دیکھتا ہے، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اسلام کیا کہتا ہے؟

مسئلہ:

جس بندے کے ذمہ قرضہ ہو وہ اگر سفید ہے، کم عقل ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنا پیسہ ضائع کر دیتے ہیں تو حاکم اس پر پابندی لگا دیتا ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتے ہو یا یہ کہ کمزور ہے یا چھوٹا ہے۔ اب ایسے آدمی کے بارے میں ہوسکتا ہے کہ غلط لکھوا دے، مثلاً: یہ لکھوا دے کہ میں نے اس کا دس لاکھ دینا ہے، حالانکہ دینا اس نے دس ہزار ہو تو اسلام نے ایسے آدمی کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ جو اس کا ولی الامر ہے اس کو چاہیے کہ وہ بتائے کہ اس پر اتنا قرض ہے۔

گواہ کے معاملہ کے اندر یہ دیکھو کہ وہ دیندار ہوں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں، تاکہ اگر کل کو شہادت کا معاملہ آئے تو کسی کو نقصان نہ پہنچائیں۔

﴿مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ مفسر فرماتے ہیں: اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ گواہ عدل وانصاف والے ہونے چاہیں، کرائے کے گواہ نہ ہوں۔ جیسا کہ آج کل رواج بن گیا ہے کہ گواہی دینے کے لیے خاص بندے موجود ہوتے ہیں، ان سے جو مرضی آئے گواہی دلوا دو۔ یاد رکھیں! شریعت میں ایسے بندوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، یہ کم ذات لوگ ہوتے ہیں اور جھوٹی گواہی دینا بہت بڑا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسی گواہی سے محفوظ رکھے۔ جھوٹ خود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ﴾ [آل عمران: ۶۱] اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے جھوٹوں پر۔ آج ہم لوگوں نے ہر چیز میں اپنے پیمانے بنا لیے ہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شراب، زنا گناہ ہے اور شرک گناہ ہے، لیکن جھوٹے کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ دنیا میں رواج ہے۔ اور وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹے آدمی پر لعنت بھیجی ہے۔ اور اسی طرح جھوٹی گواہی دینا کبیرہ گناہوں کے اندر شامل ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک فیصلہ ہے کہ جو بھی لفظ قرآن میں آجائے اس کے

بارے میں وہ کہتے ہیں: شہادت مطلق ہے، اس کی کوئی شرط نہیں۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں کہ شاہد کے لیے عادل ہونا ضروری ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ صرف فرماتے ہیں: ﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ﴾، لیکن آگے فرمایا: ﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ اس کو مقید کر دیا گیا، اس لیے گواہوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عادل ہوں۔

لین دین میں گواہی ہونے چاہیے:

جب کوئی آدمی لین دین کرے تو تحریر بھی کریں اور اس پر گواہ بھی بنائیں کہ گواہ گواہی دیں کہ ہمارے سامنے یہ لین دین ہوا ہے اور ہمارے سامنے یہ دستخط ہوئے ہیں۔ اب اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ یہ گواہ بنانا واجب ہے یا مستحب ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: گواہ بنانا مستحب اور افضل ہے۔

آپ ﷺ کے اونٹ خریدنے پر گواہ کا واقعہ:

اس پر مفسر نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے: میرے آقا سرکار مدینہ ﷺ نے ایک اعرابی سے اونٹ خریدا۔ جب اونٹ کی بات چیت طے ہوگئی، آمنہ کے لعل نے جب وہ خرید لیا تو آپ ﷺ گھر تشریف لے گئے، تاکہ پیسے لے آئیں اور اونٹ کی قیمت ادا کریں۔ کچھ لوگ اس اعرابی کے پاس سے گزرے اور ان کو پتہ نہیں تھا کہ اس اونٹ کا سودا حضور اکرم ﷺ سے طے ہو چکا ہے تو جو بھی آتا اس اونٹ کی بولی لگا دیتا تھا کہ میں اتنا دوں گا۔ جب اس اونٹ کی قیمت بڑھ گئی اس اعرابی کی نیت بدل گئی کہ مجھے تو زیادہ پیسے ملتے ہیں۔ اس نے وہیں کھڑے آواز دی: یا نبی اللہ! اگر آپ نے لینا ہے تو جلدی کریں، ورنہ میں دوسرے کو دے رہا ہوں۔ اتنی دیر میں ایک اور آدمی آیا اور اس نے اور قیمت بڑھا دی۔ اعرابی اس کو اونٹ دینے پر تیار ہو گیا، حضور پاک ﷺ تشریف لے آئے، فرمایا: اللہ کے بندے! تم نے یہ اونٹ بیچا ہے اور میں نے خریدا ہے۔ اعرابی کہنے لگا: میں نے تو نہیں بیچا، صرف آپ کی اور میری بات ہو رہی تھی۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: تم نے بیچا ہے، قیمت طے ہوگئی ہے۔ میں قیمت لینے کے لیے گیا، اب میں لے کر آگیا ہوں۔ اس نے کہا: اگر میں نے بیچا ہے تو آپ کے پاس کوئی گواہ ہے تو لے آئیں؟ اب حضور اکرم ﷺ فکر مند ہو گئے کہ کہاں سے گواہ لے آؤں؟ اس وقت معاملہ تو نقد کا تھا، لوگوں نے بھی اس اعرابی کو سمجھایا کہ عقل کی بات کرو، اللہ کے نبی ہیں، وہ جو بھی فرماتے ہیں حق فرماتے ہیں۔ اعرابی نے کہا: یہ تو خرید و فروخت کا معاملہ ہے، اس لیے اگر گواہ ہیں تو ٹھیک، ورنہ میں نے نہیں بیچا۔ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ نے

دیکھا کہ یہ بات ہو رہی ہے۔ وہ خاموش ہو کر سنتے رہے، پھر انہوں نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس بدو نے اونٹ بیچا ہے اور آپ ﷺ نے خریدا ہے۔ حضور اکرم ﷺ بڑے حیران ہوئے اور فرمایا: تم کیسے گواہی دے رہے ہو، اس وقت تو تم نہیں تھے؟ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! جب آپ فرما رہے ہیں: میں نے خریدا ہے، کیا آپ کے کہنے کے بعد کسی اور گواہی کی ضرورت ہے؟ دوسری روایت میں تفصیل ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جب جبرئیل علیہ السلام آپ پر قرآن لے کر آتا ہے تو کیا اس وقت ہم ہوتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ انہوں نے عرض کیا: ہم اس کو قرآن مان لیتے ہیں اور کیا ایک اونٹ کے سودے پر ہمیں آپ ﷺ کی زبان مبارک کا اعتبار نہیں؟ جب آپ ﷺ نے کہہ دیا تو بس میں گواہ ہوں۔ حضور اکرم ﷺ اتنے خوش ہوئے!! فرمایا: اے خزیمہ! آج کے بعد تیرے ایک کی گواہی دو کے برابر ہے۔

اس واقعہ کو بتانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جب نبی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آسکتا ہے تو تم بھی گواہ بنالیا کرو، تاکہ کل کو ایسے واقعات پیش نہ آئیں۔ دوسرا یہ نکلا کہ بغیر گواہ کے بھی سودا ہو سکتا ہے، ورنہ حضور اکرم ﷺ سودا ہی نہ کرتے، پہلے گواہ بلاتے اور پھر سودا ہوتا۔

تین آدمیوں کی دعا قبول نہیں ہوتی:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں جو دعا کرتے ہیں، لیکن ان کی دعا قبول نہیں ہوتی:

1 ......ایک وہ آدمی ہے جس کی عورت بدخلق ہے اور وہ اس کو طلاق نہیں دیتا۔ ایسے آدمی کی بھی دعا قبول نہیں ہوتی۔ (سیئۃ الخلق ''سے مراد زانیہ عورت ہے) ایسے آدمی کی نہ امامت قبول ہوتی ہے اور نہ عدالت قبول ہوتی ہے؛ کیونکہ وہ دیوث ہے۔

2 ......دوسرا آدمی وہ ہے کہ جو یتیم کا مال اس کے پاس ہے اور یتیم ابھی بالغ نہیں ہوا تو وہ یتیم کو کہے کہ اپنا مال لے جاؤ، میں تمہارا مال اپنے پاس نہیں رکھتا۔ ایسے آدمی کی دعا اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے کہ اس نے یتیم کے مال کو ضائع کیوں کیا؟

3 ......اور تیسرا وہ آدمی جو کسی کو قرض دے، لیکن گواہ نہ بنائے۔ ایسے آدمی کی بھی دعا قبول نہیں ہوتی؛ کیونکہ اس نے قرآن کے حکم کی مخالفت کی ہے۔

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾﴾ [البقرة: ۲۸۴]

''اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دل میں ہے یا اس کو چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پس جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

یعنی اگر تم لوگ میرے حکم پر نہیں چلو گے تو میرا کوئی نقصان نہیں ہے۔ میں جو تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ قرضہ دو تو لکھ لو، امانت دو تو لکھوا اور گواہ گواہی دیں، سارے کام تیرے نفع کے لیے ہیں، میرے لیے تو کوئی نفع نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر ہم نے تمہیں سود سے منع کیا ہے تو اس کا فائدہ صرف تمہارے لیے ہے۔ آج پوری دنیا پر نظر ڈال لو کہ سود خور یہودیوں نے اپنے پنجے کے اندر سب لوگوں کی زندگیاں لے رکھی ہیں۔ سود کا نتیجہ ہے۔ جب سے دنیا سود کے چکروں میں آئی ہے اب بندے نہیں، بلکہ ملکوں کے ملک سود خور اداروں کے پنجوں میں ہیں۔ وہ جو حکم دیں گے تم اس کو مانو گے اور قرضے سے تم نکل نہیں سکتے ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تمہارے فائدے کے لیے اس کو حرام کیا ہے، ورنہ تو سب کچھ میرا ہے، مجھے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

اور ان روایات میں ارشاد فرمایا کہ یاد رکھو! ''مَالِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' میں ہوں آسمانوں اور زمینوں کے خزانے کا مالک۔ دوسرا یاد رکھو! جو کچھ تمہارے جی کے اندر ہے تم اس کو ظاہر کرو، بلکہ دل کے اندر چھپائے رکھو اور چپکے سے اس کام کو سرانجام دینا چاہو، میں سب جانتا ہوں، میرے آگے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔

آیت کا شانِ نزول:

حدیث شریف میں ہے کہ بڑے بڑے کافر کعبہ شریف کے دروازے کے پاس کھڑے تھے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے: کیا اللہ تعالیٰ سنتا ہے؟ کہنے لگے: ہاں سنتا ہے۔ دوسرے نے کہا: کیسے سنتا ہے؟ کسی نے کہا: جب ہم زور سے بولتے ہیں تو سنتا ہے اور جب ہم آہستہ آہستہ بات کرتے ہیں وہ اللہ نہیں سنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں: ﴿اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ﴿٧﴾﴾ [الاعلیٰ: ۷] جو تم ظاہر کرو اور جو تم چھپاؤ سب جانتا ہے، چاہے تم آہستہ

آہستہ بات کرو یا زور سے بات کرو وہ سب سنتے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۝١٩﴾ [غافر:١٩] تیری آنکھ جو خیانت کرتی ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، کسی عورت کو سامنے جاتے ہوئے دیکھا اور دل کے اندر فتور آگیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں اس کو بھی جانتا ہوں، میرے آگے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ تو جب اس پر بیٹی سمجھ کر نظر ڈالتے ہو تب بھی میں جانتا ہوں، تم جب بہن سمجھ کر نظر ڈالتے ہو تب بھی میں جانتا ہوں اور جب تم شہوانی اور حیوانی لذت کے طور پر نظر ڈالتے ہو تب بھی میں جانتا ہوں۔ خدا کی شان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی کبھی ایسا مقام دے دیتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی آپ کی مجلس میں آیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ لوگ زنا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے؟ بعد میں جب دوستوں نے بات کھولی تو آپ نے فرمایا: اس آدمی کی آنکھوں میں زنا کا اثر مجھے نظر آرہا تھا۔ بلکہ بعض علماء نے تو اس کی ایک آسان مثال دی ہے کہ اس میں بہت بڑی ولایت کی ضرورت نہیں، بلکہ بڑا آسان مسئلہ ہے کہ ایک عورت ہے یا مرد ہے، اس کی ساری رات تہجد پڑھتے ہوئے گزر جائے اور ایک مرد یا عورت کی ساری رات زنا میں گزر جائے تو غور سے دیکھنا کہ ایک کے چہرے پر تمہیں لعنت برستی نظر آئے گی اور دوسرے کے چہرے پر تمہیں رحمت برستی نظر آئے گی۔

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ﴾ یعنی اگر کوئی آدمی ظاہر میں مثلاً: سود نہ کھائے، لیکن اندر اندر کاروبار کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں تو جانتا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو؟ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو سب کا حساب ہوگا۔

﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ﴾ میں جس کو چاہوں بخشوں اور جس کو چاہوں عذاب دوں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھیں کہ مغفرت کو مقدم کیا اور عذاب کو مؤخر کیا۔ اس سے اشارہ کیا کہ میری رحمت بڑی وسیع ہے کہ اگر تم توبہ کرلو تو میں بخشنے کے لیے تیار ہوں۔ میری رحمت بڑی ہے، میرے غضب پر سبقت لینے والی ہے۔ کتنے بڑے گناہ ہوں، میں جس کو چاہوں بخش دوں۔

ایک آیت میں ہے کہ جو ہم کریں گے یا دل میں چھپائیں گے اس کا حساب ہوگا، لیکن دوسری آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت فرمادی ہے کہ دل کے اندر جو وساوس ہوں اور برے خیالات ہوں ان پر مؤاخذہ

نہیں ہوتا، وہ معاف ہیں، البتہ جس بات پر ہم بالکل عزم کرلیں اس پر مؤاخذہ ہوگا۔ بعض علماء نے یہ بھی فرمایا کہ یہ بات منسوخ ہوگئی، جب یہ آیت اتری: ﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرۃ:۲۸۶] کہ کسی بندے کو اللہ تبارک وتعالیٰ تکلیف نہیں دیتے، لہٰذا دل کے اندر خیالات کا آجانا، حتیٰ کہ آدمی اگر بعض اوقات نہ بھی چاہے، خیالات آجاتے ہیں، جو انسان کے بس میں نہیں ہیں، تو اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں: اس میں ناسخ منسوخ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آگے ہر چیز ظاہر ہے اور ذرے ذرے کا بھی حساب ہوگا۔ ہاں یہ اس کا کرم ہے کہ کسی چیز کو معاف فرمائیں اور کسی کو معاف نہ فرمائیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان آیات کے اندر اشارہ ہے کہ ہر چیز کا حساب ہوگا۔ جب یہ آیات مبارکہ نازل ہوئیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت گھبرا گئے اور انہوں نے کہا: ہم اس بات سے ڈر گئے کہ بڑے اعمال ہوں یا چھوٹی چھوٹی چیزیں ہوں سب کا حساب ہوگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا ایمان قوی تھا، ان کا یقین اللہ تعالیٰ کے ساتھ قوی تھا۔ تو جتنا ایمان قوی ہوتا ہے اتنا اللہ تعالیٰ سے ڈر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں! ایک متقی آدمی ایک پانی کا گھونٹ پینے سے بھی ڈرتا ہے کہ حلال ہے یا حرام ہے اور عام آدمی کہتا ہے کہ کھالو، بعد میں دیکھا جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان اتنا بلند تھا، وہ ایمان کے پہاڑ تھے، پہاڑوں میں زلزلہ آسکتا ہے، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان اس سے بھی زیادہ ثابت تھا۔ اس لیے وہ ذرا سی بات پر بھی ڈرتے تھے۔ اور جن کا ایمان کمزور ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا خوف بھی دلوں میں کمزور ہوتا ہے، وہ پرواہ نہیں کرتے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کی مثال سمجھائی ہے کہ ایمان والے بندے سے اگر گناہ ہوجائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھ پر پہاڑ گر گیا ہے اور عام آدمی جو صرف نام کا مسلمان ہے اس سے کوئی گناہ ہوجائے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ مکھی ناک پر بیٹھی تھی اس کو اڑا دیا۔ بس اسی طرح گناہ ہوگیا تو ہوگیا، بندے سے غلطی ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بندے کو پیدا کر کے فرما دیا ہے کہ اگر ذرے کے برابر نیکی کروگے تو اس کا بدلہ ملے گا اور ذرے کے برابر گناہ کروگے تو اس کا بدلہ بھی تمہیں ملے گا۔

حدیث:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیات مبارکہ نازل ہوئیں: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي

الْاَرْضِ......﴾ تو حضور اکرم ﷺ کے صحابہ پر یہ آیت بڑی سخت گزری۔ وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ اتنے گھبرائے ہوئے تھے کہ گھٹنوں کے بل گر گئے، کھڑے بھی نہ ہو سکے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم نماز پڑھو، روزہ رکھو، جہاد کرو اور خیرات کرو تو وہ ہماری طاقت میں تھا، ہم نے کیا، لیکن اب جو آیات نازل ہوئیں ہیں اس میں تو ہماری طاقت نہیں ہے کہ جو ہمارے دل میں آ جائے، ہم کیا کریں؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: کیا تم اسی طرح کرنا چاہتے ہو جیسے یہود و نصاریٰ نے کیا کہ جب ان پر اللہ تعالیٰ کا حکم آیا تو انہوں نے کہا: ''سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا'' ہاں ہم نے اللہ تعالیٰ کا حکم سنا ہے، لیکن ہم نہیں کر سکتے، تو کیا تم بھی وہی کہنا چاہتے ہو؟ بلکہ کہو: ''سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا'' جو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ہم نے وہ سنا اور اس پر اطاعت گزار ہیں۔ اب جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ بات مان لی کہ جو اللہ تعالیٰ حکم فرماتے ہیں: ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ......﴾ کہ اللہ کے رسول اس بات پر ایمان لے آئے جو اللہ تعالیٰ نے اتاری اور ایمان والے بھی سب اس بات پر ایمان لے آئے۔ تو جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ آیات تلاوت کیں اور ان کی زبانوں پر چڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو تکلیف نہیں دیتے، مگر جو اس کی طاقت کے مطابق ہے۔ اگر کوئی چیز طاقت سے باہر ہے، مثلاً: برے وساوس آ گئے جو بس میں نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ اس پر مؤاخذہ نہیں کریں گے۔

برے وسوسے پر عمل کرنے پر پکڑ ہے:

(حدیث) ایک صحابی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تھا، انہوں نے یہ آیات تلاوت فرمائیں اور رو پڑے۔ اس کے بعد جب یہ آیت اتری تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بڑے روئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! میرے بھائی! جب یہ آیت اتری تھی تو سب صحابہ رضی اللہ عنہم غم میں مبتلا ہو گئے تھے اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو سخت تکلیف بھی پہنچی کہ ہمارے دل میں بھی جو خیال آئے پکڑے جائیں، اس طرح تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ تو انہوں نے حضور پاک ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: ہم جو عمل کریں گے اس پر تو پکڑ ہوگی، لیکن ہم دل کے خیال کو کیسے روک لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا کام یہ ہے کہ کہو: ''سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا'' یا اللہ! جو تیرا حکم ہے اس کی اطاعت کریں گے۔ جب انہوں نے یہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے

دوسری آیت نازل فرمادی اور قدرت کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا کہ جو دل میں خیال آئے وہ تو معاف ہے، لیکن اگر اس پر عمل کرو گے تو پکڑ ہو گی اور سزا دی جائے گی۔ [مسند احمد: ۱/ ۲۳۲]

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ پاک نے میری امت پر رعایت فرمادی ہے کہ جو چیز ان کے دل میں ہے، لیکن وہ زبان سے نہ کہے اور اس پر عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ پکڑیں گے نہیں۔

[تفسیر قرطبی: ۶/۱۰۲]

مفسر فرماتے ہیں: صحیحین کے اندر روایت ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: حضور پاک ﷺ نے فرمایا: "قَالَ اللّٰهُ: إِذَا هَمَّ عَبْدِيْ بِسَيِّئَةٍ فَلَا تَكْتُبُوْهَا عَلَيْهِ، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا سَيِّئَةً، وَإِذَا هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوْهَا حَسَنَةً، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا عَشْرًا" اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں: میرا بندہ اگر دل میں کسی برائی کا ارادہ کرے تو ہم فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ یہ نہ لکھو۔ اگر اس نے برائی کا ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل بھی کیا تو حکم ہوتا ہے کہ ایک برائی لکھو۔ اور اگر دل میں نیکی کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تو اس کی نیکی کا ارادہ لکھ لو اور اگر اس پر عمل کرے تو پھر اس پر دس گنا ثواب لکھ دو یعنی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ بندہ اگر برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو نہیں لکھا جاتا اور اگر کرے تو ایک برائی لکھتے ہیں اور اگر بندہ نیکی کا صرف ارادہ بھی کرتا ہے تو حکم ہوتا ہے کہ نیکی لکھ لو۔ [زاد المسیر لابن الجوزی: ۱/ ۳۴۳، تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۲۰]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب میرا بندہ اچھائی کا ارادہ کرتا ہے تو میں نیکی لکھ دیتا ہوں اور جب وہ اس اچھی بات پر عمل کرتا ہے تو میں دس گنا لکھ دیتا ہوں۔ دوسری حدیث میں ہے کہ فرشتے لکھ دیتے ہیں۔ تو ان میں کوئی تعارض نہیں؛ کیونکہ فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھتے ہیں تو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے لکھا۔

حدیث: کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: بعض اوقات ہمارے دل میں ایسی باتیں آجاتی ہیں کہ ہم ڈر جاتے ہیں کہ ہم برباد ہو گئے، یعنی دل میں بری باتیں آجاتی ہیں، نبی کے خلاف، صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہی ایمان کی نشانی ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو نہ ڈرتے۔ ایسی باتوں پر اللہ تعالیٰ نہیں پکڑتے، معاف فرمادیتے ہیں۔

بعض بزرگوں نے شیطان کے وسوسے سے بچنے کا ایک طریقہ لکھا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھیں کہ جو دل میں برا خیال آتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے تو بات ہی ختم ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس پر مؤاخذہ

نہیں کرتا تو شیطان نے جو زور لگانا ہے لگاتا رہے۔

بزرگ کی تہجد قضا ہونے کا واقعہ:

دوسرا بزرگوں نے لکھا ہے کہ ایک اللہ والے کی تہجد کی نماز فوت ہوگئی۔ صبح کو اٹھے اور سارا دن روتے رہے کہ اے اللہ! مجھ سے کون سا گناہ ہوگیا تھا کہ میں تہجد سے محروم ہوگیا!؟ تو اس اللہ والے نے سارا دن نفلوں میں گزار دیا کہ رات کی تہجد جو رہ گئی، اس کے ازالہ کی کوشش کروں۔ رات کو جب سوئے اور تہجد کا وقت آیا تو شیطان نے پانچ دس منٹ پہلے آکر جگایا کہ تہجد کے لیے اٹھ جاؤ۔ جب وہ اللہ والے اٹھے تو اس کو دیکھ کر فرمایا: کیا تم شیطان ہو؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس اللہ والے نے فرمایا: کیوں جگانے آئے تھے؟ اس نے کہا: تم نے جو دن میں دو سو نفل پڑھے ہیں، اس سے بہتر ہے کہ یہی چار رکعت پڑھ لو۔

نماز میں شیطان کے وساوس سے بچنے کا حیلہ:

اس لیے بزرگوں نے لکھا ہے: اگر کوئی شیطان کے حملے کو روکنا چاہے تو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ دو رکعت پڑھ رہے تھے، شیطان نے درمیان میں وسوسہ ڈالا تو دو رکعت اور پڑھو۔ پھر نماز میں وسوسے ڈالے تو سجدہ اور زیادہ لمبا کر دو اور وسوسہ ڈالے تو تم نماز کو اور لمبا کر دو۔ اس طرح شیطان وسوسہ ڈالنا چھوڑ دیتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں چھوڑتا۔ لہٰذا شیطان کے وسوسوں سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب وہ برائی سے باز نہیں آتا تو تم اچھائی سے باز کیوں آؤ؟ اس طرح وہ خود راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور پاک ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے جو ہر بندے کے ساتھ ایک شیطان لگایا ہے کیا آپ ﷺ کے ساتھ بھی ہے؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ہاں! میرے ساتھ بھی ہے، لیکن وہ اسلام لے آیا۔ وہ مجھے کوئی بری بات کہہ ہی نہیں سکتا۔

بعض علماء فرماتے ہیں: یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ اسی طرح موجود ہے۔ قیامت والے دن جب ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوگی، اللہ تعالیٰ اپنے ایمان والے بندوں کو بلا کر فرمائیں گے: یہ وہ اچھے اعمال ہیں جو تم نے کیے، یہ برے اعمال ہیں جو تم نے کیے اور یہ وہ اعمال ہیں جن کا تم دل میں خیال لے آئے، جن کے بارے میں فرشتوں کو بھی پتہ نہیں، لیکن مجھے پتہ ہے۔ اور جو کافر لوگ ہیں، جن کے دل میں نفاق و شک ہوگا، اس پر

اللہ تعالیٰ ان کو پکڑیں گے، لہٰذا یہ آیت منسوخ نہیں۔

﴿یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ ؕ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت والے دن خبر دیں گے کہ تم نے دل میں یہ خیال کیا تھا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے پتہ نہیں، بلکہ مجھے سب کچھ پتہ ہے، لیکن میں نے معاف کیا۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو پسند کیا ہے کہ یہ آیت محکمہ ہے، منسوخ نہیں ہوئی۔ اور محاسبہ کا معنی یہ نہیں کہ عذاب بھی ہو۔ حساب علیحدہ چیز ہے اور عذاب علیحدہ چیز ہے۔

حضرت ہشام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ہو کر عرض کیا: قرآن میں جو لفظ ''نَجۡوٰی'' آتا ہے (سرگوشی کرنا) اس کا کیا مطلب ہے؟ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اپنے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے مومن بندے کو اپنے قریب کریں گے، حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سایہ کے نیچے آئے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرمائیں گے: تم نے یہ گناہ کیا ہے اور یہ گناہ کیا۔ ان گناہوں کا اقرار کرے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: جاؤ! ہم نے معاف کر دیا۔ اس کے بعد اس بندے کو دائیں ہاتھ میں صحیفہ اعمال مل جائے گا، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو قیامت میں بھی رسوا نہیں کریں گے۔ [تفسیر قرطبی: ۶/ ۱۹۹]

لیکن کافروں اور منافقوں کے بارے میں اعلان کر دیا جائے گا: ﴿هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ كَذَبُوۡا عَلٰی رَبِّهِمۡ ۚ اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ۙ۱۸﴾﴾ [ھود: ۱۸] یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر بھی جھوٹ بولا۔ پس آج ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت علی بن زید رضی اللہ عنہ نے بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال پوچھا: ﴿وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡہُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ ؕ﴾ کا کیا معنی ہے؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم نے مجھ سے ایسا سوال پوچھا ہے کہ جب میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا اس کے بعد مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا۔ یہ بندے کی اللہ تعالیٰ سے حکایت ہے۔ بندے کو جو بخار آئے یا تکلیف پہنچ جائے اور کوئی چیز بازو میں باندھ کر بھول گیا اس پر بھی اللہ تعالیٰ رحمت فرما دیتے ہیں اور گناہ معاف کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنے گناہوں سے ایسے نکلتا ہے جیسا کہ سونے کو آگ میں ڈالا جائے تو وہ خالص ہو کر نکل آتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہ معاف کر دیتے ہیں کہ کبھی کانٹا لگ گیا تو معاف کر دیا، سر میں درد ہو گیا تو معاف کر دیا، کوئی چیز رکھ کر بھول گیا اور پریشان ہو گیا تو

اس پر معاف کر دیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو گناہوں سے صاف کر کے قیامت والے دن پیش کرتے ہیں۔ یہ حدیث غریب ہے۔ اس کے راوی علی بن زید بن جدعان ضعیف ہیں، جو غریب روایات بیان کرتا رہتا ہے۔ [جامع الترمذی: رقم: ۲۹۹۱]

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۫ وَاغْفِرْ لَنَا ۫ وَارْحَمْنَا ۫ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ [البقرۃ: ۲۸۶،۲۸۵]

"رسول نے مان لیا جو کچھ اس پر اس کے رب کی طرف سے اترا اور مومنین نے بھی۔ ہر ایک ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ہم فرق نہیں کرتے اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان۔ اور ان سب نے کہا کہ ہم نے سنا اور خوشی سے مانا۔ ہم تجھ سے بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے۔ نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی کو، مگر جتنی اس کو طاقت ہو۔ اس کے لیے انعام ہوگا جو اس نے (اچھا) کیا، اس پر عذاب ہوگا جو اس نے (برا) کیا۔ اے ہمارے رب! ہمارا مواخذہ نہ کرنا اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔ اے ہمارے رب! ہم پر کوئی سخت حکم نہیں بھیجیے، جس طرح سے ہم سے پہلے لوگوں پر بھیجا تھا۔ اے ہمارے رب! اور ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالیے جس کی ہم کو سہار نہ ہو۔ اور ہمارے گناہ مٹا دیجیے اور ہمیں بخش دیجیے اور رحم فرمائیے۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے، پس ہمیں کافر لوگوں پر غالب کر دیجیے۔"

سورۃ البقرۃ کی آخری آیات اتنی شان والی ہیں کہ صحیح احادیث مبارک میں ہے، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مَنْ قَرَأَ الْآيَتَيْنِ مِنْ آخِرِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فِي لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ"[1] کہ جو شخص رات کو یہ آیات پڑھ لے، یہ آیتیں اس کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ اسی طرح فرمایا: عرش کے نیچے جو اللہ تعالیٰ کے خاص خزائن ہیں ان خزائن میں سے

[1] [جامع الترمذی: رقم: ۲۸۸۱، کنز العمال: رقم: ۲۵۳۵]

اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں فرمائی گئی۔ اور وہ سورۃ البقرۃ کی آخری آیات ہیں۔ اسی طرح روایات میں یہ بات بھی آتی ہے کہ جیسا کہ آج کل بہت سارے لوگ جادو و جنات وغیرہ کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں، اس کے لیے سورۃ البقرۃ اوّل سے لے کر آخر تک تلاوت کی جائے اور ان پر پڑھی جائے۔ اگر وہ پوری سورت مبارک نہ پڑھ سکے تو سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات: ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ تک اور آیت الکرسی ﴿خٰلِدُوْنَ﴾ تک اور اس کے بعد سورۃ البقرۃ کی یہ آخری آیات ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ سے لے کر آخر تک اس کی صبح و شام تلاوت کرے تو اللہ تعالیٰ سحر و جنات اور بلاؤں سے محفوظ فرما دیتے ہیں۔ یہ ایسی جامع آیات ہیں۔

آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ان آیات کا تعلق سورت کے اوّل سے بھی ہے، ان آیات کا تعلق سورت کے آخر سے بھی ہے اور ان آیات مبارک کا تعلق سورت کے وسط سے بھی ہے۔ گویا ان آیات میں جب بھی آدمی غور کرے گا تو اسے سمجھ آئے گا کہ یہ ایسی موتیوں کی لڑی ہے جس کا ہر موتی عین برابر ہے، جو فصاحت و بلاغت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

ربط:

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ اگر کوئی شہادت ہو تو تم اس کو صحیح ادا کرو، شہادت کو مت چھپاؤ۔ اگر تم نے شہادت کو چھپا لیا تو تمہارا یہ دل گندا ہو جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ارشاد فرمایا کہ تمہارے جی کے اندر بھی جو کچھ ہے قابل محاسبہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے وہ جس کو چاہیں معاف فرما دیں اور جس کو چاہیں سزا دیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔ تو ﴿اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ کا جو تعلق تھا وہ یہاں آ گیا۔

آیات کا شانِ نزول:

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے کہ ایک آدمی نے کوئی کام نہیں کیا، لیکن دل کے اندر خیال آ گیا۔ اگر اس پر پکڑ ہو گئی تو اس سے کوئی آدمی بچ نہیں سکتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے صحابہ! تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں تم ان کی طرح نہ کرو، بلکہ تم یہ کہو: ''سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا'' اے اللہ! جو تیرا حکم ہے ہم مانتے ہیں: کیونکہ مومن کا کام یہ ہے کہ اگر کوئی بات سمجھ آ جائے یا سمجھ نہ آئے وہ کہے: اے اللہ! بس تیرا حکم ہے۔ ہمارا

اس پر ایمان ہے۔ صحابہ نے اس بات عمل کیا اور کہا: ''سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا'' تو یہ آیات مبارک نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا اور حضور اکرم ﷺ کو فرمادیا کہ اپنے صحابہ کو بتادیں کہ جو باتیں دل میں آتی ہیں وہ دو قسم کی ہوتی ہیں: اختیاری اور اضطراری۔ یعنی ایک خیال ہمارے دلوں میں ایسا ہے کہ جو ہمارے اختیار اور ارادے کے بغیر آ گیا، جیسا کہ نماز کے اندر برے برے خیال آ جاتے ہیں اور کبھی کبھی بھولی ہوئی باتیں یاد آنے لگ جاتی ہیں۔ یہ غیر اختیاری ہیں، ہمارے بس میں نہیں ہیں۔ ان پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اور جو ارادے کے ساتھ ہوں اس پر مؤاخذہ ہوگا۔

ایک یہودی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آ کر کہا: عجیب بات ہے کہ ہم یہودی لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، لیکن ہم یہودی جب اپنی عبادت کرتے ہیں تو ہمارے دلوں میں گندے گندے خیالات نہیں آتے، لیکن تمہارے مسلمان جب عبادت کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہمارے دل میں برے برے خیالات آتے ہیں، کبھی خدا کے بارے میں، کبھی نبی کے بارے میں اور کبھی نفسانی اور شہوانی باتوں کے بارے میں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہیں اس کا جواب دیتا ہوں اور میں یہ مسئلہ مثال کے طور پر حل کرا دیتا ہوں، تاکہ تمہیں بات سمجھ آ جائے۔ آپ نے فرمایا: ایک آدمی کے دو کمرے ہوں: ایک کمرے میں ہیرے، جواہرات، سونا اور چاندی پڑا ہوا ہو اور ایک کمرا خالی ہو تو ڈاکو کس کمرے میں داخل ہوگا؟ یہودی نے کہا: واضح بات ہے کہ جہاں سونا چاندی ہوگا ڈاکو وہیں ڈاکہ ڈالنے کے لیے جائے گا۔ آپ نے فرمایا: چونکہ تمہارے یہود و نصاریٰ کے دل ایمان سے خالی ہیں، اندر کچھ نہیں ہے کہ شیطان ڈاکہ ڈالے، اس کو پتہ ہے کہ جہنمی ہیں، ان کو گمراہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن جن لوگوں کے دلوں کے اندر نورِ ایمان ہے، محبتِ باری تعالیٰ ہے، محبتِ رسول پاک ﷺ ہے، محبتِ صحابہ و اہل بیت، اولیاء کرام ہے، وہاں شیطان ڈاکہ ڈالتا ہے کہ میں ان کو گمراہ کروں۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ جو خیالات غیر اختیاری ہیں ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا اور جو چیزیں ہمارے دل میں ہمارے ارادے سے آئیں گی ان پر عذاب ہوگا۔ چونکہ پہلے ﴿اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ ہو گیا تو یہاں محاسبہ کی بات آ گئی۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾۔ سورۃ البقرۃ کی ابتداء میں پڑھا تھا، جن میں اللہ تعالیٰ نے متقین کی صفات بیان فرمائی تھیں: ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ... وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ وہاں حکم تھا کہ وہ بن دیکھے

ایمان لاتے ہیں تو یہاں اس کی تفصیل آگئی کہ کس پر ایمان لاتے ہیں؟ جتنی کتابیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں پر اتاری ہیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں، اسی طرح جتنے پیغمبر گزرے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ یعنی سب رسولوں پر ایمان لاتے ہیں، اس طرح نہیں کہ کچھ پر ایمان لائیں اور کچھ پر ایمان نہ لائیں۔ جیسا کہ یہودیوں نے کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے، جیسا کہ نصرانیوں نے کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کر دیا اور جیسا کہ دونوں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا، لیکن یہ مسلمان کو شرف ملا ہے کہ جیسے ان کا ایمان اپنے پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اسی طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر پر ہے کہ سب اللہ کے نبی ہیں، اللہ کے رسول ہیں اور سب برحق ہیں۔

﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ [البقرۃ:۲۸۵]۔ ابتدائے سورت کے اندر تھا: ﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۳] کہ وہ عبادتِ بدنیہ سرانجام دیتے ہیں اور عبادتِ مالیہ بھی ادا کرتے ہیں۔ اور ان آخری آیات میں اس کی تفصیل آگئی کہ اے میرے مولا! تو نے ہمیں حکم دیا: نماز قائم کرو، تو ہم نے نماز قائم کر دی۔ میرے مولا! تو نے ہمیں حکم دیا: روزہ رکھو، ہم نے روزہ رکھا۔ میرے مولا! تو نے حکم دیا: امیر لوگوں پر حج فرض ہے، ہم نے حج ادا کیا۔ تو نے ہمیں حکم دیا: جہاد کرو، ہم نے جہاد کیا۔ اور تو نے ہمیں حکم دیا: میرے راستے پر خیرات وزکوٰۃ دو، ہم نے ادا کیا۔

اور جیسا کہ وہاں ابتدائے سورت میں پڑھا تھا: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ [البقرۃ:۴] کہ ہم ایمان والوں کا آخرت پر پورا پورا یقین ہے کہ ہم نے مرنا بھی ہے، مرنے کے بعد زندہ بھی ہونا ہے، زندہ ہونے کے بعد حساب کتاب بھی ہوگا، میدانِ عدل بھی ہوگا اور پھر جنت وجہنم کے فیصلے ہوں گے اور اس آخری آیت میں ہے: ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ [البقرۃ:۲۸۵] میرے مولا! تجھ سے بخشش چاہتے ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ ہم نے تیری طرف لوٹ کر آنا ہے۔

قرآن پاک کا یہ اعجاز ہے کہ کوئی اس کو جتنی تدبر سے اور غور سے پڑھتا ہے اسے سمجھ آتی ہے کہ واقعی قرآن کی آیات ایک دوسری سے مربوط ہیں۔ ایک آیت گویا دوسری آیت کے لیے دلیل بن رہی ہے، گویا اوّل سورت

دعویٰ اور باقی سورت اس کے دلائل اور شواہد بن کر آ رہی ہے۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۚ﴾ یعنی کسی عمل پر اللہ تعالیٰ سزا نہیں دیتے جب تک کہ انسان کا قصد اور ارادہ نہ ہو۔ صحیح احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا: اگر میرا بندہ دل میں کوئی برائی کا ارادہ کرے، لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس کو نہ لکھو۔ اور اس کے مقابلہ پر یہ ہے کہ اگر کسی نے نیکی کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں: لکھ لو۔ اگر یہ عمل کرے تو دس گنا ثواب بھی لکھ دو اور اگر عمل نہ کرے تو ایک نیکی لکھ دو۔ اس نے نیکی کا ارادہ تو کیا ہے۔

اس سے یہ بات بھی سمجھ لیں کہ بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں لکھا ہے کہ اس آدمی نے زنا کرنا ہے، ڈاکہ مارنا ہے اور قتل کرنا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے لکھے ہوئے کے مطابق ہم کر رہے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ یاد رکھیں! یہ جاہلیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں لکھا کہ تمہیں اس کو کرنے پر زبردستی مجبور کیا۔ آدمی جو بھی گناہ کرتا ہے اپنے ارادے سے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لکھنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اتنا محیط اور کامل ہے کہ اس کو پتہ ہے کہ فلاں دن آدمی فلاں وقت پر یہ کام کرے گا، لیکن تم نے یہ اپنی منشا سے کیا ہے، یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر جبر کر دیا۔ میں اس کی ایک آسان مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے گھر کے اندر اے سی لگا ہوا ہوتا ہے، ہیٹر لگا ہوا ہوتا ہے اور اسی طرح کار کے اندر سسٹم لگا ہوا ہوتا ہے کہ اگر اس کو کول پر رکھیں گے تو ٹھنڈی ہوا آئے گی اور اگر اس کو ہاٹ پر لے جائیں گے تو گرم ہوا آئے گی۔ اب یہ دونوں باتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اب اگر آپ گرمیوں کے زمانہ میں سوئی پھیر کر ہاٹ پر لے آئیں اور اندر سے ہیٹ آنی شروع ہو جائے تو کیا یہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ لکھنے والے نے غلط لکھا ہے یا پھیرنے والے نے غلط پھیرا ہے؟ صاف ظاہر ہے لکھنے والے نے تو ٹھیک لکھا ہے، لیکن پھیرنے والے نے اس کا استعمال غلط کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل دی ہے اور چلنے، پکڑنے اور سونگھنے کی قوت بھی دی ہے۔ اب اس کے بعد تم نے اپنے اختیار سے کیا ہے۔ اگر حلال اختیار کیا ہے تو ثواب ملے گا اور اگر حرام اختیار کیا ہے تو گناہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ بغیر اختیار کے کسی گناہ پر سزا نہیں دیتے؛ کیونکہ ایسی بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ سب کو مسلمان کر دیتے، پھر تو دنیا میں کوئی کافر نہیں ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ کو زبردستی والا اسلام قبول نہیں تو زبردستی والا کام کیوں کرائے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تمہارے سامنے دونوں چیزیں رکھ دیں ہیں: اب اسلام قبول کرو تو بصیرت کے ساتھ قبول کرو اور کفر پر جانا ہے تو اپنی عقل اور دلیل کے ساتھ ہو جاؤ۔ ہم کسی کو زبردستی نہ ہلاک

کرتے ہیں اور نہ برباد کرتے ہیں۔ ہاں جب تم نیکی کی طرف قدم بڑھاتے ہو تو ہم رحمتیں فرماتے ہیں اور جب تم برائی کی طرف قدم بڑھاتے ہو تو ہم روکتے ہیں۔ جب تم اپنے آپ کو خود تباہی کے گڑھے میں گرا دیتے ہو تو تمہاری مرضی ہے، اس لیے پھر ہم عذاب دیتے ہیں۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ﴾ ایک بھولنا ہے اور ایک خطا کرنا ہے۔ خطا پر بھی محاسبہ ہوتا ہے اور بھول پر بھی محاسبہ ہوتا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ درخت کو نہ چکھیں تو آدم علیہ السلام نے اس درخت کو چکھ لیا تو آدم علیہ السلام بھی بھول گئے تھے، اس پر بھی مؤاخذہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسیان ہے یا خطا ہے، یہ غیر اختیاری ہے، لیکن من وجہ اختیاری ہے، مثلاً: ڈرائیور سے خطاً قتل ہو جائے تو اس پر دیت ہے؛ کیونکہ اگر ڈرائیور گاڑی تیز نہ چلاتا اور اس کو صحیح حد اعتدال پر رکھتا تو ایکسیڈنٹ نہ ہوتا، لہٰذا اس پر دیت آجاتی ہے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا﴾ اور ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ﴾ بظاہر دونوں ایک ہیں کہ اے پروردگار! ہم پر بوجھ نہ ڈال، جیسا کہ پہلے والے لوگوں پر ڈالا اور پھر دوبارہ فرمایا: ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو۔ بظاہر دونوں کا معنی ایک نظر آتا ہے، لیکن دونوں میں فرق ہے: ایک کا تعلق تشریعیات سے ہے اور ایک کا تعلق تکوینات سے ہے۔ انسان تشریعی امر کا مکلف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: نماز پڑھو۔ اگر نہیں پڑھیں گے تو ہم پکڑے جائیں گے۔ اور ایک تکوینی حکم ہوتا ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: مر جاؤ۔ تو مر گئے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کی باتیں سمجھ نہیں آئیں؛ کیونکہ ان کا تعلق علومِ تکوینات سے تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق شریعت کے احکام سے تھا۔ دونوں علوم ہیں، زمین و آسمان کا فرق تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے آخر میں کہا: ﴿وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ﴾ [الکہف: ۸۲] کہ میں نے جو کچھ کیا وہ اپنی طرف سے نہیں کیا ہے۔ یہ تو مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا۔ اب سمجھیں! ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ﴾ کے اندر تشریعی حکم ہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا کوئی حکم نہ دینا جیسا کہ پہلے لوگوں پر حکم ہوا کہ تمہاری توبہ قبول نہیں کروں گا جب تک کہ اپنے آپ کو قتل نہ کرو، تمہارے کپڑے پاک نہیں ہوں گے جب تک کہ پلید جگہ کو کاٹ کر پھینک نہ دو اور اسی طرح تمہاری عبادت قبول نہیں کروں گا جب تک کہ عبادت گاہ کے اندر نہ آؤ۔ تو اس میں دعا ہے کہ اے اللہ! ہم پر ایسے سخت حکم نہ دینا جس پر ہم عمل نہیں کر سکتے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ﴾ اے اللہ! ہمیں مصیبتوں میں مبتلا نہ کر دینا۔ کوئی تکوینی امر کے تابع ہمیں

بیمار کردو، ہمارے گھروں میں فتنہ پڑ جائے، ماں باپ کی نافرمانی آجائے یا ایسی بلائیں آجائیں کہ بندہ اس بوجھ کو اٹھا نہ سکے، اس لیے ہمارے مولا! تو تشریعی طور پر ہم کو ایسا حکم کرنا جو پہلوں پر گزرا ہے اور نہ تکوینی طور پر ہمیں کسی ایسی مصیبت میں مبتلا کرنا جو ہماری طاقت میں بھی نہ ہو۔

آپ دیکھیں کہ بڑے بڑے اہل علم اور بڑے بڑے متقی ہیں، لیکن گھر میں بیوی نافرمان ہوتی ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ جبکہ وہ عالم لاکھوں لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا ہوا ہے، لیکن اس کی بیوی اس کی نہیں سنتی۔ اس طرح لاکھوں لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ ہے کہ اس کا درس سن سن کر لاکھوں لوگ ہدایت پر آگئے، لیکن ان کی اولاد ان کا حکم نہیں مانتی۔ یہ ایسے عذاب ہیں جو ہم نہیں اٹھا سکتے۔

''مَوْلٰىنَا'' کا لفظ استعمال:

﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾[البقرة:٢٨٦]

قرآن پاک میں کئی مقامات پر آتا ہے: ﴿هُوَ مَوْلٰىكُمْ﴾[الحج:٧٨]۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ''اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلَا لَكُمْ'' اللہ ہمارا ولی و ناصر ہے، کافروں کا ولی و ناصر نہیں ہے۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں جیسے رواج ہے کہ عالم کو ''مولانا'' کہتے ہیں تو علماء اس سے منع کرتے ہیں؛ کیونکہ بظاہر یہ لفظ اللہ کے لیے ہے۔ یہ لفظ کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن زیادہ تر اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے۔ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ اگر کسی لفظ میں کوئی شبہ پڑے تو آدمی استعمال نہ کرے۔

﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾[البقرة:٢٨٦] اے اللہ! کافروں کے مقابلہ میں مدد فرما؛ کیونکہ کافر تیرے بھی دشمن ہیں، تیرے نبیوں کے بھی دشمن ہیں، تیرے دین کے بھی دشمن ہیں، تیری کتابوں کے بھی دشمن ہیں اور ہمارے بھی دشمن ہیں۔ اس لیے ان کے مقابلہ پر ہماری مدد فرما۔

ابتدائے بقرہ اور انتہائے بقرہ میں ربط:

سورت کے شروع میں تھا: ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ......اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ اور یہاں یہ فرمایا: ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ فلاحِ دنیا یہ ہے کہ دنیا میں غلبہ ملے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں عذاب سے نجات ملے اور جنت نصیب ہوجائے۔ جب قوم کافرین پر اللہ تعالیٰ

مدد کریں گے اور اسلام کا غلبہ ہوگا تو دنیا میں بھی فلاح مل گئی اور آخرت میں بھی فلاح مل گئی۔

سورۂ بقرۃ عرش کا خزانہ ہے:

سورۃ البقرۃ معاش اور معاد کے مسائل پر مشتمل ہے۔ اس لیے بعض روایات میں آتا ہے کہ ہر چیز کی ایک کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورۃ البقرۃ ہے۔ یہ خزائنِ عرش میں سے ایک خزانہ ہے، جو ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملا اور آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو یہ نعمت نہیں ملی۔

[ابن الضریس فی فضائل القرآن]

تفسیر سورۂ آلِ عمران

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔''

﴿الٓمّٓ ① اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۭ② نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ③ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ڛ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ④ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۭ⑤ ھُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑥﴾ [آل عمران: ۱تا۶]

''الم۔ اللہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں، وہ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا ہے۔ آپ پر کتاب (قرآن) حق کے ساتھ اتاری ہے، سابقہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اسی نے تورات اور انجیل اتاری ہے۔ (اس قرآن) سے پہلے ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور فیصلے اتارے۔ جو لوگ اللہ کی آیات کے منکر ہوئے ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اور اللہ غالب ہے، انتقام لینے والا ہے۔ اللہ پر مخفی نہیں ہے کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں۔ وہی تمہاری شکل بناتا ہے ماں کے پیٹ میں جیسے چاہتا ہے (مرد و عورت، سیاہ و سفید)۔ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، (وہی) زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

تمہید:

یہ سورت مکی ہے یا مدنی ہے؟ اس کے اندر کافی سارے اقوال ہیں۔ راجح قول یہ ہے کہ یہ مدنی سورت ہے۔

اس سورت کا دوسرا نام ''المجادلۃ'' بھی ہے؛ کیونکہ نصرانیوں کے ساتھ ایک بات ہوئی تھی اور تقریباً اسی آیات تک اس کا ذکر آتا ہے۔

یاد رکھیں! سورتوں کے نام اس مناسبت سے ہوتے ہیں جو واقعہ اس سورت میں ذکر ہوتا ہے، جیسا کہ اس سورت کا نام ''آلِ عمران'' ہے؛ کیونکہ اس میں آلِ عمران کا ذکر ہے۔

ربطِ سُوَر:

سورۃ البقرۃ اور سورۃ آلِ عمران کا آپس میں عجیب تعلق ہے۔ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں روشن چمکنے والی ہیں، نور تام رکھنے والی ہیں۔ علماء نے اس کی وجہ بیان فرمائی ہے اور جیسا کہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا اسم اعظم ان آیات مبارکہ میں چھپایا ہوا ہے اور اس سورت میں ﴿الٓمّٓ ① اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ②﴾ چونکہ دونوں سورتوں میں اسم اعظم کا ذکر آ گیا، اس لیے ان دونوں سورتوں کو زہراوین کا لقب ملا ہے۔

سورۃ البقرۃ کے شروع میں تھا: ﴿الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾[] کہ قرآن ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اور یہاں فرمایا: ﴿الٓمّٓ ① اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ② نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی کتاب کو بیان فرمایا ہے۔

سورۃ البقرۃ میں بیان ہوا کہ متقین کون ہیں؟ ''مُفْلِحِيْن'' کون ہیں؟ اور اس سورت کے خاتمہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے وہی ذکر کیا ہے: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ⓶⓪⓪﴾ [آلِ عمران: ۲۰۰]۔

سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا، جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر ہے اور اس سورۃ آلِ عمران میں ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔

سورۃ البقرۃ کے شروع میں مسلمانوں کا ذکر تھا، آگے کافروں کا ذکر تھا اور ان کے بعد منافقین کا ذکر تھا۔ اور سورۃ آلِ عمران میں ''زَائِغِيْن'' کے بارے میں ذکر فرمایا اور ''زَائِغِيْن'' وہی منافق ہیں۔

آیت الکرسی میں آیا: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ اللہ تعالیٰ کی حیاتِ ذاتی کا ذکر تھا اور سورۃ آلِ عمران میں بھی اللہ تعالیٰ کی حیاتِ ذاتی اور الوہیت کا ذکر آیا۔

سورۃ البقرۃ کے مخاطب یہودی تھے اور اس سورت میں نصاریٰ سے مقابلہ کا ذکر ہے۔ یہود پہلے تھے اور نصرانی

بعد میں تھے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کو پہلے رکھ دیا اور سورۃ آلِ عمران کو بعد میں رکھ دیا۔

اللہ تعالیٰ کے قرآن کو جس نظر سے دیکھیں گے آپ کو ایک اعجاز نظر آئے گا۔آپ اس کے الفاظ پر غور کریں، معانی پر غور کریں، ترتیب پر غور کریں اور احکام پر نظر کریں تو آپ کو اعجاز نظر آئے گا۔علمائے قواعد نے قواعد کے لحاظ سے دیکھا تو ان کو اعجاز نظر آیا، ادب والوں نے ادبیت کی نظر سے دیکھا تو ان کو اعجاز نظر آیا اور بلاغت والوں نے بلاغت کی عینک پہنی ان کو اعجاز نظر آیا؛ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کسی بندے کا کلام تو نہیں ہے۔

اس سورت کے شروع میں قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے اور پھر اس وفد کا ذکر ہے جو وفد نجران سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کے لیے آیا تھا۔مدینہ کے اندر شروع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ یہود سے تھا سورۃ البقرۃ کے اندر ان کا رد تھا۔

عیسائیوں کا ایک بڑا گروہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں:

سورۂ آلِ عمران میں تقابل نصاریٰ سے ہے۔ان کا وفد یمن کے علاقہ نجران سے ۹ ہجری میں آیا، جو ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔چودہ آدمی اونچے مرتبہ کے لوگ تھے، ان میں سے تین علم میں اتنا اونچا مقام رکھتے تھے کہ شہنشاہِ روم بھی ان کے آگے جھکتے تھے۔اس وفد کی سربراہی عبدالمسیح کر رہا تھا، اور دوسرا مشہور عالم ابوالحارثہ بن علقمہ اور تیسرا بڑا پادری تھا اس کا نام الایہم تھا۔جب یہ وفد مدینہ منورہ کے اندر پہنچا تو صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ہم ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ زرق برق لباس، اعلیٰ شان سواری کے اونٹ اور گھوڑے تھے۔بہر حال وہ وفد آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم ان کو ٹھہرانے کا بندوبست کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھبرانے کی کوئی بات نہیں، انہیں اسی مسجد میں ٹھہرایا جائے۔

نصاریٰ بڑی سمجھدار قوم ہے۔آج بھی دنیا کے اندر ان کا کوئی معاملہ ہوتا ہے تو پچاس سال، سو سال پہلے اس کام کی پلاننگ کرتے ہیں، پھر اسی خطوط پر اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔یہ کفر کی اپنی دانائی ہوتی ہے۔

یہ وفد اس لیے آیا کہ انہوں نے دیکھ لیا کہ اب اسلام کو طاقت مل گئی ہے۔جو اسلام یتیم مکہ کی قیادت میں چند کمزوروں کا نام تھا آج وہ ایک قوت بن گیا۔میدانِ بدر میں مشرکین کی قوت کو توڑ چکے ہیں، یہود ان سے خائف ہیں، ان کو جلاوطن کر رہے ہیں۔اس لیے اب اسلام سے ٹکرانا بڑا مشکل ہے، لہٰذا کوئی راستہ پیدا کیا جائے۔تو وہ

حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا: دنیا میں مسائل کبھی لڑائیوں سے حل نہیں ہوئے، مسائل مذاکرات سے حل ہوتے ہیں۔ ہم آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہماری سمجھ میں آگئیں تو ہم مان لیں گے اور اگر ہم نے آپ کو قائل کرلیا تو آپ ہماری بات کو مان لینا۔

انہوں نے کہا: ہمارے عقیدے میں چند چیزیں ہیں۔ ہماری ایک جماعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کی قائل ہے اور ہمارے بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا تو نہیں، لیکن خدا کا بیٹا ہے۔ اور نصاریٰ کے کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا بھی نہیں ہے، لیکن ان تین میں سے ہر ایک خدا ہے، (جس کو آج کل عقیدہ تثلیث کہتے ہیں)۔ اس لیے بڑی بڑی کمپنیاں اپنا مونوگرام اگر پھول بنائیں گے تو اس کی تین پتیاں بناتے ہیں۔ اور اس وفد نے حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل ہمارا عقیدہ ہے۔ انہوں نے کہا: کیا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر کوئی برص کوڑھ والا، جذام والا آپ کے پاس آتا تھا اور آپ اس کو ہاتھ پھیرتے تو وہ ٹھیک ہو جاتا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہا: آپ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادرزاد اندھے پر ہاتھ پھیر دیتے تو وہ بینا ہو جاتا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل ٹھیک بات ہے۔ انہوں نے کہا یہ بتائیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کا کوئی باپ نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام جب دودھ پینے والے بچے تھے، جھولے کے اندر بات کی تھی، کیا آپ اس کو مانتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل مانتے ہیں۔ انہوں نے کہ ہم جو کہتے ہیں تین میں کوئی خدا تو نہیں ہے، لیکن عیسیٰ ﷺ اور اس کے بعد اللہ اور اس کے بعد روح القدس ان تین میں خدا ہے۔ خود قرآن میں دیکھیں! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''أَمَرْنَا، قَضَيْنَا، فَعَلْنَا، نَزَّلْنَا، أَعْطَيْنَا'' یہ سب جمع کے صیغے ہیں۔ اگر خدا صرف ایک ہوتا تو فرماتے: ''أَمَرْتُ، قَضَيْتُ، فَعَلْتُ، نَزَّلْتُ، أَعْطَيْتُ'' جب صیغہ جمع کا آجائے تو اس کے کم سے کم دو یا تین افراد ہوتے ہیں۔ تو اس کے اندر بھی ہماری وہی تین والی بات آ رہی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے بڑے حوصلے سے ان کی بات سن لی اور فرمایا: کیا اور بھی کچھ پوچھنا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، ہمارے یہی سوالات ہیں۔ اگر آپ ہمیں مطمئن کر دیتے ہیں تو ہم آپ کے مذہب کے بارے میں سوچنے کے لیے تیار ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے بتاؤ جو بیٹا ہوتا ہے وہ اپنے والد کے مشابہ ہوتا ہے یا مشابہ نہیں ہوتا؟ انہوں نے

کہا: اولاد ماں باپ کے مشابہ ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: خدا کے مشابہ تو کوئی ہوتا نہیں تو عیسیٰ ﷺ بیٹے کیسے بن گئے؟ کہنے لگے: آپ کی یہ بات تو ٹھیک ہے۔ چلو اس کے بارے میں ہم سوچیں گے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بتاؤ خدا کھاتا ہے پیتا ہے؟ اس کو حمام جانے کی ضرورت پیش آتی ہے؟ انہوں نے کہا خدا ان تینوں چیزوں سے پاک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام کھاتے تھے یا نہیں کھاتے تھے؟ انہوں نے کہا: کھاتے تھے، پانی بھی پیتے تھے اور غسل بھی کرتے تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: پھر وہ کیسے خدا ہو گئے؟ انہوں نے کہا: آپ کی یہ بات بھی ٹھیک ہے، ہم اس پر غور کریں گے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ کیا خدا بھی ماں کے پیٹ میں رہتا ہے؟ اس کو بھی کیا ماں حمل میں اٹھاتی ہے؟ اور اس کی باقاعدہ ولادت ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا: خدا تو ان تینوں چیزوں سے پاک ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر بی بی مریم کے پیٹ میں کون رہا؟ انہوں نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب خدا پیٹ میں ہونا ممکن نہیں اور ادھر تم مانتے ہو کہ بی بی مریم نے پیٹ میں اٹھایا، پھر ولادت ہوئی، عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، قوم نے جھگڑا کیا۔ جب یہ ساری باتیں مانتے ہو تو وہ خدا کیسے ہو گئے؟ انہوں نے کہا: یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ بہرحال اس پہلو پر بھی ہم غور کریں گے، لیکن ہمیں سمجھ نہیں آتا۔ کیونکہ وہ بغیر باپ کے جو پیدا ہوئے ہیں یا دنیا کے اندر اور کوئی اور بھی بندہ ہو جس کی آپ مثال دیں کہ فلاں بندہ بغیر باپ کے پیدا ہوا ہے تو حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر ان آیات مبارکہ کی تلاوت فرمائی: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ [آل عمران: ۵۹] کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ایسے ہے جیسے آدم علیہ السلام کہ ان کا باپ بھی نہیں اور ان کی ماں بھی نہیں تھی، تو کیا وہ بھی خدا بن گئے؟ اگر باپ کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا بیٹا ہو جاتا ہے...... اللہ نہ کرے...... تو آدم علیہ السلام کی نہ ماں تھی اور نہ باپ تھا اور حواء کی ماں نہیں، ان کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کر دیا تو ان کو کیا بتاؤ گے؟ انہوں نے کہا: یہ بات بھی ٹھیک ہے۔

نصاریٰ کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے، ان کو صلیب پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی اور ان پر موت آ چکی ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور آسمان سے اتریں گے۔ اگر آپ چاہتے تو ان کو ایک منٹ میں جھٹلایا جا سکتا تھا کہ کیا کوئی خدا بھی پھانسی چڑھتا ہے؟ لیکن آپ ﷺ نے یہ نہیں کیا کہ دشمن کو چپ کرانے کے لیے اس کے غلط عقیدے کا حوالہ کیوں دیں؟ بلکہ حق والے کا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے حق

پرڈٹ رہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کی ذات قیوم ہے اور ساری کائنات کی حفاظت کرنے والی ہے۔ اس کو کسی حفاظت کی ضرورت نہیں ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو حوارین کی ضرورت پڑی۔ آپ ان کو بلاتے رہے کہ کون ہے جو میری مدد کرے تو جو لوگوں کو مدد کے لیے پکارے وہ بھی خدا ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، ہم اس پر غور کریں گے اور پھر کل مسئلہ رکھیں گے۔ رات کو جب وہ آپس میں بیٹھ کر غور کرنے لگے تو انہوں نے کہا: یہ اللہ کے سچے نبی ہیں، اس کی باتیں حق بجانب ہیں۔ اگر ایک دن اور مناظرہ لمبا کریں تو جن کو ہم ساتھ لے کر آئے ہیں، یہ سارے مسلمان ہو جائیں گے، اس لیے حیلے بہانے سے یہاں سے نکل جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرما دیا۔ ایسا موقع پھر نہیں ملے گا، پڑھے لکھے لوگوں کا وفد مدینہ میں آیا ہے، آپ ان کو کھل کر دعوت مباہلہ دیں کہ اے کتاب کو ماننے والو! ہم اللہ کی توحید کی طرف آجاتے ہیں، جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک مسئلہ ہے۔ اللہ کے سوا کسی غیر کی عبادت تمہاری کتابوں میں بھی حرام اور ہماری کتاب میں بھی حرام ہے۔ اور اگر تم اس بات کو نہیں مانتے ہو تو آجاؤ! تم بھی اپنی بیوی بچوں کو لے آؤ اور میں بھی اپنے آپ اور بیوی بچوں کو لے کر ایک میدان میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ جو جھوٹا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہو جائے، تاکہ اگر برباد ہو تو ساری کی ساری نسل برباد ہو۔ جب حضور اکرم ﷺ نے ان کو چیلنج کیا تو انہوں نے کہا: ہمیں رات کا موقع دے دو اور پھر غور کریں گے۔ جب رات کو اکٹھے ہوئے تو کہا: رات کو بھاگ جاؤ؛ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا سچا نبی ہے، اس سے کون مباہلہ کر سکتا ہے؟ ہم تو برباد ہو جائیں گے۔ اس طرح وہ رات کے وقت وہاں سے نکل گئے۔ جب صبح کو آپ ﷺ کو پتہ لگا تو آپ ﷺ نے جوش میں آکر فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری زندگی ہے! اگر آج کفر کا یہ ٹولہ میرے مقابلہ میں آتا تو اسی جگہ کھڑے کھڑے اللہ ان پر عذاب نازل کر دیتا اور دنیا کو پتہ چل جاتا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ اس لیے مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ اس وجہ سے اس سورت کا نام مجادلہ بھی ہے۔

اور اس طرح اس سورت میں توحید، رسالت اور معاد جو اہم مسائل ہیں، اس میں بھی اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں۔ پہلے توحید کا ذکر آیا: ﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۲﴾ اللہ کی ذات وہ ہے کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ، جو اپنی ذات سے زندہ ہے اور زندہ رہے گا، جو ساری کائنات کو تھامنے والا ہے۔ وہ ذات پاک ہے جس نے

کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور فرقان کو اتارا۔ جب کتاب کے اترنے کا ذکر آیا ہے تو مسئلۂ رسالت ثابت ہو گیا۔ جب اللہ تعالیٰ کی کتاب سچی ہے تو جن پر اتاری گئی ان کی صداقت رسالت بھی آ گئی۔

اور یہ فرمایا گیا: اے نصاریٰ! تم تورات کا اترنا بھی مانتے ہو اور انجیل کا اترنا بھی مانتے ہو، اگر کتاب خدا نے اتاری ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے خدا ہو گئے؟ پھر تم نے انجیل کو اترتے ہوئے نہیں دیکھا، لیکن مانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے۔ تو جیسے اس کتاب کو مانتے ہو اسی طرح قرآن کو بھی مانو۔

بعض علماء فرماتے ہیں: اس سے مراد قرآن ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: وہ معجزات مراد ہیں جو اللہ کے نبی کی صداقت کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں؛ کیونکہ قرآن کا ذکر تو پہلے آ چکا ہے، اس لیے یہاں معجزات مراد ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ④﴾ [آل عمران: ۴]

جو لوگ اللہ کی آیات کا کفر کرتے ہیں ان کے لیے بڑا سخت عذاب ہے۔ اللہ غالب اور قدرت والے بھی ہیں اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینے والے بھی ہیں۔ میرے مدنی! جو تیرے دشمن ہیں وہ میرے دشمن ہیں۔ ان کو میں دنیا و آخرت میں اپنی قدرت سے عذاب دوں گا۔ ان آیات کے اندر اثباتِ توحید بھی آ گئی اور اثباتِ رسالت بھی آ گئی۔

﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ﴾ [آل عمران: ۶] اس آیت کے اندر قیامت کا ذکر ہے کہ اللہ وہ ہے جو رحم میں تمہاری شکلیں بناتا ہے۔ پانی ایک ہے، لیکن شکلیں مختلف ہیں۔ جو ان کو بنانے پر قادر ہے وہ تمہیں دوبارہ قبروں سے اٹھا کر جلانے پر بھی قادر ہیں۔ ان تینوں مسئلوں کا ذکر ان آیات کے اندر آ گیا ہے۔

﴿الٓمّٓ ①﴾ یہ حروف مقطعات ہیں۔ ان کی تفصیل سورۃ البقرۃ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

﴿الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ②﴾ اسم اعظم کی تفصیل آیت الکرسی کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

قرآن کی سچائی:

﴿نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ [آل عمران: ۳] اے پیارے نبی! ہم نے آپ پر قرآن اتارا حق کے ساتھ۔ یعنی اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا ہوا ہے اور اللہ کے ملائکہ بھی گواہ ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ گواہ ہیں تو پھر اس میں کسی قسم کا کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

یہ بات اس کے لیے تو ٹھیک ہے جو اللہ کو مانتا ہے۔ اور ایک آدمی اللہ تعالیٰ کو مانتا بھی نہیں ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی گواہی کی کیا حیثیت ہے؟ اور اس کے لیے کیا دلیل ہونی چاہیے کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ کے سچے نبی پر اتارا گیا ہے؟ اس کا جواب خود قرآن پاک کے اندر موجود ہے: "﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ ۖ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٣﴾﴾" [البقرۃ: ۲۳] اے میرے مدنی! اگر دشمن یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ہم نے نہیں اتارا، بلکہ اس نبی نے خود بنایا ہے تو آپ ان کافروں کو چیلنج کریں کہ تم ساری مخلوقات میں فصیح و بلیغ لوگوں کو اکٹھا کر کے قرآن کے مقابلہ پر ایک سورت بنا کر لے آؤ، لیکن یہ تم نہ کر سکے اور نہ قیامت تک تم قرآن کا مقابلہ کر سکو گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآن ہے اور اللہ نے اپنے پاک نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اتارا ہے۔

قرآن کی صفات:

1 ...... ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ﴿٣﴾﴾ اے پیارے پیغمبر! ہم نے آپ کو ایسی کتاب دی ہے جو آپ سے پہلے کتابیں گزری ہیں ان کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتاری اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتاری اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اتاری۔ آج میرے مدنی کی نبوت میں شک کرتے ہیں کہ تورات حضرت موسیٰ ﷺ پر اتاری اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتاری، اگر اس کو مانتے ہو تو اسی خدا نے قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اتارا ہے۔ ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں اتاریں وہ اپنے اپنے زمانے کے لیے اور اپنے حالات کے مطابق تھیں۔

2 ...... ﴿وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ فرقان سے مراد ہدایت اور گمراہی کے درمیان میں فرق کرنے والا، حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا، صدق اور کذب کے درمیان فرق کرنے والا اور اندھیرے اور روشنی کے درمیان فرق کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ کھول کر بیان کرتے ہیں کہ یہ بات حق ہے اور یہ بات باطل ہے۔

مخلوقات کا علم:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں اپنے علم کامل، علم غیب اور علم محیط کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قرآن میں جہاں الوہیت کا ذکر آئے گا اس کے ساتھ دو صفات ضرور آئیں گی: ایک علم کامل اور دوسرا قدرت

کاملہ کا ذکر ضرور آئے گا۔ یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو علم دیا ہے، مثلاً: دریا کی مخلوق ہے۔ اس کو علم ہے کہ ہم پانی کے اندر رہیں، نہیں تو مر جائیں گی۔ اس لیے اس کو باہر نکالنے کے لیے کانٹے اور جال ڈالتے ہو، ورنہ خود تو باہر نہیں آتی ہے...... سو اسی طرح مرغی کے چوزے بلی کو دور سے دیکھیں تو دوڑ کر ماں کے پروں کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ ان کو پتہ ہے کہ ہمیں یہیں پناہ ملے گی...... دس گائیں باندھ دیں اور سب کے بچھڑے چھوٹے چھوٹے ہوں، ان کو چھوڑ دیں تو ہر بچھڑا اپنی اپنی ماں کے پاس جائے گا، وہ کسی دوسری گائے کے پاس نہیں جاتا ہے۔ یہ اس کو علم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے...... سانپ کو بھی علم ہے کہ میں نے کہاں جا کر بل کے اندر گھس جانا ہے؟...... چیونٹیوں کو بھی علم ہے...... چڑیوں کو بھی علم ہے، دن رات کا علم ہے اور اب دانہ چگنے کا علم ہے۔

اتنا علم اللہ تعالیٰ نے سب کو دیا ہے اور سب سے زیادہ علم اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دیا ہے؛ کیونکہ ان کی ذمہ داری زیادہ ہے۔ ان کے لیے شریعت ہے، یہ مکلف ہے، اس کے لیے حساب کتاب، قیامت ہے اور اس کے لیے انبیاء و رسل اور اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں۔

پھر انسانوں میں سب سے زیادہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو سب انسانوں سے زیادہ علم عطا فرمایا ہے، پھر انبیاء میں جیسے جیسے مرتبہ زیادہ ہے اسی طرح علم زیادہ ہوتا ہے۔ یہ سب علم برحق ہیں، لیکن اللہ کے علم کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا؛ کیونکہ یہ سارے علم تو ہیں، لیکن کامل نہیں ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ [الشوریٰ: ۵۲] جب تک ہم نے قرآن نہیں اتارا آپ کو تو پتہ نہیں تھا کہ قرآن کیا ہے اور ایمان کی جزئیات اور تفصیلات کیا ہیں؟

ایک استدلالی ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل پر نظر ڈالنا۔ وہ تو نبی پیدائش سے ایمان والے ہوتے ہیں، لیکن ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب، یہ تفصیلات آپ کو اس وقت معلوم ہوئیں جب اللہ تعالیٰ نے وحی اتاری۔ اس لیے علم کامل صرف اللہ کا ہے، نبی کا علم ساری مخلوقات سے اونچا ہے، لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ جب تک علم نہ دیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ جب تک خبر نہ دیں ان کو علم نہیں ہوتا۔

اللہ کا کمالِ علم:

اس لیے کئی ایسے واقعات ہیں جو انبیاء کی موجودگی میں ہوئے، لیکن ان کو پتہ نہیں لگا، اس لیے کہ علم کامل اللہ کا ہے۔ جب آپ نے اس مسئلہ کو سمجھ لیا تو اللہ تعالیٰ آپ کو شرک سے بچالیں گے۔

اس کی ایک آسان مثال عرض کر دوں کہ آپ مکہ شرف میں آئے اور آپ ملتزم پر کھڑے ہو کر دعا مانگ رہے ہیں۔ایک آدمی عربی میں دعا مانگ رہا ہے، ایک آدمی اردو میں دعا مانگ رہا ہے، ایک پشتو میں دعا مانگ رہا ہے، ایک بنگالی میں مانگ رہا ہے اور ایک برمی میں مانگ رہا ہے، کوئی کسی زبان میں اور کوئی کسی زبان میں مانگ رہا ہے۔ان سب کا یہ یقین ہے کہ یہ ساری دعائیں اللہ سننے والا ہے اور اللہ یہ ساری بولیاں سمجھتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم نہ بولو اور دل میں رکھو تب بھی میں جانتا ہوں۔آہستہ بولو تب بھی اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں، زور سے مانگو تب بھی سنتے اور سمجھتے ہیں۔ بلکہ سب کی دعائیں منظور کر کے ان سب کی حاجتیں پوری کرنے پر قدرتِ کاملہ بھی رکھتے ہیں۔اس بات کو ٹھنڈے دل سے سوچیں! ایک آدمی بچہ مانگ رہا ہے۔دوسرا کہتا ہے: اللہ میاں! میرے لڑکے بہت ہو گئے ہیں، مجھے لڑکی چاہیے۔تیسرا کہتا ہے: اللہ میاں! تو نے لڑکے بھی دیئے اور لڑکیاں بھی دی ہیں، کھانے کو کچھ نہیں ملتا، ہمیں کچھ روزی چاہیے۔کوئی کہتا ہے کہ اللہ! مجھے گاڑی چاہیے۔کوئی کہتا ہے کہ اللہ میاں! مجھے خیریت سے گھر پہنچا دیں۔اور کوئی کہتا ہے: اللہ میاں! میرا بیٹا بیمار ہے، شفا کر دو۔یعنی ہر آدمی اپنی اپنی مانگ رہا ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان دعاؤں کو پورا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

مخلوق کے سامنے بے بس ہے:

اب ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ایک آدمی اللہ والے کے مزار پر جاتا ہے اور وہاں دعا کرتا ہے اور اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ سن رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں۔حالانکہ وہاں کئی زبان والے لوگ کھڑے ہیں، حالانکہ وہ بزرگ دنیا میں کوئی ایک آدھ بولی سمجھتا تھا تو کیا قبر میں جانے کے بعد سب بولیاں سمجھنے لگ گئے ہیں؟ تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کر رہا ہے؛ کیونکہ سننے والے اور سمجھنے والے اور حاجت پوری کرنے والے صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ روزانہ عرش سے آسمانِ دنیا پر اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں: کوئی مانگنے والا ہے اس کو دوں؟ اللہ کی رحمت تو جوش میں ہوتی ہے، پھر درمیان میں واسطوں کی کیا ضرورت ہوتی ہے؟ اس لیے قرآن کے اندر ہے کہ دنیا میں تم جن کو پکار رہے ہو یہ قیامت کے دن تمہارے پکار کی نفی کریں گے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کھجور کے درمیان میں جو دھاگہ ہوتا ہے اتنا ذرہ بھی ان کے پاس کوئی چیز نہیں، تو وہ تمہیں کیا دیں گے؟ وہ تو خود محتاج ہیں۔

لوگ کہتے ہیں: یہ آیات بتوں کے لیے ہیں، انسانوں کے لیے نہیں اور اللہ کے انبیاء اور اولیاء کے لیے نہیں ہیں۔ جبکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمائیں گے: ﴿ءَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ﴾ [المائدہ:۱۱۶] کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے بھی اور میری اماں کو بھی اللہ کے سوا الٰہ سمجھو؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب دیں گے: اے اللہ! تیری ذات پاک ہے! میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہوں جو مجھے زیبا نہیں؟ میں تیرا بندہ ہوں، میں الٰہ کیسے بن سکتا ہوں؟ میں تیری مخلوق ہوں، خالق کیسے بن سکتا ہوں؟ اور میں مملوک ہوں، مالک کیسے بن سکتا ہوں؟ آپ کا علم کامل اور محیط ہے؛ کیونکہ آپ کو میرے اندر کا بھی پتہ ہے: ﴿إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾ [المائدۃ:۱۱۶] میرا اللہ سب سے زیادہ غائب کا جاننے والا ہے، ہم تو غیب نہیں جانتے ہیں۔ غور کریں! اللہ کے نبی بھی کہہ رہے ہیں کہ مولا! تو جانتا ہے، ہم نہیں جانتے ہیں۔

عقیدہ کی خرابی:

آج اسی وجہ سے شرک ہے کہ لوگ خانہ کعبہ میں ملتزم میں کھڑے ہوتے ہیں، لیکن کہہ رہے ہوتے ہیں: پیر تیری مہربانی ہے، تو نے مکہ میں پہنچا دیا ہے اور حضور نے حاضری کے لیے بلایا ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ حضور اکرم ﷺ جب عمرہ کے لیے تشریف لاتے تھے آپ کو کون بلاتا تھا؟ مدینہ والا بلائے گا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کو بلائے گا یا ان کو بلائے گا جو مشکل میں بھی محمد عربی ﷺ کا دشمن ہے؟ جو عمل میں بھی ان کا دشمن ہے؟ کہتے ہیں: آپ سراپا رحمت تھے تو کیا ہم سراپا زحمت بنیں؟

واقعہ:

ایک آدمی مجھے ملنے کے لیے آیا، میں نے اس کو کہا: ''الحمد للہ'' اللہ نے آپ کو عمرہ نصیب کر دیا، کعبۃ اللہ کی حاضری نصیب ہوگئی اور مدینہ شریف کی حاضری نصیب ہوگئی۔ کہتا ہے: سارا پیر کا فیض ہے۔ دو منٹ کے بعد میں نے اس سے پوچھا: تمہارے مرشد کا کیا حال ہے؟ کہنے لگا: بیمار ہے۔ میں نے کہا: اپنی بیماری ٹھیک نہیں کر سکتے اور تجھے مکہ مدینہ پہنچا دیا ہے!!؟ اپنی خدمت کے لیے تجھے رکھ لیتے، تاکہ تم ان کی خدمت کرتے۔ کہنے لگا: میں یہاں حضرت کے لیے دعا مانگنے آیا ہوں۔ میں نے کہا: کس سے دعا مانگو گے؟ کہا: اللہ تعالیٰ سے مانگوں گا۔ میں نے کہا: یہ مسئلہ تو ہم سمجھاتے ہیں، پھر ہمیں کیوں وہابی بناتے ہوئے؟ اور کہتے ہو: پیروں کو نہیں مانتے اور بزرگوں کو نہیں مانتے؟

﴿إِنَّ اللهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ﴾ [آل عمران:۵] اللہ زمین کی چھپی ہوئی چیزیں اور آسمان میں چھپی ہوئی چیزیں سب جانتے ہیں۔ زمین کی تہوں کے اندر تم کوئی دانہ بھی ڈال دو، اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں۔ اس لیے دوسرے مقام پر فرمایا: جو کچھ قبر میں ہے اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں اور جو کچھ دریا میں ہے وہ جانتے ہیں۔

اللہ کی تخلیق کا کمال:

﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ﴾ [آل عمران:۶] وہی اللہ ہے جو تمہاری شکلیں بناتا ہے ماں کے رحم میں جیسے چاہتا ہے۔ پانی ایک ہے اور زمین ایک ہے، لیکن شکلیں مختلف ہیں۔ کبھی بچہ باپ کی شکل ہے، کبھی ماں کی شکل ہے، کبھی دونوں کی شکل ہے اور کبھی دادا یا نانا کی شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس گندے پانی کو کیسی کیسی شکلیں دی ہیں کہ انسان دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے!! اس سے ایسے ایسے عالم پیدا کر دیئے جو سورج کی طرح چمکتے رہے۔ اور وہ اللہ چاہیں تو اندھا بنا دیں اور چاہیں تو سفید بنا دیں۔ وہ چاہیں تو لنگڑا بنا دیں اور وہ چاہیں تو سالم بنا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی مثال بیان کی ہے ہے کہ کوئی پیر، کوئی قبر والا ہے جو یہ طاقت رکھے کہ ماں کے رحم کے اندر بچہ پیدا کر دے؟ بلکہ ان بزرگوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے بنایا اور وہ ماں کے رحم کے اندر پیدا ہوئے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے عیسائیوں کے وفد سے فرمایا کہ تم کہتے ہو "عیسیٰ خدا ہے" ان کو تو بی بی مریم نے پیٹ میں اٹھایا ہے، ان کی ولادت ہوئی اور اپنی ماں کا دودھ پیتے رہے۔ تو جو ماں کے پیٹ میں رہے، وہ بھی بھلا کبھی خدا اور مشکل کشا ہو سکتا ہے؟ جو پیدا ہونے کے بعد دودھ کا محتاج ہے، جھولے کا محتاج ہے اور کندھے پر اٹھانے کا محتاج ہے۔

جس ماں نے بچے کو پیٹ کے اندر اٹھایا ہوا ہے اس کو پتہ بھی نہیں کہ یہ بچہ نیک بخت ہے یا بد بخت ہے؟ اس کی عمر کتنی ہوگی؟ اس کی انگلیاں سالم ہیں یا ٹیڑھی ہیں؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے ذرہ ذرہ کا پتہ ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ [لقمان:۳۴] جو کچھ رحم کے اندر ہے اس کا علم بھی اللہ کو ہے۔

اشکال: جاہل کہتے ہیں: الٹرا ساؤنڈ سے پتہ چل جاتا ہے کہ رحم کے اندر کیا ہے؟ جواب: ساری کائنات کا کیا کوئی ایک وقت میں الٹرا ساؤنڈ کرے گا؟ کوئی الٹرا ساؤنڈ کے نیچے آئے گا تو اس کو پتہ چلے گا کہ کیا ہے؟ الٹرا ساؤنڈ کی بھی کوئی یقینی بات نہیں ہے۔ بات تو یہ ہے کہ ساری کائنات اپنے اپنے گھروں میں ہے اور وہ جانتا ہے،

اس چیز کا نام علم ہے۔

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۶﴾ [آل عمران: ۶] یہاں بھی الوہیت کا مسئلہ ہے کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ۔ وہ ایسا غالب ہے کہ اس کے حکم کو کوئی ٹالنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا، جس کے فیصلے کو کوئی رد نہیں کر سکتا اور اس کا ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝۹﴾

[آل عمران: ۷ تا ۹]

”وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے۔ اس میں بعض آیات واضح الدلالت ہیں، یہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری متشابہ (جن کے معنی معلوم یا معین نہیں)۔ پس جن کے دل حق سے پھرے ہوئے ہیں وہ متشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں گمراہی پھیلانے کے لیے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے، حالانکہ ان کی تفسیر کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور مضبوط علم والے کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے ہیں، سب ہمارے رب کی طرف سے اتری ہے۔ اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جو عقلمند ہیں۔ اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دل نہ پھیر اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا کر۔ بے شک تو ہی دینے والا ہے۔ اے ہمارے رب! تو ہی لوگوں کو جمع کرنے والا ہے ایک دن، جس میں کوئی شک نہیں۔ بے شک اللہ (دوبارہ اٹھانے میں) وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔“

قرآنی آیات کی اقسام:

قرآن پاک کے اندر دو قسم کی آیات ہیں: آیاتِ محکمات اور آیاتِ متشابہات۔

آیات محکمات کے بارے میں علماء کے بڑے اقوال ہیں، لیکن راجح قول یہ ہے کہ محکمات ایسی ہوتی ہیں جن کا معنی مفہوم واضح اور کھلا ہوا ہے یا جن کی تفسیر حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے امت کو کھول کر سمجھا دی ہے، اب اس میں کسی کا زور نہیں چل سکتا کہ کوئی اس میں ذرے کے برابر رد و بدل کر سکے؛ کیونکہ وہ کھلی ہوئی بات ہے۔

اور آیات متشابہات یہ ہیں کہ ان میں بعض الفاظ ایسے ہیں جن میں ایک دوسرے کے معنی کی طرف انسان کا شبہ جا سکتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: متشابہات ان کو کہتے ہیں کہ ان کی دوسری جگہ مثال موجود ہو، وہ ایک دوسرے کے متشابہ ہیں۔

ایک شبہ اور جواب:

ایک تشابہ تماثل سے ہوتا ہے کہ یہ چیز اس کی شبیہ ہے، بعینہٖ اس کی مثل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے جو قرآن اتارا ہے سب محکم ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ [الزمر: ۲۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کا سب قرآن ہے اور جو آیات اوپر بیان ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیات محکمات ہیں اور بعض آیات متشابہات ہیں۔ اب بظاہر تعارض اور تناقض لگ جاتا ہے؛ کیونکہ اگر ساری آیات محکمات ہیں تو متشابہ کیسے ہو گیا؟ اور اگر سارا قرآن متشابہ ہے تو محکم کیسے ہوا؟

جواب: یاد رکھیں! جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن سارے کا سارا محکم ہے تو ٹھیک ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سارے احکامات محکم ہیں۔ اگر کہیں متشابہات ہیں تو وہ محکمات کے تابع ہیں، لہٰذا سب آیات کو محکمات کہنا درست ہو گیا۔ اور جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ [الزمر: ۲۳] وہاں متشابہات سے مراد متشابہات نہیں، بلکہ مماثلت مراد ہے کہ ایک دوسرے کی مثال ہیں کہ ایک جگہ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہے تو دوسری جگہ بھی موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہے۔ ایک جگہ توحید کا بیان ہے تو دوسری جگہ بھی توحید کا بیان ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا خوارج سے مناظرہ:

اس لیے جب خوارج (جو حب صحابہ میں آ کر اہل بیت کے دشمن ہو گئے) کے ساتھ مناظرہ کا وقت آیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خبردار! خیال رکھنا! قرآن پاک کی بجائے حدیث رسول سے استدلال کرنا۔ پوچھا گیا: کس لیے؟ فرمایا: قرآن میں بعض آیات متشابہات ہیں۔ ایک لفظ کے کئی معانی مراد ہو سکتے ہیں تو

جن کے دل میں کجی ہے وہ اپنے مطلب کا معنی لیں گے، لیکن جب حدیث مبارک آجاتی ہے تو کسی باطل کو کھل کر کھیلنے کا موقع نہیں ملتا، بلکہ اس کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

آیاتِ متشابہات کی تشریح کا طریقہ:

اگر آیات متشابہات آجائیں تو کیا کریں؟ تو علماء نے فرمایا: ان کو آیاتِ محکمات کے تابع جمع کرو: کیونکہ وہ اصل بنیاد ہیں۔ مثال کے طور پر:

......حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بعض آیات محکمات ہیں کہ ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ [زخرف:۵۹] یہ میرا ایک بندہ ہے۔ تو یہ کھلی ہوئی بات ہے۔ اور فرمایا: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ [آل عمران:۵۹] تم عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر حیران کیوں ہوتے ہو؟ اس کی مثال تو ایسے ہے جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی۔ اس کو مٹی سے پیدا کیا، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔

......اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد مقامات پر فرما دیا: ﴿ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ﴾ [مریم:۳۴] یہ عیسیٰ بن مریم ہیں۔ یہ میرا بندہ اور بشر ہے۔ ہم نے ان کو بغیر باپ کے پیدا کیا، ان کو بولنے کی توفیق دی۔ ہم نے ان کو نبوت ور رسالت کے لیے چن لیا ہے۔ ہم نے ان کو آسمانوں پر اٹھا لیا ہے۔ تو یہ ساری کھلی ہوئی بات ہے، اس میں دوسرا ترجمہ نہیں ہو سکتا، لیکن ایک جگہ ارشاد فرمایا ﴿وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ﴾ [النساء:۱۷۱] عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ ہیں، اللہ کی طرف سے روح ہیں۔ ان الفاظ میں تشابہ ہو سکتا تھا کہ کلمہ کا کیا معنی ہے؟ اور اللہ کی روح کا اس کے اندر ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہ آیات متشابہات ہیں۔

اب ایمان والے ان آیاتِ متشابہات کو آیاتِ محکمات کی روشنی میں دیکھیں گے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو اللہ کا بندہ اور اللہ کی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بی بی مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا کیا، ان کو رسول بنایا، ان پر انجیل اتاری، ان کے بڑے بڑے معجزات اتارے اور ان کی شان میں بھی فرما دیا کہ وہ کلمہ ہے، یعنی جیسے آدم علیہ السلام کو کلمۂ ''کُن'' سے پیدا فرمایا تھا۔ یہاں بھی خصوصی تخلیق ہے کہ بغیر باپ کے اللہ کے حکم سے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ﴿وَكَلِمَتُهُ﴾ بھی فرما دیا ہے۔ اور جیسے اولادِ آدم ماں کے پیٹ میں جب ہوتی ہے تو روح پھونکی جاتی ہے کہ ماں باپ کا نطفہ قرار پکڑتا ہے تو اس پر کئی ادوار گزرتے ہیں اور چار ماہ کے بعد اس میں

روح پھونکی جاتی ہے، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا، ان کا لقب بھی روح ہے: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ﴾ [القدر: ۴]۔

وہ آئے، بی بی مریم کے سامنے کھڑے ہوکر پھونک ماری تو ان کے منہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نفخ جبرئیل علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام کا حمل ٹھہر گیا تو اب ایک لفظ اور بھی آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے دو مقام پر ایسے الفاظ بیان فرمائے کہ متشابہات ہیں، لیکن جب ان کو محکمات کو روشنی میں دیکھیں گے تو بات واضح ہوجائے گی اور کسی قسم کی الجھن نہیں رہے گی۔

مذکورہ مسئلہ کی دوسری تعبیر:

عرب کے اندر ایک محاورہ ہے کہ "كَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَامِ" (بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے) اور قرآن تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو ملک الاملاک والملوک ہے۔ اس کے اندر اشارات بھی ہیں، اس کے اندر اسرار کے حکم بھی ہے اور اس کے اندر ایسی ایسی اشیاء رکھی ہیں کہ ہماری عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے متشابہات کا حل یہ ہے کہ اس کو محکمات کے تابع کردیں یا پھر ایک لفظ کے کئی ترجمے تو ہوتے تھے، لیکن ایک ترجمہ معین ہوگیا۔

مثلاً: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ نماز ادا کرو۔ صلوۃ کا لفظ کئی معانی کے اندر آتا ہے: صلوۃ بمعنی دعا، صلوۃ بمعنی رحمت بھی ہے، صلوۃ بمعنی درود بھی ہے، صلوۃ بمعنی نماز بھی ہے اور صلوۃ بمعنی تحریک الصلوین بھی ہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ کر امت کو دکھایا۔ اس لیے اب لفظ "صلوۃ" کا دوسرا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نماز قائم کرو۔ تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز قائم کر کے دکھا دی۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ زکوۃ ادا کرو۔ زکوۃ کا معنی تزکیہ بھی ہوسکتا ہے، تزکیۂ باطن بھی ہوسکتا ہے، زکوۃ بمعنی ذبح بھی ہوسکتی ہے، زکوۃ بمعنی میل کچیل کی صفائی بھی ہوسکتی ہے، جیسا کہ قرآن کے اندر ہے کہ اگر بھاگا ہوا جانور پکڑا گیا تو فرمایا: ﴿اِلَّا مَا ذَكَّیْتُمْ﴾ [المائدۃ: ۳] تمہارے لیے وہ جانور حلال ہے جو تم نے ذبح کر لیا۔ تو یہاں ذال کے ساتھ ہے۔ اور زکوۃ لفظ زاء کے ساتھ ہے۔ ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ میں اللہ کے نبی نے زکوۃ کے پیمانے بیان فرما دیئے کہ سونا ساڑھے سات تولہ تو زکوۃ فرض ہوئی اور چاندی ساڑھے باون تولہ ہے تو زکوۃ ہوگی، بکریوں میں اتنا عدد اور اونٹ میں اتنا عدد معین کر کے ہمیں بتا دیا، لہٰذا اب اس آیت کا دوسرا ترجمہ نہیں ہوسکتا اور شبہ نہیں ہوسکتا۔

پھر بھی کوئی گمراہ ہو جائے تو ان کا کوئی علاج نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا کہ نماز ایکسر سائز ہے۔ اب اس کے دوسرے طریقے آ گئے ہیں، لہٰذا نماز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ضلال ہے۔ اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ ایک آدمی کہے کہ میں نہیں مانتا تو اس کا کیا حل ہے؟

متشابہات حقیقی اور متشابہاتِ اضافی:

متشابہات کی دو قسمیں ہیں: متشابہاتِ حقیقی اور متشابہاتِ اضافی۔

متشابہات حقیقی وہ ہیں جن کے معانی نہیں کھلتے، اللہ تعالیٰ نے چھپا دیے ہیں۔ جیسے حروفِ مقطعات ہیں، ان کے معانی نہیں کھل سکتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نہیں بیان فرمائے اور حضور اکرم ﷺ نے بیان نہیں فرمائے تو کون ان کے معانی بیان کر سکتا ہے؟

متشابہات اضافی کا مطلب ہے کہ معنی میں اخفا تھا، جب اس کو متشابہات کی روشنی میں دیکھا تو بات کھل گئی اور معنی سمجھ میں آ گیا۔

اللہ تعالیٰ نے قاعدہ بیان فرما دیا ہے کہ جو ایمان والے اور اہل حق ہیں وہ جب بھی کوئی آیت متشابہ پڑھتے ہیں تو اس کو فوراً آیتِ محکم کی روشنی میں دیکھتے ہیں، لیکن جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور کھوٹ ہے وہ متشابہات کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور محکمات کی روشنی میں نہیں جاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کو لیتے ہیں، تا کہ دنیا میں فتنہ پھیلائیں۔ جیسا کہ عیسائیوں نے متشابہات والی آیات کو لے لیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ فرمایا گیا، لہٰذا وہ خود خدا ہیں یا خدا کے بیٹے ضرور ہیں۔ انہوں نے یہ آیات نہ پڑھیں: ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝﴾ [سورۃ الاخلاص] اللہ تعالیٰ کی تو اولاد نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی بشریت:

اور جیسا کہ ہمارے بعض لوگ بھی متشابہات کو لے لیتے ہیں، مثلاً: ایک جگہ لفظ آ گیا: ﴿قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ۝﴾ [المائدۃ: ۱۵] تو بعض مفسرین نے لکھا کہ نور سے مراد محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، حالانکہ جمہور مفسرین

نے لکھا ہے کہ نور سے مراد قرآن ہے اور کتاب سے مراد بھی قرآن ہے، لیکن بعض مفسرین نے نحوی قاعدہ کے پیش نظر کہ درمیان میں واو عاطفہ ہے۔ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان کوئی تغایر ہونا چاہیے، اس لیے نور سے مراد حضور اکرم ﷺ ہیں اور کتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرآن ہے۔ جن لوگوں کا عقیدہ ٹھیک تھا انہوں نے کہا: کوئی بات نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو نور فرمایا ہے، لیکن جن لوگوں کا مقصد فتنہ پھیلانا تھا، جن کے دلوں میں کجی اور کھوٹ تھا انہوں نے کہا کہ دیکھو! اللہ کا نبی تو نور ہے اور یہ کیسے کہتے ہیں کہ بشر ہیں!؟

اس طرح انہوں نے ایک متشابہ آیت کو لے لیا اور ساری محکم آیات کا انہوں نے انکار کر دیا۔ انہی لوگوں کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ ان کے دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب ایک جگہ لفظ نور آ گیا تو ہم آیت محکم کی طرف دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مدنی کو فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ [حم سجدہ: ۶] ان لوگوں کو کہہ دو کہ میں تو انسان ہوں، تمہاری جنس کی طرح ہوں۔ میرا اعزاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیج کر مجھے نبی بنایا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ [بنی اسرائیل: ۹۳] کہہ دو: تیرے رب کی ذات پاک ہے، میں تو ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول ہوں۔ تیسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۗ﴾ [آل عمران: ۱۴۴] اور نہیں محمد مصطفیٰ ﷺ مگر وہ بھی ایک رسول ہے، جیسا کہ آپ سے پہلے رسول گزرے ہیں۔ کیا اگر میرے مدنی پر موت آجائے یا میرے مدنی شہید ہو جائیں تو کیا تم دین اسلام کو چھوڑ کر پھر جاؤ گے؟ یعنی اگر وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے رہیں گے تو مانو گے اور اگر کبھی شکست ہو جائے تو کیا تم بھاگ جاؤ گے؟ تم اچھے مسلمان ہو۔ میرے مدنی بھی تو ایک رسول ہیں، جیسا کہ پہلے رسول گزرے ہیں اور ان پر بھی وفات آئی ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا، شہید ہو گئے۔ اور ایسے واقعات بھی گزرے کہ اللہ کے نبیوں کو قتل کر دیا گیا، ستر ستر انبیاء کو اللہ کے راستے میں ایک دن میں شہید ہونا پڑا، ان کے سروں پر آرے رکھ کر دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اب گمراہ لوگوں کا ان ساری آیات کو چھوڑ کر ایک آیت کو پکڑ لینا اور باقی کسی آیت پر نظر نہ کرنا یہی اہل باطل کا کام ہے۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ کا نسب بھی بیان کرتے ہیں کہ آپ محمد بن عبداللہ ہیں، دادا کا نام عبدالمطلب ہے، ماں کا نام آمنہ ہے، دائی کا نام حلیمہ ہے، آپ ﷺ کی اول زوجہ محترمہ خدیجۃ الکبریٰ ہے اور آپ کی اولاد بھی ہے۔ یہ سارے رشتے بھی بیان کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کہتے ہیں کہ آپ بشر نہیں۔

ان سے پوچھا جاتا ہے کہ نور سے کونسا نور مراد ہے؟ چاند والا نور یا سورج والا نور یا تاروں والا نور؟ اب ان کو چکر آ جاتا ہے اور سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے چاند تارے والا نور کہہ دیا تو ان کی تو اللہ کے نبی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں اور انہوں نے کہہ دیا کہ وہ اللہ کے نور سے ہیں، حالانکہ ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾[النور:۳۵] ساری کائنات بھی تو اللہ کا نور ہے۔ اب اگر حضور اکرم ﷺ کو اللہ کے نور کا جز مانیں گے تو وہی شرک اور کفر آ گیا جو نصاریٰ نے کیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا جز ہے۔

یاد رکھیں! جن کی نظر محکم آیات پر ہوتی ہیں وہ کہیں گے اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾[النساء:۱۷۴] میرے نبی! ہم نے آپ کی طرف کھلا ہوا نور اتارا ہے، یعنی قرآن۔ فرمایا: ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾[الاعراف:۱۵۷] اے لوگو! اس نور کی پیروی کرو جو ہم نے ان پر اتارا ہے۔ یہاں بھی نور سے مراد قرآن ہے۔ اور ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾[المائدۃ:۱۵] وہاں بھی نور سے مراد قرآن ہے اور واؤ تفسیر کے لیے ہے۔ واؤ ہر جگہ عطف کے لیے استعمال نہیں ہوتی، بلکہ کبھی واؤ جمع کے لیے، کبھی عطف کے لیے، کبھی واؤ بمعنی او ہوتی ہے اور کبھی واؤ تفسیریہ ہوتی ہے۔

اس لیے جب ہم آیات محکمات کی روشنی میں دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اللہ کے نبی بشر نہیں، سید البشر ہیں، امام الانبیاء والمتقین ہیں، سید الاولین والآخرین ہیں اور جہاں نور کا ذکر آیا وہاں آپ کا نورِ نبوت، نورِ قرآن اور نورِ وحی مراد ہے۔ اس طرح کوئی جھگڑا اور اختلاف نہ رہا اور ہم محکمات کی روشنی میں آ گئے۔ اگر ہم محکمات سے ہٹ جاتے تو متشابہات میں پڑ جاتے۔

گمراہی کی ایک اور مثال:

حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا بندہ میری عبادت کرتے کرتے میرے اتنے قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس کا سمع بن جاتا ہوں، اس کا بصر بن جاتا ہوں اور میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں۔ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾[الانفال:۱۷] میرے مدنی! آپ ﷺ نے مٹی کے ڈھیلے نہیں پھینکے، حالانکہ وہ اللہ نے پہنچائے۔

جب یہ آیات اور احادیث سامنے آئیں تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی تھی انہوں نے کہا دیکھو! بندہ ترقی کرتا کرتا خدا بن جاتا ہے۔ اور سب سے پہلے یہ عقیدہ شیعہ نے پیش کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود خدا ہے۔ اس لیے وہ مولا

گے۔ اور انہوں نے اپنے لوگوں کو کہا ہوا ہے کہ یہ بات کسی کو بتانی نہیں، لیکن بات یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود خدا ہے، ہمارے سنیوں کو بھی غصہ آیا انہوں نے کہا: تم نے علی کو خدا بنایا، ہم اپنے پیر کو خدا بناتے ہیں کہ

علی کہیں گے اور جب سلام کریں گے تو ایک کہے گا: یا علی مدد اور دوسرا کہے گا: مولا علی مدد۔ اور السلام علیکم نہیں کہیں

ے چاچڑ وانگ مدینہ ڈسے، کوٹ مٹھن بیت اللہ
ظاہر وچ پیر فریدن باطن وچ خود اللہ

تم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ اٹھانا ہے اور ہم نبی کا روضہ اٹھائیں گے، تم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی یومِ شہادت مناؤ گے اور ہم نبی کی یوم ولادت شروع کردیں گے۔ یہ وہ عقیدے ہیں جن سے روافض خوارج گمراہ ہوئے۔

اصل عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرآن میں دیکھو! اگر کہیں کوئی آیت متشابہ ملے، اس کو محکمات کی روشنی میں لے آؤ تو بات واضح ہو جائے گی۔

''راسخین فی العلم'' کا طریقۂ کار:

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ کے اندر دو قراءتیں ہیں:

پہلی قراءت: ایک قراءت یہ ہے کہ ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ﴾ اس پر وقف لازم ہے کہ نہیں جانتا متشابہات کا کوئی معنی، مگر اللہ۔ ﴿يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ﴾ اور جن کو اللہ تعالیٰ نے علم میں رسوخ دیا ہے وہ کہتے ہیں: سب کچھ ہمارے اللہ کی طرف سے ہے۔ آیاتِ محکمات بھی ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور آیاتِ متشابہات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ ہمیں جو سمجھ نہ آئے تو ہماری سمجھ کا قصور ہے، ہماری عقل ناقص ہے، ہماری قوی ناقص ہیں اور ہمارا علم ناقص ہے۔ جس طرح ہم نے دنیا کی ہر چیز کو نہیں سمجھا، لیکن پھر بھی ہم ناقص ہیں، اسی طرح ہم نے متشابہات کو نہیں سمجھا، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہے۔

﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ کی تفسیر:

دوسری قراءت: علماء نے فرمایا: یہاں وقف لازم نہیں ہے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ نہیں جانتا متشابہات کی تاویل، مگر اللہ تعالیٰ اور جو علم کے اندر پکے ہیں وہ بھی جانتے ہیں، ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے۔ اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وہ شخص جس نے اپنی قسم کو ہمیشہ پورا کیا، کبھی جھوٹی قسم نہیں کھائی، جس نے منتوں کو پورا کیا اور جھوٹی منت نہیں مانی، جس نے اپنے پیٹ کی حفاظت کی اور کبھی حرام داخل نہیں ہونے دیا اور جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی اور کبھی زنا نہیں کیا۔ ایسے شخص کے سینے کو اللہ تعالیٰ کھول کر راسخ فی العلم بنا دیتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''الحمد للہ'' میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے راسخین فی العلم فرمایا ہے؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''اَللّٰھُمَّ! عَلِّمْهُ الْکِتَابَ'' میرے اللہ! میرے اس صحابی کو قرآن پڑھا دے۔ اور دوسری جگہ ہے: میرے اللہ! میرے اس صحابی کو قرآن کی تفسیر سکھا دے۔ اس لیے آپ فرماتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ کی دعا ہے، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی جھوٹی قسم نہیں کھائی، کبھی پیٹ میں حرام نہیں جانے دیا اور کبھی اپنی شرمگاہ کو غلط استعمال نہیں کیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے رسوخ فی العلم نصیب کیا ہے۔

اب سمجھیں کہ جو متشابہات حقیقی ہیں ان کا معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ حروف مقطعات۔ اور متشابہاتِ اضافی کا معنی راسخین فی العلم کو بھی اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ اس طرح دونوں قراءتیں صحیح ہو گئیں۔

تاویل کا ایک معنی تفسیر ہوتا ہے، جیسا کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: ''تَاْوِیْلُ ذٰلِكَ'' کا معنی تفسیر ہے۔ اور ایک تاویل کا معنی ہوتا ہے کہ جو خارج میں حقیقت پیش آتی ہے وہ بھی تاویل ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ﴾ [الاعراف: ۵۳] یہ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ جب قیامت آ جائے گی اور جب ان کا معاملہ سامنے آ جائے گا اسی وقت کا یہ انتظار کر رہے ہیں؟ اس آیت کے اندر تاویل بمعنی تفسیر ہے۔ ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝۷﴾ [آل عمران: ۷] فرمایا: قرآن سے عقل والے نصیحت پکڑتے ہیں۔

غلط تاویلوں سے بچنے کے لیے دعا:

اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دعا سکھائی ہے کہ راسخین فی العلم یہ دعا مانگتے ہیں: میرے اللہ! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر دینا ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہ کر دینا۔ اور ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۝۸﴾ [آل عمران: ۸] اپنی طرف سے ہمیں رحمت عطا فرما۔ رحمت تیری ذات ہے، جو رحمت کرنے والی ہے۔

﴿رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۝۹﴾ [آل عمران: ۹] میرے اللہ! تو

قیامت کے دن سب کو اکٹھا کرنے والا ہے، کوئی شک نہیں اور تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا۔ میرے اللہ! جب ساری کائنات کے بندوں کو جمع کرنے پر ایک میدان میں تو قادر ہے تو ہمیں بھی مختلف آیات کے ترجمے سکھانے پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ بندہ کتنا بڑا عالم کیوں نہ بن جائے، لیکن ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کہ یا اللہ! ایسا نہ ہو کہ میں بھٹک جاؤں اور میں راستہ کھو جاؤں۔ اللہ ہم سب کو گمراہی سے بچائے۔

محکمات کی ایک اور تفسیر:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت میں ہے کہ محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جو ناسخ ہیں، جیسا کہ پہلے نماز مسجد اقصیٰ کی طرف پڑھی جاتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴] اے میرے نبی! آپ اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کر لیں۔ تو پہلا حکم خود بخود ختم ہو گیا۔ اب اگر کوئی پہلے حکم کو لے کر لوگوں کو دھوکا دیتا ہے کہ تو وہ متشابہ کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حلال و حرام کا بیان بھی محکم ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو حدود مقرر فرمائیں وہ بھی محکم ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو احکامات دیئے کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو اور زکوٰۃ دو، یہ سب محکم ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا﴾ [الانعام: ۱۵۱] اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ [بنی اسرائیل: ۲۳] تین آیات تک تو یہ سب محکم ہیں۔

متشابہات کی مثالیں:

اہل باطل متشابہ آیات کو لے لیتے ہیں اور ایسی احادیث کو لے لیتے ہیں جن کے احکام منسوخ ہیں تو وہ مسلمانوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں کہ یہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔

پہلی مثال:

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "كَانَ يُبَاشِرُنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَنَا حَائِضٌ" کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مباشرت فرماتے تھے اس حال میں کہ میں حیض کے ساتھ ہوتی تھی۔

اس حدیث کے اندر مباشرت کے لفظ آ گئے تو جو منکر حدیث ہیں انہوں نے کہا کہ قرآن میں آیا ہے: ﴿وَلَا

تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ﴿[البقرة:١٨٧] تم عورتوں سے مباشرت نہ کرو، تم حالتِ اعتکاف میں مسجد کے اندر بیٹھے ہو۔ حالتِ اعتکاف کے اندر بیوی آ کر کھانا پہنچائے گی، کوئی گھر کی بات بتائے گی، کپڑے دے گی اور لے جائے گی، لیکن میاں بیوی لیٹ کر مجامعت نہیں کر سکتے؛ کیونکہ آدمی اعتکاف میں ہے۔ اگر اعتکاف نہ ہو تو رمضان المبارک میں رات کو میاں بیوی کا لیٹنا جائز ہے، منع نہیں ہے۔

باطل فرقے منکرین حدیث جیسے پرویز وغیرہ گزرے ہیں، انہوں نے اس حدیث مبارک پر طوفان کھڑا کر دیا کہ اللہ تعالیٰ معاف کرے! ایک عام آدمی بھی حیض کی حالت میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع نہیں کرتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اللہ کے نبی حیض کی حالت میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرتے تھے؟ لہٰذا یہ حدیث غلط ہے۔ اس طرح انہوں نے حدیث پر اعتراض کر دیا اور عام مسلمان بھی دھوکے میں پڑ گیا کہ بات تو ٹھیک ہے کہ اللہ کے نبی معصوم ہیں اور اتنی بڑی شان والے ہیں، ان کی ذات سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے؟ یہ تشابہ کے ساتھ لوگوں کو دھوکہ دینا ہے، حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ لفظ ''مباشرت'' کا ایک معنی جماع بھی ہے اور ایک معنی ویسے میاں بیوی کا اکٹھے لیٹنا بھی ہے۔

مسئلہ یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ میں عجیب افراط و تفریط تھی۔ یہودی لوگ اگر عورت کو حیض آ جاتا تو اس کو گھر سے بھی نکال دیتے تھے کہ یہ ناپاک ہے، ہمارے گھر میں نہیں آ سکتی۔ ان کے علیحدہ کمرے بنے ہوتے تھے، وہاں جا کر عورت حیض کے دن گزارتی تھی۔ وہ نہ اپنے گھر آ سکتی تھی اور نہ کھانا پکا سکتی تھی۔ نصاریٰ نے ان کے الٹ کر دیا کہ اگر عورت کو حیض آ گیا تو کیا ہو گیا؟ اس حالت میں جماع بھی جائز ہے اور اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانا بھی جائز ہے، کوئی منع نہیں ہے۔ اسلام نے عادلانہ حکم دیا کہ افراط و تفریط میں نہ پڑو۔ عورت کو اگر ایامِ حیض آ گئے ہیں تو عورت نماز بھی نہیں پڑھ سکتی، روزہ بھی نہیں رکھ سکتی اور میاں بیوی آپس میں جماع بھی نہیں کر سکتے، لیکن عورت گھر میں رہے گی، کپڑے دھوئے گی اور میاں بیوی اکھٹے لیٹے رہیں، کوئی منع نہیں ہے، لیکن جماع منع ہے۔

تو بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم حیض میں ہوتے تھے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے بستر پر لیٹ جاتے تھے۔ یہ مطلب یہ نہیں تھا کہ...... نعوذ باللہ...... جماع کرتے تھے، لیکن اہل باطل نے لفظ ''مباشرت'' سے لوگوں کو دھوکے میں ڈال کر حدیث رسول کا انکار کر دیا، حالانکہ اللہ کے نبی نے خود فرمایا کہ حالت حیض میں جماع کرنا حرام ہے، بلکہ اگر کوئی ایسی غلطی کر لے تو وہ توبہ کرے، صدقہ خیرات بھی کرے۔ اس نے بہت بڑی زیادتی کی ہے کہ جس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کو حرام کر دیا ہے اس نے حرام کا کیوں ارتکاب کیا ہے؟ اور

قرآن کے اندر واضح مسئلہ موجود ہے کہ حیض پلیدی ہے۔ جب تک عورت حیض میں ہے اس کے ساتھ جماع نہ کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائے۔ جب غسل کر لیں اور پاک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیویوں کو تمہارے لیے حلال کیا ہے۔

یہ قرآن کا مسئلہ تھا۔ اس میں اللہ کے نبی کی مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

دوسری مثال:

روافض نے اپنے ہاں متعہ کا مسئلہ بنایا ہوا ہے۔ ان کے آدمیوں سے سنی پوچھیں تو وہ نہیں مانیں گے، حالانکہ متعہ ان کے مذہب اور ان کی کتابوں میں ہے۔ اور جہاں جہاں ان کا تسلط ہے وہاں متعہ کا قانون رائج ہے، انکار سنیوں کے سامنے کرتے ہیں، ورنہ ان کی کتابوں میں متعہ کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ..... نعوذ باللہ..... کہتے ہیں: اگر ایک دفعہ عورت متعہ کرالے تو وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے اور جب عورت دو دفعہ متعہ کرالے اور اس کے غسلِ جنابت کرنے کے بعد جب پانی کے قطرے اس کے بدن سے گرتے ہیں تو ہر قطرے سے ایک فرشتہ پیدا ہوتا ہے، جو اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔ اور جب اس کے کسی علمی آدمی سے بحث ہو تو وہ کہتا ہے کہ کمال کرتے ہو! بخاری شریف اہلسنت والجماعت کی ایسی کتابوں میں ہے، اللہ کے قرآن کے بعد جس کا درجہ ہے، اس کے اندر حدیث موجود ہے کہ صحابہ کہتے ہیں: ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں متعہ کرتے تھے۔ تو آپ ہمارے خلاف کیوں باتیں کرتے ہیں؟ بلکہ حدیث میں ایک جگہ یہ وضاحت بھی ہے کہ دو صحابی کہتے ہیں: ہم ایک عورت کے پاس متعہ کرنے کے لیے آئے۔ ہم نے کہا: یہ بھی متعہ کرنا چاہتا ہے اور میں بھی متعہ کرنا چاہتا ہوں۔ میری عمر زیادہ تھی، لیکن جو میرے پاس چادر تھی وہ بہت اچھی تھی۔ میں نے کہا: میں متعہ کے بدلہ میں یہ چادر دوں گا۔ اور میرا ساتھی جوان تھا، لیکن اس کے پاس قیمتی چادر نہیں تھی۔ اس عورت نے کہا: میں اس نوجوان سے متعہ کرتی ہوں، تمہارے ساتھ میں متعہ نہیں کرتی ہوں۔ تو یہ اہلسنت والجماعت کی کتابوں میں موجود ہے اور کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول موجود ہے کہ متعہ جائز ہے۔ جب روافض یہ تین باتیں دکھائیں تو اہلسنت والجماعت کا آدمی تو ایک دفعہ چکر میں آجائے گا۔

اصل بات یہ تھی کہ متعہ ابتدائے اسلام میں تھا۔ جب اس کی حرمت آگئی تو اللہ کے نبی نے اس کو حرام فرما دیا: ''لَا مُتْعَةَ بَعْدَ ذٰلِكَ'' آج کے بعد متعہ حرام ہے۔ خبردار! آج کے بعد کوئی متعہ نہیں کرے گا۔ وہ اس زمانہ کی

احادیث دکھاتے ہیں جب متعہ حلال تھا۔ اور اس بات کا پتہ عالم کو ہوگا، عام آدمی کو تو اس کا پتہ نہیں ہوگا۔ یہی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہوتی ہے اور کھوٹ ہوتا ہے وہ ایسے ایسے الفاظ لے آتے ہیں اپنی باتوں کا حوالہ بنانے کے لیے، تاکہ میری بات بن جائے۔ اور ان کا اس سے مقصد اپنے متبعین کو دھوکہ دینا ہوتا ہے، حالانکہ اگر ان آیات واحادیث کو محکم آیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ آیات ان کے اوپر تو حجت بنیں گی، لیکن ان کے لیے دلیل نہیں بنیں گی۔

تیسری مثال:

نصرانیوں نے قرآن میں یہ تو دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن میں روح اللہ اور کلمۃ اللہ فرمایا ہے۔ ان باتوں کو تو لے لیا اور جو قرآن میں محکم آیات تھیں: ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ﴾ [زخرف:۵۹] کہ وہ میرا بندہ ہے۔ ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ﴾ [آل عمران:۵۹] عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ایسے ہے جیسا حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور سارے قرآن میں یہ آیات موجود ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی مخلوق ہے، اللہ کے بندوں میں سے بندے ہیں اور اللہ کے رسولوں میں سے رسول ہیں، لیکن نصرانیوں نے ان ساری آیات کو چھوڑ کر روح اللہ اور کلمۃ اللہ والی آیات کو لے لیا۔

(حدیث) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات مبارکہ تلاوت فرمائیں: ﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ...... وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں محکمات بھی اتاری ہیں اور متشابہات بھی اتاری ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ جب تم دیکھو کہ لوگ متشابہات کو دلیل بنا کر جھگڑ رہے ہیں ان سے بچ جانا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن نے ارشاد فرمایا کہ یہ اہل باطل ہیں۔

میں نے آپ کے سامنے اس لیے مثالیں بیان کیں کہ وہ لوگوں کو ایسی باتوں اور الفاظ میں الجھاتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا تھا:

خود تو بدلتے نہیں، مگر قرآن بدل دیتے ہیں

وہ یہ نہیں کرتے کہ اپنے آپ کو قرآن کے مطابق بدلیں، بلکہ وہ قرآن کے احکام کو بدل دیتے ہیں۔

چوتھی مثال:

جیسا کہ ہمارے بعض مولوی معراج کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ پر تشریف لے

گئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور بلندی نصیب فرمائی، یہاں تک جو روایات موجود ہیں ٹھیک ہیں اور اتنا تک بھی روایات کے اندر آتا ہے کہ ایک مقام ایسا بھی آیا کہ وہاں جبرائیل علیہ السلام رک گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کیوں رک گئے ہو؟ اس نے کہا: یارسول اللہ! آسمان میں فرشتوں کے لیے ایک حد ہے، اس سے آگے وہ نہیں جا سکتا۔ میری حد آگئی، اس سے آگے میں بھی نہیں جا سکتا۔

اب بعض مولوی لوگوں کو الجھن میں ڈالنے کے لیے یہاں جوڑ لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور قریب آجا اور قریب آجا اور قریب آجا اور قرآن کی آیت کا جوڑ لگاتے ہیں: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝﴾ [النجم: ۸،۹] کہ حضور اکرم ﷺ اتنے قریب ہو گئے جیسے بھنویں مل جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور قریب آجا۔ تو آپ اور قریب آگئے، پھر عرش پر پہنچ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے محبوب کو سینے سے لگایا، پھر جب جبرئیل علیہ السلام نے اوپر نظر کی تو اوپر بھی آپ تھے اور نیچے بھی آپ تھے۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یارسول اللہ! عجیب بات ہے! ہمیں تو سمجھ نہیں آئی، نیچے بھی آپ عرش پر بھی آپ ہیں۔ آگے عاشق بیٹھے ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں: یہ مولوی ہے جو معرفت کی باتیں کرتا ہے اور یہ وہابی مولوی شریعت والے ہیں ان کو معرفت کا کیا پتہ؟

بعض مولوی کہتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ عرش پر جانے لگے تو حضور اکرم ﷺ نے چاہا کہ میں اپنا جوتا اتار دوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ جوتی کے جوڑے پہن کر عرش پر آجائیں۔ اور پھر وہ مولوی آگے جوڑ لگاتے ہیں کہ ہمارے نبی کی شان دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر جوتے اتروا دیئے اور ہماری مدنی ﷺ کی شان دیکھ کہ عرش پر جوتوں کے ساتھ چلے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے جوتے اتارنے کا حکم تو قرآن میں ہے، عرش پر جوتے سمیت جانے والی آیت کہاں ہے؟ یہ ہمارے تیس پارے والے قرآن میں تو نہیں ہے، البتہ ملنگوں والے چالیس پارے والے قرآن میں ہو تو پتہ نہیں ہے۔

یاد رکھیں! اس آیت: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝﴾ [النجم: ۸،۹] کا تعلق تو میرے اللہ کے ساتھ نہیں، بلکہ وہ جبرئیل علیہ السلام کا قصہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کہا: مجھے اپنی اصل شکل دکھاؤ۔ جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر آپ کا حکم ہے تو میں دکھاتا ہوں، ورنہ آج تک کوئی پیغمبر بھی میری اصلی شکل نہیں دیکھ سکا۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہوئے، اس وقت حضور اکرم ﷺ منیٰ اور مکہ کے راستہ میں کھڑے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پر پھیلائے تو زمین سے

آسمان تک کا سارے کا سارا آفاق بھر گیا" فَأُغْمِيَ عَلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ ''۔رسول اللہ ﷺ پر غشی طاری ہوگئی، آپ ﷺ زمین پر بیٹھ گئے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جلدی جلدی اپنی شکل بدلی اور نیچے اتر کر کہنے لگے: "أَنْتَ رَسُولُ اللهِ وَأَنَا جِبْرَئِيلُ۔ حضور! آپ کیوں پریشان ہو گئے؟ میں جبرئیل ہوں اور آپ رسول اللہ ہیں۔ اور یہی اس آیت کا معنی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے قریب آ گیا، آپ کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور کہا: آپ کیوں پریشان ہو گئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری شکل دیکھ کر مجھ پر غشی طاری ہوگئی، کیا تجھ سے بڑا آسمانوں میں کوئی فرشتہ ہے؟ انہوں نے کہا: حضور! میرے تو چھ سو پر ہیں، اللہ کے ایسے فرشتے بھی ہیں جن کے پانچ پانچ ہزار پر ہیں۔ اہل باطل اس قصہ کو کہاں سے کہاں لے گئے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے قرآن میں اس سے بڑی کوئی تحریف ہوگی؟

خوارج کا رد:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ باطل فرقے چاہتے ہیں کہ ہم جس طرح چاہتے ہیں اس طرح قرآن میں تحریف کر دیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے روایت ہے: ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ ان سے مراد خوارج ہیں؛ کیونکہ خوارج کی یہ عادت تھی کہ وہ قرآن کے الفاظ کی تاویلیں کرتے تھے اور آیات متشابہات کو سامنے رکھنے کے بعد اپنی عقل سے فیصلے کرتے تھے۔

خوارج کے دلوں میں اہل بیت سے اتنی نفرت تھی کہ اگر ان کے خاندان میں کوئی خوبصورت لڑکی ہوتی اور کوئی آدمی اس کو شادی کا پیغام دیتا تو وہ لڑکی یہ شرط رکھتی تھی کہ (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) کی گردن لے آؤ تو میں تم سے نکاح کروں گی۔ اور وہ کہتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو ناراض کرے تو اس نے اللہ کے نبی کو ناراض کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب دوسری شادی کی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ناراض ہو گئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ علی کو کہہ دو: خبردار! دوسری شادی نہ کرے اور بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پر کوئی سوکن نہ لائے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی مخالفت کی اور دوسری شادی کر لی۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی تھی۔

خوارج الزام لگاتے ہیں کہ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جنازہ رات کو اس لیے پڑھایا گیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان پر تشدد کر کے ان کو مار ڈالا تھا، اس لیے رات کو جنازہ پڑھا، تاکہ راز نہ کھل جائے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ شیعہ کدھر

گئے اور خارجی کدھر گئے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اہلسنت والجماعت کا عقیدہ حق ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی برحق ہیں، اہل بیت بھی برحق ہیں اور خلفائے راشدین بھی برحق ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے ایک کو ایک پر شان عطا فرمائی ہے۔
دوسری شادی کرنا شریعت کے اندر منع نہیں تھا، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسری شادی نہیں کی۔ اور جب بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا وفات فرما گئیں، اس کے بعد آپ نے شادی کی ہے تو یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہیں ہے؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بھی یہی تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہوتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسری شادی نہ کریں۔ باقی رات کو جنازہ پڑھنے کی وجہ خود بی بی صاحبہ کی وصیت تھی کہ میرا جنازہ رات کو پڑھنا اور زیادہ لوگوں کو بھی نہ بلانا، تاکہ زیادہ سے زیادہ پردے کے ساتھ قبر میں جاؤں۔ میرے جنازے پر نظر پڑنے سے لوگوں کو میرے قدوقامت کا اندازہ ہو جائے گا، اس لیے بی بی اپنے آپ کو خود اتنا چھپانا چاہتی تھیں۔
مصیبت یہ ہوگئی کہ شیعہ محبت میں اتنے بڑھ گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا بنا دیا اور خوارج اتنے گھٹاتے گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایمان سے بھی باہر نکال دیا۔

خوارج کے آغاز کی تاریخ:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے دین کے اندر نئی باتیں نکالنے والے خوارج کا فتنہ تھا۔ ان کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ غزوۂ حنین کی کامیابی کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو زیادہ دیا اور کسی کو کم دیا۔ ایک آدمی جس کا نام الخویصرہ تھا، اس نے کھڑے ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ''اِعْدِلْ؛ فَإِنَّكَ لَمْ تَعْدِلْ (نعوذ باللہ)'' آپ عدل وانصاف کریں، آپ انصاف نہیں کر رہے ہیں کہ کسی کو زیادہ دے رہے ہیں اور کسی کو آپ تھوڑا دے رہے ہیں۔ جن کا تعلق آپ کے قبیلے سے ہے آپ ان کو زیادہ دے رہے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بدبخت انسان! اگر میں عدل نہیں کروں گا تو کون عدل کرے گا؟ اے بدبخت انسان! اللہ نے مجھے امین بنا کر زمین والوں کے لیے عدل بنا کر بھیجا ہے۔ میرے اللہ نے مجھ پر اعتبار کیا ہے، تم اعتبار نہیں کرتے ہو۔ وہ آدمی یہ بات کہہ کر مڑ گیا۔
ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اور یہ بھی کوئی بعید نہیں ہے کہ دونوں نے یہ بات کہی کہ یارسول اللہ! ہمیں اجازت دیں تو ہم اس بدبخت کی گردن اڑا دیں؟ اللہ کے نبی پر اعتراض کرتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، اس کو مت قتل کرو۔ اس بندے کی جنس

سے ،قوم سے اور قبیلہ سے ایک ایسی قوم نے نکلنا ہے، جب تم ان کی نماز دیکھو گے تو تمہیں اپنی نمازیں حقیر نظر آئیں گی اور جب وہ قرآن پڑھیں گے تو تمہیں اپنا قرآن پڑھا کچھ نظر نہیں آئے گا، لیکن نماز اور قرآن پڑھنے کے باوجود یہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر جانور کے بدن سے نکل جاتا ہے اور اس کو کوئی خون بھی نہیں لگا ہوتا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یاد رکھو! اگر اس زمانہ میں خوارج فتنے کرنے والے ملیں، ان سے قتال کرنا۔ جو ان کو قتل کرے گا اللہ تعالیٰ ان کو بہت بڑا اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔

مفسر ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں: اس قوم کی ابتداء غزوۂ حنین کے موقع پر ہوگئی۔ اور آپ ﷺ کا مال غنیمت کم زیادہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ جب مکہ فتح ہونے پر آیا تو...... ابوسفیان جو حضور اکرم ﷺ کا چچا اور مکہ کا سردار ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو توفیق دی وہ اسلام لے آئے...... حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر آپ ﷺ اس کو عزت اور عظمت نہیں دیں گے تو ایسے لوگ دل سے خوش نہیں ہوتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فوراً اعلان فرمایا تھا کہ لوگو! جو آدمی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کو امان ہے۔ تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ خوش ہوگئے کہ اسلام نے مجھے عزت دی۔

پھر یہ خوارج کا فتنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ظاہر ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ نہروان میں جنگ لڑی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فتح عطا فرمائی۔ پھر اسی خوارج سے لڑیاں پھوٹیں، کئی جماعتیں بن گئیں اور یہ وہی بات ہوگئی جیسا کہ میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا کہ پہلی امتیں بہتر (۷۲) فرقے بنی ہیں، میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور سب کے سب جہنمی ہوں گے، جنت والے صرف وہ ہوں گے جو میرے اور میرے صحابہ کے راستے پر ہیں۔

ایک موٹی بات یاد رکھ لیں کہ اگر آپ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض کرتے ہیں تو سمجھ لیں کہ آپ نجات پانے والوں میں نہیں ہیں۔ اگر آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کو حجت نہیں مانتے اور ان کے قول پر اعتماد نہیں کرتے تو سمجھ لیں کہ جہنمی ٹولے میں ہیں۔ اگر آپ حضور اکرم ﷺ کی سنت پر نہیں چلتے تو سمجھ لیں کہ پٹڑی سے ہٹے ہوئے ہیں۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری امت سے کچھ ایسے لوگ بھی آئیں گے، ایسا ایسا قرآن پڑھیں گے، ایسا ایسا کاٹیں گے جیسے سبزیوں کو کاٹا جاتا ہے، یعنی تیز تیز قرآن پڑھیں گے اور اس کی ایسی تاویلیں کریں گے اور ایسے ترجمے کریں گے جو قرآن کے حکم کے خلاف ہوں گے۔

(حدیث) حضرت ابو مالک الاشعری رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا کہ میں اپنی امت پر ان تین چیزوں کے بارے میں خوف کھاتا ہوں: 1 ...... ایک یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ مال زیادہ دیں گے، دولت عام ہوجائے گی، حسد عام بنے گا اور پھر ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔ 2 ...... دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر کتاب کھولیں گے تو وہ اس میں تاویل میں پڑ جائیں گے۔ 3 ...... تیسرا اللہ تعالیٰ ان کو علم میں زیاتی دیں گے، وہ اس کو ضائع کر دیں گے۔ ایسا نہیں کریں گے کہ سوال کر کے اپنے علم کو پختہ کرلیں۔ سند کے اعتبار سے اس میں غرابت پائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن ایسا تو نہیں اتارا کہ ایک آیت دوسری آیت کو جھٹلائے (بلکہ قرآن تو ایک دوسرے کی تفسیر کرتا ہے) جو بات تم کو سمجھ آئے اس کو تھام لو، یعنی اس پر عمل کرو اور اگر کوئی بات تم پر متشابہ ہوجائے تو اس پر ایمان لے آؤ کہ ہمارے اللہ کا حکم ہے اور ہماری عقل ناقص ہے، اس لیے ہمیں سمجھ نہیں آرہا، ورنہ اللہ تعالیٰ کا حکم حق ہے۔ اور اس کو کسی اہل علم کے پاس لے جاؤ، تاکہ وہ تمہاری مشکل حل کر سکے۔ یہ نہ ہو کہ اپنی طرف سے غلط تاویلیں کر کے اللہ کے قرآن کے معانی بدل ڈالو۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ⑩ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪﴾ [آل عمران: ۱۰، ۱۱]

"جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کو ان کے اموال اور ان کی اولاد اللہ کے سامنے ہرگز کچھ کام نہ آئیں گے۔ اور وہی دوزخ کے ایندھن ہیں۔ ان کی عادت آلِ فرعون کی طرح ہے اور ان کی طرح جو ان سے پہلے تھے (جیسے عاد و ثمود)۔ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، پھر ان کو اللہ نے ان کے گناہوں پر پکڑا اور اللہ کی مار سخت ہے۔"

نجران کے وفد کے فرد کا واقعہ:

وفدِ نجران کے بارے میں تو آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، ان کے ضمن میں ایک واقعہ آتا ہے کہ جب وہ نجران سے

آ رہے تھے۔ ابوالحارثہ جو بڑا عالم تھا اس کا ایک بھائی تھا جس کا نام قرض بن علقمہ تھا۔ اس کے جانور کو ٹھوکر لگی، وہ گرا تو قرض بن علقمہ نے کہا کہ جو دردو والا ہے اللہ اس کو ہلاک کرے، یعنی اس کا مقصد حضور اکرم ﷺ تھے۔ اس کے بھائی ابوالحارثہ نے کہا: کس کو کہہ رہے ہو کہ ہلاک ہوجائے؟ اس نے کہا: نبی کو کہہ رہا ہوں۔ اس نے کہا: عجیب بات ہے! تم اللہ کے نبی کو کہہ رہے ہو؟ تم ہلاک ہوجاؤ۔ تم نہیں جانتے کہ وہ تو ایسے نبی ہیں جن کی آنے کی بشارت خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی ہے۔ اور کتاب میں ہے کہ وہ اللہ کا سچا نبی ہے، وہ اللہ کا آخری نبی ہے۔ تو قرض بن علقمہ نے کہا: اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ اللہ کا سچا نبی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی بشارت دی ہے تو پھر تمہارے ایمان لانے میں کیا رکاوٹ ہے؟ اس نے کہا: تم جانتے ہو کہ ہمارے بادشاہ...... جنہوں نے ہمیں اتنا پیسہ دیا ہے، اتنی مال و دولت اور بڑے بڑے محلات دیئے ہیں...... اگر ہم نے اللہ کے نبی کا کلمہ پڑھ لیا تو یہ مخالف ہوجائیں گے اور ہمارے سارے مرتبے اور ساری مال و دولت چھن جائے گی۔

مولوی بھی اسی وجہ سے پٹڑی سے اترتا ہے کہ پیٹ کی جہنم کو بھرنے کے لیے کبھی حلوہ مار لیتا ہے، کبھی پیسہ مار لیتا ہے اور کبھی کرسی مار لیتا ہے۔ اور جنہوں نے ان چیزوں پر قابو پالیا وہ سیدھے راستے سے ہٹ نہیں سکے۔ اس لیے علامہ اقبال نے کہا تھا:

؎ اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اگر پہچانے تو تیرے در کے گدا دارؔ و جم

جس نے اپنے رب کو پہچان لیا ہے تو پھر بادشاہ اور بڑے سے بڑے لوگ بھی آ کر اس کے دروازے پر بھیک مانگتے ہیں اور جو اپنے آپ کو اللہ کے دروازے سے ہٹا لیتا ہے تو وہ دنیا کے سرداروں کا محتاج ہوجاتا ہے۔

بہرحال قرض بن علقمہ کہتے ہیں کہ میں نے اسی وقت دل میں کہا: اے اللہ! مجھے تیری قسم! اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے اسلام لانے سے نہیں روک سکتی۔ کہتے ہیں: میں نے اسی وقت اس وفد کو چھوڑ دیا کہ یہ جھوٹوں اور گمراہوں کا وفد ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پیغمبر اور خاتم الانبیاء ہیں اور پھر ایمان نہیں لاتے ہیں۔

آج بھی دیکھ لو کہ مولوی کہتا ہے: قرآن اور اسلام کے بغیر دنیا میں امن نہیں ہوسکتا، لیکن ان کے گھروں میں جھانک کر دیکھو تو اسلام نہیں ہے۔ ان کے اپنے کردار پر نظر ڈال کر دیکھو! کیا اسلام نافذ ہے؟ ان کے جلسوں پر نظر ڈال کر دیکھو! کیا اسلام نافذ ہے؟ یہ ساری دنیا کے وہ طور طریقے ہیں جو غلط قسم کے آدمی اپناتے ہیں اور ادھر اسلام

کا بھی نعرہ ہوتا ہے۔ یہی سب سے بڑا نفاق ہے۔

قرض بن علقمہ کہتے ہیں: میں نے اپنا گھوڑا دوڑایا اور وفد سے ہٹ گیا اور وفد کے آنے سے پہلے میں نے حضور اکرم ﷺ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کلمہ پڑھ لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ارشاد فرمایا کہ ان کو فرمادیں کہ ان کو نہ مال فائدہ پہنچائے گا، نہ اولاد پہنچائے گی، نہ دولت فائدہ پہنچائے گی اور نہ ان کو کوئی نفع ہوگا، بلکہ یہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ان کو پتہ نہیں ہے کہ ان سے پہلے فرعون اور آلِ فرعون نے کیا کیا تھا؟ قوم عاد اور قوم ثمود نے کیا کیا تھا؟ انہوں نے بھی جب ہماری آیات اور ہمارے رسولوں کو جھٹلایا تو ان کو ہم نے عذاب میں پکڑ لیا۔ اے میرے نبی! اگر آپ کی قوم، آپ کے ماننے والے اور آپ کے زمانے میں رہنے والے آپ کی تکذیب کریں گے تو ان کا انجام بھی ہلاکت ہوگا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ اور جب وہ پکڑنے پر آتے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت چھڑا نہیں سکتی۔

کفار کو مال واولاد فائدہ نہ دے گی:

ان آیات میں مفسرین نے ایک مسئلہ استنباط کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو کافر ہیں ان کو ان کے مال واولاد نفع نہیں پہنچائیں گے۔ کافر یہ دعویٰ کرتے تھے: ﴿نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ۝﴾ [السبا:۳۵] ہمارے پاس اتنا مال و دولت ہے کہ ہمیں عذاب نہیں دیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہارا مال و دولت تمہارے کام نہیں آئے گا۔ علماء نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن کافروں کو تو مال و دولت فائدہ نہیں پہنچائے گا، لیکن مسلمانوں کو مال اور اولاد فائدہ پہنچائے گی؛ اس لیے کہ حدیث میں آتا ہے کہ جس بندے کا بچہ یا بچی پیدا ہوئی اور وہ مرگئی، اس آدمی نے صبر کیا تو وہ اولاد قیامت والے دن اپنے والدین کی شفاعت کرے گی۔ اسی طریقے سے جو مسلمان صدقات وخیرات کرے ایک ایک پیسے کا اجر ملے گا۔

مسلمانوں کو ماں، باپ اور اولاد سے فائدہ پہنچے گا:

جیسے اولاد نفع دے گی اسی طرح والدین بھی نفع دیں گے۔ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جب ایک بندہ جنت میں پہنچ جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کرے گا کہ یا اللہ! تیری رحمت سے تو میں جنت میں آگیا، میری اولاد نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تیری اولاد کو بھی ہم نے معاف کردیا ہے، وہ بھی جنت میں ہیں،

لیکن تیرا رتبہ اور مقام بہت اعلیٰ ہے، وہ اس مقام پر نہیں پہنچے۔ وہ بندہ کہے گا: اے اللہ! میں نے دنیا میں عمل کیے تھے تو میں اولاد کے لیے بھی تو ساتھ ساتھ دعائیں مانگتا تھا۔ آپ مہربانی کریں! جنت کے اندر میں اپنی اولاد سے ایک جگہ جدا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم ان کی اولادوں کو بھی والدین کے مرتبہ پر بھیج دیں گے۔ ﴿يَوْمَ لَا يَنفَعُ الظَّٰلِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ ۖ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوٓءُ الدَّارِ﴾ [المؤمن: ۵۲] قیامت کے دن کافر معذرت کریں گے کہ ہم نے واقعی بڑا ظلم کیا ہے، ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیں۔ لیکن جب دنیا ختم تو سب کچھ ختم ہے اور ان کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ کافروں کے لیے لعنت ہے، اللہ کی رحمت سے دور کر دیے جائیں گے۔

زکوٰۃ دینے والے لوگوں کی حکایت:

حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی کو بھیجا کہ فلاں علاقہ میں جا کر زکوٰۃ لے آؤ۔ وہ صحابی ایک آدمی کے پاس پہنچے کہ مجھے حضور اکرم ﷺ نے بھیجا ہے، میں عاملِ زکوٰۃ ہوں۔ وہ اس صحابی کو اپنے ساتھ لے آیا اور اعلیٰ سے اعلیٰ چن کر بکریاں نکالیں۔ اس صحابی نے کہا: میں عاملِ زکوٰۃ ہوں، مجھے یہ حکم نہیں کہ جو سب سے زیادہ اچھی بکریاں ہوں مالِ زکوٰۃ میں لوں، بلکہ شریعت میں حکم یہ ہے کہ درمیانہ مال لو۔ دوسرے صحابی نے کہا: میں خود لے آیا ہوں، آپ نے تو نہیں کہا تھا۔ میں اللہ کے راستہ میں دے رہا ہوں، اس لیے میں اعلیٰ سے اعلیٰ مال دوں گا۔

پھر وہ صحابی دوسرے آدمی کے پاس زکوٰۃ لینے کے لیے گئے، اس نے کہا: زکوٰۃ بھی تو ایک ٹیکس ہے، ہر سال لینے کے لیے آجاتے ہو۔ آج میں فارغ نہیں ہوں، کل آنا ہے۔ پھر گئے تو اس نے کہا: آج مجھے بڑی مصروفیت ہے، کل آنا۔ جب اگلے دن اس کے پاس گئے تو وہ مال جو مرنے کے قریب تھا زکوٰۃ کے اندر دیا۔ اس صحابی نے کہا: یہ بکریاں تو مدینہ تک بھی نہیں پہنچ سکیں گی اور میں ان کو زکوٰۃ کے اندر لے لوں؟ اس نے کہا: یہی مال ہے۔ لینا ہے تو لے لو، اگر نہیں لینا تو نہ لو۔ وہ صحابی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان دونوں کا قصہ سنایا۔ جس نے مال عمدہ دیا تھا اس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ! اس کا مال تھوڑا کر دے اور جس نے گھٹیا مال دیا تھا اس کے بارے میں آپ نے فرمایا: اللہ! اس کا مال زیادہ کر دے۔ تو وہ صحابی پریشان ہو گئے!! لیکن چپ کر گئے۔ اللہ کے نبی کے سامنے کون بول سکتا ہے؟ اس کے اندر ضرور حکمت ہوگی۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا مال جب بڑھ گیا تو وہ بستی کے اندر نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے وہ بستی سے باہر چلا گیا۔ جب مال اور زیادہ ہو گیا تو وہ اور دور چلا گیا۔ پھر مال اور زیادہ ہو گیا تو وہ اور دور چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مدینہ سے محروم ہو گیا اور

اپنے مال میں کھو گیا۔

آخیر زمانہ کے لوگوں کے متعلق حدیث:

حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم مکہ شریف میں تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات اٹھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا اللہ! میں نے تیری توحید کی دعوت پہنچا دی، تیری توحید کی دعوت پہنچا دی، تیری توحید کی دعوت پہنچا دی۔ جب آپ نے تین دفعہ فرمایا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آواز دے کر کہا: یا رسول اللہ! آپ نے واقعی اللہ کی دعوت پہنچا دی ہے۔ جب صبح ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ پاک اسلام کو غالب کریں گے اور کفر اپنے ٹھکانوں پر چلا جائے گا اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہمت دیں گے کہ وہ دریاؤں کو عبور کر کے اسلام پھیلائیں گے۔ اس کے بعد لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ قرآن پڑھیں گے اور پڑھائیں گے اور کہیں گے: کون زیادہ بہتر ہے؟ وہ زیادہ بہتر ہے یا ہم بہتر ہیں؟ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہی جہنم کا ایندھن ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت آئے گا اسلام غالب ہو جائے گا۔ پھر کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو قرآن پڑھیں گے اور پڑھائیں گے، لیکن آیات متشابہات کو لے کر الجھ جائیں گے اور محکمات کو چھوڑ دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ راستے سے بھٹک جائیں گے اور وقود النار ہو جائیں گے۔

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝١٢ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝١٣﴾ [آل عمران: ۱۲، ۱۳]

''ان (یہودی) لوگوں سے کہہ دیجیے جنہوں نے کفر کیا کہ اب تم مغلوب ہو گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔ تمہارے لیے ان دو فوجوں میں نمونہ ہے، جن میں (جنگ بدر میں) مقابلہ ہوا۔ ایک فوج اللہ کی راہ میں لڑ رہی تھی اور دوسری کافر تھی۔ یہ (کافر) کھلی آنکھوں سے ان (مسلمانوں) کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔ اور اللہ قوت دیتا ہے اپنی مدد سے جس کو چاہتا ہے۔ دیکھنے والوں کے لیے اس میں عبرت ہے۔''

کافر مغلوب ہوں گے اسلام فتح یاب ہوگا:

اے میرے مدنی! ان کافروں سے کہہ دیں کہ تم نے مغلوب ہو جانا ہے، اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا۔ چاہے کفر کتنا زور دکھا دے، لیکن باطل آخر باطل ہوتا ہے اور حق حق ہوتا ہے۔ اور صرف یہ نہیں کہ تم دنیا میں مغلوب ہو جاؤ گے، بلکہ تم دنیا میں بھی مٹ جاؤ گے اور تمہارا حشر جہنم کی طرف ہوگا؛ کیونکہ جو کفر پر مرے گا تو مرنے کے بعد ہی اس کا معاملہ جہنم والا ہو گیا اور جس کو جہنم ملی تو وہ کتنی بری جگہ ہے؟ کافروں کا مغلوب ہونا حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں بھی ہو گیا۔ نصاریٰ بھی مغلوب ہو گئے، یہود بھی مغلوب ہو گئے اور قریشِ مکہ بھی مغلوب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو غالب کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو فتح عطا فرمادی اور پوری دنیا میں اسلام کا پرچم لہرا گیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ کے دین کو یوں پھیلایا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بائیس لاکھ مربع میل پر اسلام کے جھنڈے لگ گئے۔ لیکن یاد رکھیں! اصل میں غلبہ ایک دفعہ پھر قیامت سے پہلے آئے گا۔ اور وہ دور آنے والا ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود آسمانوں سے اتریں گے تو چرچ اور گرجے ویران ہو جائیں گے، صلیب کو توڑ دیں گے، یعنی کفر کی قوت ٹوٹ جائے گی، خنازیر قتل کر دیں گے، دجال کے فتنہ کو نیست و نابود کر دیں گے، پوری دنیا میں عدل ہو جائے گا اور اسلام کا غلبہ ہو جائے گا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ رہیں گے، ان کی شادی ہوگی، ان پر موت آئے گی اور حضور اکرم ﷺ کی قبر کے ساتھ ان کی قبر بنے گی۔

﴿وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ﴾ حشر کا دن وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اوّلین و آخرین کو اکٹھا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو فرمایا: تمہارا حشر جہنم کی طرف ہوگا۔

﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ ''مِهَاد'' ''مَهْد'' کی جمع ہے۔ ''مَهْد'' اس جھولے کو کہتے ہیں جس میں بچہ جھولتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے کافرو! تم نے میرے مہد والے نبی کا انکار کیا، اس کے کلام کو توحید کے بجائے شرک میں بدل ڈالا تو ہم نے بھی تمہارا بچھونا جہنم میں بچھا دیا۔

کافر اتنی طاقت کے باوجود کیسے مغلوب ہوں گے؟

دماغ کے اندر یہ بات آتی ہے کہ یہ کفار کیسے مغلوب ہو جائیں گے؟ حالانکہ ان کے پاس اتنی بڑی ٹیکنالوجی ہے، خلاؤں میں اسٹیشن بنا لیے ہیں اور ان کے پاس الیکٹرانک میڈیا ہے، لیکن اسلام کے پاس کیا ہے؟ اللہ تبارک

وتعالیٰ نے اگلی آیت مبارکہ کے اندر اس کی مثال دی ہے۔ فرمایا ہے: ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾﴾ اے اعتراض کرنے والو! ہم نے تمہارے لیے ایک نشانی رکھی ہے۔ یاد کرو جب دو جماعتیں ٹکرا گئی تھیں: ایک جماعت وہ تھی جو اللہ کے لیے لڑنے والے تھے اور دوسری جماعت وہ کافروں کی تھی۔ ان دونوں کی حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کے تین سو تیرہ افراد تھے، تلواریں بھی نہیں تھیں، جدید سامان بھی نہیں تھا، بلکہ اکثر کے پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔ صحابہ ﷺ نے عرض کیا تھا: اے اللہ کے رسول! ہمارے پاس تو تلوار بھی نہیں۔ فرمایا: کھجور کا گوشہ کاٹ کر لے آؤ۔

اس لیے کفر کی اعانت میں آ کر مسلمانوں کو کمزور سمجھنے والوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی ان آیات میں غور کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب وہ دونوں جماعتیں اکٹھی ہو گئیں تو ہم نے کافروں کو یہ دکھایا کہ مسلمان ہم سے دوگنا ہیں، حالانکہ تین سو تیرہ تھے، لیکن چھ سو چھبیس نظر آتے تھے۔

دوسری آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب دونوں جماعتیں ملنے والی تھیں تو کافروں کو یہ دکھایا کہ مسلمان تو بالکل تھوڑے سے ہی ہیں، یعنی تین سو تیرہ سے بھی کم کر کے دکھائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی کافر کم کر کے دکھائے اور یہاں ہے کہ دوگنا کر کے دکھایا تو بظاہر آیات میں تناقض ہے۔ علماء نے اس کا جواب دیا ہے کہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ جب دونوں جماعتیں ابتداء میں آئیں تو اللہ پاک نے مسلمانوں کی نظر میں کافروں کو تھوڑا کر دیا اور کافروں کی نظر میں مسلمانوں کو تھوڑا کر دیا، تاکہ آج ٹکراؤ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دیں؛ کیونکہ اگر کافروں کو مسلمان ابتداء کے اندر زیادہ کر کے دکھائے جاتے تو وہ بھاگ جاتے اور شاید نہ لڑتے۔ اور مسلمانوں کو اگر پتہ چل جاتا کہ وہ دو ہزار ہیں تو وہ گھبرا جاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو گھٹا کر دکھایا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تین سو تیرہ کے چھ سو چھبیس دکھائے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بھینگے آدمی کو ہم ایک کے دو دکھا سکتے ہیں اور ان کافروں کو دوگنا کر کے دکھا دیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ تو پہلے ہی اندھے ہیں کہ ایک خدا کے تین خدا بنا رکھے ہیں۔

اللہ پاک نے کافروں کو مسلمان دوگنا کر کے دکھائے؛ کیونکہ فرشتے بھی آسمان سے ان کی مدد کے لیے اتر آئے تھے، جو انسانی لباس کے اندر تھے۔ ﴿وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ اگر اللہ اس چھوٹی جماعت کو کفار پر غالب

کر سکتے ہیں تو اب بھی اللہ ہم کمزور مسلمانوں کو کفر پر غالب کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے قرآن کے ان واقعات میں عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو آنکھوں والے ہیں۔ اور جو اندھے بن گئے کہ نصرانیت میں پڑ گئے، یہودیت میں پڑ گئے اور بدعات میں پڑ گئے ان کو قرآن سمجھ نہیں آتا، جب تک کہ دل کی آنکھیں نہ کھلیں۔

یہود کی شکست کی پیش گوئی:

محمد بن اسحاق نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو بدر میں فتح عطا فرمائی (کہ کافروں کے ستر سردار مارے گئے اور ستر قید ہوئے) اور آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو آپ ﷺ نے یہود کو بنو قینقاع کے بازار میں جمع کیا اور فرمایا: اے یہود! تم بھی اسلام لے آؤ، اس سے پہلے کہ تم پر بھی اسی طرح عذاب آئے جیسا کہ قریش پر نازل ہوا۔ لیکن یہود کہنے لگے: آپ اپنے نفس کو دھوکہ میں نہ ڈالیں کہ آپ نے قریش کے چند ایسے لوگوں کو قتل کر دیا جو ناتجربہ کار لوگ تھے۔ آپ نے ابھی تک ہم سے قتال نہیں کیا۔ وہ تو قتال نہیں جانتے تھے۔ اگر آپ نے ہم سے جنگ لڑی تو آپ کو پتہ چلے گا کہ کیسے جنگ لڑتے ہیں؟ ہم جنگجو لوگ ہیں اور تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم جیسے لوگوں سے کبھی آپ کا ٹاکرا نہیں ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا: ﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ﴾ اے میرے مدنی! آپ ان کو بتا دیں کہ عنقریب تمہیں بھی شکست ہونے والی ہے، تم بھی مغلوب ہو جاؤ گے اور ذلیل کر کے مدینہ سے نکالے جاؤ گے اور پھر جزیرۃ العرب سے بھی نکالے جاؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں ہی یہ کامیابی دے دی اور اللہ تعالیٰ نے یہود کو شکست سے دوچار کیا۔ وہ خیبر میں آ گئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا۔

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا ؕ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے یہودیو! اس واقعہ بدر میں تمہارے لیے بہت بڑی نشانی ہے اور اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو عزت اور غلبہ دیں گے، اللہ تعالیٰ اپنے رسول پاک کی مدد فرمائیں گے۔ تمہیں اس واقعہ سے عبرت پکڑنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تین سو تیرہ کو غالب کر دیا۔

روافض کا شبہ اور جواب:

اس آیت مبارکہ سے روافض اور شیعہ تہمت لگاتے ہیں کہ جنگِ بدر میں تو اصل میں صحابہ رضی اللہ عنہم ایک قافلہ لوٹنے

کے لیے گئے تھے، وہ قافلہ نکل گیا اور کفار کے لشکر سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس سے زیادہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس طرح ......نعوذ باللہ...... وہ اس واقعہ کی عظمت کو کم کرتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ جب مدینہ منورہ سے مسلمان نکلے تھے یہی بات تھی، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔ اور وہ ابوسفیان کا قافلہ نکل گیا تو مسلمانوں کو بھی پتہ چل گیا کہ قافلہ نکل گیا ہے، اب ہم اس کو نہیں پکڑ سکتے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت مبارکہ کے اندر مسلمانوں کی گواہی دے رہے ہیں: ﴿تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ کہ مسلمانوں کی جماعت اللہ کے لیے لڑ رہی تھی اور ان کے مقابلہ پر لڑنے والے کافر تھے۔

مسلمانوں اور کافروں کی تعداد میں شبہ اور جواب:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس واقعہ میں ایک اشکال آتا ہے کہ اگر کافروں کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد دوگنا تھی تو یہ واقعہ بھی بعد کے قصہ میں موجود ہے کہ مشرکین نے عمرو بن سعد کو بھیجا کہ تم جا کر مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ لگاؤ کہ مسلمانوں کا عدد کتنا ہے؟ عمرو بن سعد نے آکر کہا کہ مسلمان تین سو ہیں یا تین سو سے کچھ زیادہ ہیں یا تین سو سے کچھ تھوڑے ہیں۔ اور ان کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا تو پھر دوگنا دکھانے کا کیا مطلب ہے؟ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے آدمی بھیجے کہ مشرکین مکہ کی تعداد کا اندازہ لگاؤ، لیکن مسلمانوں کو صحیح اندازہ نہ لگ سکا اور مشرکین کے جو اونٹ چرانے والے ملازم تھے وہ کچھ پکڑے گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو میرے پاس لے آؤ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہم فلاں سردار کے ملازم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور چھوڑ دیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے لشکر کے لیے روزانہ کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں؟ انہوں نے کہا: دس اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دشمنوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ اور حکم فرمایا کہ ان کو چھوڑ دو۔ اب دونوں لشکروں کی تعداد کا اندازہ ہوگیا تھا۔

یاد رکھیں کہ جنگ بدر کوئی منٹوں سیکنڈوں میں نہیں ہوگئی، بلکہ اس میں کئی دن لگے ہیں۔ اس لیے ایک وقت تو دونوں کو صحیح اندازہ ہوگیا، لیکن جب صفیں بنیں اور اللہ کے فرشتے اترے تو تعداد دوگنا نظر آنے لگی۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بعد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: عجیب بات ہے کہ جب ہم کافروں سے لڑ رہے تھے تو ہم تلوار یا چھڑی کا اشارہ کرتے تھے، ادھر ان کی گردن کٹ جاتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اللہ کے فرشتے لڑ رہے تھے۔ تو اب

کوئی اشکال نہیں رہا ہے کہ کافروں کی تعداد ایک ہزار اور مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی، لیکن جب صفیں آمنے سامنے ہوگئیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی نصرت کے لیے آسمان سے فرشتوں کو اتارا اور فرشتوں نے باقاعدہ قتال میں حصہ لیا۔

رب مسلمانوں کی مدد کیوں نہیں کرتے؟

اگر کوئی غزوۂ بدر اور غزوۂ احد کا مطالعہ کرے اور سوچے کہ آج مدرسوں والے، مساجد والے اور دین والے سب رو رہے ہیں، لیکن مدد کیوں نہیں آتی؟ اور پورے عالم پر نظر دوڑائیں تو ہر جگہ مسلمانوں کا خون بہتا ہوا نظر آئے گا اور کوئی جتنا اسلام پر پابند ہے وہ اتنا تکلیف میں ہے۔

دیکھیں! غزوۂ احد میں صحابہ سے ایک اجتہادی غلطی ہوئی، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے، ان کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک زخمی ہوگئے اور آپ کے کپڑے تر بتر ہوگئے۔ صرف ایک غلطی کا یہ نتیجہ تھا تو خود سمجھیں کہ ایک غلطی ہو، نبی خود بھی کھڑا ہو، اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتا اور ہم سارا دن غلطیاں کریں اور پھر کہیں: اللہ کی مدد آجائے تو اللہ تعالیٰ کی مدد کیسے آئے گی؟

آج بھی اگر ہم اللہ کے دروازے پر گر جائیں اور توبہ کریں تو دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت آتی ہے یا نہیں آتی ہے۔

ایک معمولی سی مثال سمجھ لیں کہ ایک آدمی کو آپ سارا دن گالیاں دو اور شام کو اس کے دروازے پر کہو کہ مہربانی کر کے مجھے ایک ریال دے دیں۔ وہ کہے گا: جو کچھ تو نے کیا ہے اس کے بارے میں تو سوچو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر بڑے ادب سے کھڑے ہو کر الصلوۃ والسلام پڑھ رہے ہوتے ہیں اور کراما کاتبین کہہ رہے ہوتے ہیں: حیا تو نہیں آتی، ابھی تم داڑھی کٹا کر آرہے ہو!!

یاد رکھیں! جب تک ہم حضور کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح غلامی اختیار نہیں کریں گے کامیابی نہیں ملے گی اور ہمیں عذاب سے نجات نہیں مل سکتی۔ نجات کا ایک راستہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر کبھی عذاب نازل نہیں کیا، مگر ان کے گناہوں کی وجہ سے۔ اور وہ مصیبت اس وقت ختم ہوگی جب مسلمان صحیح معنی کے اندر اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں گے۔

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾﴾

[آلِ عمران:۱۴،۱۵]

”فریفتہ کیا ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے، جیسے: عورتیں، بیٹے، سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے (سواریاں) اور مویشی اور کھیتی۔ یہ سامان ہے دنیا کی زندگی کا اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔ کہہ دیجیے: کیا میں تمہیں ان سے بہتر کی خبر دوں؟ پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور بیویاں ہیں پاک صاف اور اللہ کی بہت رضا حاصل ہوگی اور اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے بندے۔“

مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر بیان فرمایا ہے کہ لوگوں کے گمراہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی شہوات میں پڑ گئے اور دنیا کی لذات میں کھو گئے۔ چونکہ سب سے بڑا فتنہ عورتوں کا فتنہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عورتوں کے فتنے کا ذکر فرمایا ہے۔

لوگ اس طرح شہوات ولذات میں کھو گئے کہ اللہ تعالیٰ کو بھول گئے، دین اسلام کو بھی بھول گئے اور جذبہ جہاد کو بھی بھول گئے۔ اب ان کی زندگی کا مقصد کھانا، پینا، مکان ہو، گاڑی ہو اور بیوی ہو۔ اس وجہ سے مسلمان آج ہر جگہ ذلیل ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس دن مسلمان کے دل میں دنیا کی محبت داخل ہوگئی اور موت سے نفرت آگئی تو مسلمان ذلیل ہو جائے گا۔

آج دیکھ! مسلمان موت سے گھبرایا ہوا ہے۔ بڑے آدمی کو معمولی سا نزلہ ہو جائے تو دس لاکھ روپے خرچ کر کے یورپ میں علاج کروانے کے لیے جاتے ہیں، تاکہ بیماری زیادہ نہ ہو جائے۔ حالانکہ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ جو یورپ

میں رہتے ہیں کیا وہ نہیں مرتے؟ وہاں کوئی ڈاکٹر اوپر سے نہیں اترتے ہیں۔ وہاں بھی یہ عالم ہے کہ بعض ڈاکٹروں نے آپریشن کیا تو اپنے آلات مریض کے پیٹ میں بھول گئے اور کورٹ کے اندر مقدمات چلے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر اتنی شفا دینی ہوتی تو وہ غریبوں کے گھر میں بھی ہو جاتی ہے۔ معمولی سے ڈاکٹر کی دوائی لکھ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس میں بھی شفا عطا فرماتے ہیں۔ لیکن امیر باہر علاج کروانے جاتا ہے؛ کیونکہ زندگی سے محبت اور موت سے نفرت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کو لاکھ دے دیا تو راضی نہیں ہے، وہ کہتا ہے: دو لاکھ ہو جائیں۔ دو لاکھ مل جائیں پھر بھی راضی نہیں ہے، کہتا ہے: ایک مربع زمین مل جائے، آرام سے بیٹھ کر حلال کھائیں گے۔ جب ایک مربع زمین مل گئی تو کہتا ہے: اس سے کیا بنتا ہے؟ ٹریکٹر خرید لیں اور کم سے کم دو مربع تو ہونی چاہیے۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: دو حریص ایسے ہیں جن کا پیٹ نہیں بھرتا ہے: ایک دنیا کا حریص ہے اور دوسرا علم کا حریص ہے۔

عورتوں کا فتنہ:

صحیح حدیث کے اندر ہے: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ'' (میں اپنی امت پر جو سب سے خطرناک فتنہ چھوڑ کر جا رہا ہوں یعنی جس کا مجھے ڈر ہے وہ عورتوں کا فتنہ ہے)۔

مردوں میں اگر کوئی مسلمان بطور فتنہ نہیں، بلکہ اس لیے نکاح کرتا ہے، تاکہ میں گناہوں سے پاک رہوں اور اللہ تعالیٰ مجھے اولاد زیادہ دے، میری اولاد صالح بنے اور حضور اکرم ﷺ کی امت میں کثرت ہو تو ٹھیک ہے۔

یاد رکھیں! چیز ایک ہوتی ہے، مثلاً: مردانہ قوت ہے۔ اگر اس کو حلال میں استعمال کریں تو عبادت ہے اور اگر اس کو حرام میں استعمال کرے گا تو جہنم ہے۔

علماء نے احادیث کی روشنی میں لکھا ہے: اگر میاں بیوی آپس میں پیار محبت کرتے ہیں، نفل پڑھنے سے زیادہ ثواب ہے؛ کیونکہ نفلی عبادت میں ثواب زیادہ ملے گا اور یہاں گناہ سے بچ رہا ہے؛ کیونکہ جب میاں بیوی دونوں خوش ہوں گے تو دونوں کی نظر پاک رہے گی، نہ وہ حرام پر نظر ڈالے گا اور نہ وہ حرام پر نظر ڈالے گی۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو عورت سنگھار کر کے، اچھے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر اپنے خاوند کے انتظار میں گھر بیٹھی ہے، اس کو اللہ تعالیٰ اس مجاہد کا ثواب دیتے ہیں جو ساری رات سرحد پر کھڑا ہو کر پہرہ دیتا ہے۔ کہ وہ مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت کر رہا ہے اور یہ عورت اپنے خاوند کے ایمان کی حفاظت کر رہی ہے۔ اور ایمان جان

سے زیادہ مقدم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حلال سے منع نہیں کیا ہے۔ آپ اچھا گھر رکھیں، اچھا کھائیں، اچھا پہنیں، اچھا لباس اختیار کریں اور شادی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قوت دی ہے تو دو شادیاں کرے، تین کریں۔ اسلام صرف پابندی لگاتا ہے کہ حرام نہ کرو، دوسرے کی بہو بیٹی پر اپنی نظریں نہ گاڑو، ہمسائے کی بیٹیوں پر نظر نہ گاڑو اور اگر میاں بیوی کی نہیں بنی تو طلاق دے کر اور شادی کر لو۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ حلال کو بند رکھو، ہم حرام کھائیں گے۔ یہ کتوں کی زندگی ہے۔ اس کو بھی تم جتنا کرسی پر بٹھاؤ، پلیٹوں میں کھلاؤ کھائے گا اور کوڑے پر گوشت پھینک دو تو جا کر کھائے گا، اس کی فطرت میں گندگی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جن پرندوں کی زندگی پھولوں کے ساتھ معلق رکھی ہے، مجال ہے وہ پھولوں کے بغیر کہیں بیٹھ جائیں۔

اسلام ایک عادلانہ نظام حیات ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ پابندی لگا رہا ہے کہ غیر عورت کو نہ دیکھو، زنا نہ کرو اور یہ بھی پابندی لگائی ہے کہ نکاح بھی نہ کرو۔ بندہ تو چاہتا ہے کہ میری بیوی ہو، میں خوش رہوں اور مجھے بھی سکون ملے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو مرد ہنستے ہوئے داخل ہو اور بیوی مسکراتے ہوئے استقبال کرے اللہ دونوں کے درجات بلند فرما دیتے ہیں؛ کیونکہ جب اس طرح معاملہ ہو گیا تو دونوں حرام سے بچیں گے اور اگر دونوں پولیس کی وردی پہن کر گھر میں داخل ہوں، جیسا کہ آج کل آدمی باہر دوستوں کے ساتھ حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آتا ہے، لیکن گھر میں آئے گا تو معلوم ہوگا کہ وردی میں بیٹھا ہوا ہے۔ اسی طرح عورت جب شادی پر جائے اور ہمسائے کے گھر میں جائے تو میک اپ سنگھار کرے اور جب خاوند گھر میں آئے تو معلوم ہوگا کہ اس کو ایک سو کا بخار ہے۔ یہ لعنتی قسم کا طبقہ ہے، ان کی زندگی میں گناہوں کے سوا کچھ نہیں۔ ورنہ حضور اکرم ﷺ نے عورت کی یوں تعریف فرمائی ہے کہ سب سے اچھی بیوی وہ ہوتی ہے کہ جب شوہر کی نظر اس پر پڑے تو خوش ہو جائے، جب شوہر غائب ہو جائے تو اس کی عزت مال کی حفاظت کرے اور جب خاوند حکم دے تو اس کے حکم کی تعمیل کرے۔

فیشن اور سنگھار والی تتلیاں:

یہ نہیں کہ خاوند ڈیوٹی پر گیا اور اس نے پیچھے ٹیلی فون کر دیا کہ ہیلو! کم آن۔ یہ جو فیشن سنگھار والی اڑتی پھرتی تتلیاں ہیں یہ عورتیں نہیں، بلکہ یہ بدبودار لاشے ہیں، یہ میرے مدنی ﷺ کی نظروں میں خبیثات ہیں، معلوفات

ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ کے ستر ہزار فرشتے لعنت بھیجتے ہیں۔ عورتیں تو ازواج مطہرات، حضرت فاطمہ اور صحابیات رضی اللہ عنہن تھیں۔ جو عورتیں ان کی متبعات ہیں ان کو عورت کہلانے کا حق ہے۔ وہ عورت نہیں ہوتی جو بازاروں میں پھرے، کلب کی رونق ہو، جو غیر مردوں سے ہاتھ ملائے، غیر مردوں کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوائے، جو چہرے کھلے کر کے بازار میں پھرے اور خوشبوئیں لگا کر بازار میں جائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت ایسی خشبوئیں لگائے اور ایسا لباس پہنے کہ بندے کو اس کا بدن نظر آئے اور بازار میں پھرے۔ یہ عورت زانیہ کے حکم میں ہے۔

فیشن پرست مردوں کا خراج:

جن کو اللہ تعالیٰ نے اور اللہ کے رسول نے خبیثات فرمایا ہے وہ ہمارے ہاں معزز ہیں، لیکن عورتیں گھر میں بیٹھتی ہیں اور پردہ کرتی ہیں ان کے بارے میں خاوند بھی کہتا ہے کہ پتہ نہیں میرے گھر میں کونسی ملانی گھس آئی ہے!؟ یہ تو کوئی عذاب ہے۔ نہ میرے ساتھ باہر جاتی ہے اور نہ شاپنگ پر جاتی ہے۔ نہ میرے دوستوں کو انٹرٹیل کرتی ہے اور پردہ تو دل کا ہونا چاہیے۔

بچے زیادہ جننے والی عورت:

یہ لوگوں کا عجیب فلسفہ ہے! اللہ کے بندو! باہر بدن پلید ہوگا تو دل کیسے ٹھیک ہوگا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں ترغیب دی ہے کہ زیادہ شادیاں کرو اور اس عورت سے نکاح کرو جو زیادہ بچے پیدا کرے، تاکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اضافہ ہو۔ آج کل منصوبہ بندی پر زیادہ زور ہے کہ بچے کم پیدا کرو۔ اس کے لیے یورپ والے ہمیں کروڑوں روپیہ دیتے ہیں کہ بچے کم پیدا کرو۔ اگر آبادی بڑھے گی تو ہم کہاں سے کھائیں گے؟ حالانکہ جب اللہ تعالیٰ بندے کو پیدا کرتے ہیں تو اس کا رزق کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے، بندہ ذمہ دار نہیں ہے۔

کافروں کو اصل میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کی تعداد بڑھاؤ۔ یورپ والے اپنے بچوں کو کیوں نہیں گھٹاتے ہیں؟ جہاں لاکھوں حرامی بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے ملکوں میں حرامی بچوں کے پیدا ہونے کو بھی نہیں روکتے اور یہاں اسلامی ملکوں میں حلال بچے پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [الانفال: ۳۰] کافر بھی تدبیر کرتے ہیں اور ہم بھی

تدبیر کرتے ہیں اور ہماری تدبیر غالب ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ انگریز وائسرائے نے حکم جاری کیا کہ قرآن جلا دو کہ جب ان کے پاس یہ کتاب نہیں ہوگی تو قرآن کون یاد کرے گا؟ پریس جتنا قرآن چھاپے، آدمی پیدا کرو جوان سب کو خرید لیں، تاکہ فتنہ بھی نہ بنے اور خرید کر جلاتے جاؤ۔ اور مسجدوں کے اندر جتنے قرآن رکھے ہیں ان سے یہ کہہ کر لے لو یہ ہمیں دے دو ہم تمہیں نئے دیں گے۔ ایک دفعہ وہی وائسرائے سیر کے لیے جا رہا تھا تو ایک دیہات کی سڑک سے گزرا تو دیکھا کہ ایک مولوی صاحب کے سامنے آٹھ دس لڑکے بیٹھ کر کچھ پڑھ رہے ہیں۔ اس نے اپنا گھوڑا روک کر اس مولوی صاحب کو بلا کر پوچھا: کیا پڑھ رہے ہو؟ اس نے کہا: قرآن شریف پڑھا رہا ہوں۔ وائسرائے نے کہا: تمہارے پاس قرآن پاک کے کچھ نسخے ہیں تو دکھاؤ۔ مولوی صاحب نے ایک لڑکے کو بلا کر کہا: سورۂ فاتحہ پڑھو، دوسرے کو کہا: سورۃ البقرۃ پڑھو، تیسرے کو کہا: تم آلِ عمران سے پڑھو اور انگریز کو کہا: تم جو قرآن کے نسخے جلانا چاہتے ہو یہ نسخے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن امت محمدیہ کے سینوں میں رکھ دیا ہے۔ تم کتنے نسخے جلاؤ گے؟ آج جو چاند پر پہنچ گئے ہیں وہ ایک آدمی دکھائیں جو تورات کا حافظ ہو، انجیل کا حافظ ہو اور ہم ایک لاکھ نہیں، بلکہ ایک کروڑ اللہ کے قرآن کے حافظ پیش کر سکتے ہیں۔

حدیث حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”حُبِّبَ إِلَيَّ النِّسَاءُ وَالطِّيبُ وَقُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ“ [سنن النسائی، رقم: ۳۹۴۰] دنیا کی جن چیزوں میں اللہ نے مجھے محبت دی ہے وہ پاک عورت ہے، خوشبو ہے اور اللہ تعالیٰ نے میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی ہے۔

قنطار کا معنیٰ:

قنطار سے کیا مراد ہے؟ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بہت سا مال۔ چاندی وغیرہ کی خواہشات میں الجھ کر اللہ کو بھی بھول گئے اور اللہ کے رسول کو بھی بھول گئے اگر اللہ تعالیٰ کسی کو مال دے اور وہ شریعت کے مطابق خرچ کرے تو کوئی بری بات نہیں ہے۔

اس کے بارے میں بزرگوں نے ہی ہمارے سمجھنے کے لیے ایک مثال دی ہے: کشتی پانی پر چلتی ہے۔ پانی جب تک کشتی کے نیچے ہوتا ہے تو کشتی تیرتی ہے اور ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچ جاتی ہے، لیکن وہی پانی اگر کشتی کے اندر داخل ہو جائے ہو تو کشتی کو غرق کر دیتا ہے۔ اس لیے جب تک دنیا دین کے تابع رہے اس وقت تک اچھی

بات ہے۔ دنیا ہوگی تو حج ہوگا، صدقات وخیرات ہوں گی اور جہاد بالمال ہوگا۔ اور اگر پیسہ نہ ہو تو بے چارہ کیا کرے گا؟ جب دولت دین کے اوپر آجائے تو آدمی تباہ ہو جاتا ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قنطار سے یہاں بہت سے مال مراد ہیں، لیکن بعض علماء نے یہاں کئی اقوال نقل کیے ہیں۔ بعض نے کہا: بارہ ہزار دینار ہوں تو قنطار ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: چالیس ہزار دینار ہوں تو قنطار ہوتا ہے۔ ان اقوال کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہر دور کے احوال مختلف ہیں، مثلاً: اگر تیس سال پہلے کسی کے پاس ایک ہزار ریال تھے تو وہ بہت بڑا آدمی تھا اور اب اگر ایک لاکھ ریال ہوں تو تب بھی کوئی بات نہیں بنتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ قنطار بارہ ہزار چھٹانک کو کہتے ہیں اور ہر اوقیہ اس سے بہتر ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

(حدیث) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص روزانہ سو آیات کی تلاوت کرے اس کو اللہ تعالیٰ غافلین میں نہیں لکھتے ہیں، بلکہ وہ ذاکرین میں شمار ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی بندہ سو سے لے کر ایک ہزار آیت تک قرآن پاک کی تلاوت کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ایک قنطار اجر عطا فرماتے ہیں۔ عرض کیا گیا: قنطار کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک بہت بڑا پہاڑ، یعنی اللہ تعالیٰ بہت بڑا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: گھوڑے کی محبت تین قسم پر ہے اور جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا کہ یا تو گھوڑا ثواب ہے، یعنی اس لیے گھوڑے رکھے ہوئے ہیں کہ جہاد کی ضرورت ہوگی، ہم ان گھوڑوں پر جہاد کریں گے؛ کیونکہ پہلے دور میں گھوڑے جہاد کے لیے ہوتے تھے اور اب تو گھوڑے ریس کے لیے ہوتے ہیں۔ اور دوسری قسم گھوڑوں کی یہ ہے کہ سواری کے لیے، سفر کے لیے گھوڑا رکھا ہوا ہے، تاکہ لوگوں سے سوال نہ کروں اور اپنی ہی سواری پر چلا جاؤں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ گھوڑا باندھنا بھی ستر ہے، اس کے لیے پردہ ہے۔ اور تیسری قسم یہ ہے کہ ریا کے لیے گھوڑے باندھے ہوئے ہیں، تاکہ لوگ کہیں یہ بہت بڑا آدمی ہے۔ یہ گھوڑا اس آدمی پر گناہ ہے اور اسی عذاب میں وہ مبتلا ہو جائے گا۔

''وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مُسَوَّمَة'' ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جو چرنے والے اور موٹے تازے ہوں۔ حضرت مکحول رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مُسَوَّمَة'' اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کے ماتھے

پر سفیدی اور پاؤں پر سفیدی ہو اور باقی جسم سیاہ ہو۔ اس گھوڑے کو ابلق بھی کہتے ہیں۔

عربی گھوڑے کی دعا:

حدیث حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ فَرَسٍ عَرَبِيٍّ إِلَّا يُؤْذَنُ لَهُ مَعَ كُلِّ فَجْرٍ يَدْعُو بِدَعْوَتَيْنِ يَقُولُ: اَللّٰهُمَّ! خَوَّلْتَنِيْ مَنْ خَوَّلْتَنِيْ مِنْ بَنِيْ آدَمَ وَجَعَلْتَنِيْ أَحَبَّ أَهْلِهِ وَمَالِهِ إِلَيْهِ أَوْ مِنْ أَحَبِّ أَهْلِهِ وَمَالِهِ إِلَيْهِ'' عربی نسل کے گھوڑے کو اللہ تعالیٰ اجازت دیتے ہیں کہ وہ ہر صبح اپنے لیے دو دعائیں مانگتا ہے۔ اور وہ گھوڑا یہ دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! آپ کا شکر ہے آپ نے مجھے بنی آدم کے حوالے کیا ہے اور مجھے اس کا محبوب بنایا ہے اور مجھے اس کے مال اور اہل میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ بنایا ہے۔
[نسائی فی السنن الکبریٰ: رقم: ۱۲۲۱۸]

اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز دعائیں کرتی ہیں۔ اور مانگنے کی ان کی اپنی لغتیں ہیں، جو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور ہم نہیں جانتے ہیں۔

بارش کے لیے چیونٹیوں کی دعا:

سابقہ کتب کے اندر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: بارش نہیں آرہی ہیں، اس لیے صلوۃ الاستسقاء پڑھیں گے، اللہ سے بارش کے لیے دعا کریں گے۔ سب لوگ جمع ہو گئے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام تھوڑا سا باہر نکلے تو لوگوں کو فرمایا کہ واپس آجاؤ، نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا: جب بارش آرہی ہے تو مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ میرا چیونٹیوں پر گزر ہوا ہے۔ یہ اپنے بلوں میں پڑی ہوئی کہہ رہی تھیں کہ اے اللہ! گناہ تیرے بندے کرتے ہیں، ہمیں تو برباد نہ کر، ہمیں پانی عطا فرما۔

انسانوں کی روزی کا ایک سبب:

دوسری حدیث مبارک میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر یہ جانور، کیڑے مکوڑے، حشرات اور کمزور لوگ نہ ہوتے تو تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہارا رزق بند ہو جاتا، لیکن ان کی وجہ سے تمہیں مل جاتا ہے۔

''وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ'' کی تفسیر:

حدیث حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خَيْرُ مَالِ امْرِئٍ لَهُ مُهْرَةٌ مَأْمُوْرَةٌ أَوْ سِكَّةٌ مَأْبُوْرَةٌ'' آدمی کے لیے

بہترین مال سکھایا ہوا گھوڑا ہے اور باغ میں وہ کھجور جو پھل سے لدی ہوئی ہو، جس میں بے انتہاء کھجوریں ہوں اور پھل لگنے والے درخت ہوں۔

﴿ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ یہ ساری چیزیں جو ہم نے قرآن میں بیان فرمائی ہیں: عورتیں ہیں، اولاد ہے، سونا چاندی ہے اور گھوڑے ہیں یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگانی سے نفع اٹھانے کی چیزیں ہیں؛ کیونکہ دنیا بھی فنا ہونے والی ہے اور یہ چیزیں بھی فنا ہونے والی ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سنی: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ﴾ تو کہا: اللہ میاں! ان کے اندر محبت، شہوات اور رغبت آپ نے خود رکھی ہے اور اب ہمارے لیے امتحان بھی بن گیا ہے، اب تو ہی ہماری مدد فرما۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم تمہیں خبر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے بہتر چیزیں وہ ہیں جو اللہ کے پاس ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو، تاکہ تمہیں جنت میں نعمت ملے۔ جنت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے ایسی ایسی نہریں رکھی ہیں کہ شہد کی نہریں، دودھ کی نہریں، خمر کی نہریں اور پانی کی نہریں۔ اور ایسی نعمتیں ہیں جو کسی آنکھ نے دیکھیں نہیں ہیں، کسی کان نے سنی نہیں ہیں اور کسی کے دل میں گمان و خیال نہیں گیا ہے۔ اگر تم نے لذت حاصل کرنی ہے تو جنت کی نعمت حاصل کرو، اس کے اندر تم ہمیشہ رہو گے، اس سے کبھی نہیں نکلو گے۔ اور تمہارے لیے جنت میں پاکیزہ بیویاں رکھی ہیں، جو ہر گندگی اور برائی سے حیض و نفاس اور بول و براز سے پاک ہیں۔ اور جنت میں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [التوبۃ: ۷۲] اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔

اس لیے حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت والوں کو حکم دیں گے تو سب متوجہ ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کچھ چاہتے ہو؟ جنتی عرض کریں گے: اے اللہ! کون سی نعمت ہے جو ہمارے پاس نہیں!! آپ نے تو ایسی ایسی نعمتیں عطا فرمائیں جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے جنت والو! آج ایسی نعمت میں تم کو دیتا ہوں جو تمہیں پہلے نہیں ملی، آج میں تم پر اپنی رضا اتارتا ہوں۔ جس کے بعد میں تم پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾ [آل عمران: ۱۵] اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندوں کے احوال کو دیکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو وہ دیں گے جس کا وہ مستحق ہے۔ اگر اعمال خیر ہیں تو خیر کے بدلے ملیں گے اور اگر اعمال شر ہیں تو

بدلے بھی شر کے ملیں گے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٦﴾ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿١٧﴾﴾ [آل عمران:۱۶،۱۷]

''(یہ بندے) کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے ہیں، پس ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ صبر کرتے ہیں (ایمان میں)، سچے ہیں، فرمانبردار ہیں، صدقہ کرتے ہیں اور سحری کے وقت گناہ بخشواتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو کافر ہیں یا فاسق ہیں وہ اس دنیا کے اندر عورتوں، بچوں میں اور سونا چاندی میں کھو جاتے ہیں، لیکن جو میرے بندے ہیں ان کی صفات یہ ہیں کہ ﴿اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ کہ وہ ہر وقت مجھ سے یہ کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے اللہ پر، اللہ کے رسولوں پر، اللہ کی کتابوں پر، اللہ کے فرشتوں پر، اللہ کی تقدیر پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائے۔ ہمارے گناہ معاف فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

روایت میں ہے کہ جب بندہ تین دفعہ ''یا رب'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: مانگ میرے بندے! تو کیا مانگتا ہے؟ اسی طرح آتا ہے کہ جب مومن بندہ تین دفعہ اپنے اللہ کو پکارتا ہے یا اللہ! یا اللہ! یا اللہ! تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا منظور کر لیتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ جب صبح کی نماز کے لیے اٹھتے اور آسمان پر نظر پڑتی تو فوراً فرماتے تھے: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾﴾
[آل عمران:۱۹۰،۱۹۱]

حدیث میں آتا ہے کہ جب بندہ تین دفعہ کہے: ''اَللّٰهُمَّ! أَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ'' تو جہنم بھی کہتی ہے: اے اللہ! تو اس کو مجھ سے بچا لے۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندے ایسے ہیں جو اللہ کا اتنا ذکر کرتے ہیں کہ لوگ دیکھ کر کہتے ہیں: یہ کوئی دیوانہ اور پاگل ہے۔

صبر کا معنی:

اللہ تعالیٰ نے مومنین کی صفات بیان فرمائیں ہیں: ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾﴾ صبر کرنے والے ہیں، ماتم کرنے والا مومن نہیں ہے۔

لغت کے اندر صبر کا ایک معنی ''المنع'' ہے کہ کسی چیز سے رکنا۔ ہمارے ہاں صبر کا یہ معنی مشہور ہے کہ موت اور مصیبت پر صبر کیا۔ یہ بھی صبر ہے۔ اور دوسرا صبر یہ ہے کہ ساری دنیا داڑھی والے کو برا بھلا کہتی ہے، لیکن پھر بھی وہ صبر میں ہے، دین کو نہیں چھوڑ رہا۔ ہر شخص اس کے ساتھ مزاق بناتا ہے، کوئی اس کو دہشت گرد کہتا ہے، کوئی اس کو ملا کہتا ہے، کوئی اس کو کارٹون کہتا ہے اور کوئی اس کے ساتھ مذاق کرتا ہے اور وہ مومن صبر کر رہا ہے۔ اسی طرح سردی میں، گرمی میں دین پر وہ قائم ہے۔ اپنے آپ کو برائیوں سے روکنا، یہ بھی صبر ہے کہ حسین وجمیل عورت زنا کی دعوت دے، لیکن وہ کہے: مجھے اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے تو یہ بھی صبر ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُوْلٰی'' کہ جب مصیبت پہنچے اس وقت انسان صبر کرے۔ ورنہ کئی دنوں کے بعد سب کو صبر آجاتا ہے، ہر آدمی رو رو کے چپ ہو جاتا ہے۔

اور دوسرا صبر یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت پر کاربند رکھنا۔ اور گناہوں سے اپنے آپ کو روکنا، یہ بھی صبر ہے کہ نفس خواہش کرتا ہے میرے پاس بھی مال و دولت ہو، لیکن وہ کہتا ہے کہ سود حرام ہے، مجھے ایسا پیسہ نہیں چاہیے۔

پچھلی آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ لوگ شہوات، عورتوں کے فتنہ میں مبتلا ہو کر برباد ہو جاتے ہیں، اولاد کے فتنہ میں برباد ہوتے ہیں، سونے چاندی کے فتنے میں برباد ہوتے ہیں اور گھوڑے مویشی کے فتنہ میں برباد ہوتے ہیں، لیکن میرے بندے ''اَلصّٰبِرِیْنَ'' اپنے نفس کو شہوات سے روکنے والے ہوتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اگر صحیح معنی میں آجائے اور نفس کو صبر کرنا آجائے تو انسان کامیاب ہو جاتا ہے۔

''وَالصّٰدِقِیْنَ''

مومنین کی دوسری صفت اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی کہ میرے مومن بندے سچ بولنے والے ہوتے ہیں، کبھی

زبان سے جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔

ایک صحابی کا واقعہ:

ایک صحابی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کرتے ہیں: میں نے گناہ کیا ہے، زنا کیا ہے، مجھے سزا دیں۔ آپ ﷺ نے رخ مبارک پھیر لیا، وہ دوسری طرف سے پھر آ گیا کہ حضور! میں نے گناہ کیا ہے، مجھے سزا دیں۔ آپ ﷺ نے رخ پھیر لیا، تا کہ چلا جائے اور کوئی مدعی اور گواہ نہ بنے۔ یہ معاملہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔ اللہ قادر ہیں کہ اس کی توبہ سے اس کو معاف کر دیں، لیکن وہ پھر آ گیا۔ جب آپ نے تین دفعہ رخ پھیرا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی ایسے معاملات میں تیقن کرے۔ جب اس نے تیسری دفعہ کہا کہ مجھے پاک کریں، مجھے آخرت کی سزا سے دنیا کی سزا بہتر ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم پاگل تو نہیں ہو؟ اس نے کہا: خدا کی قسم! میں پاگل نہیں ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہو سکتا ہے تم نے اس عورت کو بوسہ دیا ہو یا سینے وغیرہ سے لگا لیا ہوگا؟ اس نے کہا: نہیں، میں نے زنا کیا ہے۔ اتنی بڑی سزا کا اس کو علم ہے، لیکن وہ پھر بھی کہہ رہا ہے: اس کو صدق کہتے ہیں۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کو لے جا کر رجم کرو۔

اس صدق کا انعام دیکھیں کہ جب اس کو رجم کر کے صحابہ رضی اللہ عنہم آ گئے تو ایک صحابی کے منہ سے یہ کلمہ نکل گیا کہ کیا بری موت تھی!؟ حضور اکرم ﷺ کے چہرے پر غصہ آ گیا اور فرمایا: کس نے بات کہی ہے آگے آؤ۔ وہ آگے آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کی توبہ ایسے قبول کی ہے کہ اگر سارے مدینہ والے گناہگار ہو جائیں تو اس اکیلے کی توبہ سب کو کافی ہے۔

صداقتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''صدیق'' کا لقب اس لیے ملا ہے کہ ان کے منہ سے زمانہ کفر میں بھی کبھی جھوٹ نہیں نکلا تھا۔ اور آج ہم سوچیں کہ یہ صفت ہمارے اندر بھی ہے یا نہیں ہے؟ اگر ایک ریال والی چیز مل جائے تو اس کا مسئلہ پوچھتے ہیں اور اگر بیس ریال والی چیز ملے تو اس کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔

عبادت میں خشوع وخضوع:

''وَالْقَانِتِيْنَ''

اللہ نے مومن بندوں کی تیسری صفت بیان فرمائی کہ وہ خشوع اور خضوع والے ہوتے ہیں، میری عبادت کے اندران پر اتنی خشیت طاری ہوتی ہے کہ میرے سوا ان کو کسی چیز کا پتہ بھی نہیں ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ تیر لگا اور وہ بدن میں ایسا داخل ہوا کہ اس کو نکالنا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ جراح نے کوشش کی، لیکن وہ تیر نہ نکل سکا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام نے جراح سے کہا: ابھی کوشش نہ کرو، نماز کا وقت آنے والا ہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز شروع کریں تو تم تیر نکال لینا؛ کیونکہ یہ اللہ کے ڈر میں اتنے کھو جاتے ہیں کہ ان کا بدن کانپتا ہے اور موم کی طرح پگھل جاتا ہے۔ تو جب نماز کا وقت آیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بدن سے تیر نکال لیا گیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے اور آپ کو بتایا گیا تو فرمایا: مجھے پتہ بھی نہیں لگا۔

جبکہ ہمارے خشوع کا یہ عالم ہے کہ اگر بدن پر مٹی لگ جائے تو نماز میں کھڑے کھڑے صاف کرتے ہیں، حالانکہ پتہ ہے کہ اس سے پیدا ہوا ہوں اور پھر اسی مٹی کے اندر جانا ہے۔ اور بعض لوگ نماز میں پورا ہاتھ نیچے نہیں رکھتے کہ میرا ہاتھ خراب نہ ہو جائے اور اگر ہاتھ کو مٹی لگ جائے تو کپڑے پر نہیں رکھتے ہیں۔ اور بعض تو...... ماشاء اللہ...... جیب سے گھڑی نکال کر ٹائم دیکھ کر دوبارہ جیب میں ڈال لیتے ہیں، کیا یہ بھی نماز ہے؟ حالانکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: تیری عبادت کا یہ عالم ہو کہ گویا کہ تو اپنے خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اگر اس منزل پر نہ پہنچ سکو تو کم از کم یہ تو سمجھو کہ تیرا خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔

''وَالْمُنْفِقِيْنَ'' کی تفسیر:

مومنین کی یہ صفت ہے کہ میرے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دینا تو فرض ہے، وہ کسی کا احسان نہیں ہے، اس کے بغیر تو مال بھی حلال نہیں ہوتا، لہٰذا زکوٰۃ کے علاوہ صدقاتِ نافلہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرتے ہیں؛ کیونکہ آج صدر صاحب چندے کے لیے بلوائے تو دو دو لاکھ دیں گے اور اگر کوئی مسجد کا مولوی چندے کے لیے کہے تو کہتے ہیں: پہلے تھوڑی مسجدیں ہیں؟ اپنی کوٹھیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کہ پہلے کوٹھیاں ہیں تو اور کوٹھی کیوں بناتے ہو؟ یاد رکھیں! جو چندے کسی وجاہت کے اعتبار سے ہوں ان کا کوئی ثواب نہیں، بلکہ یہ رشوت کے ضمن میں آتے ہیں۔ اصل خیرات وہ ہے جو اپنی رضا، خوشی اور دل سے دی جائے اور اتنا چھپا کر دی جائے کہ اگر داہنے ہاتھ سے دیا ہے تو بائیں

ہاتھ کو پتہ نہ لگے۔ اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے دیا تو یہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔

''وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ'' کی تفسیر:

مومن کی صفت یہ ہے کہ رات کے آخری وقت میں مجھ سے معافی مانگنے والا ہوتا ہے۔ آج دیکھ لیں کہ کتنے مسلمان ہیں جو رات کو اٹھ کر استغفار کرتے ہیں؟ جو فجر کی نماز نہیں پڑھتا ہے وہ آخری رات میں کیا اٹھے گا؟ سحری کا وقت رات کا خصوصی حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے عرش سے آسمانِ دنیا پر نزولِ رحمت فرماتے ہیں۔ حدیث کے اندر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کوئی مانگنے والا ہے، میں اس کو عطا کروں؟ کوئی دعا کرنے والا ہے، میں اس کی دعا قبول کروں؟

قرآن میں آتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے ابا حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے درخواست کی: ﴿يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ﴾ ابا جان! اللہ تعالیٰ سے ہمارے گناہوں کی بخشش مانگیں، ہم نے یوسف کے ساتھ واقعی زیادتی کی، انہیں کنویں میں ڈالا اور ان کو بیچ دیا۔ آج اللہ تعالیٰ نے اس کو عزت دی ہے، ہم اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے ہیں۔ تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ﴾ [یوسف:۹۸] میں تمہارے لیے بخشش مانگوں گا۔ علماء نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام چاہتے تھے کہ رات کے آخری حصہ میں بخشش مانگیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا عجیب واقعہ!

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ بیٹھے ہوئے تھے:

......ان سے کسی نے آکر عرض کیا: میری اولاد نہیں ہوتی، مہربانی فرما کر مجھے کوئی وظیفہ بتائیں۔ آپ نے فرمایا: تم استغفار کیا کرو۔

......دوسرے آدمی نے آکر عرض کیا کہ کافی عرصہ ہو گیا ہے، ہمارے علاقہ میں بارشیں نہیں ہوئیں، ہماری فصلیں برباد ہو گئی ہیں، زمینیں بنجر پڑی ہوئی ہیں اور جانور گھاس کے لیے مر رہے ہیں، مہربانی فرما کر کوئی وظیفہ بتائیں۔ فرمایا: استغفار کیا کرو۔ وہ آدمی بھی چلا گیا۔

......تیسرا آدمی آیا اور عرض کیا: کھیتی تو ہوتی ہے، لیکن ان پر ثمر نہیں لگتا ہے۔ آپ نے فرمایا: استغفار کیا کرو۔

......چوتھا آدمی آیا اور عرض کیا: ہمارا یہ عالم ہو گیا ہے کہ بارشیں آتی تھیں، برف پگھلتی تھی اور نہریں چلتی تھیں۔ ہم

فلاں دور کے ملک کے رہنے والے ہیں، اب نہروں میں پانی نہیں رہا۔ جب پانی نہیں ہوگا تو کوئی چیز نہیں ہوتی، مہربانی فرما کر کوئی وظیفہ بتائیں۔ تو فرمایا: استغفار کیا کرو۔

آپ کے ساتھ بیٹھنے والے بے تکلف احباب میں سے کچھ نے عرض کیا: آج تو آپ نے کمال کر دیا!! جو بھی آیا اس کو فرمایا: گناہوں کی بخشش طلب کیا کرو۔ حضرت حسن رحمہ اللہ فرمانے لگے: خدا کے بندو! یہ وظیفہ میں نے تو نہیں بتایا، بلکہ قرآن کہتا ہے: ﴿اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝﴾ [نوح: ۱۰ تا ۱۲] میرے بندو! تم مجھ سے استغفار کرو تو میں تمہارے گناہ معاف کر دوں گا، آسمانوں میں سے بارشیں برساؤں گا، تمہارے مال اور تمہاری اولادوں کو بڑھا دوں گا، تمہارے لیے باغ بھی اور تمہارے لیے نہریں بھی جاری کر دوں گا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں حکم دیا ہے، میں نے اپنی طرف سے کوئی وظیفہ نہیں بتایا ہے۔

استغفار کی یہ برکت ہے کہ اس سے ساری نعمتیں مل جاتی ہیں، مثلاً: کسی پر بادشاہ ناراض ہو، لیکن وہ جب راضی ہو جائے تو سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ راضی ہو کر ہمارے گناہ معاف کر دے تو ہم سے عذاب ٹل گئے اور معافی مل گئی تو پھر اس کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔

احادیث مبارکہ میں استغفار کے کئی کلمات مبارکہ ہیں۔ بعض احادیث میں آتا ہے: ''اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ''۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۳۰۶، بابُ: أَفْضَلِ الاِسْتِغْفَارِ]

اور ایک استغفار ہے: ''أَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيَّ الْقَيُّوْمَ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ'' اگر یہ یاد نہ ہوں تو ''أَسْتَغْفِرُ اللهَ رَبِّيْ الْعَظِيْمَ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ''[1] اگر یہ بھی مشکل ہو تو ''أَسْتَغْفِرُ اللهَ... أَسْتَغْفِرُ اللهَ... أَسْتَغْفِرُ اللهَ'' اتنا بھی کر لو تو بہت ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دل کے ساتھ پڑھو۔

اور صبح کے وقت میں نماز سے پہلے اور رات کے آخری حصہ میں اس کو اپنا مستقل عمل بناؤ۔ پانچ سو دفعہ پڑھ لیا کرو۔ اللہ کی رحمت سے ساری مشکلات اور پریشانیاں حل ہو جائیں گی۔ اگر زیادہ نہ پڑھ سکو تو کم از کم ایک سو دفعہ تو

[1] [الاذکار للنووی: ۱/ ۳۰۳]

پڑھ لیا کرو؛ کیونکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ روزانہ ستر دفعہ اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ روزانہ سو دفعہ استغفار فرماتے تھے۔ حالانکہ آپ ﷺ معصوم ہیں، لیکن امت کو سبق دینے کے لیے یہ عمل فرماتے تھے۔
[صحیح البخاری: رقم: ۶۳۰۷، جامع الترمذی: رقم: ۳۲۵۵]

اب آپ خود اپنے اندر غور کریں! ہمارے اندر مومنین کی یہ ساری علامات ہیں یا نہیں ہیں؟

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ'' منافق کی تین علامات ہوتی ہیں: جب بات کرے تو جھوٹی بات کرے، جب وعدہ کرے تو جھوٹا وعدہ کرے (جب کوئی عہد کرے تو اس کو توڑ ڈالے) اور جب امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ [1] اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ بندہ بھی منافق ہے: ''إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ'' جب کسی سے جھگڑا کرے تو گالی گلوچ کرے۔ [الاذکار للنووی: ۱/ ۳۷۵]

اب غور کریں! ہمارے اندر مومن والی علامتیں ہیں یا منافق والی علامتیں ہیں؟ قرآن جب پڑھیں تو ایک ایک چیز کو اپنے اوپر منطبق کرنے کی کوشش کریں کہ کیا ہمارے اندر یہ علامات پائی جاتی ہیں یا نہیں پائی جاتی ہیں؟

یہاں تک متقین کی صفات کا بیان تھا۔ اگلی آیات میں پھر مسئلہ نصاریٰ کے رد کی طرف لوٹ رہا ہے۔

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾﴾ [آل عمران: ۱۸]

''اللہ نے گواہی دی کہ معبود برحق کوئی نہیں، مگر اللہ۔ اور فرشتے اور اہل علم بھی گواہی دیتے ہیں وہی (اللہ) انصاف کا حاکم ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔ وہی زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں:

اللہ کے سوا کسی غیر کی عبادت شرک ہے۔ رکوع کرنا عبادت ہے، سجدہ کرنا عبادت ہے اور طواف کرنا عبادت ہے۔

[1] [الاذکار للنووی: ۱/ ۹۸۲]

جو قبر پر سجدہ، رکوع اور طواف کرتے ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ خود قرآن پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں: ''شَهِدَ اللّٰهُ'' میں گواہی دیتا ہوں۔ اور اللہ کی گواہی سے بڑی گواہی کسی کی نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر میں اللہ۔ اور ملائکہ بھی یہی گواہی دیتے ہیں، علم والے بھی یہی گواہی دیتے ہیں، انبیاء وصدیقین، شہداء اور صالحین بھی یہی گواہی دیتے ہیں کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ۔

عیسائی نظریہ کفریہ:

﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ ساری کائنات کو عدل وانصاف کے ساتھ تھامنے والا ہے۔

اس آیت کے اندر نصاریٰ کا رد ہے۔ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہم جو موروثی طور پر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک گنہگار آرہے تھے، اس کی سزا عیسیٰ علیہ السلام نے خود اپنے اوپر رکھ لی اور پھانسی پر چڑھ گئے اور امت گناہوں سے چھوٹ گئی۔ اب امت کے ذمہ اتنا ہے کہ اتوار والے دن گرجا میں آجائے اور پادری کے سامنے کھڑے ہوکر اقرار کرلیں کہ میں نے اس ہفتے اتنے زنا کیے، اتنے جھوٹ بولے، اتنی چوری کی اور اتنا ڈاکہ مارا تو پادری آپ کو معاف کردے گا اور آپ کو معافی مل جائے گی۔

آپ کا کیا خیال ہے یہ عقیدہ ٹھیک ہے یا غلط ہے؟ اور کہیں مسلمان کا تو یہ عقیدہ نہیں کہ پیر مضبوط ہو تو نماز کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارا بھی تو عقیدہ ہے کہ پیر چھڑوائے گا، دمادم مست قلندر کہیں گے اور جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔ ہمارے عقیدے تو ان سے بھی زیادہ کمزور ہوگئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: نبی نے بوجھ اٹھالیا۔ اور ہم کہتے ہیں: پیروں نے بوجھ اٹھالیا ہے۔ اگر یہ عقیدہ عیسائی رکھے تو کافر ہوجائے اور مسلمان یہ عقیدہ رکھے تو ایمان والا ہوجائے!؟؟

یاد رکھیں! قبر کے اندر اعمالِ صالحہ جائیں گے، گیارہویں کے دودھ نہیں جائیں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: جو دنیا میں مانگنا چاہتی ہو مانگ لو، قیامت کا میں ذمہ دار نہیں۔ اپنے عمل تیار رکھو، تاکہ آگے تمہیں آسانی ہو۔

ایک روایت میں ہے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ آپ سے عرض کیا کہ ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے ہیں، مشکیزہ اٹھاتے ہوئے کمر پر داغ پڑ گئے ہیں، مہربانی کر کے گھر کے لیے ایک خادم دے دیں۔ فرمایا: بیٹی! خادم کی کیا

ضرورت ہے؟ دنیا کی تکلیفیں گزر جاتی ہیں، تم ہر نماز کے بعد تینتیس بار ''سُبْحَانَ اللهِ'' تینتیس بار ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ''، تینتیس بار ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' اور چونتیس بار ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' پڑھ لیا کرو۔ تم جنت کی فکر کرو اور آخرت کی فکر کرو۔ دنیا تو گزر جانی ہے۔ اللہ کے نبی تو فرما رہے ہیں کہ بیٹی! میں تجھے نہیں چھڑا سکتا اور ہم کہیں پیر جنت کے مالک ہیں، یہ چھڑا لیں گے۔

بدعمل بدعقیدہ عالم کی حیثیت:

علماء نے لکھا ہے کہ آج بھی اگر کوئی آدمی لمبی لمبی تقریریں کرلے اور لمبے لمبے بیانات اور اجتماعات کرے، اگر اس کی عبادت کے اندر شرک ہے، وہ غیر اللہ کو سجدہ کرتا ہے، قبروں کا سجدہ کرتا ہے اور وہ بدعات میں الجھا ہوا ہے تو اس کو عالم کہلانے کا حق نہیں ہے۔ عالم وہ ہوتا ہے جو اللہ کی توحید کا داعی ہو اور جو دنیا کو کفر و شرک سے نکالنے والا ہو۔ عالم وہ ہوتا ہے جو بدعات سے نکل کر محمد مدنی ﷺ کی سنت پر چلانے والا ہو، لیکن جو دنیا کی رسومات میں الجھا دے وہ لاکھ علم کے دعوے کرے اور لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سنائے ان کی مثال ایسے ہوگی جیسے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایا: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعہ:۵] جیسے گدھے پر کتابیں لادنے سے گدھے کو فائدہ نہیں ہوتا اسی طرح ایسے لوگوں کو بھی علم پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں دیتا جو حق کو نہیں پہچانتے ہیں۔

علماء نے اس سے دوسرا مسئلہ یہ استنباط کیا ہے کہ اگر تمہیں کبھی شہادت دینی ہو تو شہادت کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے، یعنی شاہد اس واقعہ کو جاننے والا ہو۔ اگر شاہد اس واقعہ کو نہیں جانتا ہے تو اس کی گواہی جھوٹی ہوگی۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں، ملائکہ گواہی دیتے ہیں اور اولوالعلم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اور وہی ذات ہے جس نے پورے عالم کو عدل و انصاف سے مضبوط کر رکھا ہے اور تھام رکھا ہے۔ اس کی ذات غالب بھی ہے اور حکمت والی بھی ہے۔

اسلام کس چیز کا نام ہے؟

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران:۱۹] آج سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوگیا ہے کہ ہم لوگوں نے اسلام کو یہ سمجھا ہوا ہے کہ یہ چند رسومات کا نام ہے یا یہ چند عبادات کا نام ہے۔ اگر کوئی آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے اور زندگی میں ایک دفعہ حج کرلیتا ہے تو ہمارے نزدیک اسلام کے لیے اتنی چیزیں کافی ہیں۔ بعض لوگ اس سے بھی

بٹتے گئے اور ہر کسی نے اپنی اپنی رسومات کا نام مذہب رکھ لیا، یعنی اگر کوئی ان کے عقیدے کے مطابق عرس کرتا ہے، گیارہویں شریف مناتا ہے، ستائیسویں رجب مناتا ہے اور پندرہ شعبان کو مانتا ہے کہ سب تقدیر کے فیصلے اس رات میں ہوتے ہیں اور اسی طرح اگر وہ قل خوانیاں، چالیسواں اور سات جمعراتیں کرتا ہے تو وہ کیسا مسلمان ہے؟

اور بعض لوگوں کے نزدیک اسلام محض عبادت کا نام رہ گیا ہے، حالانکہ اسلام مذہب نہیں۔ اور اللہ پاک نے قرآن میں مذہب کا لفظ استعمال نہیں فرمایا، بلکہ ''دین'' کا لفظ ارشاد فرمایا۔ دین ایک کامل مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے۔ اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ معاملات ہوں، عبادات ہوں، ذاتیات ہوں، معاشیات ہوں، اقتصادیات ہوں اور قیامت تک دنیا جس چیز کی محتاج ہے اس تمام کے مجموعہ کامل کا نام اسلام ہے۔

جب تک ہم اس کو بطور دستورِ حیات لاگو نہیں کرتے اس وقت تک ہمیں مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المائدۃ: ۴۴] جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے قرآن کے مطابق قانون نہ بنائیں اور اس کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں۔ یہ کافر کو حکم نہیں ہے؛ کیونکہ وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتا، وہ اللہ کی توحید کا انکار کرتے ہیں، وہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ یہ حکم مسلمانوں کے لیے ہے۔ تم لاکھ اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہو، لیکن اگر تمہارے اندر اللہ کے قرآن کا قانون نافذ نہیں ہے تو تمہیں مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اگر کوئی کہے کہ اتنی طاقت تو ہمیں نہیں ہے تو جہاں جہاں تمہیں طاقت ہے کہ ایک آدمی کی طاقت صرف اپنے گھر تک چلتی ہے یا فیکٹری تک چلتی ہے تو وہاں جب تک ہم قرآن کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے ہمیں مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے۔ آپ کے بڑے لوگ حج، روزہ اور نماز پڑھتے ہیں، بلکہ اپنے ملازمین کو بھی اپنے پیسوں سے حج کرواتے ہیں، لیکن ان کا سارا لین دین سود پر چل رہا ہے۔ ان کو اسلام کا دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اللہ سے جنگ بھی لڑ رہے ہیں اور مسلمان بھی ہیں۔

اسلام کا معنی:

اسلام کا معنی ہے کہ استسلام کہ اپنے آپ کو سر سے لے کر پاؤں تک اللہ کے سپرد کر دینا۔ بعض بزرگوں نے اس کو بطور مثال کے اس طرح سمجھایا ہے کہ جیسے آدمی مر جاتا ہے اور وہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے، مردہ کچھ

نہیں کر سکتا۔ نہلانے والے جس طرف چاہیں اس کو پھیرتا رہے اور پانی ڈالتا رہے۔ اسلام کا معنی بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کامل مکمل اللہ کے ہاتھ میں دے دے کہ یا اللہ! جو بھی تیرا حکم ہے بس سر تسلیم خم ہے۔ وہاں مجھے بولنے، سوچنے اور عقل لڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک یہودی اور منافق کا واقعہ:

ایک آدمی منافق تھا، یعنی ظاہراً مسلمان تھا، لیکن اس کے اندر اسلام نہیں تھا۔ اس کا لیبن دین کے اندر ایک یہودی سے اختلاف تھا۔ جب بات بڑھی تو یہودی نے کہا: آپ کے نبی حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں جا کر فیصلہ کرواتے ہیں، لیکن منافق کہنے لگا: حضور اکرم ﷺ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، ان کے پاس بڑے کام ہیں۔ ہم کعب بن اشرف کے پاس جاتے ہیں۔ یہودی نے کہا میں کافر ہوں، لیکن تمہارے نبی کی بات مانتا ہوں، لیکن تم نہیں مانتے ہو، عجیب بات ہے۔ بہر حال حضور اکرم ﷺ نے بات سننے کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ دیا؛ کیونکہ اس کا حق بنتا تھا۔ یہودی خوش ہو گیا اور باہر نکلنے کے بعد منافق سے کہا کہ اب تو تم اپنے نبی کا فیصلہ مان لو۔ منافق نے کہا: حضور! پوری توجہ سے ہماری بات سن نہیں سکے، اس لیے حضرت عمر فارق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جا کر ان کو واقعہ سناتے ہیں۔ اس منافق کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اسلام میں شدید ہیں اور آپ کو کفر کے نام سے چڑ ہے، وہ میرے ہی حق میں فیصلہ کریں گے۔ آ کر آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ان کے سامنے واقعہ رکھا۔ یہودی نے بتایا کہ حضور اکرم ﷺ نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا ہے، لیکن یہ نہیں مانتا اور آپ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اندر تشریف لے گئے اور تلوار لے کر اس منافق کی گردن کو اڑا دیا۔ جو آپ کے فیصلے نہ مانے تو میری تلوار فیصلہ کرتی ہے۔

ایک انگریز کی تصدیق:

ایک انگریز نے آرٹیکل لکھا کہ ہم کافر ہیں، لیکن ہم تحقیقات کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: شراب حرام ہے۔ ہم کہتے ہیں: بڑی اچھی بات کی ہے؛ کیونکہ شراب اتنی مضر چیز ہے اس کو حرام ہی ہونا چاہیے۔ اس طرح اس نے کئی چیزوں کے بارے میں بتایا۔ اور کہا: آج ہم ایڈز کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ اس پر ریسرچ کی کہ یہ کیوں پھیلتا ہے؟ اس نے کہا: ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام کی بات سچی تھی کہ

عورت اور مرد دونوں پاک ہوں اور میاں بیوی کے علاوہ کوئی غلط تعلق نہ بنے تو ایڈز پیدا نہیں ہوتا۔ آگے اس نے لکھا کہ عجیب بات ہے کہ کافر تو اعتراف کر رہے ہیں کہ اسلام سچا دین ہے، اللہ کا نبی سچا ہے، ان کی بتائی ہوئی باتیں سچی ہیں اور مسلمان اپنے نبی کو چھوڑ کر ہماری عادات اور اعمال کو اپنا رہے ہیں۔

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ اے میرے نبی! اعلان فرما دیں کہ دین صرف اسلام ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں یہودی رہوں اور نجات ہو جائے تو نجات نہیں ہوگی۔ نصرانی کہے کہ میری نجات ہو جائے گی؛ کیونکہ میں نبی کو مانتا ہوں، اللہ کی کتاب کو مانتا ہوں اور آخرت کو مانتا ہوں۔ فرمایا: جب تک یہ اسلام میں نہیں آئیں گے نجات نہیں ہوگی۔ ﴿وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾﴾ [آل عمران:۱۹] کوئی آتش پرست ہے، کوئی مادہ پرست ہے، کوئی یہودی ہے اور کوئی نصرانی ہے۔ آپ ان کو کھل کر کہہ دیں کہ ہم نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا ہے۔ ہم اللہ کی توحید ماننے والے ہیں، اللہ کے نبی کی رسالت ماننے والے ہیں۔ اگر وہ یہ بات مان لیں تو ٹھیک ہے، ورنہ تمہارے ذمہ حق بات پہنچانا ہے؛ کیونکہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں، ان کی ذمہ داری بھی حق بات کا پہنچانا ہے۔

﴿رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾﴾ [آل عمران:۱۶،۱۷] یہاں سے اللہ تبارک وتعالیٰ متقین کی صفات بیان فرما رہے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے ثواب جزیل کا وعدہ فرمایا ہے۔

بندہ کوئی بھی نیک عمل کرے اس پر ناز نہ کرے، بلکہ یہ سمجھے کہ مولا! جو کچھ میں نے کیا اس کی تو نے مجھے توفیق دی ہے، اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، بلکہ تیرا کمال ہے کہ تو نے توفیق بخشی ہے۔

رات کی عبادت:

﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾﴾ سحری کا وقت دعاؤں کے قبول ہونے اور رحمت کا وقت ہے اور اس وقت میں اللہ تعالیٰ عرش سے آسمانِ دنیا پر نزول اجلال فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہے کوئی مجھ سے بخشش مانگنے والا، مجھ سے اولاد مانگنے والا؟ اس وقت آدمی جو دعا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوتی ہے۔

یاد رکھیں! رات کو جو بھی عبادت کی جائے اس کا بڑا مقام ہے، لیکن سب سے افضل وقت رات کا آخری حصہ

ہے؛ کیونکہ سحری کے وقت نزولِ رحمتِ خداوندی ہوتا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس وقت اکثر لوگ خوابِ غفلت میں ہوتے ہیں۔ اس وقت آدمی کو چاہیے کہ استغفار کرے، جو بھی یاد ہو۔ اگر عربی میں استغفار نہیں آتا تو اپنی زبان میں ''یا اللہ! میری توبہ...... یا اللہ! میرے گناہ معاف کردے'' لیکن وہ استغفار جو حضور پاک ﷺ نے سکھایا ہے وہ سب سے افضل ہے: ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ'' جتنا ہو سکے اتنا کثرت سے پڑھے۔ استغفار سے رزق میں برکت، مال میں برکت، اولاد میں برکت اور تمام پریشانیوں سے نجات، سب مسئلے اس استغفار سے حل ہوجاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی گئی تو سارے کام ہوجاتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کو سب سے پہلا حکم ملا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ① قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ②﴾ [المزمل: ۱،۲] اے میرے مدنی! رات کو اٹھو۔ پہلے حکم تھا کہ اکثر رات میرے ذکر میں گزارو اور تھوڑا حصہ آرام کرلو۔ اور فرمایا: رات کی عبادت انسان کے نفس کو کچل دینے والی ہے۔ اور یہ ایسی عبادت ہے کہ ہر بندے کا دل اور زبان موافقت کررہی ہوتی ہے؛ کیونکہ اس وقت میں انسان اپنا بستر اور اپنا آرام چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے آگے رو رہا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے آپ پر بہت بڑی عظمت والی بات اتارنی ہے، اس لیے اپنے آپ کو تیار کرو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ہر نبی کو چالیس سال بعد نبوت دی ہے۔ چالیس سال میں اللہ تعالیٰ ان کو مختلف مراحل میں گزارتے ہیں کہ اب میری دعوت کے متحمل ہونے کا وقت آگیا ہے۔

ذکر کا فائدہ:

آج یہی مشکل ہے کہ ہم لوگ اپنی اصلاح نہیں کرتے اور دوسروں کی اصلاح میں پڑ جاتے ہیں۔ ہمارا اپنا دامن صاف نہیں ہوتا، اپنے نفسِ امارہ کو نہیں مارا ہوتا، اس لیے ہماری عبادت کے اندر اثر نہیں ہوتا ہے۔ رات کو عبادت، رات کا ذکر اور رات کو استغفار اتنی بڑی نعمت ہے جو بیان میں نہیں آسکتی۔ ''اَللّٰہُ'' کے بڑے بڑے مزے جو آئے سو چکھ لے۔ پہلے آکر اس ذکر کو چکھو۔ جب اس میں داخل ہوجاؤ گے پھر پتہ چل جائے گا کہ اس اللہ کے ذکر کی کیا لذت ہے!! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ㉘﴾ [الرعد: ۲۸] دلوں کا سکون میرے ذکر میں ہے، دواؤں میں نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور اکرم ﷺ اوّل رات میں بھی تہجد پڑھتے تھے، درمیانی رات میں بھی تہجد

پڑھتے تھے اور آخر رات میں بھی تہجد پڑھتے تھے۔

یعنی یہ امت کے لیے آرام ہے، تہجد کی پابندی نہیں کہ ضرور آپ آخر رات میں پڑھیں۔ تہجد ہجود سے ہے، یعنی نیند کا چھوڑنا۔ اب جو عشا کی نماز کے بعد نفل پڑھیں گے سب تہجد ہے۔

ہمارے ہاں لوگوں نے مسئلہ بنایا ہوا ہے کہ جب تک نیند کر کے نہ اٹھو تہجد نہیں ہوتی۔ یہ جاہلوں کے مسئلے ہیں، لوگ خود مسئلے گھڑتے ہیں۔ تو یاد رکھیں! تہجد اوّل رات میں بھی جائز ہے، درمیان میں بھی جائز ہے اور آخر رات میں بھی جائز ہے، لیکن آخر رات میں تہجد پڑھنا زیادہ افضل اور زیادہ ثواب ہے۔

اور تہجد کا طریقہ یہ ہے کہ اگر تمہارا یقین کامل ہے کہ رات کو اٹھو گے تو وتر تہجد پڑھنے کے بعد پڑھو اور اگر نیند کھلنے کا یقین نہ ہو تو وتر سونے سے پہلے پڑھو، پھر آنکھ کھلے تو تہجد پڑھ لو۔ حضور اکرم ﷺ نے اس طرح بھی تہجد پڑھی ہے کہ سات سات پارے ایک رکعت میں پڑھے ہیں اور یوں بھی نماز پڑھی کہ سحر کے وقت نماز ختم ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رات کو تہجد پڑھتے تھے اور حضرت نافع رحمہ اللہ سے پوچھتے رہتے کہ سحر کا وقت ہو گیا یا نہیں؟ جب حضرت نافع رحمہ اللہ کہتے کہ سحر کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ نماز ختم کر کے استغفار اور دعا کی طرف توجہ کرتے، حتیٰ کہ صبح کا وقت ہو جاتا۔

حضرت ابن ابی حاتم رحمہ اللہ اپنے باپ حضرت ابو حاتم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک رات کو دیکھا کہ مسجد کے کنارے کے اندر سے ایک آدمی کہہ رہا ہے کہ اے میرے پروردگار! تو نے حکم دیا ہے کہ رات کو مجھ سے مانگو تو تیرے حکم کی میں نے فرمانبرداری کی ہے، میں آپ سے مانگ رہا ہوں۔ آپ مہربانی کر کے میرے گناہ معاف کر دیں۔ فرماتے ہیں: جب میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں حضور اکرم ﷺ کی طرف سے حکم تھا کہ جب رات کو تہجد پڑھو اور جب آخری رات کا وقت آجائے تو کم از کم ستر دفعہ استغفار کر لیا کرو۔ حضور اکرم ﷺ بھی کم از کم ستر دفعہ استغفار کیا کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کم از کم سو دفعہ استغفار پڑھا کرتے تھے، تاکہ امت کو تعلیم ملے۔

یاد رکھیں! اگر گناہ ہوں تو استغفار سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اگر گناہ نہ ہوں تو استغفار پڑھنے سے اللہ تعالیٰ درجات بلند کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو نصیب کرے۔

﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾﴾ [آل عمران:۱۹، ۲۰]

''پسندیدہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ اور نہیں اختلاف کیا اہل کتاب نے، مگر جب ان کے پاس (توحید کا) علم آچکا تھا آپس کی ضد کی وجہ سے۔ اور جو اللہ کے احکام کا منکر ہوگا تو اللہ (اس کا) جلدی حساب لینے والا ہے۔ اگر آپ سے (دین سے متعلق کفار) جھگڑیں تو کہہ دیجیے: میں نے خود کو اللہ کے تابع کیا ہے اور ان لوگوں نے بھی جو میرے ساتھ ہیں۔ اور کہہ دیجیے اہل کتاب کو اور ان پڑھوں کو کہ تم بھی اسلام لاؤ۔ پھر اگر وہ اسلام لائیں تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیریں تو آپ کے ذمہ صرف تبلیغ کرنا ہے۔ اور لوگ (کافر) اللہ کی نگاہ میں ہیں (یہ آیت قبل از جہاد کی ہے)۔''

عقیدۂ توحید:

آپ نے کئی مقامات پر مسئلہ توحید پڑھ لیا ہے۔ یہ سب سے اہم اور بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی الوہیت کی گواہی دے رہے ہیں۔ کلمہ شہادت کے اندر بھی یہی گواہی ہے کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ تعالیٰ اور محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

جب تک انسان کا یہ عقیدہ صحیح نہ ہو ساری عبادات اور سارے نوافل بے کار ہیں۔ اور یہی توحید الوہیت ہے جس پر انبیاء علیہم السلام نے تکالیف برداشت کیں۔ اللہ تعالیٰ خالق، رازق اور مالک ہے یہ تو سب مانتے ہیں، کافر بھی مانتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ خالق ہیں، رازق ہیں اور رب العالمین ہیں۔ وہ اللہ کے گھر کو بھی مانتے تھے، اس کا طواف بھی کرتے تھے، لبیک بھی پڑھتے تھے اور خیرات بھی کرتے تھے۔

اختلاف کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب انبیاء علیہم السلام نے اور خاص طور پر امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے دعوت دی کہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ'' ''معبود برحق کوئی نہیں، مگر اللہ۔ اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں، نہ کسی نبی کی عبادت جائز ہے، نہ کسی فرشتے کی عبادت جائز ہے اور نہ کسی اللہ کے ولی کی عبادت جائز ہے، بلکہ تمام عبادات اسی کی ذات کے

لیے ہیں۔ کائنات کا ہر بندہ، چاہے آسمانوں پر ہے اور چاہے زمین پر ہے، اس کا بندہ ہے اور اس کی مخلوق ہے۔ جب ساری مخلوق اس کی محتاج ہے تو محتاج خود عبادت کے قابل نہیں بن سکتا ہے۔ ساری مخلوق اللہ سے مانگنے والی ہے۔ جو مانگنے والا ہے وہ دینے والا نہیں بنتا۔ اور یہ بھی عقیدہ ہو کہ تمام چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں اور خالق اللہ کی ذات ہے۔ سارے کے سارے اس کے محتاج ہیں اور وہ غنی ہے۔ جب تک یہ عقیدہ نہیں بنے گا اس وقت تک کوئی عبادت قبول نہیں ہوگی۔ جو لوگ قبر والوں سے سوال کرتے ہیں، جبکہ قبر والے خود اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں تو ان سے مانگنے کا کوئی تصور ہی نہیں۔ اور جتنی انواع عبادات ہیں سب اللہ کے لیے ہیں، کسی غیر کے لیے نہیں ہیں۔ جب غیر کا تصور آئے گا تو اسی وقت شرک شروع ہو جائے گا۔

علماء کا مقام:

اس آیت سے معلوم ہوا کہ علماء کا اتنا بڑا مقام ہے اور جو صحیح معنی میں عالم ہے اس کی اتنی بڑی عظمت ہے کہ اللہ نے اپنی گواہی فرشتوں کی گواہی اور علماء کی گواہی کو اکٹھے ذکر کیا، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ علماء جو صحیح معنی میں متبع سنت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور جو صحیح معنوں میں اپنے علم پر عامل ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ جو آدمی جتنا زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے اتنا بڑا عالم ہے۔ اگر وہ اپنے علم پر عامل نہیں ہے تو اس کو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے پاس اتنی معلومات ہیں، لیکن وہ عالم کہلانے کا حقدار نہیں بنے گا۔ عالم کہلانے کا حقدار تب بنے گا جب حضور اکرم ﷺ کے علم کا وارث بنے۔ اور انبیاء علیہم السلام کا علم علمِ توحید ہے، علم کتاب ہے اور علم السنۃ ہے۔ علماء نے فرمایا: یہ بھی آدمی کا عقیدہ ہو کہ جس کو بھی جنت ملے گی اللہ کے فضل سے ملے گی اور جس کو جہنم میں ڈالا جائے گا وہ اللہ کا عدل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں فرماتے ہیں۔

﴿الْعَزِيزُ﴾ اللہ ایسے غالب ہیں جن کی ذات پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا، اس کی عظمت کبریائی پر کسی کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر ایک پر غالب ہے۔

﴿الْحَكِيمُ ⑱﴾ اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اقوال میں، اپنے افعال میں، اپنی تقدیر میں اور اپنی شریعت میں حکمت والے ہیں، یعنی جو بھی حکم دیا ہے وہ حکمت سے خالی نہیں ہے۔

آیت پر حضور ﷺ کی تائید:

(حدیث) حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور پاک ﷺ سے سنا آپ ﷺ نے

عرفات کے میدان میں یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [آل عمران:١٨] اس کے فوراً بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''وَاَنَا عَلٰی ذٰالِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ'' یا اللہ! میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ تیری ذات کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔

قرآن کی تلاوت کے آداب:

یاد رکھیں! اللہ کے قرآن کی تلاوت کے آداب میں یہ بات ہے کہ جب کوئی آیتِ رحمت آئے تو آدمی اللہ سے رحمت کا سوال کرے، جب کوئی آیتِ عذاب آئے تو اللہ سے عذاب سے نجات کا سوال کرے، جہاں جنت کا ذکر ہے وہاں جنت کا سوال کرے، اگر نار کا ذکر آئے تو اس سے پناہ کا سوال کرے اور اسی طرح جہاں کہیں اللہ کی تسبیح آئے تسبیح کہے۔

اس آیت مبارکہ میں گواہی کا ذکر آ گیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یا اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ تو معبود برحق ہے اور تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔

آدمی کو قرآن سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ اگر ایک آدمی کو قرآن کا ترجمہ نہیں آتا تو کوئی بات نہیں، لیکن وہ قرآن کے ایک ایک لفظ کو آرام سے ادا کرے۔ اور اگر قرآن کے مخارج کا اسے علم نہیں ہے تو کم از کم جتنا قرآن نماز میں پڑھتے ہیں کسی ایک قاری کے پاس بیٹھ کر اس کو صحیح کرا لے۔ مثلاً: آپ کو دو سورتیں یاد ہیں تو کم از کم وہ دو سورتیں صحیح آجائیں، تا کہ نماز میں تلاوت صحیح ہو، نہ کہ ساری زندگی نماز پڑھیں اور اس کے اندر قرآن اس طرح پڑھتے رہیں کہ کسی جگہ مد ہو اور آپ نہ کہہ رہے ہوں، کسی جگہ مدِ منفصل ہے، کسی جگہ مد ایک الف کی ہے، کسی جگہ مد دو الف کی ہوتی ہے، کسی جگہ تین الف کی ہوتی ہے اور اسی طرح وقف لازم ہے اور آپ نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر حافظ ہیں تو ''الحمد للہ'' اور اگر حافظ نہیں ہیں، دیکھ کر قرآن پڑھنے والا ہے تو تھوڑا پڑھے، لیکن صحیح پڑھے۔ اور جتنی سورتیں نماز میں پڑھتے ہیں وہ کسی قاری کے پاس بیٹھ کر ان کو صحیح کرا لے، تا کہ نماز میں تلاوت صحیح ہو؛ کیونکہ تلاوت میں بعض اوقات ایسی غلطی ہوتی ہے کہ آدمی کفر تک پہنچ جاتا ہے، حالانکہ غلطی زیر زبر کی ہوتی ہے، لیکن انسان کفر کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

حضرت غالب القطان فرماتے ہیں کہ میں کوفہ کے اندر تجارت کے سلسلہ میں آیا۔ حضرت اعمش رحمہ اللہ کے قریب

مجھے رہائش کی جگہ ملی۔ میں وہاں ٹھہرا۔ رات کے وقت میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا کہ یہاں سے چلوں، تو میں نے دیکھا کہ حضرت اعمش کھڑے ہوئے اور تہجد کی نماز پڑھنی شروع کی۔ اور تلاوت کرتے کرتے جب اس آیت پر پہنچے، اس آیت کو پڑھ کر حضرت رک گئے اور کہا: ''وَأَنَا أَشْهَدُ بِمَا شَهِدَ اللهُ'' میں بھی گواہی دیتا ہوں جو گواہی میرے اللہ نے دی ہے اور اے میرے اللہ! میں اپنی اس گواہی کو تیرے پاس امانت رکھتا ہوں، تاکہ قیامت میں میرے کام آئے۔

یاد رکھیں! نوافل اور فرائض میں بڑا فرق ہے۔ نفلی عبادت میں یہ ہے کہ آدمی پڑھ رہا ہے، درمیان میں تسبیح آگئی تو اس نے کہہ دیا: ''سبحان اللہ'' یا درمیان میں کوئی ایسی بات آگئی اور اس نے اللہ سے دعا کر لی اس آیت کے مطابق وہ جو تلاوت کر رہا ہے تو اس کی گنجائش ہوتی ہے۔ اصل میں تہجد ان لوگوں کی تھی جو قرآن میں تدبر کرتے تھے اور ان کی راتیں اللہ کی عبادت میں گزر جاتی تھیں۔

مختلف مذاہب کا حکم:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران: ۱۹] بعض دین ایسے ہیں جن کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتابوں سے اور اللہ کی وحی سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کے جھوٹے ہونے کا کوئی شبہ نہیں رہا۔ جیسے ہندو مت، بدھ مت اور اسی طریقے سے دنیا میں اس قسم کے فرقے موجود ہیں ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ بعض لوگ پڑھے لکھے لوگوں کو یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے ہندو، سکھ اور بدھ مت باطل دین ہیں، نہ ان کے پاس شریعت ہے اور نہ کوئی کتاب ہے۔ جو ان کے پاس وید وغیرہ ہیں وہ خود بھی ان کو ثابت نہیں کر سکتے کہ یہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ باقی یہودی اور نصرانی، ان کے بارے میں بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کو اہل کتاب فرمایا ہے، دوسرا اسلام نے ان کے ساتھ رعایت کا معاملہ بھی کیا ہے کہ اگر کوئی اہل کتاب جانور ذبح کرے تو اس کا ذبیحہ حلال ہے، مسلمانوں کے لیے کھانا بھی جائز ہے اور وہ اپنے آپ کو یہودیت یا نصرانیت کا ماننے والا کہتا ہے بس اتنا کافی ہے، چاہے وہ اس پر عمل کرتا ہے یا عمل نہیں کرتا ہے۔ ان کے ساتھ اسلام نے دوسری رعایت بھی دی ہے کہ اہل کتاب کی لڑکی سے اگر کوئی مسلمان نکاح کرنا چاہے تو جائز ہے، لیکن کسی ہندو لڑکی سے نکاح جائز نہیں ہے، اسی طرح کسی سکھ کی لڑکی سے اور بدھ مذہب کی لڑکی سے نکاح جائز نہیں ہے۔ تو ان وجوہات کی بنا پر ہمارے جدید تعلیم

یافتہ طبقہ کے لوگ اس شبہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ وہ خدا کو مانتے ہیں اور ان کا آخرت پر بھی ایمان ہے اور ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے سچے پیغمبر تھے تو ان کو نجات مل جائے گی؛ کیونکہ وہ آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، دوسرا اللہ کے نبی پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن نے بھی ان کو اہل کتاب کے لفظ سے مخاطب کیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے کہ جو پڑھے لکھے لوگوں کے دماغ میں بیٹھ جاتی ہے۔

یاد رکھیں! اللہ کے دین کا نظام ایسے ہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ اور شریعت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئے، اگر ایک آدمی موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور رسالت کو مانتا ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لے آتا تو وہ مومن نہیں کہلائے گا؛ کیونکہ وہ پہلی شریعت کو مان رہا ہے، اس کے بعد جو اللہ تعالیٰ نے رسول اور کتاب بھیجی اس پر ایمان نہیں لایا، لہٰذا وہ ایمان نہیں رہتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تو اللہ کے رسول ہیں تو اس نے ایک رسول کو مانا اور دوسرے رسول کا انکار کیا ہے، لہٰذا وہ مومن نہیں۔

اسی طرح عیسائی ہیں۔ اگر ان کا ایمان عیسیٰ علیہ السلام پر ہے، ان کے بعد جب ہمارے آقا ﷺ تشریف لائے تو اب جب تک وہ آپ پر ایمان نہ لے آئیں تو ایمان دار نہیں کہلائیں گے۔ اس لیے مسلمان وہ ہوگا جو اللہ کے تمام انبیاء، تمام رسولوں پر اور تمام کتابوں پر ایمان لائے، لیکن جس نبی کا اس نے کلمہ پڑھا ہے شریعت اس کی چلے گی۔ اس لیے ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے وضاحت کر دی کہ دین صرف اسلام ہے۔ کوئی یہودیت نصرانیت وغیرہ پر رہتے ہوئے نجات پا جائے ناممکن ہے۔

اہل کتاب کے ذبیحہ اور ہندوؤں کے ذبیحہ میں فرق:

باقی رہا اہل کتاب کا ذبیحہ وہ اس لیے حلال ہے کہ ذبح کرنے والے کے لیے شرط ہے کہ وہ اس چیز کو اللہ کے نام پر ذبح کرے۔ اگر اس چیز کو اللہ کے نام پر ذبح نہیں کیا تو وہ چیز حلال نہیں ہوگی۔ وہ کہتا ہے: سردار کے نام پر ہے، تب بھی حرام ہے۔ پیر کے نام پر ہے، تب بھی حرام ہے۔ اب چونکہ اہل کتاب یہودی ہے یا نصرانی ہے وہ بھی ذبح کے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں؛ کیونکہ ذبح کے وقت اللہ کے نام کی شرط پوری ہوگئی، لہٰذا ذبیحہ حلال ہوگیا۔ اور ہندو، سکھ اور بدھ مت خدا کا نام نہیں لیتے ہیں، بلکہ وہ اپنے بتوں کا نام لیتے ہیں، لہٰذا ان کا ذبیحہ حرام ہے۔

یہودی اور عیسائی لڑکی سے نکاح کیوں جائز؟

باقی اہل کتاب کی لڑکیوں سے نکاح جائز ہے، وہ بھی اس شرط پر کہ جب اس کو کوئی مسلمان لڑکی نہ ملے۔ یہ

نہیں کہ عمداً ان سے نکاح کرتے پھرو۔ حالات کے اعتبار سے حکم ہے، مثلاً: پانچ سال کے کورس کے لیے باہر چلے گئے، اس ملک میں مسلمان لڑکی نہیں ملتی اور حالات بھی اس بات کے متقاضی نہیں ہیں کہ میں اپنے ملک سے شادی کر کے لڑکی ساتھ لے جاسکوں اور میں نے زنا سے بھی بچنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی کہ تم اس وقت اہل کتاب کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہو۔ چلو وہ سابقہ کتاب، اللہ تعالیٰ کو اور کسی پیغمبر کو تو مانتے ہیں۔ جب وہ مسلمان کے گھر میں آئے گی تو اس کا اسلام پر آنا زیادہ یقینی ہے، بنسبت کسی دہریے اور بت پرست کے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی کہ کوئی اہل کتاب مسلمان لڑکی سے شادی کرلے؛ کیونکہ اہل کتاب کی لڑکی کا اسلام میں آنا متوقع تھا، لیکن یہ تو نہیں کہ ہم مسلمان کو کافر کے گھر میں ڈال دیں، نعوذ باللہ وہ بھی کافر ہو جائے۔ اہل کتاب کی نجات اس بات پر ہوگی کہ وہ اہل کتاب ہیں، ورنہ حضور اکرم ﷺ ان سے جنگیں نہ لڑتے اور ان کو مدینہ سے نہ نکالتے۔

اسلام میں بدعات کی گنجائش نہیں:

دین اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ہم نے اس کو مکمل کردیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ عرفات کے میدان میں تھے اور یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدۃ:۳] آج ہم نے دین کو مکمل کردیا، اپنی نعمت پوری کردی اور میں راضی ہوگیا تمہارے لیے اسلام کو دین بنا کر۔ اب میرے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے اور وہ مکمل ہے۔

جب دین حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں مکمل ہوگیا، لہٰذا آج اگر کوئی آدمی دین کے اندر کوئی نیا طریقہ ایجاد کرے جس کا ذکر قرآن میں نہ ہو اور فرمانِ مصطفیٰ ﷺ میں بھی نہ ہو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی نہ ہو تو ہم سمجھیں گے کہ جو لوگ بدعات رسومات میں مبتلا ہیں دراصل وہ اللہ کے دین کو مکمل نہیں سمجھتے، ورنہ نئی بات کا کیا مطلب تھا؟ اگر کوئی کہے کہ یہ ہم اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اچھی اور بہتر بات ہے تو کیا اس چیز کا اللہ اور اس کے نبی کو پتہ نہیں تھا اور ہمیں پتہ لگ گیا؟

مثل مشہور ہے کہ ایک آدمی کے پاس شادی میں دینے کے لیے پیسے نہیں تھے، اس نے سوچا کہ اگر شادی میں نہ جاؤں تو برادری کا مسئلہ ہے۔ ساری زندگی طعنہ دیں گے کہ ہم نے دعوت نامہ بھیجا اور آپ شادی پر نہیں آئے۔ اور اگر جاؤں تو میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ وہ میرے بیٹے کی شادی پر آئے تھے، پیسے دے کر گئے تھے۔ تو اس نے

ایک نیا طریقہ نکالا کہ رات کے اندھیرے میں وہاں پہنچا اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ انہوں نے پوچھا: کون ہو؟ یہ واپس چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد شادی والوں نے کہا: تم شادی پر نہیں آئے تھے۔ اس نے کہا: میں آیا تھا اور دروازہ کھٹکھٹایا تھا، لیکن ہم تو "کون؟" ہو گئے تھے۔ تم نے پہچانا بھی نہیں تھا تو میرے اندر آنے کی کیا ضرورت تھی؟

میرا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی کا یہ عقیدہ ہے کہ دین اسلام مکمل نہیں وہ کافر ہے۔ اور اگر عقیدہ ہے کہ دین مکمل ہے تو ہر چیز دین کے اندر ہوگی، قرآن میں ہوگی یا حدیث میں ہوگی یا صحابہ کے عمل میں ہوگی، کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی ہے۔ جس مدنی سرکار نے ہمیں انگلیوں میں خلال کرنا بھی سکھادیا ہے، سر پر مسح کرنا بھی سکھادیا ہے تو کیا کھانے پینے والے مسئلے نہیں سکھائے؟

حضرت ابن جریر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو "إِنَّ الَّذِيْنَ" کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے زبر کے ساتھ "أَنَّ الَّذِيْنَ" پڑھا ہے۔ اور جمہور قراء نے زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ نحوی بات ہے، لیکن دونوں قراءتوں کے اندر معنیٰ ٹھیک ہے۔ اندازہ لگائیں! اگر کسی نے زبر کے ساتھ اور کسی نے زیر کے پڑھا ہے تو اتنی چھوٹی بات بھی بتادی ہے؛ کیونکہ جو دین کی بات ہوگی وہ قرآن وحدیث میں لازماً موجود ہوگی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ قرآن میں ایک حکم اجمالی طور پر آتا ہے، اس کی تفصیل حدیث پاک میں آجاتی ہے اور اس حکم پر عمل کر کے دکھلانے والے صحابہ اور اہل بیت رسول اللہ ہیں رضوان اللہ علیہم اجمعین، تاکہ کسی چیز کے بارے میں کوئی شبہ نہ رہے اور کوئی اختلاف نہ رہے۔

بعض لوگ فروعی مسائل لے کر مثلاً: کہتے ہیں: ایک امام کہتا ہے: ظہر سے پہلے چار رکعت ہیں اور دوسرا امام کہتا ہے: دو رکعت ہیں۔ حالانکہ یہ جھگڑا نہیں ہے؛ کیونکہ دونوں کے پاس حدیث ہے، لیکن تم جو بدعات والا کام کر رہے ہو، اس کی بھی کوئی حدیث ہے؟ صرف یہ کہہ دینا کہ ہمارے بزرگوں نے کہا تھا، یہ دین نہیں ہے، رواج ہے۔ دین دین ہوتا ہے، اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہو سکی۔

یہود ونصاریٰ وغیرہ کے اختلافات:

﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾ [آل عمران:۱۹] اے میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم! جن لوگوں کو آپ سے پہلے کتاب دی گئی ہے، یعنی انجیل یا تورات جن کو دی گئی ہے ان لوگوں کے آپس

میں اختلاف ہوئے، حالانکہ ان کے پاس میری کتابیں موجود تھیں، میرے بھیجے ہوئے رسول بھی آ گئے اور حق بات بھی ان کو پہنچ گئی، لیکن انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف زیادتی اور چڑھائی کرتے ہوئے ایک دوسرے کی ضد میں آ کر حق کو چھوڑ دیا اور اختلاف میں پڑ گئے۔

یہودیوں نے اتنا اختلاف کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زنا کی اولاد کہہ دیا کہ یوسف نجار شخص تھا، ......نعوذ باللہ......اس کے ساتھ بی بی مریم علیہا السلام کے ناجائز تعلقات تھے، اس سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ اس گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے مشہور کر دیا کہ بغیر باپ کے پیدا ہوا، حتیٰ کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھانے کی کوشش کی۔ اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھاتے گئے۔ کچھ کہنے لگے کہ جب بغیر باپ کے پیدا ہوا تو اللہ کا بیٹا ہوا۔ اور کچھ نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود خدا ہیں۔ اس طرح دونوں پٹڑی سے اتر گئے اور کافر بن گئے۔ وہ دشمنی میں بڑھتے گئے اور یہ محبت کے اندر بڑھتے گئے۔

آج جتنی جماعتیں لڑ رہی ہیں اس کی وجہ ﴿بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾ کہ وہ اِس کو گرانا چاہتا ہے اور یہ اُس کو گرانا چاہتا ہے۔ ایک محبت میں بڑھتا ہے اور ایک سختی میں بڑھتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ہدایت پر رکھے اور اعتدال پر رکھے۔

قبر کے متعلق مسائل:

دیکھیں! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قبروں کو سجدہ گاہ نہ بناؤ، چونا نہ لگاؤ، عمارت نہ بناؤ اور قبریں پختہ نہ بناؤ، لیکن اب کوئی سختی کے اندر اتنا بڑھ جائے کہ قبروں پر عمداً جوتے پہن کر چلے تو یہ بھی ناجائز ہے اور دوسرے اتنے محبت میں بڑھ جائیں کہ قبروں پر غلاف ڈال رہے ہیں، روضے بنا رہے ہیں، طواف کی جگہیں اور کھڑے ہو کر مانگنے کی جگہیں بنا دیں۔ وہی ﴿بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾ ہے اور دونوں پٹڑی سے ہٹ رہے ہیں، ورنہ دین وہی تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور کر کے دکھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی صحابہ کرام فوت ہوئے، سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی، بی بی کلثوم رضی اللہ عنہا، بی بی رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی، کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پکی قبریں بنائیں؟ ان پر روضے بنائے تھے؟ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک بالشت کے برابر قبر کو اونچا کرو، تاکہ پتہ لگے یہ قبر ہے، کوئی اس کی اہانت نہ کرے، کوئی پیشاب نہ کرے، کوئی جوتے سے نہ چلے، قبر کے اوپر کوئی نہ بیٹھے اور قبر کے اوپر ٹیک کوئی نہ لگائے، تاکہ مسلمانوں کے

قبرستان کی علامت ہوجائے کہ یہاں مسلمانوں کی قبریں ہیں۔ اور فرمایا: پکی قبریں نہ بناؤ، بلکہ کچی چیزوں کے ساتھ بناؤ۔ ہاں اگر کہیں ضرورت ہے کہ قبر ٹھہرتی نہیں ہے، وہاں عذر ہے، لیکن لڑ جھگڑ رہے ہیں۔

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ⑲﴾ [آلِ عمران: ۱۹]

اللہ نے جو قرآن میں اتارا ہے کوئی شخص اس کا انکار کرے تو سمجھ لو کہ اللہ جلد حساب لینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو جھوٹ پر سزا دیں گے۔ قرآن آگیا، حق واضح ہوگیا، اب اگر کوئی انکار کرے گا تو اللہ تعالیٰ خود بدلہ لیں گے۔

﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ﴾ [آلِ عمران: ۲۰] اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ پسندیدہ دین دین اسلام ہے، اس کے علاوہ کوئی دین بھی لے آئے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔ اب نہ دین یہودیت پر نجات ہے، نہ نصرانیت پر نجات ہے اور نہ کسی مکذوبہ مصنوعہ ادیان پر نجات ہے، بلکہ نجات کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ دین اسلام ہے۔

آپ نے پڑھ لیا کہ یہودیوں اور نصرانیوں کا آپس میں اختلاف ہے اور پھر نصرانیوں میں بھی اختلاف ہے اور ان کے اندر تین جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں: 1 ...... ایک جماعت ''یعقوبیہ'' کہلاتی ہے، 2 ...... دوسری جماعت ''نسطوریہ'' کہلاتی ہے 3 ...... اور تیسری جماعت ''ملکانیہ'' کہلاتی ہے۔ اور ان کے پاس چار اناجیل ہیں: 1 ...... متی، 2 ...... لوقا، 3 ...... یوحنا 4 ...... اور مرقس۔ اور یہ تینوں جماعتیں ایک دوسرے کو حق پر نہیں سمجھتی ہیں۔ یعقوبیہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود خدا ہے۔ ملکانیہ کہتے ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تو نہیں، مگر اللہ کا بیٹا ہے۔ اور جب بیٹا ہم پر راضی ہوگیا تو خدا خود بخود ہم پر راضی ہوگیا، لہٰذا خدا کو راضی کرنے کے لیے ہم بیٹے کو راضی کر رہے ہیں۔ اور تیسری جماعت کہتی ہے: خدا بھی نہیں اور ابن بھی نہیں، لیکن ان تین میں سے ایک ہے۔ اسی طرح یہودیوں کے اندر بھی زبردست اختلاف ہے۔

یہود و نصاریٰ کا اسلام سے اختلاف:

پھر ان سب کا اسلام سے اختلاف ہے۔ ان سب نے حضور اکرم ﷺ کی تکذیب کی اور قرآن کا انکار کیا، حالانکہ ان کو علم تھا اور سمجھتے تھے کہ آپ سچے ہیں، لیکن حسد کی وجہ سے انکار کیا کہ ہم اونچے ہوجائیں، ورنہ ان کو پتہ تھا کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں۔

حضور ﷺ کی تصدیق کے لیے ایک راہب کا واقعہ:

حضور اکرم ﷺ عین جوانی کے عالم میں خواجہ ابو طالب کے ساتھ شام کا سفر فرما رہے تھے۔ راستے کے اندر نصاریٰ کا ایک بہت بڑا راہب تھا، وہ اپنے عبادت خانہ سے کبھی باہر نہیں آتا تھا، لیکن اس دن وہ دوڑ کر باہر آیا اور پوچھا: قافلہ کا سردار کون ہے؟ لوگوں نے ابو طالب کا بتا دیا۔ تو ان کی خدمت میں پہنچ کر کہنے لگا: آج آپ میرا کھانا قبول فرمالیں۔ ابو طالب حیران ہو گئے اور کہا: آپ اتنے بڑے پادری اور اتنے بڑے راہب ہیں۔ ہم نے پوری زندگی اس علاقہ کا سفر کیا اور آپ کے بارے میں ہمیں ہمیشہ تمنا رہی کہ آپ کی زیارت کریں، لیکن آپ باہر نہیں آتے تھے، کسی سے ملاقات بھی نہیں کرتے تھے اور آج آپ ہماری دعوت کر رہے ہیں۔ راہب نے کہا: آج تمہارے ساتھ ایک ایسی شخصیت ہے کہ میں اگر اپنے عبادت خانہ سے باہر آکر استقبال نہ کرتا تو شاید میرا عبادت خانہ گر جاتا۔ ابو طالب نے کہا: ہمارے ساتھ تو کوئی ایسا بندہ نہیں ہے، ہم تو آپس کے لوگ ہیں، جو ہمیشہ تجارت پر جاتے رہتے ہیں۔ راہب نے کہا: اس بات کو رہنے دیں اور آپ میری دعوت قبول کریں۔ جب کھانے کا وقت آیا اور حضور اکرم ﷺ کو آنے میں دیر ہوگئی تو اس راہب نے کہا کہ ابو طالب! سب آگئے؟ انہوں نے کہا: میرے بھتیجے ابھی نہیں پہنچے ہیں۔ راہب نے کہا: انہی کے لیے تو میں نے دعوت کی ہے۔ ابو طالب نے کہا: وہ نوجوان آدمی ہے، اس میں تم نے کیا دیکھا ہے؟ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس نے کہا: ابو طالب! ادھر آؤ، میں تمہیں دکھاؤں۔ اور باہر آکر کہا: وہ جو دور سے آرہے ہیں وہی تمہارا بھتیجا ہے۔ ابو طالب نے کہا: تم نے کیسے پہچان لیا ہے؟ راہب نے کہا: تمہیں اور کسی جگہ بادل نظر نہیں آرہے، لیکن ان پر بادل نے سایہ کیا ہوا ہے۔ ابو طالب کہتے ہیں: میری آنکھیں کھلیں، ورنہ ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے گھر میں اتنی بڑی شان والی ذات موجود ہے۔ بس ایک یہ خیال تھا کہ عبد اللہ کے بیٹے ہیں، خوبصورت ہیں، خوب سیرت ہیں اور سچ بولنے والے ہیں۔ اور ہمیں خوشی تھی کہ ہمارے خاندان میں ایک فرد ایسا کمال والا ہے، لیکن اس بات کا پتہ نہیں تھا۔ جب حضور اکرم ﷺ تشریف لے آئے تو راہب نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور ابو طالب سے کہا: میری درخواست ہے کہ ان کو شام نہ لے جاؤ، ان کو واپس مکہ مکرمہ بھیج دو۔ یہ وہ نبی ہیں جنہوں نے خاتم الانبیاء بن کر آنا ہے۔ اگر آگے جاؤ گے تو یہود ان کے دشمن ہیں، وہ ان کو نقصان پہنچائیں گے۔ ابو طالب کہتے ہیں: میں نے سوچا ٹھیک کہتا ہوگا اور ہمیں بھی کچھ باتیں نئی نئی نظر

آ رہی تھیں، لہٰذا میں نے اس کے کہنے پر حضور اکرم ﷺ کو واپس بھیج دیا؛ کیونکہ ان لوگوں کا راہبوں اور نجومیوں پر بڑا ایمان تھا، جیسا کہ اب ہمارا حال ہے کہ پیر بات کہہ دے تو اس پر خوب عمل کریں گے اور جو محمد مصطفیٰ ﷺ کہہ دیں اس پر عمل نہیں کرتے ہیں۔

اللہ کی صفات:

﴿فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ [آل عمران: ۲۰] اے میرے مدنی ﷺ! اگر آپ سے اہل کتاب جھگڑا کریں اور مناظرہ کریں تو آپ ان کو سیدھی بات بتادیں کہ میں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے اور میرے ماننے والے بھی۔ ہم نے صرف اسی کی عبادت کرنی ہے، وہ وحدہ لاشریک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کی مثال بھی کوئی نہیں، اس کی کوئی اولاد بھی نہیں اس کا کوئی والد بھی نہیں اور جو بیوی سے بھی پاک ہے۔

دعا بھی اللہ سے:

یاد رکھیں! اگر ہم نے اللہ کے سوا غیر کو پکارا تو عبادت ختم۔ دعا بھی عبادت ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم عبادت اللہ کی کرتے ہیں اور دعائیں ان سے مانگتے ہیں، ان کو سفارشی بناتے ہیں، یہ تو درمیان میں خدا تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں ہیں، ورنہ ہم اللہ سے مانگتے ہیں۔ یہی غلط فہمی ہے۔ قرآن کھول کر پڑھ لیں، کفار کا بھی یہی حال تھا اور اسی کا نام شرک ہے۔

دین کی طرف حضور اکرم ﷺ کی دعوت:

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ آپ ان کو اپنے دین اور اپنی شریعت کی طرف بلائیں۔ یہودیوں کو بھی دعوت دیں، نصرانیوں کو بھی دعوت دیں اور امیین کو بھی دعوت دیں۔ اور ان لوگوں کو کہہ دیجیے جن کو کتاب دی گئی: کیا تم اسلام لاتے ہو جیسے میں اسلام لایا اور جیسے اللہ تعالیٰ کی توحید کو مانتا ہوں؟ اگر وہ اسلام لے آئیں اور آپ کے طریقے کو اپنالیں تو سمجھو کہ وہ ہدایت پا گئے اور اگر آپ کی دعوت کے بعد وہ انحراف کر جائیں اور آپ کے دین پر نہ آئیں تو آپ کے ذمہ دین کو پہنچانا ہے۔ اگر وہ مان لیں گے تو ان کا فائدہ ہے اور اگر وہ نہیں مانیں گے تو ان کے لیے ہلاکت و بربادی ہے۔ نبی کا کام یہ نہیں ہوتا کہ کسی کو زبردستی مسلمان کر دے؛ کیونکہ ہدایت کے فیصلے اللہ کے پاس ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے گھر میں ایسے لوگ پیدا کیے جنہوں نے اسلام کو چار چاند لگا

دیئے اور حضور اکرم ﷺ کے قریبی رشتہ دار جہنم میں چلے گئے۔ ابوجہل، ابولہب، عقبہ، عتیبہ اور ولید وغیرہ حضور پاک ﷺ کے سارے معجزات اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے، لیکن ایمان نہیں لائے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اللہ پاک کسی کو ہدایت دیتے ہیں اور کسی کو گمراہ کرتے ہیں۔ اس کی دلیلیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔

ہدایت دینے کا اختیار اللہ کے پاس:

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ [آل عمران: ۲۰] اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کو دیکھنے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون گمراہی کا مستحق ہے؟ اسی کی ذات ہے، اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ وہ تو مالک اور خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔

حضور ﷺ کی نبوت تمام دنیا کے لیے:

ان آیات مبارکہ سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رسول بنایا۔ آپ ﷺ کی نبوت خاص علاقے یا خاص قوم کے لیے نہیں ہے، بلکہ ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الاعراف: ۱۵۸] اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

بخاری و مسلم میں ہے: اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فارس کے بادشاہوں کو خط لکھے، روم کے بادشاہوں کو بھی خط لکھے، آپ نے عرب کو بھی دعوت دی اور عجم کو بھی دعوت دی اور پوری دنیا کو اسلام کی دعوت دی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ساری دنیا کے لیے بھیجا تھا، ساری مخلوق کے لیے بھیجا تھا۔

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے سرکارِ مدینہ ﷺ سے سنا ہے: ”وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ يَهُودِيٌّ، وَلَا نَصْرَانِيٌّ، ثُمَّ يَمُوتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ، إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ“ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری زندگی ہے! اس دنیا میں چاہے کوئی یہودی ہے یا نصرانی ہے اور یا کسی دین پر ہے جس کو میرا دین میری نبوت اور میری ذات کے بارے میں خبر پہنچی اور وہ ایمان نہ لایا تو جہنم میں جائے گا۔ [صحیح مسلم: رقم: ۱۵۳]

اب وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں یہودی بن کر نجات پا جاؤں گا یا نصرانی بن کر نجات پا جاؤں گا یا میں کسی دوسرے

مذہب پر نجات پا جاؤں گا، بلکہ جس کو بھی پیغامِ محمد مصطفیٰ ﷺ پہنچا ہے اور ''الحمد للہ'' اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا فرمائے جنہوں نے آپ کا پیغام دنیا تک پہنچایا ہے۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''بُعِثْتُ إِلَى الْأَسْوَدِ وَالْأَحْمَرِ'' مجھے ہر گورے اور کالے کے پاس بھیجا گیا ہے، یعنی سب مخلوق کے لیے نبی بنایا گیا۔

(حدیث) اور فرمایا: ''كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَ بُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً'' پہلے نبی اپنی قوموں کے لیے بھیجے جاتے تھے، لیکن اللہ پاک نے مجھے تمام مخلوقات کے لیے نبی بنا کر بھیجا۔

(حدیث) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا تھا جو کبھی حضور اکرم ﷺ کے لیے لوٹا بھر کر رکھ دیتا تھا اور کبھی حضور اکرم ﷺ کے جوتے اٹھا کر آپ کو پہنا دیتا تھا، حالانکہ وہ یہودی تھا، لیکن پھر بھی وہ حضور اکرم ﷺ کا اتنا احترام کرتا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گیا۔ حضور پاک ﷺ نے پوچھا: وہ لڑکا کدھر ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: وہ بیمار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چلو مجھے اس کا گھر دکھاؤ۔ آپ ﷺ اس کے پاس تشریف لے آئے۔ اس کا باپ بھی اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا: اے غلام! گواہی دے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس لڑکے نے باپ کی طرف دیکھا۔ آپ ﷺ نے پھر اس کو فرمایا تو اس نے پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کا باپ پھر بھی چپ رہا کہ کیا کہوں؟ حضور اکرم ﷺ نے پھر اس کو کہا: ''قُلْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ'' اس بچے نے پھر باپ کی طرف دیکھا۔ باپ نے کہا: بیٹا! جیسے ابو القاسم کہتے ہیں مان لو۔ تو اس لڑکے نے کلمہ پڑھ لیا اور اس بعد وفات ہو گئی۔ حضور اکرم ﷺ جب باہر نکلے تو یہ فرما رہے تھے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَخْرَجَهُ بِيْ مِنَ النَّارِ...... '' اللہ تیرا شکر ہے کہ میری وجہ سے اس بچے کو جہنم سے بچا لیا۔ [صحیح البخاری]

مفسر فرماتے ہیں: اس حدیث کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ یہودی بھی جہنم سے تب بچے گا جب حضور اکرم ﷺ کا کلمہ پڑھے گا، ورنہ اس کو جہنم سے نجات نہیں مل سکتی۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٢٢﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٥﴾﴾

[آلِ عمران: ۲۱ تا ۲۵]

''جنہوں نے اللہ کے احکام کا انکار کیا اور انبیاء کو ناحق قتل کیا اور لوگوں میں سے جو انصاف کا حکم کرتے ہیں ان کو قتل کیا، ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔ یہی ہیں جن کے دنیا اور آخرت میں (اچھے) اعمال ضائع ہو گئے اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ آپ نے وہ لوگ نہیں دیکھے جن کو حصہ دیا گیا کتاب تورات سے ان کو؟ کتاب اللہ (قرآن) کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ یہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق تغافل کر کے منہ پھیر لیتا ہے۔ یہ (اعراض) اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہمیں دوزخ کی آگ نہیں جلائے گی، مگر گنتی کے چند (چالیس) دن۔ اور اپنی بنائی ہوئی باتوں پر اپنے دین کے معاملے میں بہکے ہوئے ہیں۔ پس ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ان کو ایک دن جمع کریں گے جس میں شبہ نہیں اور ہر نفس کو جو کچھ اس نے کیا پورا بدلہ ملے گا اور ان کی حق تلفی نہ ہوگی۔''

یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ابراہیم علیہ السلام سے تمہاری ملاقات نہیں ہے، لہٰذا لازمی بات ہے کہ تمہیں یہ بات تمہاری کتابوں سے معلوم ہوئی ہوگی۔ انہوں نے کہا: تورات میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تورات لے آؤ اور مجھے پڑھ کر دکھاؤ کہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دین یہودیت پر تھے؟ کہنے لگے: تورات میں موجود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے مدرسہ میں بیٹھا ہوں، تورات لے آؤ۔...... وہ کیسے تورات لے کر آتے؟ لکھا ہوا ہوتا تو وہ تورات لے کر آتے۔ اور حیلے بہانے کرنے لگے، جیسا کہ باطل کی عادت ہے۔ دعوے تو بڑے کرتا ہے، لیکن جب اس سے حق ٹکراتا ہے تو باطل کو بھاگنے کے

سوا راستہ نہیں ہوتا...... بہرحال یہودیوں سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے مدنی! آپ ان کو بلاتے ہیں کہ آؤ کتاب اللہ پر فیصلہ کرتے ہیں، پھر بھی یہ بھاگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو حق کی بات کہتے ہیں آپ ان کو خبر دے دو کہ عذاب دردناک تمہارے لیے تیار ہے۔ یہ لوگ ہیں جن کے عمل دنیا میں مٹا دیئے گئے اور نہیں ہے کوئی ان کی مدد کرنے والا۔

یہودیوں کا انبیاء اور علماء پر ظلم:

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ یہودی اتنے ظالم ہیں کہ انہوں نے ایک دن میں تینتالیس انبیاء علیہم السلام کو شہید کر دیا اور ایک سو ستر آدمی علماء حق میں سے جنہوں نے کہا تھا کہ اللہ کے انبیاء کو کیوں قتل کر رہے ہو؟ تو یہودیوں نے شام کو ان ایک سو ستر کو بھی شہید کر دیا۔

یہودیوں کی سزا:

اس لیے قرآن میں آیا کہ اس فرقہ کے کئی جرم ہیں:

......ایک جرم تو اللہ کی آیات کا انکار کیا،

......دوسرا جرم یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ناحق کے شہید کر دیا۔

......اور تیسرا جرم یہ ہے کہ ان لوگوں کو قتل کیا جنہوں نے انصاف کی بات کہی، لہٰذا ان کو جہنم کی سزا ملے گی۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال برباد ہو گئے، یہ انبیاء علیہم السلام کے قتل کی سزا ملی۔ اور لوگوں کو ناحق قتل کرنے کی یہ سزا ہے کہ ان کی کوئی مدد کرنے والا نہیں ہوگا، جو ان کو اللہ کے عذاب سے چھڑا سکے۔

کافروں کے قیامت کے متعلق نظریات:

......قیامت کے بارے میں کافروں کے ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ہم مرنے کے بعد نہیں اٹھائے جائیں گے۔ بس یہ دنیا کا نظام ہے کہ پیدا ہوتے رہیں گے اور مرتے رہیں گے۔ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔

......کافروں کے دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قیامت نہیں ہے، لیکن اگر قیامت ہوئی تو وہاں بھی اللہ پاک ہمیں تم سے زیادہ اچھی نعمتیں دیں گے۔ ﴿وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیْۤ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی﴾ [حم سجدہ: ۵۰] اور اگر

تمہارے کہنے کے مطابق ہمیں اپنے رب کی طرف دوبارہ لوٹا دیا گیا، پھر بھی ہمیں وہاں تم سے بہتر چیزیں ملیں گی۔ یہاں تم کلمہ پڑھتے ہو، نماز پڑھتے ہو اور روزے رکھتے ہو، لیکن تم ہر جگہ ذلیل وخوار ہو اور مار کھا رہے ہو۔ اور ہم لوگ خدا کو بھی نہیں مانتے، نماز بھی نہیں پڑھتے اور روزہ بھی نہیں رکھتے، لیکن ہمارے پاس دولت ہے، اولاد ہے، صحت ہے اور بہترین ملک ہمارے پاس ہیں۔ تو وہاں بھی اچھی سے اچھی چیزیں ہمیں دے گا اور تمہیں وہاں بھی یہ نعمتیں نہیں ملیں گی۔

......کافروں کا تیسرا گروہ اہل کتاب میں سے ہے۔ وہ کہتے ہیں: قیامت تو ہے، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھیں گے اور وہاں جنت جہنم بھی ہوگی، لیکن ہمیں جہنم میں صرف گنے ہوئے چند دن بھیجا جائے گا، اس کے بعد ہم جنت میں چلے جائیں گے۔

فلاسفہ کا اشکال:

یہ کافروں کے فرقے ہیں اور بعض فرقے جیسے فلاسفہ انہوں نے بھی قیامت کا انکار کیا اور کہا: قیامت نہیں ہے؛ کیونکہ انسان عناصر اربعہ سے پیدا ہوا ہے: آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے انسان پیدا ہوا ہے۔ جب انسان مر کر قبر میں چلا جاتا ہے تو ساری چیزیں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں اور ہر چیز اپنے کل میں مل جاتی ہے۔ مثلاً: ایک گلاس پانی کا ہے۔ اس پانی کو دریا میں ڈال دیں تو دریا میں پانی مل جائے گا تو یہ جز کل میں مل جائے گا۔ اسی طرح موٹر کے ٹائر میں ہوا بند ہے، پنکچر ہوا اور ہوا نکل کر ہوا میں مل گئی، لہٰذا اجزا اپنے کل میں چلا گیا۔ تو فلسفی کہتے ہیں کہ جب جز کل میں مل جاتا ہے تو اس کا جدا کرنا مشکل ہے، اسی طرح بندہ جب قبر میں ریزہ ریزہ ہو گیا تو اس کے اندر جو اربعہ عناصر تھے پانی پانی میں مل گیا، ہوا ہوا میں مل گئی، آگ آگ میں مل گئی اور مٹی مٹی میں مل گئی۔ اب قیامت والے دن کیسے فیصلہ ہوگا کہ یہ فلاں شخص کی مٹی ہے اور یہ فلاں شخص کی مٹی ہے۔ اس لیے کوئی قیامت نہیں ہے اور یہ ایسی بات ہے جو عقل میں نہیں آتی ہے۔

فلاسفہ کے اشکال کا جواب:

ان کو ٹھوکر اس لیے لگی کہ ہم پانی کو پانی میں ڈال دیں تو ہم علیحدہ نہیں کر سکتے، لیکن انہوں نے یہ نہ سوچا کہ خدا تو کر سکتا ہے۔ ہم خالق ماء، خالق ہوا اور خالق نار نہیں ہیں۔ اللہ تو ان کو پیدا کرنے والا ہے، اس کے لیے کوئی مشکل

نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ دنیا میں ہمیں نظارے بھی دکھائے گا کہ ایک ہی دریا ہے، ایک ہی دن ہے، ایک ہی وقت ہے، موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دریا کو حکم دیتے ہیں کہ تھم جاؤ اور راستے بنا دو اور جم کر کھڑے ہو جاؤ تو اسی وقت راستے بن گئے۔ تو پانی نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی۔ جب موسیٰ علیہ السلام گزر گئے اور پیچھے فرعون آ گیا اس کے ساتھ بھی لاکھوں کا لشکر ہے،؛ اس کے دماغ میں نہ آیا کہ میں نے تو دریا کے اندر یہ راستے نہیں بنائے، پھر یہ کیسے بن گئے؟ لیکن اس نے کہا: اس سے موسیٰ علیہ السلام گزر گئے ہیں تو ہم بھی گزر جائیں گے۔ جب دریا کے اندر پوری فوج اتر گئی تو اللہ تعالیٰ نے پانی کو حکم دیا: میرا دشمن ہے، اس کو پکڑ لو۔ تو پانی پھر اپنی موج پر آ گیا فرعون بمع اپنی برادری کے غرق ہو گیا اور پانی پر اللہ کا حکم نافذ ہو گیا۔

آیات کی تفسیر:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی مذمت فرمائی ہے، جو انہوں نے گناہ کیے، حرام کے ارتکاب کیے، اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا، وہ اپنی بڑائی میں اتنے مبتلا ہو گئے، عناد میں اتنے بڑھ گئے اور حضور اکرم ﷺ کی اتباع میں اپنی حقارت سمجھی کہ ہم ان کے تابع کیوں ہو جائیں کہ یہ مکہ میں پیدا ہوئے اور امی ہیں اور ہم اہل کتاب ہیں؟ ان جرائم کے ساتھ ساتھ وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ اللہ کے انبیاء کو بھی قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ معاف کرے انسان جب انسانیت کی حدود سے گر جاتا ہے تو دنیا میں اس سے بڑا خسیس انسان کوئی نہیں ہوتا کہ انسان انسان کو قتل کرے، اہل اللہ کو قتل کرے اور یہاں تک ہو جائے کہ اللہ کے نبیوں کو قتل کر دے۔

آخرت میں سب سے سخت عذاب کس کو؟

(حدیث) حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! قیامت والے دن سب سے سخت عذاب کس کو ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کو سخت عذاب ہوگا جس نے اللہ کے نبی کو قتل کیا، یا وہ جو اللہ کے نبی کے ہاتھ سے قتل ہوا! کیونکہ اللہ کے نبی سراپا رحمت اور سراپا ہدایت ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو قتل کیوں کریں گے؟ وہ تو کسی کو بد دعا دینے پر بھی راضی نہیں، حالانکہ انبیاء کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، ان کا بدن لہولہان کر ڈالا گیا، لوگوں نے سامنے کھڑے ہو کر جادوگر کہا، لیکن انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ دعا کی کہ یا اللہ! ہماری قوم کو ہدایت عطا فرما،

لیکن اگر نبی کے ہاتھ سے کوئی بدبخت قتل ہو جائے تو اس سے بڑا شقی کوئی نہیں بن سکتا۔

﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ ''بِغَيْرِ حَقٍّ'' کے بارے میں مفسرین کرام نے دو باتیں لکھی ہیں:

......ایک قول یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ انبیاء علیہم السلام سے ان کا کوئی ذاتی جھگڑا تھا یا انبیاء علیہم السلام نے ایسی بات کی جو ان کے وقار اور عظمت کے خلاف تھی، یہ بات نہیں تھی، بلکہ انہوں نے بغیر کسی سبب کے ان کو شہید کر دیا۔

......دوسرا قول یہ ہے کہ ''بِغَيْرِ حَقٍّ'' کا معنی ہے کہ نبی تو ہمیشہ ناحق قتل ہوگا، ''بِغَيْرِ حَقٍّ'' کا اضافہ اس لیے فرمایا کہ وہ بدبخت خود بھی جانتے تھے کہ ہم انبیاء علیہم السلام کو بغیر کسی وجہ کے مار رہے ہیں، لیکن انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا اور کفر کی آخری حدوں تک پہنچ گئے۔

تکبر کا ایک معنی تو یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص متکبر ہے، لوگوں کے سامنے بڑا بنتا ہے۔ یہ بھی تکبر ہے۔ اصل میں تکبر کا معنی یہ ہوتا ہے: ''بَطَرَ الْحَقِّ وَغَمِطَ النَّاسُ'' حق کو مٹانا اور لوگوں کو ذلیل کرنا۔ حق تو یہ تھا کہ ہم سب بھائی ہیں اور ناحق یہ تھا کہ ہم انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے پر آ گئے۔

متاخرین علماء نے لکھا ہے کہ اگر ہم حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خیر القرون کے زمانے تک نظر ڈالیں تو پہلے جتنی انسانیت کا دور گزرا ہے اس میں قیادت مخلص تھی، لیکن قومیں مخلص نہیں تھیں، انہوں نے نبیوں کو قتل کر دیا۔ اب معاملہ الٹ ہو گیا ہے، قومیں مخلص ہیں اور قائد چور ہیں۔

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْـحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾﴾

[آلِ عمران: ۲۶، ۲۷]

''کہہ دیجیے: اے اللہ! اے سلطنت کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ تیری قدرت میں ہے خیر (اور شر)، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے۔ اور رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے حساب۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے کہ بنو اسرائیل نے تین سو نبیوں کو صبح کے وقت شہید کر دیا اور شام کو سبزی منڈی میں دکانیں لگا کر سبزی بیچ رہے ہیں، یعنی ان کو کوئی فکر نہیں تھی کہ ہم نے جرم بھی کیا ہے۔

جب انہوں نے حق کا انکار کیا اور مخلوق کے اوپر متکبر بنے اور انبیاء کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلت اور ہلاکت کا عذاب دیا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا: آپ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیں۔ عذاب کی کوئی خوشخبری نہیں ہوتی، لیکن استہزاء کے طور پر ان سے فرمایا گیا۔

شانِ نزول:

غزوۂ احزاب کے موقع پر جب خندق کھودی جا رہی تھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ کدال ماری۔ اس سے روشنی پھوٹی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اللہ اکبر'' فرمایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم حیران ہو گئے اور پوچھا تو فرمایا: جب پہلی دفعہ کدال ماری ہے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے حیرہ تک کا ملک دکھایا، دوسری کدال پر جب روشنی ہوئی تو روم کے محلات بھی مجھے دکھائے گئے اور تیسری دفعہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے صنعاء (یمن کا شہر) دکھایا اور حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خوشخبری دی ہے کہ میرے نبی کو کہہ دے کہ جہاں جہاں تک روشنی میں ہم نے یہ ملک دکھائے ہیں یہ سب علاقے تمہارے تابع ہو جائیں گے اور یہاں اسلام کا جھنڈا لہرائے گا۔ جب یہ بات کافروں کو پہنچی تو انہوں نے کہا: بڑی عجیب بات ہے! مدینہ کو بچانے کے لیے خندق کھود رہے ہیں، خود پتھر اٹھا رہے ہیں، لیکن اپنے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یہ باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ نہیں کر سکتے، لیکن ایک جانب سے روم کے فتح ہونے کی اور دوسری جانب صنعاء تک فتح ہونے کی خوشخبری سنا رہے ہیں، یہ کیسے ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات مبارکہ نازل فرمائیں:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز﴾ [آل عمران:۲۶] ان کو کہہ دو: اللہ تعالیٰ ہی اس ملک کے مالک ہیں۔ جس کو چاہیں ملک دے دیں اور جس سے چاہیں ملک چھین لیں۔ جس کو چاہیں عزت دیں اور جس کو چاہیں ذلت دیں۔ اسی کے ہاتھ میں سب خیر و بھلائی ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ رات کو دن میں داخل کرتے ہیں اور دن کو رات میں داخل کرتے ہیں۔ زندہ سے مردہ کو اور مردہ کو زندہ سے نکالتے ہیں۔ اور جس کو چاہیں بغیر حساب کے رزق عطا فرماتے ہیں۔ اے میرے نبی! آپ ان کافروں سے کہہ دیں کہ ملک

دینے والے بھی اللہ ہیں اور چھیننے والے بھی اللہ ہیں اور ذلت دینے والے بھی اللہ ہیں اور عزت دینے والے بھی۔

اللہ کا اسم اعظم:

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔

ایک حدیث مبارک میں یہ بھی روایت موجود ہے کہ ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے اوپر اتنا قرضہ چڑھ گیا ہے کہ اتر نہیں سکتا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ کلمات پڑھ کر دعا کیا کرو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تیری ساری تکلیفیں دور کردیں گے۔

حضور اکرم ﷺ کے حق میں دلیل:

﴿تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ [آل عمران: ۲۷] حضور اکرم ﷺ پر اعتراض کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک دلیل دی ہے کہ جو اللہ ظلمت کو نور میں داخل کرنے پر قادر ہے اور نور کو ظلمت میں داخل کرنے پر قادر ہے جو اس رات دن کے تغیر تبدل پر قادر ہے وہ حکومت بدلنے پر بھی قادر ہے۔

اور فرمایا: ﴿وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ [آل عمران: ۲۷] اللہ زندہ کو مردہ سے نکالنے پر قادر ہے، انڈہ مردہ ہے اور زندہ مرغی سے نکل آیا اور چاہے تو زندہ سے مردہ کو نکالنے پر قادر ہے۔ مرغی زندہ ہے اور انڈہ مردہ نکل آیا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کی مثال یہ ہے کہ مومن کے پیٹ سے کافر کو پیدا کردے؛ کیونکہ مومن زندہ ہے اور کافر مردہ ہے۔ اللہ چاہیں ابوجہل کے پیٹ سے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو پیدا کردیں اور ابوجہل پر کروڑوں لعنتیں برس رہی ہیں اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ صحابی جلیل اور بطل الاسلام ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نبی ہیں اور ان کی صلب سے پیدا ہونے والا بیٹا کافر ہے۔ آدم علیہ السلام کے صلب سے پیدا ہونے والا بیٹا قابیل کافر ہے۔

اللہ کا بے حساب رزق:

﴿وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [آل عمران: ۲۷] وہ رزق دینے پر آجائے تو انگوٹھے لگانے والے کروڑوں میں کھیلتے ہیں اور بخاری پڑھانے والے لوگ چندہ کے محتاج ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے اور اس کا نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے کافرو! تم اعتراض کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو نبوت ولد اسماعیل میں

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف منتقل کر دی، وہ چاہیں تو اس سارے ملک پر اسلام غالب فرما دیں، اس کو کون روکنے والا ہے۔

قرضہ دور کرنے کی دعا:

اس دعا کو زبانی یاد کر لیں:

((قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ؗ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؗ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ؗ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ رَحْمَانُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَرَحِيْمُهُمَا تُؤْتِي مِنْهُمَا مَنْ تَشَاءُ وَ تَمْنَعُ مِنْهُمَا مَنْ تَشَاءُ فَارْحَمْنِي رَحْمَةً تُغْنِيْنِي بِهَا عَنْ رَحْمَةِ مَنْ سِوَاكَ اَللّٰهُمَّ! أَغْنِنِي مِنَ الْفَقْرِ اَللّٰهُمَّ! اكْفِنِي عَنِ الدَّيْنِ))

علما نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی ہر نماز کے بعد سات دفعہ پڑھ لیا کرے، اگر پہاڑوں کے برابر بھی قرضہ ہو تو اتر جائے گا۔ اللہ ہم سب کو پڑھنے کی توفیق دے۔ آج ہمارے لوگوں کو اگر کوئی انتر منتر والا وظیفہ بتا دے اس کو بڑا خوش ہو کر پڑھتے ہیں اور جو وظیفے قرآن میں ہیں اور میرے محمد پاک ﷺ نے بتائے ہیں وہ نہیں پڑھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توحید:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پاک پیغمبر کو حکم دیا کہ اپنے رب کی تعظیم بیان کریں، اپنے رب کا شکر کریں، اپنے رب کو ہر چیز سونپ دیں اور اسی پر سہارا کریں؛ کیونکہ سارا ملک اللہ کا ہے۔ ان آیات مبارکہ میں حکم ہے کہ اپنی امت کو توحید کا مسئلہ سمجھا دیں۔ دوسرا مشرکین کا بھی رد فرما دیں کہ تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟ اللہ تعالیٰ نے اس کو نبوت کیوں دی ہے؟ سارا ملک اللہ کا ہے، وہ جو چاہے کرے۔

ان آیات میں اس امت کے لیے سب سے بڑا سبق بھی ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ اپنی زبان مبارک سے خود کہہ رہے ہیں کہ اللہ مالک الملک ہے، اس میں تصرف کرنے کا اختیار بھی اسی کو ہے ساری کائنات کا ہر بندہ اور ہر ذرہ اس کا محتاج ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے مدنی ﷺ! آپ بھی اپنا سب کچھ اللہ کو سونپیں اور

اللہ پر توکل کریں۔

حضور اکرم ﷺ نے تین جملے ارشاد فرمائے، آگے فرمایا: ''إِذَا سَأَلْتَ فَاسْئَلِ مِنَ اللّٰهِ'' جب تم نے کچھ مانگنا ہو تو اللہ سے مانگو، اللہ کے سوا کسی غیر سے نہ مانگو۔ اگر کوئی اللہ کے سوا مردہ سے مانگے تو حضور اکرم ﷺ کے پہلے سبق کا نافرمان ہو گیا۔

میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان پر قربان ہو جاؤں!! جب انہوں نے یہ بات سنی، اس کے بعد اگر وہ گھوڑے پر بیٹھے ہوتے اور بید گر جاتا ہے تو خود اتر کر اٹھا لیتے تھے! کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کسی سے نہ مانگو، لہٰذا ہم نہیں مانگتے۔ حالانکہ یہ منع نہیں ہے، کیونکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر سوال کرنا اور اس طرح سوال کرنا جس طرح کوئی اللہ کو پکارتا ہے، جائز نہیں ہے۔

اور دوسرا جملہ ارشاد فرمایا: ''إِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ'' جب اعتماد اور بھروسہ کرنا ہو تو اللہ کی ذات پر بھروسہ کرو۔ تم کسی غیر کا سہارا لو گے، اس پر تو موت آجائے گی پھر کیا کرو گے؟ اس لیے اس کا سہارا لو جس نے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ آج اگر یہی مسئلہ سمجھ لیں تو جھگڑے کی کوئی بات نہیں رہتی، لیکن اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اس کے سو بہانے ہیں۔ جو بتوں سے مانگتے ہیں ان کے پاس بھی بہانے ہیں۔

حضور ﷺ کے کمالات:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر ہمیں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سب سے بڑی نعمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ عطا فرمائے ہیں۔ نبوت جو بنی اسرائیل میں چلی آرہی تھی وہ حضور اکرم ﷺ کی طرف منتقل فرمادی۔

حضور اکرم ﷺ سے پہلے انبیاء میں جتنے محاسن تھے وہ سب کے سب حضور اکرم ﷺ میں جمع فرما دیئے، مثلاً: اگر کسی پیغمبر میں صبر کی صفت تھی، کسی پیغمبر میں جمال کی صفت تھی، کسی پیغمبر میں کمال کی صفت تھی اور کسی پیغمبر کے اندر حوصلہ کی صفت تھی، ان ساری صفات کا مجموعہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو بنا دیا۔ اور ہر نبی کا زمانہ بھی گزر گیا اور اس کے معجزات بھی گزر گئے، لیکن حضور اکرم ﷺ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت کو بھی قیامت تک رکھا اور آپ ﷺ کے معجزات بھی قیامت تک ہیں۔ مسلمان کا کوئی گھر ایسا نہیں جہاں قرآن نہ پڑھا جا رہا ہو۔ کوئی بدنصیب مسلمان ہوگا جس کے گھر میں قرآن نہ ہو۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ

نے میری امت پر مالِ غنیمت کو حلال کر دیا، اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے مٹی کو بھی پاک کر دیا کہ اگر پانی نہ ملے تو پاک مٹی پر تیمم کر کے نماز پڑھ لے اور اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے ساری زمین کو سجدہ کے قابل بنا دیا۔ یہ ایسے خصائص ہیں جو آپ ﷺ کو دیئے گئے اور کسی کو نہیں دیئے گئے۔ اسی طرح آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور شریعت عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بعض وہ مغیبات جو گزر چکے ہیں ان کی بھی اطلاع فرمائی اور ان واقعات کی بھی اطلاع فرمائی جو آنے والے زمانہ میں ہیں۔ مثلاً: حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ مغیبات میں ہے، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصص مغیبات میں سے ہیں۔ اور اسی طرح: ﴿الٓمّٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ③﴾ [الروم: ۱ تا ۳] یہ خبر بھی عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو قیامت کی علامات کا بھی علم عطا فرما دیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی امت کو پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں، الحمد للہ امت محمدیہ موجود ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو غالب فرمایا اور آپ کی شریعت کو غالب فرمایا۔ غلبہ حجت اور دلیل سے بھی ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب اسلام کی حقانیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اعدائے اسلام بھی حقانیتِ اسلام کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی کو اسلام نصیب ہو اور کسی کو اسلام نصیب نہ ہو۔

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ وہی اللہ کی ذات ہے جو ساری کائنات میں تصرف کرنے والی ہے۔ اسی کی ذات ہے جو چاہے، جیسا چاہے اور جس وقت چاہے کر دے۔ جیسا کہ کافر کہنے لگے: ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ③١﴾ [زخرف: ۳۱] کہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ﴾ [زخرف: ۳۲] میرے مدنی! آپ ان کو کہہ دیں: کیا اللہ کی رحمت کے خزانے ان کے ہاتھ میں ہیں؟ حالانکہ ان کے ہاتھ میں تو روٹی بھی نہیں ہے، ان کے ہاتھ میں تو اپنی زندگی بھی نہیں ہے۔ میری مرضی ہے، میں جس کو چاہوں چن لوں اور نبوت دے دوں۔ یہ کون ہیں میری مرضی پر اعتراض کرنے والے کہ اس کو نبی بنایا ہے اور اس کو نبی کیوں نہیں بنایا ہے؟ یا اس کو بنانا چاہیے تھا۔

ساری مخلوقِ خدا اللہ کی ملک ہے:

اسحاق بن احمد رحمۃ اللہ علیہ سے حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ خلیفہ مامون ایک دفعہ روم کے شہروں کے

اندر گیا۔ اس نے دیکھا کہ حمیری زبان کے اندر کتبہ لکھا ہوا ہے تو اس نے اپنے پڑھے لکھے لوگوں کو بلایا کہ اس کو پڑھ کر عربی میں ترجمہ کر کے مجھے بتاؤ کہ کیا لکھا ہوا ہے؟ انہوں نے پڑھا تو اس میں لکھا ہوا تھا:

"بِسْمِ اللّٰهِ مَا اخْتَلَفَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَلَا دَارَتْ نُجُوْمُ السَّمَاءِ فِي الْفُلْكِ إِلَّا بِنَقْلِ النَّعِيْمِ عَنْ مَلِكٍ قَدْ زَالَ سُلْطَانُ إِلَى مَلِكٍ وَ مَلِكُ ذِي الْعَرْشِ دَائِمٌ أَبَدًا لَيْسَ بِغَانٍ وَإِلَّا بِمُشْتَرِكٍ......"

"شروع اللہ کے نام سے۔ یہ رات دن کا اختلاف آسمانوں اور زمینوں میں، اسی طرح ستاروں کا چمکنا اور سورج چاند کا چمکنا، یہ سارا ادوار دیکھ رہے ہیں کہ ایک بادشاہ سے اللہ نے ملک لے کر دوسرے کو دے دیا۔ جیسے رات اور دن بدل رہے ہیں اسی طرح دنیا میں سب طاقتیں بدل رہی ہیں، لیکن اسی کا ملک ہے جو ہمیشہ ہے، دائم ہے، جس پر کبھی فنا نہیں آئے گی، باقی ہر چیز پر فنا آجائے گی اور اللہ کی ذات باقی رہے گی۔"

﴿تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ [آل عمران: ۲۷] اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے اندر زمانے پیدا کیے ہیں۔ کبھی سردی ہے اور کبھی گرمی ہے، کبھی دن بڑا ہوگا اور رات چھوٹی ہوگی اور کبھی رات بڑی ہوگی اور دن چھوٹا ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ رات کو گھٹا کر دن کو بڑھا دیتے ہیں اور کبھی رات کو بڑھا کر دن کو گھٹا دیتے ہیں۔ تو جو اس دن رات میں تصرف کرنے پر قادر ہے، ہر تصرف پر بھی اسی کی ذات قادر ہے۔ کبھی رات ہے، کبھی دن ہے، جو اس تصرف پر قادر ہے وہ اس عالم کو فنا کر کے دوسرے عالم پر قادر ہے۔

یاد رکھیں! جن لوگوں کا اس دن رات کے ہیر پھیر میں تصرف نہیں ہے وہ مختار کل یا حاجت روا کیسے بن سکتے ہیں؟ آج ساری دنیا اکٹھی ہو جائے اور کہے: رات ہونی چاہیے، دن نہیں ہونا چاہیے تو اس پر بھی قادر نہیں ہے۔ وہ حاجت روا اور مشکل کشا کیسے بن سکتے ہیں؟ جب ایک مومن کے دل کے اندر یہ بات بیٹھ جائے کہ عزت و ذلت کا مالک اللہ ہے، نفع و نقصان کا مالک اللہ ہے، ہدایت دینے کا مالک اللہ ہے اور رزق دینے کا مالک اللہ ہے تو پھر کافروں سے دوستی کا کیا معنی ہے؟ اس کا مطلب تو ہوا کہ اللہ پر ایمان نہیں ہے، صرف زبانی کلامی باتیں ہیں۔ اس لیے وہ آیات آئیں جن کا تعلق موالاتِ کفار کے ساتھ ہے۔

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝﴾ [آل عمران: ۲۸]

''مسلمان مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جس نے ایسا کیا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ (کی تدبیر) کرنا چاہو۔ اور اللہ تمہیں اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے۔''

شانِ نزول:

علماء نے لکھا ہے کہ چند انصاری صحابی تھے، ان کی یہودی قبائل سے بھی دوستی تھی؛ کیونکہ ایک شہر کے اندر سب آباد تھے، مسلمان ہونے کے بعد بھی ان سے تعلق تھا۔ تین صحابی تھے جن کا تعلق یہودیوں سے زیادہ تھا تو ان کو دو تین صحابہ نے ہدایت کی کہ اب ہم مسلمان ہیں، کافروں کے ساتھ تعلق نہ رکھیں۔ انہوں نے کہا: ہمارا ان سے قدیمی تعلق ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حکم نازل فرمادیا: ﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ؀﴾ [آل عمران:۲۸] خبردار! مومنوں کی مومنوں کے علاوہ کافروں سے دوستی نہیں ہوسکتی۔

موالات کی اقسام:

موالات کی تین قسمیں ہیں:

1 ......ہم کفر کے تمام مذاہب کو غلط اور برا سمجھتے ہیں اور دل میں نفرت کرتے ہیں۔ اور یہی مطلوبِ مومن ہے، لیکن دنیوی تعلق کا کاروبار، لین دین ٹھیک ہے، منع نہیں ہے کہ آپ اپنے مذہب پر قائم رہیں اور ان کے مذہب کو برا سمجھیں اور لین دین کی حد تک ان سے تعلق رکھیں تو کوئی حرج نہیں۔

2 ......ان کے مذہب کو مذہب اور ان کے دین کو حق سمجھتا ہے، یعنی دماغ کے اندر یہ خلش ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہمارا مذہب بھی ٹھیک ہے، لیکن یہود و نصاریٰ بھی اہل کتاب ہیں اور کسی نبی کو مانتے ہیں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، کہیں زلزلہ آجائے تو سب سے پہلے مدد کو پہنچتے ہیں، اچھے لوگ ہیں۔ جب کوئی آدمی یہ عقیدہ رکھے تو وہ کفر تک پہنچ جاتا ہے۔

3 ......وہ ان کے دین کو تو برحق نہیں سمجھتا، لیکن ان کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور کبھی ان کی مدد بھی کر دیتا ہے اور کبھی

مسلمانوں کی خبر بھی پہنچا دیتا ہے۔ یہ کفر تو نہیں بنتا، لیکن یہ گناہِ کبیرہ ہے۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

جیسا کہ ایک صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ۔ ان کو زندگی میں ایک واقعہ پیش آ گیا، حالانکہ وہ کافروں کو کافر اور گمراہ سمجھتے تھے، مشرکین مکہ کو دشمن دین سمجھتے تھے، لیکن واقعہ اس طرح ہوا کہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے بال بچے مکہ میں تھے اور ان کا دوسرا کوئی رشتہ دار نہیں تھا جو ان کی خبر گیری کرتا۔ اس لیے وہ پریشان رہتے تھے کہ میں ان کی خبر گیری کیسے کروں؟ اگر ان پر کوئی مشکل وقت آ جائے تو ان کی مدد کون کرے گا؟ اتفاق سے ایک عورت مکہ کی رہنے والی تھی، وہ مدینہ منورہ آئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم یہاں کیوں آئی ہو؟ اس نے کہا: آپ میری درخواست تو سنیں! ٹھیک ہے کہ غلط عورت ہوں، لیکن انسان تو ہوں۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ نے ہمارے سرداروں کو بدر میں قتل کر دیا ہے، کچھ قید ہو گئے، پھر فدیہ دے کر چھوٹے اور ان کی مالی طور پر کمر ٹوٹ گئی۔ اب مکہ میں کوئی بڑا آدمی تو نہیں رہا جو ہم پر پیسے خرچ کرے اور خرچہ برداشت کرے۔ میں بھوکی ہو گئی ہوں، کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ میں یہاں آئی ہوں، تاکہ لوگوں سے پیسے لوں اور روٹی کھا کر زندہ تو رہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام میں ایسی چیزیں منع ہیں۔ جہاں تک تمہاری مدد کا تعلق ہے، اگر کوئی تمہیں روٹی کپڑا کھانا دینا چاہتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ اس عورت کو حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ مل گئے۔ انہوں نے کہا: میں تجھے اتنے پیسے دوں گا، تم میرا یہ خط مکہ کے فلاں سردار کو پہنچا دو۔ اس عورت کو پیسوں کی لالچ تھی، اس نے کہا: میں آپ کا خط لے جا کر پہنچا دوں گی۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے مکہ کے سردار کو خط لکھا کہ اللہ کے نبی اپنی فوجوں کو تیار کر رہے ہیں، بہت جلد وہ مکہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اور ساتھ یہ درخواست کی کہ میں چونکہ آپ کو اللہ کے نبی کا ایک راز دے رہا ہوں، اس کے صلے میں تم میرے بیوی بچوں کا خیال رکھو گے اور اگر ہو سکے تو ان کو مدینہ منورہ بھجوا دو۔ وہ عورت خط لے کر چلی گئی اور ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ فوراً اپنے ساتھ جوانوں کا دستہ لے کر مکہ کے راستے پر روضۂ خاخ پر جاؤ۔ ایک عورت اونٹنی پر سفر کر رہی ہے، اس کے پاس ایک خط ہے وہ برآمد کرو اور عورت کو بھی پکڑ کر لے آؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اپنے سوار ساتھ لیے اور گھوڑوں کو دوڑایا۔ اللہ کی

شان ہے! جیسے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا اس جگہ پر پہنچے تو ایک عورت اونٹ پر جارہی تھی۔ ہم نے اس کو ٹھہرنے کا کہا، وہ ٹھہر گئی۔ اس سے پوچھا: کیا تمہارے پاس مدینہ منورہ سے کوئی خط ہے؟ اس نے کہا: میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس اونٹ کو بٹھایا اور اس کے سامان کی تلاشی لی تو اس کے اندر سے خط نہ نکلا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اچھی طرح تلاش کرو، کوئی جگہ ایسی تو نہیں ہے جو نہ دیکھی ہو۔ انہوں نے پھر تلاشی لی، لیکن خط نہ ملا۔ ساتھی کہنے لگے: اکیلی عورت ہے، آپ خوامخواہ اس پر سختی کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ غصے میں آ گئے اور فرمایا: میں مدینہ منورہ سے خود تو نہیں آیا، مجھے حضور اکرم ﷺ نے بھیجا ہے اور آپ ﷺ کی بات کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ آپ نے اس عورت سے کہا: اگر تم عورت ہو تو اپنی جگہ ہو۔ سیدھے طریقے سے خط مجھے دے دو، ورنہ مار مار کر تیری جان نکال دوں گا اور تیرے سارے کپڑے اتار کر بھی میں تلاشی لوں گا۔ مجھے میرے نبی کا حکم ہے اور وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ اب عورت ڈر گئی، اس نے خط بالوں کے اندر چھپایا ہوا تھا، تو بال کھول کر خط حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔

آپ رضی اللہ عنہ خط اور عورت کو لے کر مدینہ منورہ میں دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ جب خط پڑھا گیا تو حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ جو صحابی تھے ان کا خط تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو بلوایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ موجود تھے، انہوں نے کہا: حضور! ان کو بلانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب خط مل گیا ہے اور عورت بھی اقرار کرتی ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے مجھے خط دیا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں، میں تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں کہ اللہ کے نبی کا راز کھول دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عمر! چپ کرو، کیا کہہ رہے ہو؟ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غصہ میں آ کر یہ کہا کہ حضور! مجھے اجازت دیں کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عمر! کیا کہہ رہے ہو؟ وہ اصحابِ بدر سے ہے اور اللہ تعالیٰ فیصلہ کر چکے ہیں کہ بدر والوں سے جو بھی غلطی ہو معاف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر چکا ہے تو ہم کیسے سزا دے سکتے ہیں؟ میرا صحابی منافق نہیں ہے۔

جب حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ آ گئے تو حضور اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: تم نے کوئی خط لکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی لکھا ہے۔ کیوں لکھا ہے؟ اس نے کہا: سچی بات یہ ہے کہ میرا ایمان ہے کہ آپ نے مکہ پر حملہ کرنا ہے اور یہ بھی میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو فتح دیں گے، کافر آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب آپ کی فتح یقینی ہے اور آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو میں نے اپنے بچوں کی زندگی بچانے کے لیے یہ ایک راستہ نکالا تھا کہ میں

ان کافروں پر احسان کردوں اور وہ میرے بچوں کا خیال رکھیں۔ اب میری گردن حاضر ہے، جو بھی سزا دیں مجھے قبول ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: حاطب نے سچ کہا ہے۔ بہر حال میں تمہیں معاف کرتا ہوں اور آئندہ ایسے حالات میں احتیاط کریں۔ کافروں سے دوستی رکھ کر مسلمانوں کا راز ظاہر کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

موالات کی ایک قسم یہ ہے کہ ایک آدمی کافروں کے ملک میں پھنس گیا اور اس کو اپنی جان کا خطرہ ہے، وہ مجبور ہے۔ اسلام اتنی اجازت دیتا ہے کہ دل میں ایمان کامل رکھتے ہوئے محض زبانی طور پر ایسا لفظ کہہ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے: ﴿إِلَّآ أَن تَتَّقُوا۟ مِنْهُمْ تُقَىٰةً﴾ [آلِ عمران: ۸] لیکن اس وقت بھی اگر کوئی اپنے ایمان پر قائم رہے تو بڑی بات ہے۔

ایک صحابی کی عالی ہمتی کا واقعہ:

ایک صحابی کافروں میں پھنس گئے۔ کافروں نے کہا: اگر تم اپنی زبان سے حضور اکرم ﷺ کی شان میں کوئی بے ادبی کا لفظ کہہ دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ صحابی نے کہا: تم مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دو، لیکن میں آپ ﷺ کی بے ادبی نہیں کر سکتا۔

ایک اور صحابی کا واقعہ:

ایک دفعہ ایک اور صحابی پھنس گئے۔ بادشاہ کافر تھا، اس نے کہا: اگر تم میرے ماتھے پر صرف بوسہ دے دو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ انہوں نے کہا: میں تجھے بوسہ نہیں دیتا۔ بادشاہ نے کہا: پھر اس کی سزا موت ملے گی۔ صحابی نے کہا: موت قبول ہے۔ بادشاہ نے ایک اور چال چلی اور کہا: تمہارے ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں، اگر تم میرے ماتھے پر بوسہ دے دو تو میں سب کو چھوڑ دوں گا۔ صحابی نے کہا: اب میں بوسہ دیتا ہوں؛ کیونکہ اب مجھے اپنی زندگی نہیں بچانی ہے، اب مجھے مسلمانوں کی زندگی بچانی ہے۔ اگر ان کی زندگی کی حفاظت میری اس غلطی سے ہو سکتی ہے تو ان کے لیے میں یہ غلطی کر سکتا ہوں۔ اس نے بوسہ دے دیا تو اس بادشاہ نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو چھوڑ دیا۔ جب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور سارا واقعہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: دیکھو! اس نے اپنے ایمان کو کتنا کھرا پایا ہے!! اس نے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اب سارے ساتھی اس کے ماتھے کو بوسہ دو۔

کافروں سے دفاعی معاہدہ کی اجازت:

اگر کبھی مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ دفاعی معاہدہ کی ضرورت پڑے تو وہ بھی جائز ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے یہودِ مدینہ سے بھی معاہدہ کیا تھا کہ اگر تمہارا دشمن تم پر چڑھائی کرے گا تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اگر ہمارا دشمن مدینہ پر چڑھائی کرے گا تو تم ہماری مدد کرو گے۔ اسی طرح بعض قبائل کفار سے حضور اکرم ﷺ نے مکہ کے فتح ہونے کے بعد معاہدے کئے کہ اگر تمہارا دشمن تمہیں ستائے گا تو ہم تمہاری مدد کو پہنچیں گے اور ہمارے اوپر اگر دشمن چڑھائی کرے اور ہمیں تمہاری ضرورت ہو تو تم ہماری مدد کرو گے۔

اصل وجہ یہ تھی کہ حضور اکرم ﷺ نے اس وقت امت کے لیے قیامت تک کا ایک راستہ پیدا کیا، ورنہ اللہ تعالیٰ نے جیسے بدر میں مدد کی تھی تو بعد میں بھی فرشتے بھیج کر مدد کر سکتے تھے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے امت کو سبق دیا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں اور کسی کفر کی طاقت سے معاہدہ کرنا پڑے تو جائز ہے، شریعت کے اندر اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ کوئی ایسا معاہدہ نہ کیا جائے جو مسلمانوں کی ذلت اور ناکامی کا باعث ہو۔

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ﴾ اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتے ہیں کہ خبردار! تم نے کافروں سے عزت تلاش کی، ان سے دلی محبت کی اور دل لگا ڈر کھا تو گویا تم نے اللہ کی ذات کو اپنا دشمن بنا لیا ہے؛ کیونکہ جو اللہ کو محبوب رکھتا ہے وہ کافروں کو محبوب نہیں رکھ سکتا۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝٢٨﴾ [آل عمران: ۲۸] اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور اللہ ہی تمہیں جزا دیں گے۔ مومن کو ایمان کی جزا ملے گی اور کافروں کو کفر کی سزا ملے گی۔

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٢٩﴾ [آل عمران: ۲۹]

''(ان سے) کہہ دیجیے: اگر تم (ان سے دوستی کی) بات کو اپنے سینے میں چھپاؤ گے یا اس کو ظاہر کرو گے اللہ کو معلوم ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ﴾ تم جو کچھ اپنے سینوں میں چھپاؤ یا اپنی زبانوں پر ظاہر کرو

اللہ جاننے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ عالم الغیب، علیم بذات الصدور ہیں اور اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کے ذرے ذرے کو محیط ہے۔

﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ اور اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [آل عمران: ۲۹] اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں کہ تم دل میں کافروں سے دوستی کو چھپاؤ اور تم یہ سمجھو کہ اللہ کے علم میں نہیں ہوگا، بلکہ اللہ کے آگے تو تمہارے دل میں بھی جو کچھ ہے اور ظاہر میں بھی جو کچھ ہے اس کو جانتے ہیں۔ اور اللہ صرف علمِ کامل ہی نہیں رکھتے، بلکہ قدرت بھی کامل رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ چاہیں تو تمہیں سزا دے دیں اور اللہ چاہیں تو تیری عزت کو ذلت میں بدل دیں اور اللہ تعالیٰ چاہیں تو تیری کامیابی کو ناکامی میں بدل دیں۔ اصل عزت دینے والا اصل مدد کرنے والا اللہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شانِ بے نیازی کا واقعہ:

جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس پہنچے تو سارے لوگوں نے کہا کہ اچھے کپڑے پہن لیں؛ (کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کی قمیص پر ٹاکیاں لگی ہوئی تھیں) آپ نے فرمایا: خبردار! ہم وہ لوگ ہیں جنہیں عزت اسلام نے دی ہے اور اسلام کے سوا ہم اپنی عزت لباس میں نہیں ڈھونڈنا چاہتے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس روایت پر اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ آج مسلمان لباس اس لیے ڈھونڈتا ہے؛ کیونکہ اس کے پاس اسلام نہیں رہا۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس پہنچے تو حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور بڑے بڑے صحابہ نے مجبور کر دیا کہ نیا لباس پہن لیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لباس بدلا اور سواری کے لیے گھوڑا لے آئے۔ آپ رکاب میں پاؤں رکھ زین کے اوپر ابھی بیٹھے نہیں تھے کہ دوبارہ چھلانگ لگا کر نیچے آگئے اور فرمایا: ''هَلَكَ عُمَرُ'' عمر برباد ہوگیا۔ جلدی کرو اور میرا لباس لے آؤ۔ تو وہی پرانا لباس پہنا اور اس اونٹ پر بیٹھے جس پر سفر کر کے مدینہ سے آئے تھے اور اپنے نوکر کو ساتھ لے گئے۔ یہودیوں نے کتابیں کھول کر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ساری نشانیاں دیکھیں۔ نشانیاں دیکھنے کے بعد جب تسلی کر لی تو بیت المقدس کی چابیاں آپ کے حوالے کر دیں۔

تفسیرِ مکی

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب
کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: بیت اللہ، کتاب اللہ اور اہل اللہ۔ اگر
کسی شخص پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دل [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
سامعین [illegible]
طریقے پر چلتے ہوئے [illegible] کمال مہارت سے سامعین [illegible] اقتداء پر گامزن
کرتے ہیں یہ ایک سے درس کا خاصہ ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم
العالیہ کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی
درستگی، فکر آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاق حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر
بھی زور دیا جاتا ہے۔ زیر نظر تفسیر "انوار الحرم" المعروف "تفسیر مکی" حضرت
اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس کا مجموعہ ہے۔

مکتبۃ الفقیہ